از نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت
زیرِ نظر
اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
تفسیرِ نمونہ
ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
مصباح القرآن ٹرسٹ

یہ کتاب

اپنے بچوں کے لیے scan کی بیرونِ ملک مقیم ہیں

مو منین بھی اس سے استفادہ حاصل کرسکتے ہیں.
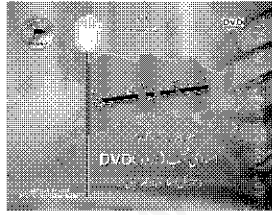
منجانب.

سبیلِ سکینہ

یونٹ نمبر ۸ لطیف آباد حیدر آباد پاکستان

آثارِ نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد ۱۴

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

پیشکش، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

نام کتاب ------ تفسیر نمونہ

جلد ------ ۱۴

زیرِ نظر ------ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ------ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفیؒ

ناشر ------ مصباح القرآن ٹرسٹ۔ ۱۰، گنگارام بلڈنگ
شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور

مطبع ------ معراج دین پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ------ ربیع الثانی ۱۴۱۷ھ

ہدیہ ------

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۲۴، الفضل مارکیٹ اردو بازار، لاہور

فون: ۷۳۱۴۳۱۱

عرضِ ناشر

قارئین محترم: السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلام حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغاز کار میں موجودہ دور کی شہرہ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور پھر محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر بسیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کرلی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآن پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیرِ طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہ، کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، لہذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کرکے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سورتوں کا کچھ حصہ ایک جلد میں اور بقایا حصہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سورت دو حصوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سورت کی کامل تفسیر پر ختم ہوگئی۔ اس طرح پوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۴ اس وقت آپ کے زیر نظر ہے جس میں سابقہ جلد ۲۴ میں سے صفحہ ۱۹۳ تا ۴۱۵، جلد ۲۵ مکمل اور جلد ۲۶ میں سے صفحہ ۲۶ تا ۱۴۸ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سورہ طلاق، سورہ تحریم، سورہ ملک، سورہ القلم، سورہ الحاقہ، سورہ معارج، سورہ نوح، سورہ جن، سورہ مزمل، سورہ مدثر، سورہ قیامت، سورہ دہر، سورہ مرسلات، سورہ نبا، سورہ نازعات اور سورہ عبس کی تفسیر پر محیط ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیر مرد مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہار تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعا گو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسلام

اراکین

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

یہ تفسیر

حسب ذیل علما و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے داؤد الہامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے اسد اللہ ایمانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱- تفسیر مجمع البیان — از — مشہور مفسر علامہ طبرسی
۲- تفسیر تبیان — از — دانشمند فقیہ بزرگ شیخ طوسی
۳- تفسیر المیزان — از — علامہ طباطبائی
۴- تفسیر صافی — از — علامہ محسن فیض کاشانی
۵- تفسیر نور الثقلین — از — مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶- تفسیر برہان — از — مرحوم سید ہاشم بحرینی
۷- تفسیر روح المعانی — از — علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸- تفسیر المنار — از — محمد رشید رضا تقریرات، درس تفسیر شیخ محمد عبدہ
۹- تفسیر فی ظلال القرآن — از — سید قطب مصری
۱۰- تفسیر قرطبی — از — محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱- اسباب النزول — از — واحدی (ابو الحسن علی بن متویہ نیشاپوری)
۱۲- تفسیر مراغی — از — احمد مصطفی مراغی
۱۳- تفسیر مفاتیح الغیب — از — فخر رازی
۱۴- تفسیر روح الجنان — از — ابو الفتوح رازی

گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ مُحسنِ ملت حضرت علّامہ سیّد صفدر حسین نجفی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان بھی یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں، جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماء میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققین اسلام کی محنتوں اور حاصلِ فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر....؟ وہ تفسیر کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریات زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابل ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیش نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شامل حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی نو جلدیں جو اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی دسویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیق الٰہی کا میں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو۔ یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[1] کے مقام پر، حتٰی کہ بستر بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

اس میں ہم آہنگی نہیں ہوگی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا ۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔ (یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بارالٰہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزہ علمیہ قم ۔ ایران

تفسیر نمونہ جلد ۱۴

فہرست

سُورۂ جن

سُورہ مزمل

سورہ مدثر

سورہ قیامت

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد ۱۴

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

سورۂ طلاق : مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۸

سورۂ تحریم : مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۸

سورۂ مُلک : مکی سورت ہے اور اس کی ۳۰ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ قلم : مکی سورت ہے اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ حاقہ : مکی سورت ہے اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ معارج : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۴ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ نوحؑ : مکی سورت ہے اور اس کی ۲۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ جن : مکی سورت ہے اور اس کی ۲۸ آیات ہیں۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ مزمّل : مکی سورت ہے اور اس کی ۲۰ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ مدّثر : مکی سورت ہے اور اس کی ۵۶ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ قیامت : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۰ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ دھر : مدنی سورت ہے اور اس کی ۳۱ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ مرسلات : مکی سورت ہے اور اس کی ۵۰ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۲۹

سورۂ نباء : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۰ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۳۰

سورۂ نازعات : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۶ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۳۰

سورۂ عبس : مکی سورت ہے اور اس کی ۴۲ آیات ہیں ۔

پارہ ــــ ۳۰

سورۂ

طلاق

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

آغاز ترجمہ

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

سورۂ طلاق کے مضامین

اہم ترین مسئلہ جو اس سورہ میں پیش کیا گیا ہے جیسا کہ اس سورہ کے نام سے ظاہر ہے، وہ مسئلۂ طلاق، اس کے احکام و خصوصیات اور اس کے نتائج ہیں۔ اس کے بعد مبدء و معاد، پیغمبرؐ کی نبوت اور بشارت و نذارت کے مباحث بیان کئے گئے ہیں۔

اس طرح اس سورہ کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ: اس سورہ کی پہلی سات آیات ہیں، جو طلاق اور اس سے مربوط مسائل کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان میں اس مسئلہ کی جزئیات کو مختصر اور پُرمعنی عبارتوں میں دقیق اور لطیف انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ انسان انھیں دیکھ کر خود کو اس موضوع میں پورے طور پر مستغنی سمجھتا ہے۔

دوسرا حصہ: جو حقیقت میں پہلے حصہ کے اجراء کا سبب ہے، خدا کی عظمت، اس کے رسولؐ کے مقام عظمت، صالحین کے اجر و ثواب اور بدکاروں کی سزا و عذاب کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ نیز اس اہم اجتماعی مسئلہ کے اجراء کی ضمانت کے طور پر ایک منظم مجموعۂ قواعد پیش کرتا ہے۔ ضمناً یہ سورہ ایک دوسرا نام بھی رکھتا ہے اور وہ سورہ نساء قصریٰ (بروزن وسطیٰ) مشہور سورہ نساء کے مقابلہ میں ہے، جو "نساء کبریٰ" ہے۔

* * *

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرؐ اکرم سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الطلاق مات علیٰ سنة رسول الله صلی الله علیه وآله"

"جو شخص سورہ طلاق کو پڑھے (اور اسے اپنی زندگی کے امور میں اپنائے اور اس پر کاربند رہے) وہ دنیا سے سنّتِ پیغمبرؐ پر جائے گا۔"[1]

* * *

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۭ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے۔

(۱) اے پیغمبرؐ! جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو عدت کے زمانہ میں طلاق دو۔ (وہ زمانہ جب وہ ماہانہ عادت سے پاک ہوگئی ہو اور مرد نے اپنی بیوی سے نزدیکی نہ کی ہو) اور عدت کا حساب رکھو اور اس خدا سے ڈرتے رہو جو تمھارا پروردگار ہے۔ نہ تو تم انھیں ان کے گھروں سے باہر نکالو اور نہ وہ (عدت کے دوران) باہر جائیں۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ ظاہر بظاہر کوئی برا کام انجام دیں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو شخص حدودِ الٰہی سے تجاوز کرتا ہے تو وہ خود اپنے ہی اوپر ظلم کرتا ہے۔ تو نہیں جانتا، شاید خدا اس کے بعد کوئی اور نئی وضع (اور اصلاحی ذریعہ) فراہم کر دے۔

تفسیر

طلاق اور علیحدگی کی شرائط

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی اہم ترین بحث وہی طلاق کے بارے میں ہے کہ جو اس کی پہلی آیت سے شروع ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کے عظیم پیشوا و رہبر کے عنوان سے روئے سخن پیغمبرؐ اسلام کی طرف کیا، اور اس کے بعد ایک عمومی حکم جمع کے صیغہ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے پیغمبرؐ! جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو انہیں عدت کے زمانہ میں طلاق دو" (یاایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن)۔

یہ ان پانچ احکام میں سے پہلا حکم ہے جو اس آیت میں آئے ہیں جیسا کہ مفسرین نے اس سے استفادہ کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صیغۂ طلاق ایسے زمانہ میں جاری کیا جائے جب عورت اپنی ماہانہ عادت سے پاک ہو گئی ہو اور اپنے شوہر سے اس کی نزدیکی نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ کے مطابق عدت طلاق "ثلاثۃ قروء" (تین مرتبہ پاک ہونے) کی مقدار میں ہونی چاہیے۔ اب یہاں یہ تاکید کرتا ہے کہ طلاق عدت کے آغاز کے ساتھ ہو۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ جب طلاق پاکیزگی کی حالت میں اختلاطِ جنسی کے بغیر متحقق ہو۔ اگر طلاق حیض کے زمانہ میں واقع ہو جائے تو عدت کے زمانہ کا آغاز، طلاق کے آغاز سے جدا ہو جائے گا۔ اور عدت کا آغاز پاک ہونے کے بعد ہوگا۔

اسی طرح سے اگر عورت ایسی طہارت کی حالت میں ہو کہ اس نے اپنے شوہر سے نزدیکی کی اور جدا ہونا مسلّم ہوا ہو، کیونکہ اس قسم کی پاکیزگی اختلاط جنسی کی بنا پر رحم میں نطفہ کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ (غور کیجیے)۔

بہر حال یہ طلاق کی پہلی شرط ہے۔

متعدد روایات میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہوا ہے کہ:

"جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اس کی ماہانہ عادت میں طلاق دے تو اس طلاق کی پروا نہیں کرنی چاہیے اور پلٹ آنا چاہیئے، یہاں تک کہ عورت پاک ہو جائے" اس کے بعد اگر وہ طلاق دینا چاہتا ہے تو دے دے"۔ [1]

یہی مطلب روایات اہل بیتؑ میں بھی بارہا بیان ہوا۔ یہاں تک کہ آیت کی تفسیر کے عنوان سے بھی ذکر ہوا ہے۔ [2]

اس کے بعد دوسرے حکم کو، جو عدت کا حساب رکھنے کا مسئلہ ہے، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "عدت

---

[1] یہ روایات کتاب "الطلاق" صحیح مسلم جلد ۲ میں صفحہ ۱۰۹۳ کے بعد نقل ہوئی ہیں۔ [2] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۳۴۸ "باب کیفیۃ طلاق العدۃ"۔

کا حساب رکھو" (واحصوا العدة)۔

غور کے ساتھ ملاحظہ کیجیے کہ عورت تین مرتبہ اپنی پاکیزگی کے دن ختم کرے اور ماہانہ عادت دیکھے، جب تیسرا دورِ پاکیزگی ختم ہو اور تیسری ماہانہ عادت میں داخل ہو تو اس کے ایامِ عدت کی مدّت آخر کو پہنچی اور ختم ہوئی۔

اگر اس امر میں غور نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ عدت کا دور ضروری مقدار سے زیادہ شمار ہو جائے۔ اور عورت کو کچھ ضرر اور نقصان پہنچے، کیونکہ یہ چیز اُسے نئے نکاح اور ازدواج سے مانع ہوگی۔ اگر یہ مدّت کمتر ہو تو عدت کے اصلی ہدف کی رعایت نہیں ہوگی کہ جو پہلے ازدواج کے حریم کی حفاظت اور انعقادِ نطفہ کا مسئلہ ہے۔

"احصوا"، "احصاء" کے مادہ سے شمار کرنے کے معنی میں ہے، اور اصل میں "حصیٰ" سے لیا گیا ہے جس کے معنی سنگریزہ کے ہیں۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں بہت سے لوگ جبکہ وہ پڑھنے لکھنے سے آشنا نہیں تھے، مختلف موضوعات کا حساب کتاب سنگریزوں کے ذریعے رکھتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے: عدت کا حساب رکھنے کے مخاطب مرد ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ نفقہ اور سکنیٰ کا مسئلہ ان کے ذمہ ہے۔ اسی طرح حقِ رجوع بھی انہیں کو حاصل ہے ورنہ عورتیں بھی موظف ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کے واضح ہونے کے لیے پورے غور کے ساتھ عدت کا حساب رکھیں۔

اس حکم کے بعد تمام لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: "اس خدا سے ڈرو جو تمہارا پروردگار ہے اور تقویٰ اختیار کرو" (واتقوا اللّٰہ ربکم)۔

وہ تمہارا پروردگار اور مربّی ہے اور اس کے احکام تمہاری سعادت کے ضامن ہیں۔ اس بناء پر اس کے فرامین پر کاربند ہو جاؤ، اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کرو، خصوصاً طلاق اور عدت کا حساب رکھنے میں دقت سے کام لو۔

اس کے بعد تیسرے اور چوتھے حکم کے بارے میں، جن میں سے ایک شوہروں اور دوسرا بیویوں سے مربوط ہے۔ فرماتا ہے: "تم انہیں ان کے گھروں سے نہ نکالو، اور وہ بھی عدت کے دوران گھروں سے باہر نہ نکلیں" (لا تخرجوھن من بیوتھن ولا یخرجن)۔

اگرچہ بہت سے بے خبر اس حکمِ اسلامی کو طلاق کے وقت اصلاً جاری نہیں کرتے اور محض صیغۂ طلاق کے جاری ہوتے ہی مرد بھی خود کو آمادہ کرتا ہے کہ عورت کو گھر سے باہر نکال دے اور عورت بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھ لیتی ہے کہ شوہر کے گھر سے نکل کر اپنے عزیزوں کے گھر واپس چلی جائے۔ لیکن یہ اسلامی حکم بہت ہی اہم فلسفہ کا حامل ہے، کیونکہ یہ عورت کے احترام کے علاوہ عام طور پر شوہروں کی طلاق سے بازگشت اور رشتۂ زوجیت کے استحکام کے لیے بھی اسباب فراہم کرتا ہے۔

اس اہم اسلامی حکم کو نظرانداز کر دینے سے، جو قرآن کے متن میں آیا ہے، بہت سی طلاقیں دائمی جدائی کا سبب بن جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر اس حکم کا اجرا ہوتا تو یہ اکثر زوجین کی صلح اور نئے سرے سے بازگشت پر

منتہی ہوتا۔

لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ طلاق کے بعد عورتوں کو گھر میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہذا پانچویں حکم کا استثناء کی صورت میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "سوائے اس صورت کے کہ وہ عورتیں کسی واضح بڑے کام کو انجام دیں۔" (الّا ان یأتین بفاحشۃ مبینۃ)۔

مثلاً وہ شوہر اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ اس قدر ناسازگاری، بدخلقی اور بدزبانی کرے کہ اسے گھر میں رکھنا زیادہ مشکلات کا باعث بن جائے۔

یہ بات کئی ایک روایات میں نظر آتی ہے، جو آئمہ اہل بیت سے نقل ہوئی ہیں[1]

البتہ اس سے مراد ہر قسم کی مخالفت اور جزئی ناسازگاری نہیں ہے، کیونکہ لفظ فاحشہ کے مفہوم کا تقاضا ہے کہ کوئی بہت بڑا کام ہو گیا ہے، خاص طور پر جب کہ وہ 'مبینہ' کی صفت سے بھی موصوف ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فاحشہ" سے مراد عفت اور پاکدامنی کے منافی عمل ہے، اور یہ ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل ہوا ہے۔ اس صورت میں خارج کرنے سے مراد اجراء حد کے لیے باہر لے جانا اور واپس گھر میں لے آنا ہے۔

ان دونوں معانی کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے کے بعد پھر تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے: "یہ خدائی حدود ہیں اور جو شخص حدود الٰہی سے تجاوز کرے تو اس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔" (وتلک حدود اللّٰہ ومن یتعد حدود اللّٰہ فقد ظلم نفسہ)۔

کیونکہ یہ قوانین اور احکام الٰہی خود مکلفین کے مصالح کے نگاہبان ہیں اور ان سے تجاوز کرنے سے، چاہے وہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی طرف سے، خود ان کی سعادت پر ضرب لگتی ہے۔

آیت کے آخر میں عدت کے فلسفہ اور عورت کے گھر اور اصلی اقامت گاہ سے باہر نہ نکلنے کی علت کی طرف ضمناً اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تو نہیں جانتا کہ خدا اس واقعہ کے بعد نئی وضع اور اصلاح کا موقع فراہم کر دے۔" (لا تدری لعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلک امرًا)۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیظ و غضب کا وہ طوفان رُک جاتا ہے جو عام طور طلاق وجدائی کے معاملہ میں ناگہانی فیصلوں کا موجب بن جاتا ہے۔ چنانچہ عدت کی مدت میں عورت کا ہر وقت مرد کے ساتھ ہونا، نیز خصوصاً جہاں اولاد کا معاملہ بھی درمیان میں ہو ایسے میں ایک دوسرے سے محبت کا اظہار رجوع کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور دشمنی وعداوت کے تیرہ وتار بادلوں کو ان کے آسمانِ زندگی سے دور کر دیتا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۰، ۳۵۱، حدیث ۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۰

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے اور امام باقرؑ سے بھی مروی ہے:

"المطلقة تكتحل و تختضب و تطيب و تلبس ماشاءت من الثياب لان الله عزّوجل يقول لعل الله يحدث بعد ذالك امراً لعلها ان تقع فى نفسه فيراجعها"

"مطلقہ عورت اپنی عدت کے دوران آرائش کرے، آنکھ میں سرمہ لگائے، اپنے بالوں کو رنگین کرے، اپنے آپ کو معطر کرے اور ہر وہ لباس جو اُسے پسند ہو پہنے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے: شاید خدا اس واقعہ کے بعد کوئی نئی کیفیت فراہم کر دے اور ممکن ہے کہ اس طریقہ سے عورت دوبارہ شوہر کے دل کو مسخر کرے اور مرد رجوع کرے۔"[1]

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عام طور پر علیٰحدگی اور طلاق کا ارادہ جلد گذر جانے والے ہیجانوں کی وجہ سے ہوتا ہے، جو وقت کے گزرنے اور مرد و عورت کے ایک مدت تک جو نسبتاً طولانی (عدت) ہوتی ہے، مسلسل معاشرت کرنے اور انجام کار غور و فکر کرنے سے معاملہ کلی طور پر بدل جاتا ہے۔ اور بہت سی علیٰحدگیوں اور طلاقوں میں صلح ہو جاتی ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مذکورہ اسلامی احکام عدت کے زمانہ میں عورت کے سابق شوہر کے گھر میں رہنے پر دقت کے ساتھ عمل ہو۔ انشاء اللہ ہم بعد میں بتائیں گے کہ یہ سب امور طلاق رجعی کے بارے میں ہیں۔

چند نکات

۱۔ طلاق حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زوجیت کی قرارداد ایک ایسی قرارداد ہے کہ جسے جدائی کے قابل ہونا چاہیئے کیونکہ بعض اوقات ایسے علل و اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو عورت اور مرد کی مشترک زندگی کو غیر ممکن یا مشکلات اور مفاسد سے بھر دیتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم یہ اصرار کرتے رہیں کہ یہ قرارداد ابد تک باقی رہے تو یہ بات بہت زیادہ مشکلات کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا اسلام نے اصل طلاق کے ساتھ موافقت کی ہے۔ آج ہم عیسائی معاشروں میں طلاق کے بالکل ممنوع ہونے کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو عیسائی مذہب کے تحریف شدہ قانون کے حکم کے مطابق طلاق کو ممنوع شمار کرتے ہیں۔ قانونی طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے شوہر و زوجہ ہیں لیکن عملی طور پر ایک دوسرے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۲ حدیث ۱۴

سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہر ایک نے اپنے لیے ایک غیر رسمی بیوی یا شوہر کا انتخاب کر رکھا ہے۔

اس بناء پر اصل مسئلہ طلاق ایک ضرورت ہے لیکن ایک ایسی ضرورت جسے ایک ممکن حد تک کم ہونا چاہیے، اور جب تک زوجیت کو برقرار رکھنے کی راہ ہو کوئی اس پر عمل نہ کرے۔

اسی بناء پر اسلامی روایات میں شدت کے ساتھ طلاق کی مذمت کی گئی اور اسے (مبغوض ترین حلال) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک روایت میں آیا ہے:

"ما من شیء ابغض الی اللہ عزوجل من بیت یخرب فی الاسلام بالفرقۃ یعنی الطلاق"

"خداوند تعالیٰ کے نزدیک کوئی عمل اس سے زیادہ قابلِ نفرت نہیں ہے کہ اسلام میں کسی گھر کی بنیاد جدائی (یعنی طلاق) کے ساتھ ویران ہو۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"ما من شیء مما احلہ اللہ ابغض الیہ من الطلاق"

"حلال امور میں سے کوئی چیز خدا کی بارگاہ میں طلاق سے زیادہ مبغوض نہیں ہے۔"[2]

اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں رسول اکرمؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"تزوجوا ولا تطلقوا، فان الطلاق یھتز منہ العرش"

"نکاح کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ طلاق عرشِ خدا کو لرزا دیتی ہے۔"[3]

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ طلاق، عورتوں، مردوں، خاندانوں اور خصوصاً اولاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر دیتی ہے، جنہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱: عاطفی مشکلات اس میں شک نہیں کہ وہ مرد اور عورت جو کئی سالوں یا مہینوں سے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، طلاق کے بعد ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ عاطفی و جذباتی لحاظ سے مجروح ہوں گے اور آئندہ کے ازدواج میں انہیں اس کی تلخ یاد ہمیشہ پریشان کرے گی، یہاں تک کہ دوسری بیوی یا شوہر کو ایک قسم کی بدبینی اور سوءظن کے ساتھ دیکھیں گے۔ اس چیز کے نقصان دہ آثار کبھی پوشیدہ نہیں ہیں۔ اسی لیے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۲۶۶ (حدیث ۱-۵)

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۲۶۸ (حدیث ۵)

قسم کی عورتیں اور مرد ہمیشہ کے لیے نکاح کرنے سے اعراض کرتے رہتے ہیں۔

۲: اجتماعی مشکلات طلاق کے بعد بہت سی عورتوں کو شائستہ اور دلخواہ طور پر نئی شادی کا موقع ہی نہیں ملتا اس لحاظ سے وہ شدید پریشانی میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ مردوں کو بھی اپنی بیویوں کو طلاق دینے کے بعد اپنے مطلب کی شادی کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ خصوصاً اگر درمیان میں بچوں کا معاملہ بھی ہو۔ تب وہ اکثر ایسی شادی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو انھیں امن و سکون نہیں پہنچاتی اور اس بناء پر آخر زندگی تک رنج و تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں۔

۳: اولاد کی مشکلات اولاد کی مشکل ان سب سے زیادہ اہم ہے اور بہت کم دیکھا گیا ہے کہ سوتیلی مائیں سگی ماں کی طرح شفیق و مہربان ہوں یعنی وہ اس اولاد میں شفقت و محبت کے خلا کو پر کر سکے جو ماں کی محبت بھری گود سے جدا ہوئی ہے۔ اسی طرح سے اگر عورت اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لے جائے تو سوتیلے باپ کے بارے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ البتہ کچھ عورتیں اور مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کی اولاد کے لیے شفیق و مہربان اور وفادار ہوتے ہیں لیکن مسلّمہ طور پر ان کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے، اسی وجہ سے طلاق کے بعد بیچاری اولاد بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ شاید ان میں سے اکثر بچے آخر عمر تک روحانی سکون سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

درحقیقت یہ ایک ایسا نقصان ہے جو نہ صرف اس گھرانے کے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے ہے، کیونکہ اس قسم کے بچے جو ماں یا باپ یا دونوں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات خطرناک افراد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ مناسب توجہ نہ ہونے کی وجہ سے انتقام جوئی کے جذبہ کے زیر اثر آجاتے ہیں اور اپنا انتقام پورے معاشرے سے لیتے ہیں۔

اگر اسلام نے طلاق کے بارے میں اس قدر سخت گیری کی ہے تو اس کی وجہ یہی نقصان دہ نتائج ہیں جو مختلف جہات میں نمودار ہوتے ہیں۔

اسی بناء پر قرآن مجید بھی صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ جس وقت عورت اور مرد کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں کے عزیز و اقارب ان میں اصلاح کی کوشش کریں۔ وہ لوگ ایک "خاندانی صلح کمیٹی" بنا کر دونوں میاں بیوی کو شرعی عدالت تک جانے اور طلاق و جدائی کے عمل سے روکیں۔

(ہم نے صلح کمیٹی کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۲ میں سورہ نساء کی آیت ۳۵ کے ذیل میں بیان کی ہے)

اسی بناء پر جو چیز عورت اور مرد میں خوش بینی اور خاندانی تعلقات کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں مدد دے وہ اسلام کی نظر میں محبوب ہے اور جو اسے متزلزل کرے وہ بری اور قابل نفرت ہے۔

❖ ❖ ❖

۲ : اسباب طلاق

دُوسرے اجتماعی امور میں پیدا ہونے والے اختلافات کی طرح طلاق کی بھی مختلف وجوہات ہوتی ہیں کہ جن کا دقیق مطالعہ اور مقابلہ کیے بغیر ایسے حادثہ کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ہم طلاق کے عوامل کو معلوم کریں اور معاشرے میں اس کی جڑوں کو ختم کریں۔ اگرچہ یہ عوامل بہت زیادہ ہیں لیکن ان میں سے ذیل کے امور زیادہ اہم ہیں:

الف: عورت یا مرد کی غیر محدود توقعات، جُدائی اور علیحدگی کے اہم ترین عوامل میں سے ایک ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک اپنی توقع کے دامن کو محدود کر دے، خواب و خیال کی دُنیا سے باہر نکل آئے، طرفِ مقابل کو اچھی طرح سے سمجھ لے اور جتنی اس کی حدود میں ممکن ہو اتنی ہی توقع رکھے تو بہت سی طلاقوں کو روکا جا سکتا ہے۔

ب: بہت سے گھرانوں میں حُسن پرستی اور اسراف و تبذیر کی رُوح کا کارفرما ہونا ایک اور اہم عامل ہے جو خاص طور پر عورتوں کو ہمیشہ کے لیے ناراضی کی حالت میں رکھتا اور طرح طرح کے بہانوں سے طلاق و جُدائی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

ج: دونوں میاں بیوی کی خصوصی زندگی خصُوصاً ان کے اختلافات میں عزیز و اقارب اور جان پہچان والوں کی بے جا مداخلتیں طلاق کا ایک اور اہم عامل شمار ہوتی ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اگر وہ دونوں میاں بیوی کے درمیان اختلافات کے ظہور کے وقت انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دیں اور اِس کی یا اُس کی جانبداری میں اختلاف کی آگ کو ہوا نہ دیں تو زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ وہ آگ خاموش ہو جاتی ہے۔ لیکن دونوں طرف کے لوگوں کی مداخلت کہ جو اکثر تعصب اور بے جا محبتوں کے ساتھ ہوتی ہے، وہ مُعاملے کو دن بدن مشکل اور پیچیدہ تر بناتی رہتی ہے۔

البتہ یہ بات اس معنی میں نہیں ہے کہ عزیز و اقارب ہمیشہ ہی اپنے آپ کو ان اختلافات سے دور رکھیں، بلکہ مُراد یہ ہے کہ وہ انھیں معمولی اختلافات میں ان کی حالت پر چھوڑ دیں۔ لیکن جب اختلافات کلی صورت میں جڑ پکڑ لیں تو پھر طرفین کی مصلحت پر توجہ رکھتے ہُوئے اور ہر طرح کی تعصب آمیز جانبداری سے اجتناب اور پرہیز کرتے ہُوئے مداخلت کریں اور فریقین کی صلح کے مقدمات فراہم کریں۔

د: عورت اور مرد کا ایک دُوسرے کی خواہش کے بارے میں بے اعتنائی کرنا خصوصاً ان چیزوں سے جو عاطفی اور جنسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً ہر مرد یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی بیوی پاک و صاف اور پُرکشش رہے۔ اسی طرح ہر بیوی بھی اپنے شوہر سے یہی توقع رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایسے امور ہیں جن

کے اظہار کے لیے وہ عام طور پر تیار نہیں ہوتے۔ یہ وہ مقام ہے کہ طرف مقابل کا بے اعتنائی برتنا اپنی ظاہری وضع قطع کا خیال نہ رکھنا، ضروری تزئین کو ترک کر دینا، اور پریشان بال اور گندہ رہنا، بیوی یا شوہر کو اس قسم کی ازدواجی زندگی سے سیر کر دیتا ہے۔ خاص طور پر اگر ان کی زندگی کے ماحول میں ایسے افراد بھی رہتے ہوں جو ان امور کی رعایت کرتے ہوں لیکن وہ اس مسئلہ سے بالکل ہی بے اعتنائی کریں۔

اسی لیے اسلامی روایات میں اس مطلب کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"لا ینبغی للمرأة ان تعطل نفسها"

"عورت کے لیے یہ بات سزاوار نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے زینت و آرائش کیے بغیر رہے۔"[1]

ایک اور حدیث سے امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ولقد خرجن نساء من العفات الی الفجور ما اخرجهن الا قلة تهيئة ازواجهن"

"بہت سی عورتیں جادۂ عفت سے خارج ہو گئیں اور اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھی کہ ان کے شوہر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتے تھے۔"[2]

ھ: عورت اور مرد کے گھرانے کے تمدن اور رہنے سہنے کے طریقوں کا ایک دوسرے سے مناسبت نہ رکھنا بھی طلاق کا ایک اہم عامل ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر بیوی یا شوہر کے انتخاب سے پہلے بڑی دقت کے ساتھ توجہ کرنی چاہیے۔ انھیں "کفو شرعی" یعنی مسلمان ہونے کے علاوہ "کفو عرفی" بھی ہونا چاہیے۔ یعنی ان دونوں کے درمیان مختلف جہات سے ضروری مناسبتوں کی رعایت ہونی چاہیئے اس اہتمام کے بغیر اس قسم کی شادیوں کے ٹوٹ جانے پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

۳: عدت کا فلسفہ

اس میں شک نہیں ہے کہ عدت کی دو بنیادی وجوہات ہیں جن کی طرف قرآن مجید اور اسلامی روایات میں اشارہ ہوا ہے:

اوّل: نسل کی حفاظت اور عورت کی وضع و حالت کا حاملہ ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے مشخص ہونا۔

[1،2] مکارم الاخلاق ص ۹۱، ۱۰۲

دوئم: پہلی زندگی کی طرف پلٹ آنے اور علیٰحدگی کے عوامل کو ختم کرنے کا وسیلہ ہونا کہ جس کی طرف اوپر والی آیت میں ایک لطیف اشارہ ہوا تھا۔ خاص طور پر یہ بات کہ اسلام اس مسئلہ میں یہ تاکید کرتا ہے کہ عورت عدت کے زمانہ میں اپنے شوہر کے گھر میں ہی رہے۔ اس طرح طبعی طور پر ان کے درمیان چند ماہ کی ایک مسلسل معاشرت رہے گی جو انہیں اس بات کا موقع فراہم کرے گی کہ وہ علیٰحدگی کے مسئلہ کا جلد گزر جانے والے ہیجانات سے بالاتر ہو کر حالات کا نئے سرے سے جائزہ لیں۔

خصوصاً طلاق رجعی [1] کے سلسلہ میں کہ جہاں زوجیت کی طرف لوٹنا کسی قسم کے تکلفات کا محتاج نہیں۔ اور ہر ایسا قول یا فعل، جو مرد کے بازگشت کی طرف مائل ہونے پر دلالت کرے، وہ رجوع شمار ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر وہ عورت کے بدن پر شہوت کے ساتھ یا بغیر شہوت کے ہاتھ رکھ دے، چاہے رجوع کا ارادہ نہ ہو تو بھی وہ رجوع ہی شمار ہوگا۔

اس طرح سے اگر یہ عدت ان شرائط کے ساتھ گزر جائے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں، اور وہ دونوں آپس میں صلح نہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ واقعاً وہ مشترک زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد اوّل میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ کے ذیل میں ایک اور تشریح بھی پیش کی ہے۔

---

[1] "طلاق رجعی" سے مراد وہ طلاق ہے جو پہلی یا دوسری مرتبہ دی جاتی ہے اور جدائی کا ارادہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس طرح سے عورت نہ اپنے حق مہر کو اور نہ دوسرے مال کو خرچ کرتی ہے۔

۲ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ فَارِقُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنكُمْ وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ ۚ ذَٰلِكُمْ يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَمَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا ۝

۳ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَالِغُ أَمْرِهِ ۚ قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝

ترجمہ

۲ جب ان کی عدت ختم ہو جائے تو پھر یا تو شائستہ طور پر انھیں روک لو یا شائستہ طریقہ سے ان سے جُدا ہو جاؤ اور اپنے میں سے دو عادل مردوں کو گواہ بنا لو، اور خدا کے لیے شہادت کو قائم کرو۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی ان لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے لیے کوئی نہ کوئی نجات کی راہ فراہم کر دیتا ہے۔

۳ اور اسے ایسی جگہ سے روزی عطا فرماتا ہے جس کا اُسے گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو

شخص خدا پر توکل کرے تو خدا اس کے امر کی کفایت کرتا ہے۔ خدا اپنے امر کو انجام تک پہنچا کر رہتا ہے۔ اور خدا نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

تفسیر

صلح یا پسندِ خدا علیحدگی

طلاق سے مربوط مباحث جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں ان کو جاری رکھتے ہوئے پہلی زیر بحث آیت میں چند مزید احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے: "جب ان کی عدت کی مدت آخر کو پہنچ جائے تو انھیں شائستہ طور پر، رجوع کے طریق سے روک لو یا شائستہ طور پر ان سے الگ ہو جاؤ۔" (فاذا بلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف او فارقوھن بمعروف)۔

"بلوغ اجل" (مدت کے آخر کو پہنچنے) سے مراد یہ نہیں ہے کہ عدت کی مدت پورے طور پر ختم ہو جائے بلکہ مراد مدت کا آخری دنوں تک پہنچنا ہے۔ ورنہ عدت کے ختم ہو جانے پر رجوع کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ مگر یہ کہ انھیں روک رکھنا عقدِ جدید کے صیغہ کے ذریعہ ہو، لیکن یہ معنی آیت سے بہت بعید نظر آتا ہے۔

بہر حال اس آیت میں ازدواجی زندگی سے مربوط ایک اہم ترین اور مناسب ترین حکم پیش ہوا اور وہ یہ ہے کہ عورت اور مرد یا تو شائستہ طور پر آپس میں زندگی بسر کریں یا پھر شائستہ طریقے سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ جس طرح مشترک زندگی کو صحیح اصول، انسانی طرز اور شائستہ اور مناسب طور پر ہونا چاہیے، اسی طرح سے جدائی بھی ہر قسم کے نزاع اور جھگڑے، بدگوئی اور ناسزا کہنے، ظلم وستم اور حقوق ضائع کرنے سے خالی ہونی چاہیے۔ اہم بات یہ ہے کہ جس طرح تعلقات صلح صفائی کے ساتھ انجام پائیں اسی طرح علیحدگیاں بھی افہام وتفہیم کے ساتھ ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے یہ مرد اور عورت مستقبل میں دوبارہ مشترک زندگی کی سوچ لیں لیکن جدائی کے وقت بدسلوکیاں ان کی فکری فضا کو اس طرح سے تیرہ وتاریک بنا دیتی ہیں کہ بازگشت کی راہ ان کے لیے بند کر دیتی ہیں اور بالفرض اگر وہ نئے سرے سے ازدواج کرنا بھی چاہیں تو مناسب فکری اور عاطفی ذریعہ موجود نہیں ہوتا۔ دوسری طرف آخر وہ مسلمان ہیں اور ایک ہی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا مخاصمت اور ناشائستہ طریقے سے جدائی نہ صرف انھیں میں اثر انداز ہوگی، بلکہ دونوں کے خاندانوں میں بھی نقصان دہ اثرات چھوڑے گی۔ اور بعض حالات میں آئندہ کے لیے بھی ان کی بھلائی کا سلسلہ کلی طور پر برباد کر دے گی۔

واقعاً یہ کتنی اچھی بات ہے کہ نہ صرف ازدواجی زندگی میں بلکہ ہر قسم کی دوستی اور مشترک عمل میں بھی جہاں تک ہو

سکے، انسان شائستہ اور مناسب ہمکاری کو جاری رکھے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر شائستہ طور پر جدا ہو جائے، کیونکہ شائستہ طور پر جدائی بھی طرفین کے لیے ایک قسم کی کامیابی اور موفقیت ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ "امساک بمعروف" اور "فراق بمعروف" وسیع معنی رکھتے ہیں یہ ہر قسم کے واجب و مستحب شرائط اور اخلاقی کاموں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اور اسلامی و اخلاقی آداب کے ایک مجموعہ کو ذہن میں مجسّم کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "تم طلاق اور جدائی کے وقت اپنے (مسلمانوں) میں سے شاہد و گواہ بناؤ"۔ (واشهدوا ذوی عدل منکم)۔

تاکہ اگر آئندہ کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو طرفین میں سے کوئی انکار نہ کر سکے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ گواہ بنانا طلاق کے سلسلہ میں اور رجوع کرنے کے سلسلہ میں بھی ہے۔ لیکن چونکہ رجوع بلکہ تزویج کے وقت بھی گواہ بنانا قطعاً واجب نہیں ہے، لہٰذا اس بناء پر اگر ہم فرض کر بھی لیں کہ اوپر والی آیت رجوع کو بھی شامل ہے تو یہ اس سلسلے میں ایک مستحبی حکم ہو گا۔

تیسرے حکم میں گواہوں کی ذمہ داری کو اس طرح بیان کرتا ہے: "شہادت کو خدا کے لیے قائم کرو"۔ (و أقيموا الشهادة لله)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا دونوں میں سے کسی ایک طرف قلبی میلان، حق کی شہادت سے مانع ہو جائے۔ لہٰذا رضائے خدا اور حق کو قائم کرنے کے سوا اور کسی چیز کو اس میں راہ نہیں پانا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ گواہوں کو عادل ہونا چاہیے، لیکن عدالت کے باوجود بھی گناہ کا صدور محال نہیں ہے۔ اس بناء پر انھیں خبردار کرتا ہے کہ وہ اپنے نگران ہوں اور جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر حق کی راہ سے منحرف نہ ہوں۔

ضمناً "ذوی عدل منکم" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں گواہ مسلمان، عادل اور مرد ہونے چاہئیں۔

آیت کے آخر میں تاکید کے عنوان سے تمام گزشتہ احکام کے متعلق مزید کہتا ہے: "صرف وہ لوگ جو خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، اس وعظ و نصیحت سے سبق حاصل کرتے ہیں"۔ (ذالکم یوعظ به من کان یؤمن بالله والیوم الآخر)۔

بعض ذالکم کو صرف خدا کی طرف توجہ کرنے اور گواہوں کی طرف سے عدالت کی رعایت کرنے کے مسئلہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک وسیع معنی رکھتی ہے اور طلاق کے بارے میں گزشتہ تمام مسائل کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

بہرصورت یہ تعبیر ان احکام کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے، اس طرح کہ اگر کوئی شخص ان کی رعایت نہیں کرتا اور ان سے وعظ و نصیحت حاصل نہیں کرتا تو گویا وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔

چونکہ بعض اوقات آئندہ کی معیشت اور زندگی سے مربوط مسائل یا دوسری گھریلو مجبوریاں، اس بات کا سبب بن جاتی ہیں کہ میاں بیوی طلاق کے وقت یا رجوع کے وقت یا دونوں گواہ شہادت دینے کے وقت حق و عدالت

کی راہ سے منحرف ہو جائیں۔ لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "جو شخص خدا سے ڈرے اور گناہ کو ترک کر دے تو خدا اس کے لیے نجات کی راہ قرار دے دیتا ہے اور اس کی زندگی کی مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔" (و من یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجا)۔

* * *

"اور اس کو ایسی جگہ سے جس کا اُسے گمان بھی نہ ہو گا روزی دے گا۔" (و یرزقہ من حیث لا یحتسب)۔

"اور جو شخص خدا پر توکّل کرے اور اپنا امر اس کے سپرد کر دے تو خدا اس کی کفایت کرتا ہے۔" (و من یتوکل علی اللّٰہ فھو حسبہ)۔

"کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا فرمان ہر چیز میں نافذ ہے۔ اور جس کام کا وہ ارادہ کرے اُسے انجام دے دیتا ہے۔" (ان اللّٰہ بالغ امرہ)۔

"لیکن خدا نے ہر کام اور ہر چیز کے لیے ایک اندازہ اور حساب قرار دیا ہے۔" (قد جعل اللّٰہ لکل شیء قدرا)۔

اس طرح سے وہ مردوں، عورتوں اور گواہوں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ حق کی مشکلات سے نہ گھبرائیں اور عدالت کو جاری کریں پھر اپنے مشکل کاموں کی کشائش خدا سے چاہیں کہ خدا نے یہ ضمانت لی ہے کہ وہ پرہیزگاروں کی مشکل کو حل کرے گا اور انھیں ایسی جگہ سے روزی دے گا جہاں سے خود انھیں بھی گمان نہیں ہو گا۔

خدا نے ضمانت دی ہے کہ جو توکّل کرے گا وہ مصیبت میں گرفتار نہیں رہے گا، اور خدا اس ضمانت کے ادا کرنے پر قادر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یہ آیات طلاق اور اس سے مربوط احکام کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن ان کا مفہوم وسیع ہے جو دیگر موارد کو بھی شامل ہے۔ یہ خدا کی طرف سے تمام پرہیزگاروں اور توکّل کرنے والوں کے لیے ایک امید بخش وعدہ ہے کہ انجام کار لطفِ الٰہی انھیں اپنی پناہ میں لے لے گا، انھیں مشکلات کے پیچ و خم سے گزار دے گا، سعادت کے تابناک افق کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا، معیشت کی سختیوں کو برطرف کر دے گا اور مشکلات کے تیرہ و تاریک بادلوں کو ان کی زندگی کے آسمان سے ہٹا دے گا۔

"قد جعل اللّٰہ لکل شیء قدرا" کا جملہ اس نظام کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو عالمِ تشریع و تکوین پر حاکم ہے۔ یعنی یہ احکام جو خدا نے طلاق وغیرہ کے بارے میں صادر فرمائے ہیں سب کے سب ایک حساب اور دقیق حکیمانہ اندازے کے مطابق ہیں۔

اسی طرح سے وہ مشکلات جو انسان کی زندگی میں ازدواجی مسئلہ میں یا کسی اور مسئلہ میں ڈونما ہوں ان میں سے ہر ایک کا اندازہ و حساب اور مصلحت و اختتام ہوتا ہے۔ انھیں ان حوادث کے ظاہر ہونے پر گھبرانا نہیں چاہیے اور زبان پر گلہ اور شکوہ کے الفاظ نہیں لانے چاہئیں۔ نیز مشکلات کے حل کے لیے خلافِ تقویٰ امور

سے متوسّل نہیں ہونا چاہیے، بلکہ تقویٰ اور خودداری کے ساتھ ان سے جنگ کرنی چاہیے اور ان کا حل خدا سے طلب کرنا چاہیے۔

* * *

چند نکات

۱: مشکلات سے نجات اور تقویٰ

اوپر والی آیات قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید دلانے والی آیات ہیں۔ ان کی تلاوت دل کو صفائی اور روح کو نور و روشنی بخشتی ہے۔ یہ تلاوت یاس و ناامیدی کے پردوں کو چاک کر دیتی ہے، دل میں امید کی حیات بخش شعاعیں چمکاتی ہے اور تمام پرہیزگار اور باتقویٰ افراد کو نجات اور حل مشکلات کا وعدہ دیتی ہے۔

ایک حدیث میں ابوذر غفاری سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"انی لاعلم اٰیۃ لو اخذ بھا الناس لکفتھم و من یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجًا ... فما زال یقولھا ویعیدھا"

"میں ایک ایسی آیت کو پہچانتا ہوں کہ اگر تمام انسان اس کے دامن کو تھام لیں تو وہ ان کی مشکلات کے حل کے لیے کافی ہے" اس کے بعد آپ نے آیۂ "ومن یتق اللّٰہ" کی تلاوت فرمائی اور اس کی بار بار تکرار فرماتے رہے[1]

ایک اور حدیث میں رسولِ خداؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

"من شبھات الدنیا و من غمرات الموت و شدائد یوم القیامۃ"

"خدا پرہیزگاروں کو دُنیا کے شبہات، موت کی سختی اور روز قیامت کے شدائد سے رہائی بخشے گا" [2]

یہ تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ تقویٰ کے لیے امور کی کشائش دنیا میں ہی منحصر نہیں بلکہ قیامت کو بھی شامل ہے۔

ایک اور حدیث میں بھی آنحضرتؐ سے آیا ہے:

"من اکثر الاستغفار جعل اللّٰہ لہ من کل ھم فرجًا و من کل ضیق مخرجًا"

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۶ [2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۶ حدیث ۳۴

"جو شخص کثرت سے استغفار کرے گا (اور لوح دل کو گناہوں کے زنگ سے دھوتے گا) تو خدا اس کے لیے ہر غم و اندوہ سے کشائش اور ہر تنگی سے نجات کی راہ قرار دے گا۔"[1]

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اوپر والی پہلی آیت عوف بن مالک کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اصحاب پیغمبر میں سے تھا اور دشمنان اسلام نے اس کے بیٹے کو قید کر لیا تھا۔ وہ پیغمبر کی خدمت میں آیا۔ اس واقعے اور فقر و فاقہ نیز تنگدستی کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا تقویٰ اختیار کرو صبر کرو اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا بہت زیادہ ذکر کیا کر۔ اس نے اس کام کو انجام دیا تو اچانک جبکہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا اس کا بیٹا دروازے سے اندر آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ دشمن کی غفلت کے ایک لمحہ سے فائدہ اٹھا کر بھاگ آیا ہے۔ یہاں تک کہ دشمن کا اونٹ بھی اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ یہ وہ مقام تھا جس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس باتقویٰ شخص کی مشکل کی کشائش اور جہاں سے توقع نہیں تھی وہاں سے روزی کی خبر دی۔[2]

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ آیت کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان سعی و کوشش کو بالکل ہی ترک کر دے اور یہ کہے کہ میں گھر میں بیٹھ جاؤں گا، تقویٰ اختیار کروں گا اور لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ذکر کروں گا یہاں تک کہ جا : سے مجھے گمان بھی نہیں ہے میری روزی پہنچ جائے گی۔ نہیں! آیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ تقویٰ و پرہیزگاری کا مقصد سعی و کوشش کے ساتھ ہے۔ اگر اس حالت میں انسان پر دروازے بند ہوں گے تو خدا نے انکے کھولنے کی ضمانت لی ہے۔

"اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادق کا صحابی عمر بن مسلم ایک مدت تک آپ کی خدمت میں نہ آیا۔ حضرت نے اس کے حالات دریافت فرمائے تو لوگوں نے بتلایا کہ اس نے تجارت چھوڑ دی، اور عبادت کی طرف رُخ کر لیا ہے۔ آپ نے فرمایا: وائے ہو اس پر:

"اما علم ان تارك الطلب لا يستجاب له"

"کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ جو شخص سعی و کوشش اور روزی طلب کرنے کو ترک کر دے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔"

اس کے بعد مزید فرمایا:

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۷ حدیث ۲۵

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۶، یہی ماجرا "تفسیر فخر رازی" اور "روح البیان" میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ آیا ہے اور بعض نے ایک سو اونٹ کی تعداد لکھی ہے۔

"اصحاب رسول میں سے ایک جماعت نے جب آیت "و من یتق الله یجعل له مخرجاً و یرزقه من حیث لا یحتسب" نازل ہوئی تو اپنے دروازے بند کر لیے، عبادت میں مصروف ہو گئے، اور انھوں نے کہا: "خدا نے ہماری روزی کا ذمہ لے لیا ہے"۔ اس واقعہ کی اطلاع پیغمبرؐ کو ہوئی تو آپ نے کسی کو ان کے پاس بھیج کر بلوایا اور ان سے کہا: تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: یا رسولؐ اللہ! چونکہ خدا ہماری روزی کا کفیل ہو گیا ہے لہٰذا ہم عبادت میں مشغول ہو گئے ہیں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا:

انه من فعل ذالك لم يستجب له، عليكم بالطلب"

"جو شخص ایسا کرے گا اس کی دعا قبول نہیں ہوگی۔ تم پر لازم ہے کہ سعی و کوشش اور جدوجہد کرو"۔[1]

* * *

۲: روحِ توکّل

خدا پر توکّل کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کام کی سعی و کوشش کو اس کے سپرد کر دے اور اور اپنی مشکلات کا حل اسی سے چاہے۔ وہ خدا جو اس کی تمام احتیاجات سے آگاہ ہے، وہ خدا جو اس کے بارے میں رحیم و مہربان ہے، اور وہ خدا جو ہر مشکل کو حل کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اب جو شخص روحِ توکّل کا حامل ہے، وہ ہرگز یاس و ناامیدی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا، مشکلات کے مقابلہ میں ضعف و زبوں حالی کا احساس نہیں کرتا اور سخت حوادث کے مقابلے میں ڈٹا رہتا ہے۔ اس کا یہی علم و عقیدہ اسے ایسی روحانی طاقت دیتا ہے جس سے وہ مشکلات پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری طرف سے غیبی امدادیں کہ توکّل کرنے والوں کو جن کی خوشخبری دی گئی ہے، وہ اس کی مدد کو آ جاتی ہیں اور اُسے شکست و ناتوانی سے نجات بخشتی ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ گرامیؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے خدا کی وحی پہنچانے والے فرشتے جبرئیل سے پوچھا: توکّل کیا ہے؟ تو اس نے کہا:

العلم بان المخلوق لا يضر ولا ينفع، ولا يعطى ولا يمنع، واستعمال اليأس من الخلق، فاذا كان العبد كذالك لم يعمل لاحد سوى الله و

---

[1] "توحی" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۲ (حدیث ۳۵)

ولم یرج ولم یخف سوی اللّٰہ ولم یطمع فی احد سوی اللّٰہ فھذا هو التوکل:

"توکل کی حقیقت یہ ہے کہ انسان یہ جان لے کہ مخلوق نہ نقصان پہنچا سکتی ہے نہ ہی نفع، نہ کچھ عطا کر سکتی ہے نہ روک سکتی ہے۔ مخلوق سے کوئی اُمید نہ رکھنا (اور خدا ہی سے لَو لگانا) جس وقت ایسا ہو جائے تو پھر انسان خدا کے علاوہ کسی کے لیے کام نہیں کرتا اور اس کے غیر سے اُمید نہیں کرتا، نہ اس کے غیر سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ دل لگاتا ہے۔ یہ ہے توکّل کی روح۔"[1]

اس عمیق مضمون کے ساتھ، توکّل انسان کو ایک نئی شخصیت بخشتی ہے اور اس کے تمام اعمال میں اثر پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے شب معراج بارگاہِ خداوندی میں سوال کیا:

پروردگارا: ای الاعمال افضل؟

"کون سا عمل سب سے افضل و برتر ہے؟"

خداوند متعال نے فرمایا:

"لیس شیء عندی افضل من التوکل علیّ والرضا بما قسمت

"میرے نزدیک مجھ پر توکّل کرنے اور جو کچھ میں نے تقسیم کیا ہے اس پر راضی رہنے سے افضل و برتر کوئی چیز نہیں ہے۔"[1]

یہ بات واضح ہے کہ اس معنیٰ میں توکّل ہمیشہ جہاد اور سعی و کوشش کے ساتھ ہوتی ہے۔ سستی اور ذمہ داریوں سے فرار کے ساتھ نہیں ہوتی۔

ہم نے اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں سورۂ ابراہیمؑ کی آیت ۱۱ کے ذیل میں ایک اور تشریح بھی پیش کی ہے:

---

[1] بحار الانوار جلد ۶۹ ص ۳۷۳ حدیث ۱۹۔

۴ وَالّٰٓـِٔيْ يَىِٕسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ○

۵ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ○

۶ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ۞

۷ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۞

ترجمہ

(۴) تمہاری عورتوں میں سے جو ماہانہ عادت سے ناامید ہیں، اگر تمہیں ان کی وضع میں (حاملہ ہونے کے لحاظ سے) شک ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور اسی طرح سے وہ عورتیں جنھوں نے ابھی ماہانہ عادت نہیں دیکھی ہے۔ اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ وضع حمل کریں۔ اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے گا، خدا اس پر کام کو آسان کر دے گا۔

(۵) یہ خدا کا فرمان ہے جو اس نے تم پر نازل کیا ہے اور جو شخص خدائی تقویٰ اختیار کرے گا تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور اس کے اجر و ثواب کو بڑھا دے گا۔

(۶) جہاں تم سکونت رکھتے ہو اور جو تمہارے اختیار میں ہے، وہاں ان (مطلقہ عورتوں) کو سکونت دو، اور انھیں ضرر نہ پہنچاؤ کہ معاملے کو ان پر تنگ نہ کردو (اور وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں) اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کو نفقہ دو یہاں تک کہ وہ وضع حمل کریں اور اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو تم اس کی اُجرت دو (اور بچوں کے بارے میں معاملے کو) شائستہ مشورے کے ذریعے انجام دو، اور اگر تم میں باہم موافقت نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے کا کام دوسری عورت اپنے ذمہ لے گی۔

(۷) جن لوگوں کے پاس وسیع ذرائع و وسائل ہیں وہ تو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کریں، لیکن جو تنگ دست ہیں تو جو کچھ خدا نے انھیں دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کریں۔ خدا کسی شخص کو اس توانائی سے زیادہ جو اس نے اُسے دی ہے تکلیف نہیں دیتا۔ خدا عنقریب سختی کے بعد آسانی قرار دے گا۔

تفسیر

مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق

منجملہ ان احکام کے جو گزشتہ آیات سے معلوم ہوتے ہیں، طلاق کے بعد عدت پوری کرنے کا ضروری ہونا ہے۔ چونکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ میں عدت کے مسئلہ میں ان عورتوں کا حکم واضح ہوگیا ہے جو ماہانہ عادت دیکھتی ہیں کہ انہیں تین بار پاکیزہ ہو کر ماہانہ عادت دیکھنی چاہیئے۔ جب وہ تیسری مرتبہ ماہانہ عادت میں وارد ہوں تو ان کی عدت ختم ہو جائے گی، لیکن انہیں میں سے کچھ ایسی عورتیں بھی ہیں جو کئی اسباب کی بنا پر ماہانہ عادت نہیں دیکھتیں یا وہ حاملہ ہوتی ہیں، تو اوپر والی آیات ان عورتوں کے حکم کو واضح کرتے ہوئے عدت کی بحث کی تکمیل کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "تمہاری عورتوں میں سے جو ماہانہ عادت سے ناامید ہوگئی ہیں اگر ان کی وضع و کیفیت میں (حاملہ ہونے کے لحاظ سے) شک کرو تو ان کی عدت تین ماہ ہے"۔ (واللائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلاثۃ اشھر)۔

اور اسی طرح سے وہ عورتیں بھی جنھوں نے ماہانہ عادت دیکھی ہی نہیں وہ بھی تین ماہ عدت رکھیں"۔ (واللائی لم یحضن)۔

اس کے بعد تیسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ وضع حمل کریں"۔ (و اولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن)۔

اس طرح سے اوپر والی آیت میں عورتوں کے دوسرے تین گروہوں کے لیے حکم مشخص ہوگیا ہے۔ یعنی دو گروہوں کو تو تین ماہ تک عدت رکھنی چاہیئے اور تیسرے گروہ، یعنی حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے چاہے وہ طلاق کے ایک لحہ بعد یا آٹھ ماہ بعد وضع حمل کریں۔

"ان ارتبتم" (اگر تمھیں شک اور تردد ہو) کے جملہ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں تین احتمال بیان کیے گئے ہیں:

۱: اس سے مراد وجود "حمل" میں احتمال اور شک ہے، اس معنی میں کہ اگر سن یاس (عام عورتوں میں پچاس سال کے سن اور قرشی عورتوں میں ساٹھ سال[1] کے سن) کے بعد کبھی عورت میں وجود حمل کا احتمال ہو تو اُسے عدت گزارنی چاہیئے۔ اگرچہ اس بات کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات ایسا ہوا ہے (توجہ رہے کہ روایات اور کلمات فقہا میں لفظ "ریبۃ" حمل میں شک کے معنی میں بولا آیا ہے)۔ لہ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۲ : ایسی عورتیں مراد ہیں جن کے بارے میں ٹھیک طرح سے معلوم نہ ہو کہ سن یاس کو پہنچی ہیں کہ نہیں۔
۳ : اس مسئلہ کے حکم میں شک اور تردد مراد ہے۔ اس بناء پر آیت یہ کہتی ہے کہ اگر تم حکم خدا کو نہیں جانتے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کی عورتیں عدت گزاریں۔ لیکن ان تمام تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ والّٰی یئسن کے جملہ کا ظاہر یہ ہے کہ یہ عورتیں سن یاس کو پہنچ گئی ہیں۔

ضمناً جب عورتوں کی ماہانہ عادت بیماریوں یا دوسرے عوامل کی بناء پر منقطع ہو جائے تو وہ اس حکم کی شمول میں یعنی انہیں چاہیے کہ تین ماہ تک عدت گزاریں۔ (اس حکم کو قاعدۂ اولویت کے طریق سے یا فقط آیت کے شمول سے معلوم کیا جا سکتا ہے) [1]

واللائی لم یحضن" (وہ عورتیں جنہوں نے ماہانہ عادت نہیں دیکھی) کا جملہ ممکن ہے اس معنی میں ہو کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ گئی ہیں لیکن ابھی ماہانہ عادت شروع نہیں ہوئی۔ اس صورت میں بلاشک وشبہ انہیں تین ماہ تک عدت گزارنی چاہیئے۔ ایک اور احتمال جو علماء نے آیت کی تفسیر میں دیا وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ تمام عورتیں ہیں جو ماہانہ عادت نہیں دیکھتیں، چاہے وہ سن بلوغ تک پہنچی ہوں یا نہ پہنچی ہوں۔

لیکن ہمارے فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ اگر عورت سن بلوغ کو نہ پہنچی ہو تو طلاق کے بعد اس کی عدت نہیں ہے، لیکن اس مسئلہ کے مخالف بھی ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں بعض روایات سے استدلال کیا اور اوپر والی آیت کا ظاہر بھی ان کے موافق ہے۔ (اس مسئلہ کی مزید تشریح کا بھی فقہ کی کتابوں میں مطالعہ کرنا چاہیئے) [2]

وہ شان نزول جو آخری جملوں کے لیے بیان کی گئی ہے اس سے بھی اوپر والی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ شان نزول یہ ہے کہ ابی بن کعب نے حضرت رسولؐ سے عرض کیا کہ بعض عورتوں کی عدت قرآن میں نہیں آئی ہے، ان میں غیر بالغ لڑکیاں، کبیرہ (یائسہ) عورتیں اور حاملہ عورتیں ہیں تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور ان کے احکام بیان کیے گئے۔ [3]

عدت اس صورت میں ہے کہ اس بارے میں حمل کا احتمال ہو، کیونکہ اوپر والی آیت میں یائسہ عورتوں پر عطف ہوا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دونوں کا حکم یکساں ہے۔ [4]

(مزید وضاحت کے لیے) جواہر جلد ۳۲ ص ۲۲۹۔ "وسائل الشیعہ" جلد ۱۵ باب ۴ از ابواب عدد، حدیث ۶

[1] ہمارے فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ عورت جب سن یاس کو پہنچ جائے تو اس کی عدت بالکل نہیں ہے، لیکن اس قول کے مقابلے میں علماء قدیم کی ایک تھوڑی سی تعداد عدت کی قائل ہے، اور بعض روایات بھی اس پر شاہد ہیں۔ اگرچہ دوسری روایات اس سے معارضہ کرتی ہیں جو بات اوپر والی آیت کے ظاہر سے موافق ہے وہ یہ ہے کہ احتمال حمل کی صورت میں وہ عدت رکھتی ہیں۔ اس موضوع کی مزید تشریح فقہی کتابوں میں دیکھنی چاہیے۔

[2] "جواہر الکلام" جلد ۳۲ ص ۲۳۲۔ اور فقہ کی دوسری کتابیں۔

[3] کنز العرفان جلد ۲ ص ۲۴

[4] مرحوم طبرسی مجمع البیان میں یوں کہتے ہیں: تقدیرہ واللائی لم یحضن ان ارتبتم فعدتھن ایضاً ثلاثة اشھر

پھر آیت کے آخر میں نئے سرے سے مسئلہ تقویٰ پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : "اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے گا، خدا معاملے کو اس پر آسان کر دے گا" (ومن یتق اللہ یجعل لہ من امرہ یسرًا)۔

وہ اس کی مشکلات کو اس جہان میں اور دوسرے جہان میں بھی چاہے وہ علیحدگی، مسئلہ طلاق اور اس کے احکام سے مربوط ہوں اور چاہے دوسرے مسائل سے تعلق رکھتی ہوں، اپنے لطف و کرم سے حل کر دے گا۔

* * *

نیز بعد والی آیۃ میں تاکید کے لیے ان احکام کے بارے میں جو طلاق اور عدت کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں آئے ہیں، مزید کہتا ہے : "یہ خدا کا حکم ہے جسے اس نے تم پر نازل کیا ہے" (ذلک امر اللہ انزلہ الیکم)۔

"اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے گا اور اس کے فرمان کی مخالفت سے پرہیز کرے گا خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور اس کے اجر و ثواب کو بہت بڑھا دے گا" (ومن یتق اللہ یکفر عنہ سیئاتہ ویعظم لہ اجرًا)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں 'سیئات' سے مراد گناہان صغیرہ ہیں اور تقویٰ سے مراد "گناہان کبیرہ" سے پرہیز ہے۔ اور اس طرح کبائر سے پرہیز صغائر کے بخشے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ بات اس کے مشابہ ہے جو سورۂ نساء کی آیت ۳۱ میں بیان ہوئی ہے۔ اس گفتگو کا لازمہ یہ ہے کہ طلاق اور عدت کے سلسلہ میں گزشتہ احکام کی مخالفت گناہان کبیرہ میں شمار ہوتی ہے۔[1]

البتہ یہ درست ہے کہ بعض اوقات 'سیئات' صغیرہ گناہوں کے معنی میں بھی آیا ہے لیکن قرآن مجید کی بہت سی آیات میں تمام گناہوں کے لیے، چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ لفظ سیئات کا اطلاق ہوا ہے۔ مثلاً سورہ مائدہ کی آیت ۶۵ میں آیا ہے : ولو ان اھل الکتاب اٰمنوا واتقوا لکفرنا عنھم سیئاتھم "اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان کے تمام گزشتہ گناہوں کو بخش دیں گے" (یہ معنی دوسری آیات میں بھی آیا ہے)۔

مسلّمہ طور پر ایمان اور قبولِ اسلام تمام گزشتہ گناہوں کی بخشش کا سبب ہے۔

* * *

بعد والی آیت طلاق کے بعد عورت کے حقوق کے بارے میں 'مسکن' اور 'نفقہ' کے لحاظ سے اور دوسری جہات سے بھی وضاحت کرتی ہے۔

پہلے مطلقہ عورتوں کے مسکن کی کیفیت کے بارے میں فرماتا ہے : "جہاں تم سکونت رکھتے ہو اور تمہارے

---

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۳۶۸

وسائل تقاضا کرتے ہیں انھیں بھی وہیں سکونت دو" (اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم)۔

"وجد" (بروزن حکم) توانائی اور تمکن کے معنی میں ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی اور تفاسیر بھی بیان کی ہیں، جو نتیجہ میں اسی معنی کی طرف لوٹتی ہیں۔ "راغب" بھی مفردات میں یہی کہتا ہے کہ "من وجدکم" کی تعبیر کا مفہوم یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی توانائی اور مقدور کے مطابق رہنے کے لیے مناسب مکان دو۔

فطری طور پر جب مکان شوہر کے ذمہ ہے تو باقی اخراجات بھی اسی کے ذمہ ہوں گے۔ آیت کا آخری حصہ جو حاملہ عورتوں کے نفقہ کے بارے میں ہے وہ اسی مدعا پر گواہ ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "انھیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤ کہ معاملے کو ان پر ایسا تنگ کر دو کہ وہ تمہارے مکان کو چھوڑنے اور نفقہ کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں" (ولا تضاروھن لتضیقوا علیھن)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ کینہ پروری، عداوت اور نفرت تمہیں حق اور عدالت کے راستہ سے منحرف کر دے، تم انھیں ان کے مسلّم حقوق مسکن و نفقہ سے محروم کر دو اور ان پر اتنا دباؤ پڑے کہ وہ ہر چیز کو چھوڑ کر نکلنے کھڑی ہوں۔

تیسرے حکم میں حاملہ کے بارے میں کہتا ہے: "اور اگر وہ حاملہ ہوں تو جب تک وہ وضع حمل نہ کر لیں ان کے اخراجات دیتے رہو" (وان کن اولات حمل فانفقوا علیھن حتّٰی یضعن حملھن)۔

کیونکہ جب تک انھوں نے وضع حمل نہیں کیا وہ حالتِ عدت میں ہیں اور ان کا نفقہ اور مسکن شوہر پر واجب ہے۔

چوتھے حکم میں دودھ پلانے والی عورتوں کے حقوق کے بارے میں فرماتا ہے: "اگر وہ علیٰحدگی کے بعد بچوں کو دودھ پلانے پر رضامند ہو جائیں تو ان کی اُجرت انھیں دے دو" (فان ارضعن لکم فاٰتوھن اجورھن)۔

اتنی اُجرت جو عرف و عادت کے لحاظ سے دودھ پلانے کی مقدار اور وقت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔

چونکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ طلاق کے بعد شوہر اور بیوی میں نوزاد بچے کے سلسلے میں مصالحت کرنے پر اختلاف پیدا ہو جاتے ہیں، لہٰذا پانچویں حکم میں اس سلسلے میں ایک قاطع حکم صادر فرماتے ہوئے کہتا ہے: "اولاد کی سرنوشت کے سلسلے میں ایک دوسرے کے مشورے سے شائستہ فیصلہ کرو" (واْتمروا بینکم بمعروف)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ شوہر اور بیوی کے اختلافات بچوں کے منافع پر ایسی ضرب لگائیں کہ جس سے وہ جسمانی اور ظاہری لحاظ سے خسارے میں گرفتار ہو جائیں یا باطنی لحاظ سے معنوی محبت اور شفقت سے محروم رہ جائیں۔ والدین کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خدا کو نظر میں رکھیں اور دفاع نہ کر سکنے والے نوزاد کو اپنے اختلافات اور اغراض پر قربان نہ کر دیں۔

"وأتمروا" کا جملہ "ایتمار" کے مادہ سے بعض اوقات تو کسی دستور کو قبول کرنے اور کبھی مشاورت کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہاں دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ نیز معروف کی تعبیر بڑی جامع ہے جو ہر قسم کے مشورے کو شامل ہے کہ جس میں خیر و صلاح ہو۔

چونکہ بعض اوقات طلاق کے بعد بچے کے مصالح اور اسے دودھ پلانے کے سلسلے میں بیوی اور شوہر میں ضروری اور لازمی موافقت پیدا نہیں ہوتی۔ لہٰذا چھٹے حکم میں فرماتا ہے: "اور اگر تم ایک دوسرے کے لیے سخت ہو جاؤ اور موافقت نہ کرو، تو پھر کوئی دوسری عورت بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری لے سکتی ہے۔ تاکہ کشمکش جاری نہ رہے۔" (وان تعاسرتم فسترضع له اخریٰ)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر اختلافات طول پکڑ جائیں تو اپنے آپ کو مشغول نہ رکھو اور بچے کو کسی دوسری عورت کے سپرد کردو۔ پہلے درجہ میں تو ماں ہی کا حق تھا کہ وہ اس بچے کو دودھ پلائے، لیکن جب سخت گیری اور کشمکش کی بناء پر یہ امر امکان پذیر نہیں رہا تو بچے کے منافع کو فراموشی کے سپرد نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا اس کی ذمہ داری کسی دایہ کے سپرد کردو۔

◆ ◆ ◆

بعد والی آیت اس سلسلہ میں ساتویں اور آخری حکم کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "وہ لوگ جو وسیع وسائل رکھتے ہیں وہ اپنے وسائل اور امکانات کے مطابق خرچ کریں، لیکن جو تنگ دست ہیں تو جو کچھ خدا نے انھیں دے رکھا ہے وہ اس میں سے خرچ کریں۔ خدا کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا کہ جو اس کو عطا کیا ہوا ہے۔" (لینفق ذو سعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما اٰتاه الله لا یکلف الله نفسا الا ما اٰتاها)۔

کیا یہ حکم یعنی طاقت کے مطابق خرچ کرنا ان عورتوں سے مربوط ہے جو طلاق کے بعد بچوں کو دودھ پلانے کی ذمہ داری قبول کرلیتی ہیں یا عدت کے دنوں کے ساتھ مربوط ہے کہ جس کی طرف گزشتہ آیات میں اجمالی طور پر اشارہ ہوا یا یہ دونوں کے ساتھ مربوط ہے؟

آخری معنی سب سے مناسب ہے۔ اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت اسے صرف دودھ پلانے والی عورتوں سے مربوط سمجھتی ہے۔ حالانکہ گزشتہ آیات میں اس بارے میں اجر (اجرت) کی تعبیر آئی ہے، نفقہ اور انفاق کی تعبیر نہیں آئی۔

بہرحال جن لوگوں میں کافی طاقت اور توانائی ہے انھیں تنگ دلی اور سخت گیری نہیں کرنی چاہیے جن میں کچھ زیادہ مالی طاقت نہیں ہے وہ اپنی توانائی سے زیادہ پر مامور نہیں اور عورتیں ان پر اعتراض نہیں کرسکتیں۔
اسی طرح جو وسعت رکھتے ہیں انھیں بخل نہیں کرنا چاہیے، اور جو وسعت نہیں رکھتے، وہ ملامت کے لائق نہیں ہیں۔

معیشت کی تنگی لوگوں کے حق و عدالت کے راستہ سے خارج ہونے کا سبب نہ بنے اور کوئی بھی شخص شکایت کے لیے زبان نہ کھولے۔ اس بناء پر آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا عنقریب سختی کے بعد راحت اور آسانی قرار دے گا۔" (سیجعل اللہ بعد عسر یسرًا)۔

یعنی غم نہ کھاؤ، بیتابی نہ کرو، دنیا ایک حالت پر باقی نہیں رہتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ منقطع ہو جانے والی اور جلدی سے گزر جانے والی مشکلات تمہارے صبر و شکیبائی کے رشتہ کو توڑ کر پارہ پارہ نہ کر دیں۔

یہ تعبیر ہمیشہ کے لیے، خصوصًا ان آیات کے نزول کے وقت کہ جب مسلمان معیشت کے لحاظ سے سخت تنگی میں تھے، صابرین کے مستقبل کی ایک اُمید بخش بشارت ہے، پھر اتفاق سے کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ خدا نے اپنی رحمت و برکت کے دروازے ان پر کھول دیئے۔

• • •

چند نکات

۱: طلاقِ رجعی کے احکام

ہم بیان کر چکے ہیں کہ "طلاق رجعی" وہ ہے کہ جس میں شوہر عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے جس وقت چاہے رجوع کر سکتا ہے اور میاں بیوی کے رشتہ کو بحال کر سکتا ہے۔ اور اس میں کسی نئے عقد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ رجوع کم سے کم بات اور عمل سے بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو بازگشت کی علامت ہو۔

بعض احکام جو اوپر والی آیات میں بیان کیے گئے ہیں، جیسے نفقہ اور مسکن کے احکام، وہ طلاقِ رجعی کی عدت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی طرح عدت کی حالت میں عورت کا اپنے شوہر کے گھر سے نہ نکلنے کا مسئلہ بھی ہے۔ لیکن طلاق بائن یعنی وہ طلاق جو قابلِ رجوع نہیں (مثلاً تیسری طلاق) تو اس میں اوپر والے احکام کا وجود نہیں ہے۔

صرف حاملہ عورت کے بارے میں وضع حمل کے وقت تک نان و نفقہ اور مسکن کا حق ثابت ہے۔

"لا تدری لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرًا" (تو نہیں جانتا شاید خدا کوئی نئی وضع و کیفیت پیدا کر دے) کی تعبیر بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب یا اوپر والے احکام کا ایک حصہ طلاق رجعی کے ساتھ مربوط ہے۔[1]

• • •

---

[1] مزید وضاحت کے لیے فقہ کی کتابوں منجملہ "جواہر الکلام" جلد ۳۲ ص ۱۲۱ کی طرف رجوع کریں۔

۲ : خدا طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا

نہ صرف عقل کا حکم یہی ہے، بلکہ حکم شریعت بھی اسی مطلب کا گواہ ہے کہ انسانوں کی ذمہ داریاں ان کی طاقت کے مطابق ہونی چاہئیں: لا یکلف اللہ نفسًا الا ما اٰتاھا کا جملہ جو اوپر والی آیات کے ضمن میں آیا ہے اس میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ ما اٰتاھا سے مراد ما اعلمھا ہے۔ یعنی ہر شخص پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتا ہے جتنی اسے تعلیم دی ہے۔ اسی لیے علماء نے "علم اصول" میں "اصل برأت" کے مباحث میں، اس آیت کے ساتھ استدلال کیا ہے کہ اگر انسان کسی حکم کو نہیں جانتا تو وہ اس کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔

لیکن چونکہ عدم آگاہی بعض اوقات عدم توانائی کا سبب بن جاتی ہے، لہٰذا ممکن ہے اس سے مراد وہ جہالت ہو جو عجز و ناتوانی کا سرچشمہ بنے۔

اس بناء پر ممکن ہے یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہو کہ جو عدم قدرت کو اور اس جہالت کو بھی شامل ہو، جو کسی کام کے انجام دینے میں عدم قدرت کی موجب ہو۔

⁂

۳ : گھرانے کے نظام کی اہمیت

وہ باریکی اور عمدگی جس سے مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق بیان کرنے کے سلسلہ میں اوپر والی آیت میں کام لیا گیا ہے، یہاں تک کہ آیات قرآن میں اس مسئلہ کی نسبت ساری جزئیات بیان ہوئی ہیں کہ جو حقیقت میں اسلام کا بنیادی قانون ہے، اس اہمیت کی ایک واضح دلیل ہے کہ گھریلو نظام نیز عورتوں اور بچوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اسلام اس کا قائل ہے۔

جہاں تک ہو سکتا ہے اسلام طلاق سے روکتا ہے اور اس کی جڑوں کو کاٹتا ہے لیکن جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے کہ ہر طرف کے راستے بند ہو جائیں اور طلاق و علیحدگی کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہو تو پھر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کشمکش میں اولاد یا عورتوں کے حقوق پامال ہو جائیں، یہاں تک کہ علیحدگی کا طریقۂ کار بھی اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ عام طور پر رجوع اور بازگشت کا امکان موجود رہے۔

معروف طریقہ سے روکے رکھنا اور معروف سے جدائی، عورتوں کو نقصان اور ضرر کا نہ پہنچانا اور تنگی اور سخت گیری نہ کرنا، نیز بچوں کی سرنوشت کو محفوظ کرنے کے لیے شائستہ اور مناسب مشورہ کرنا، اور اسی قسم کے دوسرے احکام جو اوپر والی آیات میں آئے ہیں، وہ سب اس بات کے گواہ ہیں۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان امور سے بہت سے مسلمانوں کی لاعلمی یا علم کے باوجود عمل نہ کرنا، اس بات

کا سبب ہوتا ہے کہ طلاق اور علیحدگی کے وقت گھرانوں اور خصوصاً اولاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمان قرآن کے فیض بخش چشمہ سے دور ہو گئے ہیں۔ مثلاً اس بات کے باوجود کہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ عورتیں عدّت کے دوران شوہر کے گھر سے باہر نہ جائیں، اور نہ ہی شوہر کو یہ حق ہے کہ وہ انھیں گھر سے نکالے۔ یہ ایسا عمل ہے کہ اگر اسی طرح انجام پا جائے تو اکثر عورتوں کے ازدواجی زندگی کی طرف لوٹ آنے کی بہت زیادہ اُمید ہے۔ لیکن آپ بہت کم مسلمان مرد اور مسلمان عورت کو دیکھیں گے، جو طلاق و جدائی کے بعد اس اسلامی حکم پر عمل کرتے ہوں۔ یہ امر واقعی طور پر قابلِ افسوس ہے۔

◆ ◆ ◆

(۸) وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝

(۹) فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝

(۱۰) اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۚۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝

(۱۱) رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝

ترجمہ

(۸) کتنے ہی شہر اور آبادیاں ایسی ہیں جن کے رہنے والوں نے خدا اور اس

کے رسولوں کے فرمان سے سرپیچی کی تو ہم نے بھی ان کا حساب شدت کے ساتھ چکایا اور انھیں بہت ہی بڑے عذاب میں گرفتار کر دیا۔

(۹) انھوں نے اپنے کردار و عمل کا وبال چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ اور نقصان تھا۔

(۱۰) خدا نے ان کے لیے شدید عذاب فراہم کیا، پس اے صاحبانِ ایمان وعقل! تم خدا کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کرو، (کیونکہ) خدا نے تم پر وہ چیز نازل کی ہے جو تمھارے لیے ایک نصیحت ہے۔

(۱۱) تمھاری طرف ایک رسولؐ بھیجا ہے جو خدا کی واضح آیات کی تم پر تلاوت کرتا ہے، تاکہ ان لوگوں کی جو ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیتے ہیں، تاریکیوں سے نور کی طرف ہدایت کرے۔ اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا، اور عمل صالح انجام دیتا ہے، خدا اسے اس جنت کے باغات میں وارد کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور خدا نے ان کے لیے اچھی روزی قرار دی ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

سرکشوں کا دردناک انجام

قرآن کا شیوہ یہ ہے کہ اکثر مواقع پر عملی احکام کے ایک سلسلے کو بیان کرنے کے بعد گذشتہ امتوں کے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے، تاکہ مسلمان ان کی سرگذشت میں اطاعت وعصیاں کا نتیجہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور یہ مسئلہ بطورِ خود ایک جیتی صورت اختیار کرلے۔ اسی لیے اس سورہ میں بھی طلاق وعلیحدگی کے موقع پر مردوں اور عورتوں کے وظائف اور ذمہ داریاں بیان کرنے کے بعد اسی مطلب کو پیش کر کے گنہگاروں اور سرکشی کرنے والوں کو خبردار کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "کتنے ہی شہر اور آبادیاں ایسی تھیں جن کے رہنے والوں نے خدا اور اس کے رسولوں کے فرمان سے سرپیچی کی تو ہم نے بھی ان کا حساب شدت کے ساتھ چکایا اور انھیں بہت ہی بڑے عذاب میں

گرفتار کر دیا"۔ (وکاین من قریۃ عتت عن امر ربھا ورسلہ فحاسبناھا حسابا شدیدا وعذبناھا عذابا نکرا)۔[۱]

"قریۃ" سے مراد، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے، انسانوں کے اجتماع کی جگہ ہے، چاہے وہ شہر ہو یا گاؤں۔ اور یہاں مراد اس میں رہنے والے ہیں۔

"عتت"، "عتو" (بروزن غلو) کے مادہ سے اطاعت سے روگردانی کرنے کے معنی میں ہے۔

"نکر"، (بروزن شکر) ایسی مشکل کے معنی میں ہے کہ جس کی مثال نہ ہو یا بہت کم پائی جاتی ہو۔

"حسابا شدیدا" یا تو دقیق اور سخت گیری کے ساتھ حساب لینے کے معنی میں یا شدید عذاب کے معنی میں ہے کہ جو دقیق حساب کا نتیجہ ہے۔ بہرحال یہ ان سرکش اقوام کے اس دنیا میں عذاب کی طرف اشارہ ہے کہ کبھی قوم کی طوفان کے ساتھ، کبھی گروہ کی تباہ کرنے والے زلزلے کے ساتھ اور کسی گروہ کی صاعقہ یعنی بجلی اور اسی قسم کی چیزوں کے ساتھ بیخ کنی کی گئی، اور ان کے تباہ اور ویران شدہ شہر و دیار آنے والے لوگوں کے لیے درس عبرت کی صورت میں باقی رہ گئے۔

* * *

لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "انھوں نے اپنے کفر و گناہ کا عذاب چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ اور نقصان تھا"۔ (فذاقت وبال امرھا وکان عاقبۃ امرھا خسرا)۔

اس سے بڑھ کر خسارہ اور کیا ہوگا کہ وہ خداداد سرمایہ کو ہاتھ سے گنوا بیٹھے اور اس دنیا کے بازار تجارت سے نہ صرف یہ کہ انھوں نے کوئی مال و متاع نہیں خریدا بلکہ انجام کار عذاب الٰہی سے نابود ہو گئے۔

بعض نے یہاں "حساب شدید" اور "عذاب نکر" کو عذاب قیامت کی طرف اشارہ سمجھا، اور فعل ماضی کو مستقبل کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کا کوئی سبب موجود نہیں ہے، بالخصوص جبکہ عذاب قیامت کے سلسلہ میں بعد والی آیت میں بات کی جائے گی اور یہ بات خود ایک زندہ گواہ ہے کہ یہاں عذاب سے مراد عذاب دنیا ہی ہے۔

* * *

اس کے بعد ان کے اخروی عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا نے ان کے لیے شدید عذاب تیار کر رکھا ہے"۔ (اعد اللہ لھم عذابا شدیدا)۔

---

[۱] "کأیّن" مشہور علمائے ادب کے نظریہ کے مطابق ایک مرکب اسم ہے، "کاف" تشبیہ اور "ای" سے جو تنوین کے ساتھ توام ہے۔ چونکہ تنوین اس اسم کی بناء میں داخل ہے اس لیے حالت وقف میں بھی پڑھی جاتی ہے، اور قرآن کی کتابت میں بھی لکھی جاتی ہے۔ اور اس کا معنی "کم" خبریہ کے مانند ہے، اگرچہ اس کے ساتھ کچھ فرق ہے، ایک غیر مشہور نظریہ یہ ہے کہ یہ ایک اسم بسیط ہے اور اس کا "کاف" اور "تنوین" جزو کلمہ ہے۔

ایک دردناک، شدید، وحشت انگیز، ذلیل کرنے والا اور رُسوا کرنے والا عذاب اور ان کے لیے دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی جگہ ابھی سے فراہم ہے۔

جب یہ بات ہے تو "اے صاحبانِ عقل وخرد اور اے ایمان لانے والو! خدا کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کرو"۔ (فاتقوا اللّٰہ یا اولی الالباب الذین اٰمنوا)۔

ایک طرف سے غور وفکر اور دوسری طرف سے ایمان اور آیاتِ الٰہی تمہیں خبردار کرتی ہیں کہ تم سرکش اور رُوگردانی کرنے والی قوموں کی سرگزشت کو دیکھو اور اس سے عبرت حاصل کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان کی صف میں جا کھڑے ہو، پھر خدا تمہیں اس جہان میں بھی ہولناک اور بے سابقہ عذاب میں گرفتار کر دے گا۔ اور آخرت کا شدید عذاب بھی تمہارے انتظار میں ہو گا۔

اس کے بعد غور وفکر کرنے والے مومنین کو مخاطب کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "خدا نے تم پر ایسی چیز نازل کی ہے جو تمہارے لیے باعثِ نصیحت ہے"۔ (قد انزل اللّٰہ الیکم ذکرا)۔

❊ ❊ ❊

"اور ایک رسول تمہاری طرف بھیجا ہے، جو خدا کی واضح آیات کی تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح بجا لانے والوں کی تاریکیوں سے نور کی طرف ہدایت کرے"۔ (رسولاً یتلوا علیکم اٰیات اللّٰہ مبینات لیخرج الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات من الظلمات الی النور)۔

یہاں ذکر سے کیا مراد ہے؟ اور رسول سے کون مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

مفسرین کا ایک گروہ "ذکر" کو قرآن کے معنی میں لیتا ہے، جبکہ ایک جماعت نے اس کی رسولِ خدا کے ساتھ تفسیر کی ہے، کیونکہ آپ لوگوں کے لیے یاد آوری کا سبب ہیں۔ اس تفسیر کے مطابق اس کے بعد جو لفظ "رسولاً" آیا ہے اس سے پیغمبر کی ذات مراد ہے۔ (اور اس کلام میں کوئی محذوف نہیں ہے)، لیکن یہاں "نازل کرنے سے مراد" خدا کی طرف سے امت کو پیغمبر کے وجود کا عطا کرنا ہے۔

لیکن اگر ذکر کو قرآن مجید کے معنی میں لیں تو "رسولاً" اس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس جملے میں ایک محذوف ہے۔ اور تقدیر میں اس طرح ہے: "انزل اللّٰہ الیکم ذکرا وارسل رسولاً" خدا نے ایک نصیحت والی چیز نازل کی اور ایک رسول بھیجا۔

بعض نے "رسول" کی "جبرئیل" کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ اس صورت میں اس کا نزول نزولِ حقیقی ہو گا، کیونکہ وہ آسمان سے نازل ہوتا تھا۔ لیکن یہ تفسیر "یتلوا علیکم اٰیات اللّٰہ" "وہ خدا کی آیات تمہارے سامنے پڑھتا ہے" کے جملہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے کیونکہ جبرئیل براہِ راست مومنین کے سامنے نہیں پڑھتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک تفسیر میں ایک اضافہ اور ایک مشکل موجود ہے۔ لیکن مجموعی طور پر پہلی

تفسیر (یعنی ذکر کا معنی قرآن اور رسول کا معنی پیغمبر اکرمؐ ہیں) سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں لفظ ذکر کا قرآن پر اطلاق ہوا ہے، خصوصاً جہاں لفظ "انزال" کے ساتھ ہو۔ اس طرح سے کہ جب "نزول ذکر" کہا جائے تو یہ قرآن کے معنی کا ہی ادعا کرتا ہے۔

سورۂ نحل کی آیت ۴۴ میں آیا ہے: و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم: "ہم نے ذکر کو تجھ پر نازل کیا ہے، تاکہ تو لوگوں کے لیے اس چیز کو بیان کرے جو ان پر نازل ہوئی ہے"۔

نیز سورۂ حجر کی آیت ۶ میں آیا ہے: "وقالوا یاایھا الذی نزل علیہ الذکر انک لمجنون" دشمنوں نے کہا: اے وہ شخص کہ جس پر ذکر نازل ہوا ہے تو ایک دیوانہ ہے"۔

اگر آئمہ اہل بیتؑ سے بعض روایات میں آیا ہے کہ ذکر سے مراد حضرت رسولؐ ہیں اور ہم "اہل ذکر" ہیں، تو ممکن ہے کہ یہ آیت کے بطون کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ "اہل الذکر" جو آیت فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (اگر تم نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو) (نحل ۴۳) میں آیا ہے یہ خاص طور پر اہل بیت کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کی شانِ نزول میں علماء اہل کتاب آتے ہیں۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ "ذکر" ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جو پیغمبر اسلامؐ کو شامل ہے تو یہ بھی اس کا ایک مصداق ہو گا۔[1]

بہرحال اس رسولؐ کے بھیجنے اور اس کتاب آسمانی کے نازل کرنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ وہ انھیں آیات الٰہی کی تلاوت کے ذریعے کفر و جہالت، معصیت اور اخلاقی فساد کی تاریکیوں سے باہر نکالتے ہوئے ایمان، توحید اور تقویٰ کے نور کی رہنمائی کرے۔ جبکہ حقیقت میں بعثتِ پیغمبرؐ اور نزولِ قرآن کے تمام اہداف و مقاصد کا خلاصہ اسی ایک جملہ میں آگیا ہے: یعنی تاریکیوں سے باہر نکال کر نور کی طرف لا۔ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "ظلمات" کا صیغہ جمع کے ساتھ اور نور کا صیغہ واحد کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ کیونکہ شرک و کفر و فساد، پراگندگی و کثرت کے عامل ہیں، جبکہ ایمان و توحید و تقویٰ، وحدت و یگانگت کے عامل ہیں۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کے اجر و ثواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو ایمان و عمل صالح رکھتے ہیں، مزید کہتا ہے: "جو شخص خدا پر ایمان لائے، عمل صالح بجا لائے اور اسی راستے پر چلتا رہے، تو خدا اُسے جنت کے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہیں پر رہے گا، اور خدا نے اس کے لیے اچھی روزی قرار دی ہے"۔ (ومن یؤمن باللہ ویعمل صالحا یدخلہ جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدًا قد احسن اللہ لہ رزقا)۔

"یؤمن" اور "یعمل" کی تعبیر فعل مضارع کی صورت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا ایمان اور عمل صالح کسی خاص زمانہ کے ساتھ محدود نہیں بلکہ استمرار و دوام رکھتا ہے۔[2]

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۹ سے رجوع کریں۔ [2] توجہ رکھنی چاہیے کہ جو ضمیریں آیت میں استعمال ہوئی ہیں بعض ترکیب کی صورت میں ہیں اور بعض مفرد کی صورت میں ہیں۔ یہ اس بناء پر ہے کہ جہاں مفرد کی صورت میں ہیں وہاں وہ جنس اور جمع کے معنی میں ہیں۔

خالدین کی تعبیر جنت کی ہمیشگی کی دلیل ہے۔ اس بناء پر اس کے بعد "ابداً" کے لفظ کا ذکر "خلود" کے لیے ایک تاکید شمار ہوتا ہے۔

"رزقاً" کی تعبیر "نکرہ" کی صورت میں ان اچھی اچھی روزیوں کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے جو خدا ان لوگوں کے لیے فراہم کرے گا یہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو آخرت میں ہر قسم کی خدائی نعمت، یہاں تک کہ دنیاوی مواہب کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے، کیونکہ ایمان و تقویٰ کا نتیجہ صرف آخرت کے ساتھ مربوط نہیں بلکہ مومن و پرہیزگار لوگ اس دنیا میں بھی پاکیزہ تر، آرام دہ اور زیادہ لذت بخش زندگی رکھتے ہیں۔

◆ ◆ ◆

(۱۲) اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَىْءٍ عِلْمًا ۟

ترجمہ

(۱۲) خدا نے ہی ساتوں آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور اتنی ہی زمینیں (پیدا کی ہیں) اس کا حکم ہمیشہ ان کے درمیان نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، اور اس کا علم ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے۔

تفسیر

خلقت عالم کا مقصد معرفت ہے

سورۂ طلاق کی یہ آخری آیت آسمانوں اور زمینوں کی خلقت میں اللہ کی قدرت کی عظمت اور اس خلقت کے مقصدِ اصلی کی طرف ایک پُرمعنی اور واضح اشارہ ہے۔ نیز یہ ان مباحث کی تکمیل کر رہا ہے جن میں پرہیزگار مومنین کے لیے ثوابِ عظیم کے وعدے کے سلسلے میں اور اسی طرح ان وعدوں کے سلسلے میں جو ان کی مشکلات کی گرہ کھولنے کے بارے میں کیے تھے۔ یہ بات واضح ہے کہ وہ خدا جو اس عظیم خلقت پر قدرت رکھتا ہے وہ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی ان وعدوں کو پورا کرنے کی طاقت اور قوت رکھتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "خدا وہی ہے جس نے ساتوں آسمان پیدا کیے": (اللہ الذی خلق سبع سماوات)۔

"اور اتنی ہی زمینیں پیدا کی ہیں": (ومن الارض مثلھن)۔

یعنی جس طرح آسمان سات ہیں اسی طرح زمینیں بھی سات ہیں۔
یہ قرآن مجید کی واحد آیت ہے جو سات زمینوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔
اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان سات آسمانوں اور اتنی ہی زمینوں سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد اول میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ کے ذیل میں اور جلد ۱۱ میں سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۱۲ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔ لہٰذا یہاں ایک مختصر سے اشارہ پر قناعت کرتے ہیں اور وہ یہ ہے:
ممکن ہے کہ سات کے عدد سے مراد وہی کثرت ہو، کیونکہ یہ تعبیر قرآن مجید میں اور اس کے علاوہ بھی کثرت کے معنی میں آتی ہے، جیسے ہم کہتے ہیں اگر تم سات سمندر بھی لے آؤ تو کافی نہیں ہوں گے۔
اس بناء پر سات آسمانوں اور سات زمینوں سے مراد آسمانی کواکب اور زمین سے مشابہ کُرّوں کی عظیم و کثیر تعداد ہے۔
لیکن اگر ہم سات کے عدد کو تعداد اور گنتی کے لیے سمجھیں تو اس کا مفہوم سات آسمانوں کا وجود ہوگا، چنانچہ سورہ صافات کی آیت ۶ کہتی ہے: "انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب؛ ہم نے نزدیکی آسمان (پہلے آسمان) کو کواکب اور ستاروں سے زینت بخشی ہے" اس کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اور انسانی علم و دانش جس پر احاطہ رکھتی ہے وہ سب کچھ پہلے آسمان سے مربوط ہے۔ لیکن ان ثوابت و سیارات کے علاوہ اور بھی کچھ عالم موجود ہیں جو ہمارے علم کی دسترس سے باہر ہیں۔
یہ بات تو سات آسمانوں کے بارے میں تھی۔ باقی رہا سات زمینوں کے بارے میں تو ممکن ہے کہ یہ کرہ زمین کے مختلف طبقات کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اس وقت یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زمین طرح طرح کے پرتوں اور تہوں سے بنی ہے۔ یا یہ زمین کے سات براعظموں کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ آج کے زمانے میں اور گزشتہ زمانے میں بھی کرہ زمین کو سات منطقوں میں تقسیم کرتے تھے۔ (البتہ گزشتہ اور موجودہ زمانے کے طرز تقسیم میں فرق ہے۔ موجودہ زمانہ میں دو منجمد منطقوں شمالی و جنوبی، دو معتدل منطقوں، دو گرم منطقوں اور ایک استوائی منطقہ میں تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن گزشتہ زمانہ میں سات اقلیمیں (براعظم) دوسری شکل میں تقسیم ہوتی تھیں)
لیکن ممکن ہے کہ یہاں بھی سات کا عدد جو "مثلهن" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے تکثیر کے لیے ہی ہو، اور یہ بھی متعدد زمینوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو عالم ہستی میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ کرہ زمین سے مشابہ وہ کرّے جو اس عظیم عالم میں مختلف آفتابوں کے گرد گردش کر رہے ہیں، ان کی کم از کم تعداد تین سو ملین ہے۔ [۱]
اگرچہ منظومہ شمسی کے علاوہ اجرام کے بارے میں ہم جو معلومات رکھتے ہیں، ان کے ناکافی ہونے کے باعث

---

[۱] "تفسیر مراغی" جلد ۲۸ ص ۱۵۱۔ ایک حدیث جو امیر المومنین حضرت علیؑ سے نقل ہوئی ہے، اس میں بھی آیا ہے: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان کی تعداد متعین کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن بہرحال دوسرے ماہرین فلکیات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ اس کہکشاں میں کہ منظومہ شمسی جس کا ایک جزء ہے، کئی ملین کرے موجود ہیں، جو کرۂ زمین سے مشابہ اور حیات و زندگی کا مرکز ہیں۔

البتہ ممکن ہے کہ آگے چل کر علم و دانش میں انسان کی پیش رفت، اس قسم کی آیات کے بارے میں ہمیں مزید اطلاعات مہیا کر سکے۔

اس کے بعد خدا کے حکم و فرمان کے ذریعے اس عظیم عالم کی تدبیر کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس کا حکم و فرمان ہمیشہ ان کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے": (یتنزل الامر بینھن)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں امر سے مراد وہی خدا کا حکم و امر تکوینی ہے جو وہ اس عالم بزرگ اور ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی تدبیر کے سلسلے میں جاری کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے مخصوص حکم کے ساتھ ایک منظم طریقے سے ہدایت رہبری کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ آیت سورہ سجدہ کی آیت ۵ کے مشابہ ہے جس میں فرماتا ہے: "یدبر الامر من السماء الی الارض: "وہ آسمان سے لے کر زمین تک تدبیر امور کرتا ہے"۔

بہرحال اگر اس کی تدبیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس عالم سے جدا ہو جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے، اور سب کے سب فنا ہو جائیں۔

آخر میں اس عظیم خلقت کے ہدف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "یہ سب کچھ اس بناء پر ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم و آگہی ہر چیز پر محیط ہے"۔ (لتعلموا ان اللّٰہ علیٰ کل شیء قدیر و ان اللّٰہ قد احاط بکل شیء علما)۔

کیسی عمدہ تعبیر ہے کہ وہ اس عظیم خلقت کا ہدف یہ قرار دیتا ہے کہ انسان خدا کے علم اور اس کی قدرت کی صفات سے آگاہ ہو جائے کیونکہ ان دو صفات سے آگاہی انسان کی تربیت کے لیے کافی ہے۔

انسان کو یہ جان لینا چاہیے کہ خدا اس کے وجود کے تمام اسرار پر احاطہ رکھتا ہے اور اس کے تمام اعمال سے باخبر ہے۔ نیز اسے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ معاد و قیامت، جزاء و سزا اور مومنین کی کامیابی کے بارے میں خدا کے وعدوں میں کبھی تخلف کا شائبہ تک نہیں ہے۔

ہاں! وہ خدا جو اس قسم کا علم و قدرت رکھتا اور عالم ہستی کے نظام کا ادارہ کرتا ہے۔ اگر اس نے انسانوں کی زندگی کے بارے میں طلاق اور عورتوں کے حقوق سے مربوط کچھ احکام صادر فرمائے ہیں تو وہ سب کے سب دقیق اور پختہ حساب پر مبنی ہیں۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) لھذہ النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض: "ان ستاروں میں بھی جو آسمان پر ہیں ایسے زمین کے شہروں کی طرح سے شہر ہیں"۔ (تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۵۵)۔

"ہدف آفرینش" کے سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی مختلف آیات میں انسان کی خلقت کے ہدف کی طرف یا اس جہان کی خلقت کے ہدف کی طرف ایسے اشارے ہوتے ہیں جو ابتداء میں مختلف دکھائی دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو وہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں۔

۱ : سورۂ ذاریات کی آیت ۵۶ میں انسان اور جن کی خلقت کا مقصد "عبادت" کو قرار دیا ہے۔ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"

۲ : سورہ ہود کی آیت ۷ میں آسمانوں اور زمین کی عظیم خلقت کا ہدف و مقصد انسان کی آزمائش بتائی گئی ہے۔ "وھو الذی خلق السماوات والارض فی ستة ایام وکان عرشه علی الماء لیبلوکم ایکم احسن عملاً"

۳ : سورہ ہود کی آیت ۱۱۹ میں ہدف و مقصد خدا کی رحمت کو قرار دیا ہے۔ "ولذالك خلقهم"

۴ : آخر میں زیرِ بحث آیت میں خدا کی صفات کے علم و آگہی کو ہدف بتایا ہے۔ (لتعلموا...)

ان آیات میں تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے لیے مقدمہ ہیں۔ آگاہی و معرفت، بندگی و عبادت کے لیے ایک مقدمہ ہے۔ وہ انسان کی آزمائش اور تربیت کے لیے ایک مقدمہ ہے اور وہ خدا کی رحمت سے فیض یاب ہونے کے لیے ایک مقدمہ ہے (غور کیجئے)

* * *

خداوندا! اب جبکہ تو نے ہمیں اپنی عظیم خلقت کے ہدف سے آشنا کر دیا ہے اس عظیم ہدف تک پہنچنے کے سلسلہ میں ہماری مدد فرما!

پروردگارا! تیرا علم و قدرت بے پایاں ہے اور تیری رحمت بھی غیر متناہی ہے، ہمیں اس بے انتہا رحمت کا ایک حصہ عنایت فرما!

بارِ الٰہا! تو نے قرآن و پیغمبر کو ظلمات سے نور کی طرف لانے والے بنا کر بھیجا ہے۔ ہمیں گناہ اور ہوائے نفس کی ظلمت اور تاریکی سے باہر نکال لے اور ہمارے دلوں کو نورِ ایمان و تقویٰ سے منور کر دے!

آمین یا رب العالمین

* * *

سورۂ طلاق کا اختتام : ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۴ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ، مطابق ۲۹ جولائی ۱۹۸۷ء

بروز بدھ صبح ۵ بجکر ۱۴ منٹ، ۱۰۸۱ ای ماڈل ٹاؤن، لاہور

سورۂ تحریم

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

آغاز

آخر رمضان المبارک، ۱۴۰۶ھ

سورۂ تحریم کے مضامین

اس سورہ کے بنیادی طور پر چار حصّے ہیں :

پہلا حصّہ : یہ پہلی آیت سے پانچویں آیت تک ہے جو پیغمبرؐ اور ان کی بعض بیویوں کے ایک واقعہ سے مربوط ہے۔ آنحضرتؐ نے حلال غذاؤں میں سے کسی چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تو مذکورہ آیات نازل ہوئیں اور پیغمبرؐ کی ان بیویوں کو ملامت ہوئی کہ جس کی تفصیل انشاء اللہ شانِ نزول میں بیان ہوگی۔

دوسرا حصّہ : یہ آیت ۶ سے شروع ہو کر آیت ۸ تک جاتا ہے، اور تمام مومنین سے ایک کلی خطاب ہے۔ یہ گھر والوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں نگران رہنے اور گناہوں سے توبہ کے ضروری ہونے کے بارے میں ہے۔

تیسرا حصّہ : یہ صرف ایک ہی آیت ہے جس میں پیغمبرؐ کو کفار و منافقین سے جنگ اور جہاد کرنے کے بارے میں خطاب ہوا ہے۔

چوتھا حصّہ : یہ سورۃ کا آخری حصّہ ہے جو آیت ۱۰ سے آیت ۱۲ تک ہے۔ اس میں خدا نے گزشتہ بحث کو واضح کرنے کے لیے دو صالح اور نیک خواتین (مریمؑ اور آسیہ زوجۂ فرعون) اور دو غیر صالح خواتین (زوجۂ نوحؑ اور زوجۂ لوطؑ) کے حالات کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اس میں درحقیقت تمام مسلمانوں کی بیویوں اور خصوصیت سے پیغمبرؐ کی بیویوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ خود کو پہلے گروہ (مریمؑ و آسیہ زوجہ فرعون) سے ہم آہنگ کریں، دُوسرے گروہ کے ساتھ نہیں۔

٭ ٭ ٭

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں رسولِ خداؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے :

"جو شخص سورہ تحریم کو پڑھے گا۔ اعطاه الله توبة نصوحا، تو خدا اسے خالص توبہ کی توفیق عطا فرمائے گا۔"[1]

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۱

"جو شخص سورہ طلاق و تحریم کو واجب نماز میں پڑھے گا، خدا اُسے قیامت میں خوف و ہراس سے پناہ دے گا، جہنم کی آگ سے رہائی بخشے گا، اور اُسے اس سورہ کی تلاوت اور اس پر مداومت کی بنا، پر جنت میں داخل کرے گا، کیونکہ یہ دونوں سورتیں پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص ہیں۔"[1]

◆ ◆ ◆

[1] ثواب الاعمال مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۶۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(۲) قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○

(۳) وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۖ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ○

(۴) اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ○

(۵) عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

① اے پیغمبرؐ! جو چیز خدا نے تیرے لیے حلال کی ہے اُسے اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے اُوپر حرام کیوں کرتے ہو اور خدا غفور و رحیم ہے۔

② خدا نے (ایسے موقعوں کے لیے) تمھاری قسموں کے کھولنے کی راہ کو واضح کر دیا ہے اور خدا ہی تمھارا مولا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔

③ اور اس وقت کو یاد کرو کہ جب پیغمبرؐ نے اپنا ایک راز اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا، لیکن جب اس نے اس راز کو افشا کر دیا تو خدا نے پیغمبرؐ کو اس سے آگاہ کیا اور پیغمبرؐ نے اس کا ایک حصّہ تو اس سے بیان کیا اور ایک حصّہ بیان نہ کیا۔ جب پیغمبرؐ نے اپنی بیوی کو اس کی خبر دی تو اس نے کہا کہ آپ کو اس بات سے کس نے آگاہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ علیم و خبیر خدا نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا ہے۔

④ اگر تم دونوں اپنے فعل سے توبہ کر لو (تو اس میں تمھارا نفع ہے) کیونکہ تمھارے دل حق سے پھر گئے ہیں، اور اگر تم دونوں اس کے برخلاف ایک دوسری کی مدد کرتی رہو گی (تب بھی تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گی) کیونکہ خدا اس کا مددگار ہے۔ اور اسی طرح جبرئیل اور صالح مومنین اور ان کے علاوہ تمام فرشتے اس کے پشتیبان ہیں۔

⑤ اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو قریب ہے کہ اس کا پروردگار تمھاری جگہ اس کے لیے تم سے اچھی بیویاں قرار دے جو مسلمان، مومن، متواضع، توبہ کرنے والیاں، عبادت گذار اور ہجرت کرنے والیاں ہوں گی اور بیوہ اور باکرہ ہوں گی۔

شانِ نزول

اوپر والی آیات کے شانِ نزول کے بارے میں شیعہ اور اہلِ سُنّت کی تفسیر، حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں۔ اُن میں سے جو زیادہ مشہور اور زیادہ مناسب نظر آتی ہیں وہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

پیغمبرؐ بعض اوقات (اپنی ایک بیوی) زینب بنت جحش کے پاس جاتے تو زینب آپ کو بٹھا لیتیں اور جو شہد اُن کے پاس موجود ہوتا وہ آپ کی خدمت میں پیش کرتیں۔ یہ بات بی بی عائشہ کے کانوں تک پہنچی تو ان پر بہت گراں گذری، وہ کہتی ہیں: میں نے حفصہ (پیغمبرؐ کی دوسری بیوی) کے ساتھ یہ طے کیا کہ جب بھی پیغمبرؐ ہمارے قریب آئیں تو ہم فوراً یہ کہیں: کیا آپ نے "مغافیر" کھائی۔ (مغافیر ایک گوند تھی جو حجاز کے ایک درخت "عرفط" (بروزن ہرمز) سے نکلتی تھی اور اس کی بُو خوشگوار نہیں تھی) پیغمبرؐ اس بات کے پابند تھے کہ آپ کے دہن مبارک یا لباس سے ہرگز کوئی نامناسب بو نہ آئے بلکہ اس کے برعکس آپ پابندی کے ساتھ خوشبو لگاتے اور معطر رہتے تھے۔

اس طرح ایک دن پیغمبرؐ حفصہ کے پاس آئے تو اس نے پیغمبرؐ سے یہی بات کہی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: میں نے مغافیر نہیں کھائی بلکہ زینب بنت جحش کے ہاں سے شہد نوش کیا ہے اور میں قسم کھاتا ہوں کہ اب اس کے بعد وہ شہد نہیں پیوں گا۔ (ممکن ہے کہ شہد کی مکھی کسی نامناسب نبات یا شاید مغافیر پر ہی بیٹھی ہو) لیکن تم یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ (کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات لوگوں کے کانوں تک پہنچے تو وہ کہیں کہ پیغمبرؐ نے ایک حلال غذا کو اپنے اوپر حرام کیوں کر لیا ہے؟ یا وہ اس سلسلے میں یا اس سے مشابہ امور کے بارے میں پیغمبرؐ کے اس عمل کی پیروی کرنے لگیں، یا یہ بات زینب کے کان تک پہنچ جائے تو وہ شکستہ دل ہو)

لیکن انجام کار یہ راز اس نے فاش کر دیا اور بعد میں معلوم ہو گیا کہ اصل میں یہ معاملہ تو ایک سازش تھی اس پر پیغمبرؐ کو بہت رنج ہوا تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس ماجرے کو اس طرح سے ختم کیا گیا کہ پھر پیغمبرؐ کے گھر میں اس قسم کے امور کا تکرار نہ ہوا۔[1]

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ پیغمبرؐ اس ماجرے کے بعد ایک ماہ تک اپنی ازواج سے الگ رہے۔ یہاں تک کہ آنحضرتؐ کی طرف سے ان کو طلاق دینے کے ارادہ کی خبر منتشر ہو گئی۔ اس طرح ازواج سخت پریشان اور وحشت زدہ ہو گئیں اور اپنے فعل پر پشیمان ہوئیں۔

---

[1] اس اصل حدیث کو بخاری نے اپنی صحیح کی جلد ۶ ص ۱۹۶ میں نقل کیا ہے اور جو وضاحتیں ہم نے قوسین میں لکھی ہیں وہ دوسری کتب سے معلوم ہوئی ہیں۔

تفسیر

پیغمبرؐ کی بعض ازواج کی شدید سرزنش

اس میں شک نہیں کہ پیغمبر اسلامؐ جیسے عظیم انسان صرف اپنی ذات سے ہی تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا تعلق پورے اسلامی معاشرے اور عالم انسانیت سے تھا۔ اس بناء پر اگر ان کے گھر کے اندر ان کے خلاف سازشیں ہوں، چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی اور معمولی کیوں نہ ہوں تو آن کے قریب سے آسانی کے ساتھ نہیں گزرجانا چاہیئے۔ یعنی پیغمبرؐ کی حیثیت، مقام اور مرتبہ کو نعوذ باللہ کسی کے بھی ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا چاہیئے۔ اگر اس قسم کا کوئی معاملہ پیش آئے تو قاطعیت کے ساتھ اس کا سامنا کرنا چاہیے۔

اوپر والی آیات حقیقت میں خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے اس قسم کے واقعہ کے مقابلے اور اپنے پیغمبرؐ کی حیثیت و مقام کی حفاظت کے لیے ایک قطعی اور دو ٹوک فیصلہ ہے۔

سب سے پہلے خود پیغمبرؐ کی طرف رُوئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے: "اے پیغمبرؐ! جو چیز خدا نے تیرے لیے حلال کی ہے اُسے اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو"؟ (یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللّٰہ لک تبتغی مرضات ازواجک)۔

معلوم ہے کہ یہ شرعی تحریم نہیں تھی بلکہ جیسا بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے، پیغمبرؐ کی طرف سے قسم کھائی گئی تھی اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض مباح چیزوں کے ترک کرنے کی قسم کھا کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس بناء پر "لم تحرم" (اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو) کا جملہ عتاب اور سرزنش کے عنوان سے نہیں بلکہ ایک قسم کی ہمدردی اور شفقت کا اظہار ہے۔

ٹھیک اس طرح کہ جیسے ایک شخص جو اپنی معاش حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ زحمت اٹھاتا ہے لیکن خود اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں لیتا، ہم اس سے کہتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو اتنی زحمت کیوں دیتے ہو، اور اس زحمت کے ثمرے سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔

بعدہٗ آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا غفور و رحیم ہے۔" (واللّٰہ غفور رحیم)۔

یہ عفو و رحمت کی بات ان بیویوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اس واقعہ کے اسباب مہیا کیے ہیں۔ یعنی اگر واقعی وہ توبہ کرلیں تو وہ اس کی مشمول ہوں گی۔ یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہتر تھا پیغمبر اس کی قسم نہ کھاتے، کیونکہ یہ ایک ایسا کام تھا جو احتمالاً آنحضرتؐ کی بعض بیویوں کی جرأت اور جسارت کا سبب بن جاتا۔

بعد والی آیت میں اضافہ کرتا ہے: "خدا نے (ایسے موقعوں کے لیے) تمہاری قسموں کے کھولنے کی

راہ کو واضح کر دیا ہے۔" (قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم)۔[1]

البتہ اگر قسم کسی ایسے امر کے لیے ہو جس میں کسی کام کا ترک کرنا برتری رکھتا ہو تو پھر قسم پر عمل کرنا چاہیے اس کا توڑنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ ہے۔ لیکن اگر وہ قسم کسی ایسی چیز کے لیے ہو جس کا ترک کرنا مناسب نہ ہو (زیر بحث آیت کی مانند) تو پھر اس صورت میں اس کا توڑنا جائز ہے، لیکن اس قسم کے احترام کی حفاظت کے لیے بہتر ہے کہ کفارہ بھی دیا جائے۔[2]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا تمھارا مولا اور تمھارا محافظ و مددگار ہے اور وہ علیم و حکیم ہے"۔ (واللہ مولاکم وھو العلیم الحکیم)۔

اسی لیے اس نے اس قسم کی قسموں سے نجات کی راہ تمھارے لیے ہموار کر دی ہے اور اپنے علم و حکمت کے مطابق تمھارے لیے مشکل کشائی کی ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد ایک غلام آزاد کیا، اور جو کچھ اپنے اوپر قسم کی وجہ سے حرام کیا ہوا تھا، اُسے حلال کر لیا۔

⬥ ⬥ ⬥

بعد والی آیت میں اس واقعہ کے سلسلے میں مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب پیغمبرؐ نے اپنا ایک راز اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا، لیکن اس نے رازداری نہ کی اور دوسری کو خبر دے دی، خدا نے پیغمبرؐ کو اس افشائے راز سے آگاہ کیا تو پیغمبرؐ نے اس کا ایک حصہ تو اس سے بیان کیا اور ایک حصہ بیان نہ کیا"۔ (واذ اسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثاً فلما نبأت بہ واظھرہ اللہ علیہ عرف بعضہ واعرض عن بعض)۔

یہ راز کیا تھا جو پیغمبرؐ نے اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا تھا اور اس نے رازداری نہ کی: مذکورہ شانِ نزول کے مطابق یہ راز دو مطالب پر مشتمل تھا، ایک اپنی بیوی زینب بنت جحش کے پاس شہد کا پینا اور دوسرا آئندہ کے لیے اس کے پینے کو اپنے اوپر حرام کر لینا۔ اس آیت میں اس بیوی سے مراد بی بی حفصہ تھی جو رازداری نہ کر سکی اور اس نے یہ بات سن کر بی بی عائشہ سے بیان کر دی۔

پیغمبرؐ چونکہ وحی کے ذریعے اس افشائے راز سے آگاہ ہو چکے تھے، لہٰذا آپ نے اس کا ایک حصہ

---

[1] راغب 'مفردات' میں کہتا ہے، "جہاں کہیں 'فرض'، 'علیٰ' کے ساتھ ہو وہاں "وجوب" کے معنی دیتا ہے اور جہاں لام کے ساتھ ہو، وہاں عدم ممنوعیت کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر زیر بحث آیت میں 'فرض' وجوب کے معنی میں نہیں بلکہ اجازت کے معنی میں ہے۔ تحلۃ (باب تفعیل کا مصدر ہے) حلال کرنے کے معنی میں ہے یا دوسرے لفظوں میں ایسا کام جو قسم کی گرہ کو کھول دے یعنی کفارہ۔

[2] جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۳ سورۂ مائدہ کی آیت ۸۹ کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔ قسم کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا دس افراد کو لباس پہنانا یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ جو ان میں سے کوئی کام نہ کر سکتا ہو وہ تین روزے رکھے۔

بی بی حفصہ سے بیان کیا اور اس بناء پر کہ وہ زیادہ شرمندہ نہ ہو دوسرا حصہ بیان نہ کیا۔ (ممکن ہے پہلا حصہ اصل شہد کا پینا ہو، اور دوسرا حصہ اسے اپنے اوپر حرام کرنا ہو۔)

بہرحال جب پیغمبرؐ نے بی بی حفصہ کو اس افشائے راز کی خبر دی تو اس نے کہا: "آپ کو اس بات سے کس نے آگاہ کیا؟" (فلما نبأها به قالت من انبأك هذا)۔

آپ نے فرمایا: "علیم وخبیر خدا نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا ہے۔" (قال نبأني العليم الخبير)۔

اس تمام آیت سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کی بیویوں میں سے بعض نہ صرف انھیں اپنی باتوں سے دکھ پہنچاتی تھیں بلکہ رازداری کا مسئلہ جو ایک باوفا بیوی کی اہم ترین خوبیوں میں سے ہے، وہ بھی ان میں نہیں تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود، ان کے ساتھ پیغمبرؐ کا سلوک ایسا فراخدلانہ تھا کہ آنحضرتؐ اس تمام راز کو جو اس نے فاش کیا تھا اس کے منہ پر کہنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور صرف اس کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی لیے ایک حدیث میں امیرالمومنین علیؑ سے آیا ہے:

ما استقصى كريم قط، لان الله يقول عرف بعضه واعرض عن بعض۔

"شریف اور بڑے آدمی اپنے احقاقِ حق کے لیے آخری مرحلے تک آگے نہیں جاتے کیونکہ خدا اس مقام پر پیغمبرؐ کے متعلق کہتا ہے، انھوں نے ایک حصے کی خبر دی اور ایک حصہ بیان نہ کیا۔"[1]

✦ ✦ ✦

اس کے بعد ان دو بیویوں کی طرف جو اوپر والی سازش میں شریک تھیں، روئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے:

"اگر تم اپنے فعل سے توبہ کرو اور پیغمبرؐ کو دکھ دینے اور آزار پہنچانے سے دستبردار ہو جاؤ تو یہ بات تمھارے فائدہ میں ہے، کیونکہ تمھارے دل اس عمل کی بناء پر حق سے منحرف اور گناہ سے آلودہ ہو چکے ہیں!" (ان تتوبا الى الله فقد صغت قلوبكما)۔

ان دو بیویوں سے مراد بالاتفاق مفسرین شیعہ واہلِ سنت بی بی حفصہ اور بی بی عائشہ ہیں جو بالترتیب عمر بن خطاب اور ابوبکر بن قحافہ کی بیٹیاں تھیں۔

"صغت" "صغو" کے مادہ سے (عفو کے وزن پر) کسی چیز کی طرف متمائل ہونے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں: صغت النجوم "یعنی ستارے مغرب کی طرف متمائل ہوئے۔" اور اسی لیے 'اصغاء' کسی دوسرے کی بات کان دھر کے سننے کے معنی میں آیا ہے۔

زیرِ بحث آیت میں 'صغت قلوبکما' سے مراد ان کے دلوں کا حق سے گناہ کی طرف انحراف تھا۔[2]

---

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۳۴۲

[2] اس تفسیر کے مطابق جو ہم نے اوپر بیان کی اور جسے بحث سے مفسرین نے اختیار کیا ہے، اس آیت میں کچھ محذوف ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اگر تم دونوں نے اس (پیغمبرؐ) کے برخلاف اتفاق کر لیا تو بھی تم کچھ نہ کر سکو گی۔ کیونکہ خدا اس کا مولا و یار و مددگار ہے، اسی طرح جبرئیل، صالح مومنین اور ان کے علاوہ تمام فرشتے اس کے پشتیبان ہیں۔ (و ان تظاهرا علیه فان الله هو مولاه و جبریل و صالح المؤمنین والملائکة بعد ذالك ظهیر)۔

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس ماجرے نے پیغمبرؐ کے پاک دل اور عظیم روح میں کس حد تک منفی اثر چھوڑا تھا، یہاں تک کہ خود خدا کو ان کا دفاع کرنا پڑا۔ نیز باوجود اس کے کہ اس کی قدرت ہر لحاظ سے کافی ہے۔ جبرئیل، صالح المومنین اور دوسرے فرشتوں کی حمایت کا بھی اعلان کر رہا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "صحیح بخاری" میں ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا: میں نے عمر بن خطاب سے پوچھا: پیغمبرؐ کی وہ دو بیویاں کون تھیں جنھوں نے آنحضرتؐ کے خلاف اتفاق کر لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا وہ حفصہ اور عائشہ تھیں۔ اس کے بعد مزید کہا: خدا کی قسم! ہم جاہلیت کے زمانے میں عورتوں کے لیے کسی چیز کے قائل نہیں تھے۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کے بارے میں آیات نازل کر دیں اور ان کے لیے کچھ حقوق مقرر کر دیئے اور وہ جسور ہو گئیں۔[1]

تفسیر "درّ المنثور" میں بھی ابن عباس سے ایک مفصل حدیث میں ہے کہ عمر بن خطاب کہتے ہیں: "اس ماجرے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ پیغمبرؐ نے سب بیویوں سے کنارہ کشی کر لی ہے اور "مشربۂ امّ ابراہیم" نامی مقام پر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "یا رسول اللہ! کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟" آپ نے فرمایا: "نہیں"! میں نے عرض کیا: "اللہ اکبر! ہم جمعیت قریش ہمیشہ اپنی بیویوں پر مسلط رہتے تھے، لیکن جب سے ہم مدینہ میں آئے ہیں تو ہم نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کی عورتیں ان پر مسلط ہیں اور ہماری عورتوں نے بھی ان سے یہ چیز سیکھ لی ہے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میری بیوی مجھ سے جھگڑ رہی ہے تو میں نے اس عمل کو عجیب اور بُرا سمجھا۔ اس نے کہا کہ تجھے تعجب کیوں ہو رہا ہے؟ خدا کی قسم! پیغمبرؐ کی بیویاں بھی ان کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں۔ یہاں تک بعض اوقات ان سے زیادتی کرتی ہیں۔ تب میں نے اپنی بیٹی حفصہ کو نصیحت کی کہ وہ ایسا نہ کرے اور میں نے اس سے کہا کہ اگر تیری ہمسائی (مراد بی بی عائشہ ہے) ایسا کرے، تو بھی تُو ایسا

(بقیہ سابقہ صفحہ) اور تقدیر میں اس طرح تھی: ان تتوبا الی الله کانت خیرا لکما، یا اسی معنی کے مشابہ کوئی اور دوسری تقدیر) لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ شاید آیت میں کوئی محذوف نہ ہو اور صفت قلوبکما کا جملہ شرط کی جزاء ہو (اس قید کے ساتھ کہ جملہ کا مفہوم حق کی طرف تمایل ہو نہ کہ باطل کی طرف) لیکن یہ احتمال بہت ہی بعید ہے کیونکہ شرط تو فعل مضارع کی صورت میں ہے اور اکثر نحویوں کے نظریہ کے مطابق یہ صحیح نہیں ہے جیسا قلوبکما کا ذکر جمع کے صیغہ کے ساتھ نہ کہ تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ اس بناء پر ہوا ہے کہ دو تثنیوں کا ایک ساتھ ہونا فصاحت کے لحاظ سے ثقیل اور ناپسندیدہ ہے۔ اس لیے جمع کی صورت میں ذکر ہوا اور اس کا معنی تثنیہ ہے۔

[1] صحیح بخاری جلد ۶ ص ۱۹۵ (سورہ تحریم کے ذیل میں)

ذکر نا، کیونکہ اس کے حالات تم سے مختلف ہیں۔[1]

صالح المومنین" کے بارے میں بھی ایک بحث ہے جو انشاء اللہ نکات کے بیان میں آئے گی۔

* * *

آخری زیر بحث آیت میں خدا تمام ازواج پیغمبر کی طرف رُوئے سخن کرتے ہوئے شدید آمیز لب ولہجہ میں فرماتا ہے: "اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو اُمید ہے کہ پروردگار تمھاری جگہ اس کے لیے تم سے اچھی بیویاں قرار دے۔ ایسی بیویاں جو مسلمان، مومن، متواضع، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، خدا کی اطاعت شعار، غیر باکرہ اور باکرہ عورتیں ہوں گی"۔ (عسیٰ ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجا خیرا منکن مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عابدات سائحات ثیبات وابکارا)۔

اس طرح انھیں خبردار کرتا ہے کہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ پیغمبر تمھیں ہرگز طلاق نہیں دے گا، اور یہ بھی تصور نہ کرنا کہ اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو تمھاری جگہ آنے والی بیویاں تم سے بہتر نہیں ہوں گی۔ لہٰذا تم سازشں جھگڑے اور آزار و اذیت سے باز آجاؤ ورنہ پیغمبر کی زوجیت کے اعزاز و افتخار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گی اور تم سے بہتر اور بافضیلت عورتیں تمھاری جگہ لے لیں گی۔

* * *

چند نکات

۱۔ اچھی بیوی کے اوصاف

یہاں قرآن نے ایک اچھی بیوی کے لیے چھ صفات بیان کی ہیں تاکہ وہ سب مسلمانوں کے لیے بیوی کا انتخاب کرتے وقت نمونہ بن سکیں۔

پہلی صفت "اسلام" ہے اور اس کے بعد "ایمان" ہے۔ یعنی ایسا اعتقاد جو انسان کے دل کی گہرائیوں میں نفوذ کر جائے۔ اس کے بعد "قنوت" یعنی تواضع، انکساری اور شوہر کی اطاعت ہے۔ اس کے بعد "توبہ" یعنی اگر اس سے کوئی غلط کام سرزد ہو جائے تو وہ عذر خواہی کرے اور اپنی غلطی پر اصرار نہ کرے۔ اس کے بعد خدا کی عبادت اور ایسی "عبادت" جو اس کی روح و جان کو سنوار دے۔ اور اسے پاک و پاکیزہ بنا دے۔ اس کے بعد فرمانِ خدا کی اطاعت اور ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کا ذکر ہوا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بہت سے مفسرین نے "سائحات" جمع "سائح" کی تفسیر صائم (روزہ دار) کے معنی میں کی ہے۔ لیکن جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا، روزہ دو قسم کا ہوتا ہے "حقیقی روزہ" جو کھانے پینے

---

[1] در المنثور جلد ۶ ص ۲۴۳ (تلخیص کے ساتھ)۔

اور تعلق جنسی کو ترک کرنے کے معنی میں ہے۔ دوسرا حکمی روزہ جس کا معنی بدن کے اعضاء و جوارح کو گناہوں سے بچانا ہے یہاں اس کا دوسرا معنی مراد ہے۔

(راغب کا یہ قول مقام کی مناسبت کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت ہی عمدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جاننا چاہیے کہ مفسرین نے سائح کی تفسیر اس شخص کے لیے بھی کی ہے جو خدا کی اطاعت کی راہ میں سیر کرتا ہے) [1]

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے عورت کے باکرہ اور غیر باکرہ ہونے پر تکیہ نہیں کیا اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ کیونکہ مذکورہ معنوی اوصاف کے مقابلہ میں اس مسئلہ کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

* * *

۲: صالح المؤمنین سے کون مراد ہے؟

اس میں شک نہیں کہ صالح المومنین ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو تمام صالح باتقویٰ اور کامل الایمان مومنین کو شامل ہے۔ اگرچہ صالح یہاں مفرد ہے جمع نہیں ہے، لیکن چونکہ جنس کا معنی رکھتا ہے۔ اس لیے اس سے عمومیت کے معنی کا استفادہ ہوتا ہے [2]

لیکن اس بارے میں کہ یہاں اس کا اتم و اکمل مصداق کون ہے؟ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد امیر المومنین علیؑ ہیں۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے:

لقد عرف رسول اللہ (ص) علیًا (ع) اصحابہ مرتین: اما مرۃ فحیث قال: "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" و اما الثانیۃ فحیث نزلت ھذہ الآیۃ: "فان اللہ ھو مولاہ و جبریل و صالح المؤمنین ....." اخذ رسول اللہ (ص) بید علی (ع) فقال: ایھا الناس ھذا صالح المؤمنین!

---

[1] "سائح" سیاحت کے مادہ سے اصل میں ان جہانگرد سیاحوں کو کہتے ہیں جو بغیر توشہ و زادِ راہ کے چل پڑتے اور لوگوں کی مدد سے زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ روزہ دار اپنے آپ کو کھانے سے روکتا ہے یہاں تک کہ افطار کا وقت آ جائے، اس لحاظ سے یہ بات سیاحت کرنے والوں کے مشابہ، لہٰذا اس لفظ کا اطلاق صائم یعنی روزہ دار پر ہوا ہے۔

[2] بعض نے صالح کو یہاں جمع سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ صالحوا کی واؤ اضافت کے وقت حذف ہو جاتی ہے، لہٰذا قرآن کے رسم الخط میں بھی نہیں آئی لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

"حضرت رسولؐ نے امام علیؑ کا اپنے اصحاب سے دو مرتبہ (صراحت کے ساتھ) تعارف کرایا۔ ایک مرتبہ تو اس وقت جبکہ آپ نے (غدیر خم میں) فرمایا :
من کنت مولاہ فعلی مولاہ : "جس جس کا میں مولا ہوں اُس اُس کا علیؑ مولا ہے"،
دوسری مرتبہ اس وقت جبکہ آیت ان اللہ ھو مولاہ .... نازل ہوئی، تب حضرت رسولؐ نے امام علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اے لوگو! یہ صالح المومنین ہے۔[1]

اس معنی کو بہت سے علماء اہل سنت نے بھی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ ان میں علامہ ثعلبی علامہ گنجی، ابوحیان اندلسی اور سبط ابن جوزی وغیرہ شامل ہیں۔[2]

بہت سے مفسرین اور منجملہ ان کے 'سیوطی' نے 'دُرالمنثور' میں 'قرطبی' نے اپنی مشہور تفسیر میں اور اسی طرح 'آلوسی' نے 'رُوح المعانی' میں اسی آیت کی تفسیر میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

'رُوح البیان' کا مولف اس روایت کو 'مجاہد' سے نقل کرنے کے بعد کہتا ہے: "اس حدیث کی تائید مشہور حدیث 'منزلت' سے ہوتی ہے کہ جس میں پیغمبرؐ نے امام علیؑ سے فرمایا: 'انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی'؛ کیونکہ قرآن میں صالحین کا عنوان انبیاء کے لیے آیا ہے۔ منجملہ ان کے سورۂ انبیاء کی آیت ۷۲ میں وکلا جعلنا صالحین اور سورہ یوسفؑ کی آیت ۱۰۱ میں الحقنی بالصالحین ہے۔ (پہلی آیت میں 'صالح' کا عنوان انبیاء کی ایک جماعت کے لیے اور دوسری میں حضرت یوسفؑ کے لیے آیا ہے۔ اور جب علیؑ بمنزلۂ ہارونؑ ہوں تو آپ بھی صالح کا مصداق ہوں گے۔ (غور کیجیے)

خلاصہ یہ کہ اس سلسلے میں بہت زیادہ احادیث ہیں، جیسے مفسر معروف محدث 'بحرانی' 'تفسیر برہان' میں اس سلسلہ کی ایک روایت ذکر کرنے کے بعد محمد بن عباس[3] سے نقل کرتا ہے کہ اس نے اس بارے میں ۵۲ احادیث شیعہ اور اہل سنت کے طرق سے جمع کی ہیں۔ اس کے بعد وہ خود ان میں سے چند ایک احادیث نقل کرتا ہے۔[4]

۳: پیغمبرؐ کی اپنی بعض بیویوں سے ناراضی

طول تاریخ میں ایسے بہت سے بزرگ گزرے ہیں جن کی بیویاں ان کے شایان شان نہیں تھیں اور ان میں ضروری اوصاف نہ ہونے کی وجہ سے انہیں تکلیف اُٹھانا پڑتی تھی۔ ان میں سے کچھ نمونے بزرگ انبیاء کے بارے میں قرآن مجید میں بیان ہوتے ہیں:۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۹

[2] مزید وضاحت کے لیے "احقاق الحق" جلد ۳ ص ۳۱۱ کی طرف رجوع کریں۔

[3] جیسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمد بن عباس وہی ابوعبداللہ ہے جو ابن الجوام کے نام سے مشہور ہے اور کتاب ما نزل من القرآن من اھل بیتؑ کا مولف ہے۔ اس کتاب کے متعلق علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس کی مثل کوئی کتاب ابھی تک تالیف نہیں ہوئی۔ (جامع الرواۃ جلد ۲ ص ۱۳۳)

[4] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۵۳ حدیث ۲ کے ذیل میں۔

اوپر والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ پیغمبرِ اسلام کی حالت بھی اپنی بعض بیویوں کی طرف سے ایسی ہی تھی۔ ان رقابتوں کی وجہ سے جو وہ ایک دوسری سے رکھتی تھیں، بعض اوقات وہ آنحضرتؐ کی روح پاک کو مجروح کرتی تھیں، کبھی وہ آپ پر اعتراض کرتی تھیں یا آپ کے راز کو فاش کر دیا کرتی تھیں، یہاں تک کہ خدا نے انھیں سرزنش کی اور اپنے پیغمبر کا دفاع کرتے ہوئے اس سلسلے میں تاکیدی فرمان دیا اور انھیں طلاق تک کی تہدید بھی کی۔ جیسا کہ ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ اوپر والی آیات میں مذکورہ واقعہ کے بعد آپ تقریباً ایک ماہ تک اپنی بیویوں سے ناراض رہے کہ شاید وہ اپنی اصلاح کر لیں۔

اصولی طور پر آنحضرتؐ کی تاریخ زندگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پیغمبر کی بعض بیویاں نہ صرف مقام نبوت کی ضروری اور لازمی معرفت نہیں رکھتی تھیں، بلکہ بعض اوقات آپ پر ایک عام آدمی کی طرح اعتراض کیا کرتی تھیں، یہاں تک کہ خدانخواستہ آپ کی توہین بھی کرتی تھیں۔ اس بناء پر اوپر والی آیات کی صراحت کو دیکھتے ہوئے بھی یہ اصرار کرنا کہ سب کی سب شائستہ اور کامل تھیں، بے دلیل نظر آتا ہے۔

تاریخ اسلام نے پیغمبر کے بعد ان کی بیویوں کے بارے میں خصوصاً داستانِ جنگ جمل نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ یہ بات نہ صرف آنحضرتؐ کے زمانے میں تھی بلکہ آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کے بارے میں بھی دہرائی گئی ہے۔ لیکن یہاں ان تمام مسائل کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اصولی طور پر اوپر والی آیات کی تعبیر جو یہ کہتی ہے: "اگر پیغمبر تمھیں طلاق دے دے تو خدا اُسے تم سے بہتر بیویاں دے گا جو آیات میں مذکورہ چھ صفات کی حامل ہوں گی" اس واقعیت وحقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ کم از کم آنحضرتؐ کی بعض بیویاں ان اوصاف کی حامل نہیں تھیں۔

پیغمبر کی بیویوں کے بارے میں سورۂ احزاب کی آیات کی طرف رجوع کرنے سے بھی اوپر والے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

۴: افشائے راز

رازداری نہ صرف حقیقی مومنین کی صفات میں سے ہے بلکہ ہر بار ہر باحیثیت انسان کو راز دار ہونا چاہیے، پھر یہ بات قریبی دوستوں اور زوجہ وشوہر میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اوپر والی آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ پیغمبر کی بعض بیویوں کو رازداری ترک کرنے کی بناء پر خدا نے کیسی شدت کے ساتھ ملامت اور سرزنش کی ہے۔

امام علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

جمع خير الدنيا والأخرة في كتمان السر ومصادقة الاخيار، وجمع الشر في الاذاعة ومواخاة الاشرار؛

"دنیا اور آخرت کی تمام خیر و خوبی ان دو چیزوں میں چھپی ہوئی ہے : راز کو پوشیدہ رکھنا اور نیک افراد سے دوستی ۔ اور تمام شر ان دو چیزوں میں چھپا ہوا ہے : رازوں کا افشاء کرنا اور اشرار سے دوستی رکھنا۔

* * *

۵ : حلال خدا کو اپنے اوپر حرام نہیں کرنا چاہیے

وہ امور، جو خدا کی طرف سے حلال یا حرام کر دیئے گئے ہیں وہ سب دقیق مصلحتوں کی بناء پر ہوئے ہیں۔ اسی بناء پر اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ انسان کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام یا کسی حرام چیز کو اپنے اوپر حلال کرے، یہاں تک کہ اگر اس سلسلے میں قسم بھی کھالے جیسا کہ اوپر والی آیات میں آیا ہے تو اس قسم کو توڑ سکتا ہے۔

ہاں ! اگر کوئی ایسا مباح فعل جس کے ترک کی قسم کھائی ہے، کوئی مکروہ فعل ہو یا کسی جہت سے اس کا ترک کرنا اولیٰ اور بہتر ہو تو اس صورت میں اُسے قسم کی پابندی کرنا چاہیے۔

(۶) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ وَ اَهۡلِیۡکُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ عَلَیۡهَا مَلٰٓئِکَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ وَیَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ○

(۷) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَا تَعۡتَذِرُوا الۡیَوۡمَ ؕ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ○

(۸) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا ؕ عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّکَفِّرَ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ وَ یُدۡخِلَکُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۙ یَوۡمَ لَا یُخۡزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ۚ نُوۡرُهُمۡ یَسۡعٰی بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَ بِاَیۡمَانِهِمۡ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ○

ترجمہ

(۶) اے ایمان لانے والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ وہ آگ جس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بہت ہی سخت گیر اور تندوتیز ہیں۔ وہ کبھی بھی خدا کی مخالفت نہیں کرتے اور اس کے احکام و فرامین کی پوری پوری تعمیل کرتے

۷۔ اے کافرو! آج عذر خواہی نہ کرو، کیونکہ تمھیں تو صرف تمھارے اعمال کا ہی بدلہ دیا جائے گا۔

۸۔ اے ایمان لانے والو! توبہ کرو۔ اللہ کے حضور خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمھارا پروردگار اس کی وجہ سے تمھارے گناہ بخش دے گا، اور تمھیں جنت کے ان باغات میں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں داخل کرے گا۔ خدا اس دن پیغمبرؐ کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو ذلیل وخوار نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب چل رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے: پروردگارا! ہمارے نور کو کامل کر دے اور ہمیں بخش دے۔ بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر

اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

خدا پیغمبرؐ کی بعض بیویوں کو خبردار کرنے اور انھیں سرزنش کرنے کے بعد زیر بحث آیات میں رُوئے سخن تمام مومنین کی طرف کرتے ہوئے بیوی، اولاد اور گھر والوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ احکام دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ کہ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں" (یاایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ)۔

خود کو بچانا تو گناہوں کو ترک کرنے اور سرکش خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کے ساتھ ہے، اور گھر والوں کو بچانا تعلیم و تربیت، امر بالمعروف ونہی از منکر کرنا نیز گھر اور گھرانے کی فضا میں ایک پاک اور ہر قسم کی آلودگی سے مبرّا ماحول فراہم کرنا ہے۔

یہ وہ طریقۂ کار ہے جو گھرانے کے سنگِ بنیاد، یعنی ازدواج کے مقدمات سے اور اس کے بعد بچے کی پیدائش کے پہلے لمحہ سے شروع ہونا چاہیے۔ ان تمام مراحل میں صحیح لائحہ عمل ترتیب دے کر پورے انہماک سے اس پر عمل کرنا چاہیے۔

دوسرے لفظوں میں بیوی اور اولاد کا حق صرف ان کی ضروریاتِ زندگی، مکان اور کھانے پینے کی چیزوں کے فراہم کرنے سے پورا نہیں ہو جاتا۔ ان سے زیادہ اہم ان کی روح اور جان کی غذا کا مہیا کرنا اور صحیح اصولِ تعلیم و تربیت کو

عمل میں لاتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "قوا" (بچاؤ) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم انھیں خود ان کی اپنی حالت پر چھوڑ دو گے تو وہ خواہ مخواہ جہنّم کی آگ کی طرف بڑھیں گے۔ صرف تمہیں ان کو جہنّم کی آگ میں گرنے سے بچا سکتے ہو۔

"وقود" (بروزن کبود) جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، "آتشگیر یعنی ایسے مادہ کے معنی میں ہے جو آگ پکڑنے کے قابل ہو۔ مثلاً ایندھن، (آگ لگانے والے مثلاً دیا سلائی کے معنی میں نہیں ہے) کیونکہ عرب اُسے "زناد" (چقماق) کہتے ہیں۔

اس لحاظ سے جہنّم کی آگ دنیاوی آگ کی مانند نہیں ہے۔ اس کے شعلے خود انسان کے وجود کے اندر سے ہی بلند ہوتے ہیں۔ (اور پتھروں کے اندر سے بھی) نہ صرف گندھک کے پتھر سے جس کی طرف بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے بلکہ ہر قسم کے پتھر سے، کیونکہ آیت کا لفظ مطلق ہے۔ موجودہ زمانے میں ہم جانتے ہیں کہ پتھر کا ہر ٹکڑا ایٹم کے اربوں کھربوں ذرات سے مرکب ہے اور اگر ان کے اندر موجود ذخیرہ آزاد ہو جائے تو ایسی آگ پیدا کر دے کہ انسان دنگ رہ جائے۔

بعض مفسرین نے یہاں 'حجارۃ' کی تفسیر بتوں کے ساتھ کی ہے جو پتھر سے بنائے جاتے تھے اور مشرکین انھیں پوجا کرتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس آگ پر ایسے فرشتے مقرر کیے گئے ہیں جو بہت ہی سخت اور تند و تیز ہیں، وہ ہرگز خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ وہ انھیں جو بھی حکم دیتا ہے اس کی بے چون و چرا تعمیل کرتے ہیں" (علیھا ملائکۃ غلاظ شداد لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون)۔

اس طرح نہ تو بھاگنے کی ہی کوئی راہ ہے اور نہ ہی گریہ و زاری، التماس و التجا اور جزع و فزع ہی مؤثر ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ہر مامور جس بھی کام پر مقرر ہوتا ہے وہ اس لحاظ سے مناسب جذبات رکھتا ہے۔ لہٰذا عذاب پر مامور افراد کو طبعی طور پر سخت اور تند و تیز ہونا چاہیے۔ کیونکہ جہنّم رحمت کا مرکز نہیں ہے بلکہ خدا کے غیظ و غضب کا مرکز ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مامورین ہرگز عدالت کی سرحد سے خارج نہیں ہوں گے اور حکم خدا کو بے کم و کاست جاری کریں گے۔

یہاں مفسرین کی ایک جماعت نے ایک سوال پیش کیا ہے کہ اوپر والی آیت میں عدم عصیان کی تعبیر قیامت میں عدم وجود تکلیف کے مسئلہ کے ساتھ کس طرح سازگار ہے؟

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ فرشتوں کی اطاعت اور ترکِ عصیان ایک قسم کی تکوینی اطاعت ہے نہ کہ تشریعی اور اطاعتِ تکوینی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ دُوسرے لفظوں میں وہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ خدائی فرامین کا انتہائی میل و رغبت اور خاص لگاؤ کے ساتھ عین اختیار کے ساتھ اجرا کرتے ہیں۔

بعد والی آیت میں کفار کو مخاطب کرکے اس دن کی وضع وکیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے کافرو آج عذر و معذرت نہ کرو، کیونکہ تمہیں تو صرف تمہارے اعمال ہی کی جزا دی جائے گی"۔ (یاایھا الذین کفروا لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون)۔

اس آیت کا گزشتہ آیت کے بعد قرار پانا کہ جس میں مخاطب مومنین تھے اس واقعیت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم اپنی بیوی اولاد اور گھر والوں کی حالت کا خیال نہ رکھو گے تو ممکن ہے تمہارا معاملہ اس حد تک پہنچ جائے کہ قیامت کے دن اس خطاب سے مخاطب کیے جاؤ۔

انما تجزون ما کنتم تعملون کی تعبیر دوبارہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ قیامت میں گنہگاروں کی جزا خود انہیں کے اعمال ہیں جو ان کے سامنے ظاہر ہوں گے اور ان کے ساتھ ہوں گے۔ گزشتہ آیت کی تعبیر کہ جہنم کی آگ خود انسانوں کے اندر سے شعلہ زن ہوگی وہ اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ وہاں عذر و معذرت کا قبول نہ ہونا اس بناء پر ہے کہ عذر خواہی ایک قسم کی توبہ ہے اور توبہ صرف اس جہان میں ہی امکان پذیر ہے، نہ کہ دوسرے جہان میں اور نہ ہی جہنم میں ورود کے بعد توبہ کی کوئی گنجائش ہے۔

* * *

بعد والی آیت حقیقت میں جہنم کی آگ سے نجات کا راستہ بتاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے: "اے ایمان والو! اللہ کی طرف لوٹ آؤ اور توبہ کرلو، خالص توبہ" (یاایھا الذین اٰمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا)۔

ہاں! نجات کے لیے پہلا قدم گناہ سے توبہ ہے، ایسی توبہ جو ہر لحاظ سے خالص ہو، ایسی توبہ جس کا محرک حکم خدا اور خوفِ گناہ ہو، نہ کہ گناہ کے اجتماعی اور دنیاوی آثار سے وحشت! ایسی توبہ جو انسان کو ہمیشہ کے لیے معصیت اور نافرمانی سے دور کردے اور پھر اس میں گناہ کی طرف بازگشت رونما نہ ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ توبہ کی حقیقت، وہی گناہ سے ندامت و پشیمانی ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ آئندہ کے لیے گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام تھا جس کی تلافی ہوسکتی ہے تو اس کی تلافی کی کوشش کرے۔ استغفار کرنا بھی اسی معنی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس طرح سے توبہ کے ارکان کا پانچ باتوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

۱: ترکِ گناہ

۲: ندامت

۳: آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ

۴: گزشتہ گناہوں کی تلافی

۵: استغفار

"نصوح" "نصح" (بروزن صلح) کے مادہ سے اصل میں خالص خیرخواہی کے معنی میں ہے۔ اسی لیے خالص شہد کو "ناصح" کہا جاتا ہے۔ چونکہ حقیقی و واقعی خیرخواہی کو مضبوطی کے ساتھ توأم ہونا چاہیئے۔ لہذا "نصح" کا لفظ بعض اوقات اس معنی کے لیے بھی آتا ہے۔

اسی بناء پر محکم عمارت کو "نصاح" (بروزن کتاب) اور درزی کو "ناصح" کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ دونوں معنی یعنی خالص ہونا اور محکم ہونا "توبۂ نصوح" میں جمع ہونے چاہئیں۔[1]

اس بارے میں کہ توبۂ نصوح کیا ہوتی ہے، مفسرین نے بہت زیادہ تفاسیر بیان کی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض نے ان تفاسیر کی تعداد ۲۳ بتائی ہے۔[2] لیکن وہ سب تفاسیر ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتی ہیں یا وہ توبہ کی مختلف قسمیں اور مختلف اوصاف وصفات ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ "توبۂ نصوح" وہ ہوتی ہے جس میں چار اوصاف و شرائط ہوں۔

۱: قلبی پشیمانی

۲: زبانی استغفار

۳: ترکِ گناہ

۴: آئندہ کے لیے ترکِ گناہ کا پختہ ارادہ

بعض نے کہا ہے کہ توبۂ نصوح وہ ہوتی ہے جس میں تین اوصاف و شرائط ہوں:

۱: اس بات کا خوف کہ شاید قبول نہ ہو

۲: اس بات کی امید کہ قبول ہو جائے گی۔

۳: خدا کی اطاعت پر قائم رہنا۔

یا توبۂ نصوح یہ ہے کہ اپنے گناہ کو ہمیشہ اپنی نظر کے سامنے رکھے اور اس سے شرمندہ ہوتا رہے۔

یا توبۂ نصوح یہ ہے کہ جو چیزیں ظلم کے ساتھ لی ہیں وہ ان کے مالکوں کو واپس کر دے، مظلوموں سے حلیت طلب کرے اور خدا کی اطاعت کا پابند رہے۔

یا توبۂ نصوح وہ ہوتی ہے جس میں یہ تین شرطیں ہوں:

۱: کم بولنا۔ ۲: کم کھانا۔ ۳: کم سونا۔

یا توبۂ نصوح وہ ہوتی ہے جو رونے والی آنکھ اور گناہ سے بیزار دل سے توأم ہو .... اور دیگر اسی قسم کے

---

[1] بعض کا خیال یہ ہے کہ "نصوح" ایک خاص شخص کا نام ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے ایک مفصل داستان توبۂ نصوح کے عنوان سے نقل کی ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے کہ نصوح کسی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک وصفی معنی ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ یہ مشہور واقعہ صحیح ہو۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۶۷۶

امور جو سب ایک ہی واقعیت کے شاخ و برگ ہیں اور یہ خالص و کامل توبہ ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے کہ جب "معاذ بن جبل" نے توبہ نصوح کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"ان یتوب التائب ثم لا یرجع فی ذنب کما لا یعود اللبن الی الضرع"۔

"توبہ نصوح" یہ ہے کہ توبہ کرنے والا شخص پھر کبھی طرح بھی گناہ کی طرف نہ لوٹے، جیسا کہ دودھ کبھی پستان کی طرف نہیں لوٹتا۔[1]

یہ لطیف تعبیر اس واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ توبۂ نصوح انسان میں اس طرح سے انقلاب برپا کر دیتی ہے کہ اس پر پہلی حالت کی طرف بازگشت کی راہ کلی طور پر بند کر دیتی ہے، جیسا کہ دودھ کی پستان کی طرف بازگشت قطعی طور پر ناممکن ہوتی ہے۔

یہ مطلب جو دوسری روایات میں بھی آیا ہے، حقیقت میں توبۂ نصوح کے اعلیٰ ترین درجہ کو بیان کرتا ہے، ورنہ نچلے مراحل میں تو یہ ممکن ہے کہ گناہ کی طرف بازگشت ہو جائے اور توبہ کی تکرار کے بعد انجام کار دائمی ترک پر جا منتہی ہو۔

اس کے بعد توبۂ نصوح کے آثار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "امید ہے کہ اس کام کی وجہ سے تمہارا پروردگار تمہارے گناہوں کو بخش دے اور ان کی پردہ پوشی کرے"۔ (عسیٰ ربکم ان یکفر عنکم سیاٰتکم)۔

"اور تمہیں اس جنت کے باغات میں داخل کرے جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں"۔ (و یدخلکم جنّات تجری من تحتها الانهار)۔

"یہ کام اس دن ہوگا جس دن خدا پیغمبرؐ اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں ذلیل و خوار نہیں کرے گا"۔ (یوم لا یخزی الله النبی والذین اٰمنوا معه)۔

"یہ اس حال میں ہوگا کہ ان کا (ایمان اور عمل صالح کا) نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب چل رہا ہوگا، وہ عرصۂ محشر کو روشن کر دے گا اور بہشت کی طرف ان کی راہ کھول دے گا"۔ (نورهم یسعٰی بین ایدیهم وبایمانهم)۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں وہ خدا کی بارگاہ کی طرف رُخ کر کے کہیں گے: "پروردگارا! ہمارے نور کو مکمل کر دے اور ہمیں بخش دے کیونکہ تو ہر کام پر قدرت رکھتا ہے"۔ (یقولون ربنا اتمم لنا نورنا واغفرلنا انک علیٰ کل شیءٍ قدیر)۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۸

حقیقت میں اس توبۂ نصوح کے پانچ عظیم ثمر ہیں :

پہلا : سیئات اور گناہوں کی بخشش۔

دوسرا : خدا کی نعمتوں والی جنت میں داخلہ۔

تیسرا : اس دن رُسوائی اور ذلت کا نہ ہونا جس دن سب پردے ہٹ جائیں گے اور جھوٹے تباہ و رُسوا اور ذلیل ہو جائیں گے۔ ہاں ! اس دن پیغمبرؐ اور مومنین آبرومند ہوں گے۔ کیونکہ جو کچھ انھوں نے کہا تھا، وہ حقیقت بن جائے گا۔

چوتھا : اُن کے ایمان اور عمل کا نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب چلے گا اور جنت کی طرف ان کی راہ کو روشن کر دے گا۔ (بعض مفسرین نے اس نور کو جو ان کے آگے آگے چلے گا "عمل" کا نور سمجھا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک دوسری تفسیر بھی تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ میں سورہ حدید کی آیت ۱۲ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔)

پانچواں : ان کی توجہ خدا کی طرف زیادہ ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ بارگاہِ خدا کی طرف رُخ کر کے اس سے نور کی تکمیل اور اپنے گناہوں کی مکمل بخشش کا تقاضا کریں گے۔

چند نکات

۱: اہل خانہ کی تعلیم و تربیت

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم ایک عام حکم ہے جو تمام مسلمان ایک دوسرے کے لیے رکھتے ہیں لیکن اوپر والی آیات اور ان روایات سے جو اسلامی مصادر میں اولاد وغیرہ کے حقوق کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان اپنی بیوی اور اولاد کے لیے بہت ہی بھاری ذمہ داری رکھتا ہے۔ اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ جہاں تک اس سے ہو سکے ان کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرے، انھیں گناہ سے باز رکھے اور نیکیوں کی طرف دعوت دے، نہ یہ کہ صرف ان کے جسم کے لیے غذا وغیرہ مہیا کرنے پر قناعت کرے۔

حقیقت میں ایک عظیم مُعاشرہ چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے مل کر بنتا ہے، جس کا نام خاندان (گھرانا) ہے۔ جب ان چھوٹی چھوٹی اکائیوں کی اصلاح ہو جائے، جن کی دیکھ بھال آسان ہے، تو پھر سارے معاشرے کی اصلاح ہو جاتی ہے اور یہ ذمہ داری پہلے درجہ میں ماں باپ کے کاندھوں پر ہے۔

خصوصاً ہمارے زمانہ میں جب کہ فساد کی تباہ کرنے والی موجیں گھروں کے باہر بہت ہی قوی اور خطرناک

ہیں۔ انھیں جیسے اثر کرنے کے لیے گھرانے کی تعلیم و تربیت کا زیادہ بنیادی اور زیادہ دقیق لائحہ عمل مرتب کیا جانا چاہیے۔

نہ صرف قیامت کی آگ بلکہ دنیا کی آگ کا سرچشمہ بھی انسانوں کے وجود کے اندر سے پیدا ہوتا ہے پس ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھرانے کو اس آگ سے محفوظ رکھے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحاب پیغمبرؐ میں سے ایک نے آپ سے سوال کیا: "ہم اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے کس طرح محفوظ رکھیں"؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

تأمرهم بما أمر الله، وتنهاهم عما نهاهم الله ان اطاعوك كنت قد وقيتهم، وان عصوك كنت قد قضيت ما عليك

"انھیں امر بالمعروف اور نہی از منکر کر، اگر تجھ سے انہوں نے قبول کر لیا تو پھر تو نے انھیں جہنم کی آگ سے بچا لیا، اگر انھوں نے قبول نہ کیا تو تو نے اپنا وظیفہ اور ذمہ داری پوری کر دی"۔[1]

ایک اور جامع اور عمدہ حدیث میں رسول خداؐ سے آیا ہے:

"الا كلكم راع، وكلكم مسئول عن رعيته، فالامير على الناس راع، وهو مسئول عن رعيته، والرجل راع على اهل بيته وهو مسئول عنهم فالمرأة راعية على اهل بيت بعلها وولده وهي مسئولة عنهم، الا فكلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته"

"یاد رکھو کہ تم سب کے سب نگہبان ہو، اور تم سب ہی جوابدہ ہو ان لوگوں کے لیے جن کی نگہبانی پر تم مامور ہو۔ حکومت اسلامی کا رئیس و امیر تمام لوگوں کا نگہبان ہے، لہٰذا وہ ان سب کے لیے جوابدہ ہے اور عورت بھی اپنے شوہر کے گھرانے اور اولاد کی نگہبان ہے اور ان کے بارے میں جوابدہ ہے۔ جان لو کہ تم سب ہی نگہبان ہو، اور تم سب ہی جوابدہ ہو، ان لوگوں کے لیے جن کی نگہبانی پر تم مامور ہو۔"[2]

ہم اس وسیع بحث کو امیر المومنین علیؑ کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، امامؑ نے اوپر والی آیت

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۷۲

[2] "مجموعہ ورام" جلد اول ص ۶

کی تفسیر میں فرمایا:

"علموا انفسکم واھلیکم الخیر وادبوھم"

اس سے مراد یہ ہے کہ تم خود کو اور اپنے گھر والوں کو نیکی کی تعلیم دو، اور انھیں آداب سکھاؤ۔[1]

* * *

۲: توبہ رحمتِ خدا کا ایک دروازہ ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان سے خصوصاً تربیت اور سیر وسلوک الی اللہ کی ابتداء میں بہت سی لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ اب اگر اس کے سامنے توبہ اور بازگشت کے دروازے بند کر دیئے جائیں تو وہ مایوس ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لیے سیدھے راستے سے بھٹک جائے گا۔ اس لیے اسلام کے مکتب تربیتی میں توبہ کو ایک تربیتی اصل کے عنوان کے طور پر حد سے زیادہ اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور وہ تمام گنہگاروں کو دعوت دیتا ہے کہ اپنی اصلاح اور گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کے لیے اس دروازے سے وارد ہوں۔

امام علیؑ بن الحسینؑ بارگاہِ خداوندی میں تائبین کی مناجات میں اس طرح سے عرض کرتے ہیں:

"الٰھی انت الذی فتحت لعبادک بابا الی عفوک سمیتہ التوبۃ، فقلت توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا، فما عذر من اغفل دخول الباب بعد فتحہ"

"اے میرے اللہ تو ہی تو ہے کہ جس نے اپنی عفو وبخشش کی طرف اپنے بندوں کے سامنے ایک دروازہ کھولا ہے کہ جس کا نام تو نے توبہ رکھا ہے۔ تو نے فرمایا ہے کہ خدا کی طرف لوٹو، اور توبہ کر لو، خالص توبہ، اب ان لوگوں کا عذر کیا ہے جو اس دروازہ کے کھلنے کے بعد اس دروازے سے داخل ہونے سے غافل ہو جائیں؟"[2]

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے:

"ان اللہ تعالیٰ اشد فرحا بتوبۃ عبدہ من رجل اضل راحلتہ وزادہ فی لیلۃ ظلماء، فوجدھا"

"خداوند تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ وہ شخص خوش

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۲۴۴

[2] پندرہ مناجاتوں میں سے پہلی مناجات۔ بحار الانوار جلد ۹۴ ص ۱۴۲

ہوتا ہے جس نے ایک رات میں اپنی سواری اور زادِ راہ گم کر دیا ہو، اور پھر اسے پا لیا ہو۔[1]

عظمت اور بزرگواری رکھنے والی یہ سب تعبیریں زندگی کے اس اہم امر کی حیاتی تشویق کے لیے ہیں۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ توبہ صرف تلفظ لسانی اور زبان سے "استغفر اللہ" کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ شرائط اور ارکان ہیں کہ جن کی طرف اوپر والی آیات میں توبۂ نصوح کی تفسیر میں اشارہ ہوا ہے۔ جب توبہ ان شرائط کے ساتھ انجام پاتی ہے تو وہ اس طرح اثر کرتی ہے کہ وہ انسان کی روح اور جان سے گناہ اور آثارِ گناہ کو کلی طور پر محو کر دیتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے:

"التائب من الذنب کمن لا ذنب له، والمقیم علی الذنب وهو مستغفر منه کالمستهزء"

"جو شخص گناہ سے توبہ کرلے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے بالکل کوئی گناہ نہیں کیا، جو شخص اپنے گناہ پر برقرار رہے اور استغفار بھی کرتا رہے، تو وہ اس شخص کی مانند ہے جو مذاق اڑاتا اور تمسخر کرتا ہو۔[2]

ہم توبہ کے بارے میں دوسرے تفصیلی مباحث (دوسری جلد میں) سورۂ نساء کی آیت ۱۷ کے ذیل میں اور (جلد ۱۱ میں) سورۂ زمر کی آیت ۵۳ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب التوبہ حدیث ۸

[2] اصول کافی جلد ۲ باب التوبہ حدیث ۱۰

۹ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

۱۰ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝

۱۱ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝

۱۲ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ۝

ترجمہ

۹ اے پیغمبرؐ! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔ ان کا ٹھکانہ جہنم

ہے۔ اور وہ بری جگہ ہے۔

(۱۰) خدا نے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے ہیں، ایک مثال دی ہے۔ نوحؑ کی بیوی کی مثال اور لوطؑ کی بیوی کی مثال۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں۔ لیکن ان دونوں سے انھوں نے خیانت کی، اور ان دونوں (پیغمبروں) کے ساتھ ان کا تعلق (عذاب الٰہی کے مقابلہ میں) انھیں کوئی نفع نہ دے سکا اور ان سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ، آگ میں داخل ہو جاؤ۔

(۱۱) اور خدا نے مومنین کے لیے بھی ایک مثال بیان کی ہے۔ وہ فرعون کی بیوی کی مثال ہے، جبکہ اس نے کہا پروردگارا! میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالم قوم سے رہائی بخش دے۔

(۱۲) اور اسی طرح سے مریمؑ بنت عمران کی مثال بیان کی ہے جس نے اپنے دامن کو پاک رکھا اور ہم نے اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا، اس نے پروردگار کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ خدا کے حکم کی اطاعت کرنے والوں میں سے تھی۔

تفسیر

مومن اور کافر عورتوں کے نمونے

منافقین پیغمبرؐ کے گھر کے اندر کے رازوں کے فاش ہونے اور آپ کی بیویوں کے درمیان جھگڑے اور اختلافات کے ظاہر ہونے پر جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا تھا، خوش تھے بلکہ انھیں اور ہوا دیتے تھے، شاید اسی مناسبت سے پہلی زیر بحث آیت میں ان کے بارے میں شدتِ عمل کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے: "اے پیغمبرؐ! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر سختی کرو، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔" (یاایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم ومأواھم جھنم وبئس المصیر)۔

یہ جہاد کفار کے مقابلہ میں تو ممکن ہے کہ مسلح یا غیر مسلح ہو، لیکن منافقین کے مقابلہ میں شک نہیں کہ یہ مسلح جہاد نہیں ہے۔ کیونکہ کبھی بھی تاریخ میں یہ نقل نہیں ہوا کہ پیغمبر نے منافقین کے ساتھ مسلح جنگ کی ہو۔ لہٰذا ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ان رسول اللّٰہ لم یقاتل منافقاً قط انما کان یتألفھم"

"رسولِ خداؐ نے ہرگز کبھی منافق سے جنگ نہیں کی، بلکہ آپ ہمیشہ ان کی تالیفِ قلوب کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔"

اس بناء پر ان کے ساتھ جہاد کرنے سے مراد وہی توبیخ، سرزنش، انذار، ڈرانا اور انھیں رسوا کرنا ہے، یا بعض موارد میں ان کی تالیفِ قلوب کرنا ہے، کیونکہ "جہاد" ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے۔ اور ہر قسم کی جدوجہد اور سعی و کوشش کو شامل ہے "واغلظ علیھم" (ان پر سختی اور خشونت کر) کی تعبیر بھی گفتگو میں سختی اور اشاراتی تہدید، دھمکی اور اس قسم کی چیزوں میں سختی کی طرف اشارہ ہے۔

منافقین کے ساتھ یہ مخصوص وضع و کیفیت اس بناء پر تھی کہ وہ ظاہراً اسلام کا دم بھرتے اور مسلمانوں کے ساتھ مکمل طور پر آمیزش رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ایک کافر جیسا سلوک کیا جا سکے۔

البتہ یہ اس صورت میں تھا کہ وہ ہتھیاروں کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔ اگر وہ یہ کام کرتے تو یقیناً ان کے ساتھ مقابلہ بالمثل ہوتا، کیونکہ اس صورت میں وہ "محارب" کا عنوان اپنے لیے لے لیتے۔

اگرچہ یہ مسئلہ پیغمبر کے زمانہ میں واقع نہیں ہوا، لیکن آنحضرتؐ کے بعد خصوصاً امیر المومنینؑ کے زمانہ میں رونما ہوا اور آپ مسلح جنگ کے لیے کھڑے ہوتے۔

بعض نے کہا ہے کہ اوپر والی آیت میں "منافقین سے جہاد" کرنے سے مراد ان کے بارے میں حدود شرعی کا اجراء ہے، کیونکہ وہ لوگ جن پر حد جاری ہوئی اکثر منافقین تھے۔ لیکن اس تفسیر اور اس دعوے کے لیے کہ اس زمانہ میں زیادہ تر حدود شرعی ان ہی لوگوں پر جاری ہوئی ہیں، ہمارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت بعینہٖ اور بغیر کسی کمی و زیادتی کے سورۂ توبہ آیت ۷۳ میں بھی آئی ہے۔

⁂

اس کے بعد دوبارہ پیغمبر کی بیویوں کے ماجرے کی طرف لوٹتا ہے۔ اس بناء پر کہ انھیں عملی اور زندہ سبق دے، دو بے تقویٰ عورتوں کی سرگزشت جو دو بزرگ پیغمبروں کے گھر میں تھیں، اور دو مومن و ایثار گر خواتین کی سرگزشت بیان کرتا ہے جن میں سے ایک تاریخ کے جابر ترین شخص کے گھر میں تھی۔

پہلے فرماتا ہے: "خدا نے کافروں کے لیے ایک مثال بیان کی ہے۔ نوحؑ کی بیوی کی مثال اور لوطؑ کی بیوی کی مثال۔" (ضرب اللّٰہ مثلاً للذین کفروا امرأت نوح و امرأت لوط)۔[1]

---

[1] ضرب کے یہاں دو مفعول ہیں۔ "امرأۃ نوح" مفعول اول ہے جو مؤخر ہو گیا ہے اور "مثلاً" دوسرا مفعول ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

"وہ دونوں ہمارے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں لیکن انہوں نے اُن سے خیانت کی"۔ (کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخانتاھما)۔

"لیکن ان دو عظیم پیغمبروں سے ان کے ارتباط نے عذاب الٰہی کے مقابلہ میں انھیں کوئی نفع نہیں دیا اور اُن سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے لوگوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ"۔ (فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئًا وقیل ادخلا النار مع الداخلین)۔

اِس طرح سے پیغمبرؐ اسلام کی ان دو بیویوں کو جنھوں نے افشاءِ راز کیا اور آنحضرتؐ کو تکلیف و آزار پہنچایا تھا خبردار کرتا ہے کہ وہ یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ صرف پیغمبر کی بیوی ہونا انھیں عذاب سے بچا لے گا۔ جس طرح نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کا رابطہ خیانت کی وجہ سے خاندانِ نبوت و وحی سے منقطع ہو گیا اور وہ دونوں عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گئیں۔

ضمنی طور پر یہ تمام طبقات کے مومنین کو ایک تنبیہ ہے کہ وہ گناہ و عصیان کی صورت میں اولیاء اللہ کے ساتھ اپنے رشتوں اور تعلقات کو عذاب الٰہی سے مانع نہ سمجھ بیٹھیں۔

مفسرین کے بعض کلمات میں آیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بیوی کا نام "والھۃ" اور حضرت لوطؑ کی بیوی کا نام "والعۃ" تھا۔[1] اور بعض نے اس کے برعکس لکھا ہے۔ یعنی نوحؑ کی بیوی کا نام "والعۃ" اور لوطؑ کی بیوی کا نام "واعلۃ" یا "والھۃ" کہا ہے۔[2]

بہرحال ان دونوں عورتوں نے ان دونوں عظیم پیغمبروں کے ساتھ خیانت کی، البتہ ان کی خیانت جادۂ عفت سے انحراف ہرگز نہیں تھا، کیونکہ کسی پیغمبرؐ کی بیوی ہرگز بے عفتی سے آلودہ نہیں ہوتی جیسا کہ پیغمبر اسلام سے ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ آیا ہے:

"ما بغت امرأۃ نبی قط"۔

"کسی بھی پیغمبر کی بیوی ہرگز منافیٔ عفت عمل سے آلودہ نہیں ہوئی"۔[3]

حضرت لوطؑ کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ اس پیغمبر کے دشمنوں کے ساتھ تعاون کرتی تھی اور آنحضرت کے گھر کے راز انھیں بتاتی تھی، اور حضرت نوحؑ کی بیوی بھی ایسی ہی تھی۔

"راغب" مفردات میں کہتا ہے کہ "خیانت" اور "نفاق" حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں، سوائے اس

(بقیہ صفحہ سابقہ) یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "ضرب" کا ایک ہی مفعول ہو اور وہ "مثلاً" ہے اور "امرأۃ نوح" اس کا بدل ہے۔ (البیان فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۴۴۹)

[1] قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۶۸۰

[2] روح المعانی جلد ۲۸ ص ۱۴۲ (بعض نے نوحؑ کی بیوی کا نام "واغلۃ" یا "والغۃ" بھی بیان کیا ہے)

[3] "درالمنثور" جلد ۶ ص ۲۴۵

کہ کہ خیانت 'خود امانت' کے مقابلہ میں ہوتی ہے، اور نفاق مسائل دینی میں۔

اس داستان کی پیغمبر کے گھر کے افشائے راز کی داستان کے ساتھ مناسبت بھی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خیانت سے مُراد یہی ہو۔

بہرحال اوپر والی آیت ان افراد کی جھوٹی اُمیدوں کو جو یہ گمان کرتے ہیں کہ پیغمبر جیسے عظیم شخص سے تعلق اور رشتہ داری ہی ان کی نجات کا سبب بن جائے گی (چاہے عمل کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو) منقطع کر دیتی ہے، تاکہ کوئی بھی شخص اس لحاظ سے اپنے لیے نجات کا قائل نہ ہو۔ اسی لیے آیت کے آخر میں کہتا ہے: "ان سے کہا جائے گا تم بھی تمام دوزخیوں کے ساتھ جہنّم میں داخل ہو جاؤ۔" یعنی تمہارے اور دوسروں کے درمیان اِس لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں ہے۔

* * *

اس کے بعد باایمان افراد کے لیے دو مثالیں بیان کرتے ہُوئے کہتا ہے: "خدا نے مومنین کے لیے ایک مثال بیان کی ہے: یہ فرعون کی بیوی کی مثال ہے، جس وقت اس نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: میرے پروردگار! میرے لیے اپنے نزدیک جنّت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے کاموں سے نجات دے اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات عطا فرما" (وضرب الله مثلاً للذین اٰمنوا امرأت فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتاً فی الجنة ونجنی من فرعون وعمله ونجنی من القوم الظالمین)۔

مشہور یہ ہے کہ فرعون کی بیوی کا نام آسیہ اور اس کے باپ کا نام مزاحم تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اُس نے جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا تو اس کے دل کی گہرائیاں نورِ ایمان سے روشن ہوگئیں، وہ اسی وقت موسیٰؑ پر ایمان لے آئی۔ وہ ہمیشہ اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتی تھی۔ لیکن ایمان اور خدا کا عشق ایسی چیز نہیں ہے جسے ہمیشہ چھپایا جا سکے۔ جب فرعون کو اس کے ایمان کی خبر ہُوئی تو اس نے اُسے بارہا سمجھایا اور منع کیا اور یہ اصرار کیا کہ موسیٰؑ کے دین سے دستبردار ہو جائے اور اس کے خدا کو چھوڑ دے، لیکن یہ با استقامت خاتون فرعون کی خواہش کے سامنے ہرگز نہ جھکی۔

آخرکار فرعون نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں میخوں کے ساتھ باندھ کر اسے سُورج کی جلتی ہُوئی دھوپ میں ڈال دیا جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس کے سینہ پر رکھ دیں۔ جب وہ خاتون اپنی زندگی کے آخری لمحے گزار رہی تھی تو اس کی دُعا یہ تھی:

"پروردگارا! میرے لیے جنّت میں اپنے جوارِ رحمت میں ایک گھر بنا دے۔ مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے رہائی بخش اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات دے۔"

خدا نے بھی اس پاکباز اور فداکار مومنہ خاتون کی دعا قبول کی اور اسے مریمؑ جیسی دنیا کی بہترین خاتون کے

قرار دیا جیسا کہ وہ ان آیات میں مریمؑ کے ہم ردیف قرار پائی ہے۔

ایک روایت میں رسولِ خدا سے آیا ہے:

"افضل نساء اهل الجنة خديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد (ص) ومريم بنت عمران وآسية بنت مزاحم امرأة فرعون!"

"اہلِ جنت میں افضل ترین اور برترین عورتیں چار ہیں۔ خویلد کی بیٹی خدیجہؑ محمدؐ کی بیٹی فاطمہؑ اور عمران کی بیٹی مریمؑ اور مزاحم کی بیٹی آسیہؑ جو فرعون کی بیوی تھی۔" [1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ فرعون کی بیوی اپنی اس بات سے فرعون کے عظیم قصر کی تحقیر کر رہی ہے، اور اُسے خدا کے جوارِ رحمت میں گھر کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ اس گفتگو کے ذریعہ ان لوگوں کو جو اُسے یہ نصیحت کرتے تھے کہ ان تمام نمایاں وسائل و امکانات کو جو ملکۂ مصر ہونے کی وجہ سے تیرے قبضہ و اختیار میں ہیں موسیٰؑ جیسے چرواہے پر ایمان لاکر ہاتھ سے نہ دے، جواب دیتی ہے:

"ونجنی من فرعون وعمله" کے جملہ کے ساتھ خود فرعون سے اور اس کے مظالم اور جرائم سے بیزاری کا اعلان کرتی ہے۔

"ونجنی من القوم الظالمین" کے جملہ سے اس آلودہ ماحول سے اپنی علیحدگی، اور ان کے جرائم سے اپنی بیگانگی کا اظہار کرتی ہے۔

زندگی کے آخری لمحات میں اس با معرفت اور ایثار گر عورت کے یہ تینوں جملے کس قدر جچے تلے اور حساب شدہ ہیں، ایسے جملے جو پوری دنیا کی سب عورتوں اور مردوں کے لیے نفع بخش اور باعثِ ہدایت ہو سکتے ہیں۔

ایسے جملے جو ان تمام افراد کے ہاتھوں سے، جو ماحول یا معاشرے کے دباؤ کو خدا کی اطاعت اور تقویٰ کو ترک کرنے کا ایک جواز شمار کرتے ہیں فضول بہانوں کو چھین لیتے ہیں۔

مسلّم طور پر فرعون کے دربار سے بڑھ کر زرق برق اور جلال و جبروت موجود نہیں تھا۔ اسی طرح فرعون جیسے جابر و ظالم کے شکنجوں سے بڑھ کر فشار اور شکنجے موجود نہیں تھے۔ لیکن نہ تو وہ زرق برق اور نہ ہی وہ فشار اور شکنجے اس مومنہ عورت کے گھٹنے جھکا سکے۔ اس نے رضائے خدا میں اپنا سفر اسی طرح سے جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اپنی عزیز جان اپنے حقیقی محبوب کی راہ میں فدا کر دی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ استدعا کرتی ہے کہ اسے خدا جنت میں اور اپنے جوار میں اس کے لیے

---

[1] درمنثور جلد ۶ ص ۲۴۶

ایک گھر بنا دے جس کا جنت میں ہونا تو جنبۂ جسمانی ہے اور خدا کے جوار رحمت میں ہونا جنبۂ روحانی ہے۔ اس نے ان دونوں کو ایک مختصر سی عبارت میں جمع کر دیا ہے۔

* * *

اس کے بعد دوسری باشخصیت خاتون کی طرف جو صاحب ایمان لوگوں کے لیے نمونہ شمار ہوتی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور خدا نے مریم بنت عمران کی مثال بھی بیان کی ہے جس نے اپنے دامن کو پاک رکھا" (ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجها)[1]

اور ہم نے اپنی روح میں سے اس میں پھونکا" (فنفخنا فیه من روحنا)۔

اور اس نے خدا کے حکم سے شوہر کے بغیر بچہ جنا جو پروردگار کا اولوالعزم پیغمبر بنا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس نے پروردگار کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور ان سب پر ایمان لائی" (وصدقت بکلمات ربها وکتبه)۔

"اور وہ خدا کے حکم کی اطاعت کرنے والوں میں سے تھی" (وکانت من القانتین)۔

وہ ایمان کے لحاظ سے اعلیٰ مرتبے پر تھی۔ تمام آسمانی کتابوں اور اوامر الٰہی پر ایمان رکھتی تھی اور عمل کے لحاظ سے ہمیشہ احکام الٰہی کی مطیع تھی۔ وہ خدا کی ایک ایسی کنیز تھی جو اپنی جان و دل ہتھیلی پر لیے ہوئے آنکھ اس کے حکم پر اور کان اس کے فرمان پر لگائے رکھتی تھی۔

"کلمات" اور "کتب" میں فرق ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ کتب کی تعبیر سے تو ان تمام آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہو جو پیغمبروں پر نازل ہوئی ہیں اور کلمات کی تعبیر سے مراد وہ الہام ہوں جو کتاب آسمانی کی صورت میں نہیں آئے تھے۔

مریمؑ ان کلمات اور کتابوں پر ایسا ایمان رکھتی تھی کہ قرآن نے سورۂ مائدہ کی آیت ۷۵ میں اسے صدیقہ (بہت زیادہ تصدیق کرنے والی) کے عنوان سے یاد کیا ہے۔

قرآن کی مختلف آیات میں اس باایمان خاتون کی شخصیت اور اس کے مقام والا کے سلسلہ میں بہت زیادہ مطالب نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک اہم حصہ تو اس سورہ میں ہے جو اسی کے نام سے موسوم ہے۔ (ایک گروہ نے صدیقہ کی توصیف زیادہ سچ بولنے والی کے ساتھ کی ہے۔)

بہرحال قرآن ان تعبیروں کے ساتھ مریمؑ کے دامن کو ان ناروا باتوں سے، جو آلودہ اور جفاکار یہودیوں کی ایک جماعت اس کے بارے میں کہتی تھی اور وہ لوگ اس کی شخصیت اور اس کی پاک دامنی کے خلاف جو بھی

---

[1] اس بارے میں کہ "فرج" کی تعبیر سے کیا مراد ہے؟ ہم نے ایک تفصیلی بیان، تفسیر نمونہ کی جلد ۷ میں ص ۳۹۳ پر سورۂ انبیاء کی آیت ۹۱ کے ذیل میں پیش کیا ہے۔

باتیں بناتے تھے، ان سے اس کو پاک و پاکیزہ شمار کرتا ہے اور بدگوئی کرنے والوں کے منہ پر ایک سخت طمانچہ رسید کرتا ہے۔

"فنفخنا فیہ من روحنا" (ہم نے اپنی روح میں سے اس میں پھونکا) کی تعبیر سے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، ایک باعظمت اور بلند روح مراد ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں "خدا کی طرف "روح" کی اضافت ایک "اضافہ تشریفیہ" ہے کہ جو کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے آتی ہے۔ مثلاً بیت اللہ کی تعبیر میں "گھر" کی اضافت خدا کی طرف سے ہے، ورنہ خدا کی نہ روح ہے نہ گھر اور نہ بیت۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین۔ [illegible] کے ہاں باشخصیت اور والامقام عورتوں کے بارے میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بی بی عائشہ کو ان سب سے برتر و افضل شمار کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس حدیث کو سورہ تحریم کی تفسیر میں ذکر نہ کرتے، کیونکہ سورہ تحریم تو اس گھڑی ہوئی حدیث کے برخلاف پکار پکار کر پیغام دے رہی ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اہل سنت کے بہت سے مفسرین و مؤرخین نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ دو عورتیں جن کی اسی سورہ کی آیات شدت کے ساتھ مذمت کر رہی ہیں اور جو خدا اور اس کے رسولؐ کے غیظ و غضب کا سبب بنی ہیں، وہ حفصہ و عائشہ تھیں، اور یہی بیان صراحت کے ساتھ صحیح بخاری میں بھی آیا ہے۔[1]

ہم ان تمام لوگوں سے جو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر غور و خوض اور سوچ بچار کرتے ہیں، یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ پھر سے اس سورہ کی آیات کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد اس قسم کی حدیثوں کی قدر و قیمت کو واضح اور روشن کریں۔

✦ ✦ ✦

خداوندا! ہمیں بے ثبوت اور تعصب آمیز حب و بغض سے محفوظ رکھ اور ایسا کر کہ ہم قرآن مجید کی آیات کے مقابلہ میں اپنے سارے وجود کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیں اور خاضع رہیں۔

پروردگارا! وہ دن نہ آئے کہ تیرا عظیم پیغمبرؐ ہمارے اعمال سے ناخوش اور ہماری زندگی کی روش سے ناراض ہو۔

بارالٰہا! ہمیں ایسی استقامت عطا فرما کہ سارے جہان میں زمانے کے فرعونوں کے دباؤ اور شکنجے ہماری روح اور ایمان پر معمولی سے معمولی اثر بھی نہ کریں۔ آمین یا رب العالمین۔

اختتام ترجمہ ۸ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۳ اگست ۱۹۸۷ء
تقریباً پونے آٹھ بجے صبح ۱۰۱-اے ماڈل ٹاؤن، لاہور

اختتام سورۂ تحریم
۸ شوال ۱۴۰۶ھ

---

[1] صحیح بخاری جلد ۶ ص ۱۹۵

سورۂ ملک

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور اس کی ۳۰ آیتیں ہیں

تاریخ آغاز

۷ شوال ۱۴۰۶ھ

سورۂ مُلک کے مضامین

یہ سورہ جو قرآن مجید کے پارہ ۲۹ کی ابتداء ہے ان سوروں میں سے ہے جو مشہور قول کے مطابق سارے سے سارے مکہ میں نازل ہوئے، جیسا کہ اس پارہ کی زیادہ تر سورتیں مکی ہی ہیں۔ بلکہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق تو اس پارے کی تمام کی تمام سورتیں مکی ہیں۔[1] گزشتہ پارہ کی سورتوں کے برعکس کہ جو مدنی تھیں لیکن جیسا کہ ہم بیان کریں گے کہ سورہ دہر (یا سورۃ انسان) اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

سورۃ ملک جس کا دوسرا نام 'منجیہ' (نجات بخشنے والی) اور تیسرا نام 'واقیہ' یا 'مانعہ' ہے (کیونکہ وہ اپنے تلاوت کرنے والے کو عذابِ الٰہی یا عذاب قبر سے محفوظ رکھتی ہے)، قرآن کی بہت ہی بافضیلت سورتوں میں سے ہے۔ اس میں بہت سے مسائل پیش ہوئے ہیں جو زیادہ تر تین محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں:

۱ : مبدأ، خدا کی صفات، خلقت کا شگفت انگیز نظام، خصوصاً آسمانوں اور ستاروں کی خلقت، زمین کی خلقت اور اس کی نعمتیں اور اسی طرح پرندوں کی خلقت، جاری ہونے والے پانی نیز کان، آنکھ اور آلاتِ شناخت کی خلقت کے بارے میں بحث ہے۔

۲ : معاد و قیامت، دوزخ کا عذاب اور دوزخیوں کے ساتھ عذاب کے فرشتوں کی گفتگو اور اسی قسم کے امور سے متعلق مباحث۔

۳ : کافروں اور ظالموں کو دُنیا و آخرت کے انواع و اقسام کے عذابوں سے انذار و تہدید۔ بعض کے قول کے مطابق تمام سورہ کا محورِ اصلی وہی خدا کی مالکیت و حاکمیت ہے جو پہلی آیت میں آئی ہے۔[2]

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۱۸۰

[2] گزشتہ مدرک ص ۱۸۴

تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت میں پیغمبر اور ائمہ اہل بیت سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں:

منجملہ ان کے ایک حدیث میں پیغمبر اکرم سے آیا ہے:

"من قرأ سورة تبارك فكانما احيا ليلة القدر"

"جو شخص سورہ تبارک کو پڑھے تو ایسا ہے جیسا کہ اس نے شب قدر بیدار رہ کر عبادت میں بسر کی ہو۔"[1]

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے:

"وددت ان تبارك الملك فى قلب كل مؤمن"

"میں دوست رکھتا ہوں کہ سورہ تبارک تمام مومنین کے دل میں ثبت ہو جائے"[2]

ایک حدیث میں امام محمد بن علی الباقرؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"سورة الملك هى المانعة تمنع من عذاب القبر وهى مكتوبة فى التوراة سورة الملك ومن قرأها فى ليلة فقد اكثر واطاب، ولم يكتب من الغافلين..."

"سورہ ملک سورہ مانعہ ہے۔ یعنی عذاب قبر سے بچاتی ہے اور تورات میں اسی نام کے ساتھ لکھی ہوئی ہے جو شخص اس کو رات کے وقت پڑھے تو اس نے بہت کچھ پڑھا اور خوب پڑھا ——— وہ غافلین میں شمار نہیں ہوگا۔"[3]

اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔

البتہ یہ سب عظیم آثار فکر و عمل کے بغیر پڑھنے سے مربوط نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد ایسا پڑھنا ہے جس میں عمل کے لیے ہدایت ہو۔

1۔ مجمع البیان ج ۱۰ ص ۳۲۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(۱) تَبٰرَكَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡكُ وَ ہُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرُ ۙ

(۲) الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَكُمۡ اَیُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ۙ

(۳) الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ

(۴) ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ہُوَ حَسِیۡرٌ

(۵) وَ لَقَدۡ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ وَ جَعَلۡنٰہَا رُجُوۡمًا لِّلشَّیٰطِیۡنِ وَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابَ السَّعِیۡرِ

ترجمہ

خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے

(۱) بڑی برکتوں والی بلند و بالا ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں سارے عالم

ہستی کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۲) وہی ذات ہے جس نے موت و حیات کو پیدا کیا، تاکہ وہ آزمائے کہ تم میں سے بہترین عمل کون کرتا ہے، اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے۔

(۳) وہی جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا۔ تم خدائے رحمٰن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے۔ پھر نظر دوڑا کر دیکھو۔ کیا تمھیں کوئی شگاف یا خلل نظر آتا ہے؟

(۴) پھر دوبارہ (عالم ہستی کی طرف) نظر اٹھا کر دیکھو، انجام کار تیری نظر (خلل و نقص کی جستجو میں ناکام ہو کر) تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہو گی۔

(۵) ہم نے نچلے آسمان کو روشن چراغوں سے زینت دی ہے اور انھیں شیاطین کے لیے (شہب) تیر قرار دیا ہے، اور ہم نے ان کے لیے دوزخ کا عذاب فراہم کیا ہے۔

تفسیر

تم عالم ہستی میں کسی قسم کا نقص نہیں دیکھو گے۔

یہ سورہ خدا کی مالکیت و حاکمیت اور اس کی ذات پاک کے دوام اور ہمیشگی جیسے اہم مسئلہ سے شروع ہوتا ہے جو حقیقت میں اس سورہ کے تمام مباحث کی کلید ہے۔

فرماتا ہے: "برکتوں والی اور زوال ناپذیر ہے وہ ذات، جس کے قبضۂ قدرت میں عالم ہستی کی حکومت ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (تبارك الذی بیده الملك وهو علیٰ كل شیء قدیر)۔

"تبارك" "برکت" کے مادہ سے اصل میں "برك" (بروزن برگ) ہے جو اونٹ کے سینہ کے معنی میں ہے۔ جب "برك البعیر" کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اونٹ نے اپنا سینہ زمین پر رکھ دیا، اس کے بعد یہ لفظ دوام، بقاء اور زوال ناپذیر کے معنی میں اور پھر اس نعمت کے معنی میں جو پائیداری و دوام رکھتی ہو، بولا

جانے لگا۔ پانی کے خزانے کو بھی اس لیے برکہ کہتے ہیں کیونکہ پانی ایک طویل مدت تک اس میں باقی اور محفوظ رہتا ہے۔

اوپر والی آیت میں حقیقت میں خدا کی ذات پاک کے مبارک ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے، اور عالم پر اس کی مالکیت و حاکمیت اور ہر چیز پر اس کی قدرت ہے، اسی بنا پر وہ زوال ناپذیر اور برکت سے پُر وجود ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں انسان کی موت و حیات کی خلقت، جو خدا کی مالکیت و حاکمیت کے شئون میں سے ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہی تو ہے کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے بہترین عمل کون کرتا ہے"۔ (الذی خلق الموت والحیاة لیبلوکم ایکم احسن عملاً)۔

"موت" اگر فنا اور نیستی کے معنی میں ہو تو مخلوق نہیں ہے۔ کیونکہ خلقت کا تعلق امورِ وجودی کے ساتھ ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ موت کی حقیقت ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال ہے اور یہ یقیناً ایک وجودی امر ہے جو مخلوق ہو سکتا ہے۔

اگر یہاں موت کا حیات سے پہلے ذکر ہوا ہے تو اس کی وجہ وہ گہری تاثیر ہے جو حسن عمل میں موت کی طرف توجہ سے ہوتی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ موت زندگی سے پہلے بھی تھی۔

خدا کی آزمائش سے مراد، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ایک قسم کی تربیت ہے اس معنی میں کہ وہ انسانوں کو میدانِ عمل کی طرف کھینچتی ہے تاکہ تجربے اور آزمائش میں پاک و پاکیزہ ہو کر قرب خدا کے لائق ہوں۔[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آزمائش کا ہدف "حُسنِ عمل" کو بتایا گیا ہے نہ کہ کثرتِ عمل کو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کیفیت کو اہمیت دیتا ہے کمیت کو نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ عمل خالص ہو، خدا کے لیے اور مفید جامع ہو، اگرچہ کمیت و مقدار کے لحاظ سے تھوڑا ہو۔

اس لیے اس بارے میں کہ "احسن عملاً" سے کیا مراد ہے، بعض اسلامی روایات میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اتمکم عقلا . واشدکم لله خوفا ، واحسنکم فیما امر الله به و نهی عنه نظرا ، وان کان اقلکم تطوعا"

"اس سے مراد یہ ہے کہ تم میں سے کس کی عقل و خرد کامل اور خدا ترسی زیادہ ہے اور

---

[1] خدائی آزمائشوں کے بارے میں مزید تشریح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱ سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ کے ذیل میں ملاحظہ کریں۔

خدا کے اوامر و نواہی سے کون زیادہ آگاہی رکھتا ہے، چاہے تمہارے مستحبی اعمال کم ہی ہوں۔[1]

صاف ظاہر ہے کہ کمال عقل، عمل کو پاک تر، نیت کو خالص تر اور اجر و پاداش کو زیادہ سے زیادہ کر دیتی ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"لیس یعنی اکثر عملا، ولکن اصوبکم عملا، وانما الاصابة خشیة الله والنیة الصادقة، ثم قال الابقاء علی العمل حتی یخلص اشد من العمل، والعمل الخالص الصالح الذی لا ترید ان یحمدک علیه احد الا الله عزوجل۔"

"یہ مراد نہیں ہے کہ تم میں سے کون زیادہ عمل کرتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ تم میں سے زیادہ صحیح عمل کون کرتا ہے۔ عمل صحیح وہ ہے جس میں خدا ترسی اور پاک نیت شامل ہو۔ اس کے بعد فرمایا: عمل کو آلودگی سے محفوظ رکھنا خود عمل سے زیادہ سخت ہے۔ خالص و صالح عمل وہ ہوتا ہے جس میں تو یہ نہ چاہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس عمل پر تیری تعریف کرے۔"[2]

انسان کی خلقت کے ہدف کے بارے میں ہم سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ وہاں ہدف "عبودیتِ خدا" ذکر ہوا ہے، اور یہاں حُسنِ عمل کی آزمائش۔ یہ بات واضح ہے کہ آزمائش و امتحان کا مسئلہ عبودیت کے مسئلہ سے الگ نہیں ہے، جیسا کہ کمالِ عقل، خدا ترسی اور نیت خالص، جن کی طرف اوپر والی روایات میں اشارہ ہوا ہے روحِ عبودیت ہیں۔

اس طرح یہ دُنیا تمام انسانوں کے لیے ایک عظیم آزمائش کا میدان ہے۔ آزمائش کا ذریعہ موت و حیات ہے اور اس عظیم آزمائش کا ہدف حسن عمل تک پہنچنا ہے۔ جس کا مفہوم تکاملِ معرفت، اخلاصِ نیت اور ہر کارِ خیر کو انجام دینا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مفسرین نے یہاں 'احسن عملا' کی تفسیر موت کو یاد کرنے یا موت کے لیے آمادہ ہونے اور اسی قسم کے امور سے کی ہے تو وہ حقیقت میں اس معنی کلی کے مصادیق میں سے ہے۔

چونکہ اس عظیم آزمائش کے میدان میں انسان بہت سی لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے، یہ لغزشیں اسے مایوس نہ کر دیں اور اس کی سعی و کوشش سے اسے باز نہ رکھیں۔ لہٰذا آیت کے آخر میں بندوں کو مدد اور بخشش کا وعدہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۲

[2] تفسیر صافی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

دیتے ہوئے کہتا ہے: "اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے۔" (وھو العزیز الغفور)۔

ہاں! وہ ہر چیز پر قادر اور ہر توبہ کرنے والے انسان کو بخشنے والا ہے۔

موت وحیات کے نظام کو بیان کرنے کے بعد عالم کے نظامِ کلی کو پیش کرتے ہوئے انسان کو مجموعۂ عالمِ ہستی کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ اس طریقہ سے اپنے آپ کو اس عظیم آزمائش کے لیے آمادہ کرے، فرماتا ہے: "وہی خدا جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا۔" (الذی خلق سبع سماوات طباقاً)۔

سات آسمانوں کے بارے میں تو ہم اس سے پہلے تھوڑی سی بحث سورۂ طلاق کی آیت ۱۲ کی تفسیر میں بھی کر چکے ہیں۔ یہاں "طباقاً" کے بارے میں ہم کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کی بناء پر ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں کیونکہ "مطابقۃ" کا معنی اصل میں یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر قرار دیں۔

اب اگر ہم سات آسمانوں کو منظومۂ شمسی کے سات کروں کی طرف اشارہ سمجھیں، جو بغیر کسی آلہ کے دیکھے جا سکتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا سورج کے ساتھ ایک معین فاصلہ ہے، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر ہے۔

لیکن اگر ہم ان تمام ثوابت وسیار ستاروں کو جنہیں ہم دیکھتے ہیں پہلے آسمان کی جزء شمار کریں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالاتر مراحل میں کچھ دوسرے عوالم ہیں کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "تم خدائے رحمٰن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے۔" (ماتری فی خلق الرحمٰن من تفاوت)۔

عالمِ ہستی اس ساری عظمت کے باوجود جو کچھ بھی ہے وہ نظم ونسق، استحکام وانسجام، پختگی اور ٹھیک ٹھیک حساب شدہ ترکیبات اور دقیق قوانین ہیں۔ اگر اس عالم کے کسی گوشہ میں بے نظمی واقع ہو جاتی تو وہ اسے نابود کر کے رکھ دیتی۔

اس عجیب وغریب نظام سے لے کر جو ایک ایٹم کے مرکزہ اور الیکٹرون وپروٹون کے ذرات پر حاکم ہے، کل منظومۂ شمسی اور دوسرے منظوموں اور کہکشاؤں پر حاکم نظامات تک، سب کے سب دقیق قوانین کے زیرِ تسلط ہیں جو انہیں ایک خاص راستہ پر چلا رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر جگہ قانون وحساب ہے اور ہر جگہ ایک نظم اور خاص ترکیب ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: "پھر نظر دوڑا کر دیکھو اور اس عالم کو غور سے دیکھو، کیا تمہیں اس میں کوئی شگاف یا خلل اور اختلاف نظر آتا ہے؟" (فارجع البصر ھل تری من فطور)۔

"فطور" "فطر" (بر وزن سطر) کے مادہ سے طول میں شگاف کرنے کے معنی میں ہے اور توڑنے کے معنی میں (مثلاً روزہ کا افطار) اور اختلال وفساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔ زیرِ بحث آیت میں اسی معنی میں ہے۔

مراد یہ ہے کہ انسان عالم آفرینش میں چاہے جتنا بھی غور کرے، کم سے کم خلل اور ناموزونیت بھی اس میں نہیں دیکھے گا۔

* * *

اسی لیے بعد والی آیت میں اس معنی کی تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "پھر دوبارہ عالم ہستی کی طرف آنکھ کھول کر دیکھ، انجام کار تیری نظر خلل و نقص کی جستجو میں ناکام ہو کر اور تھک ہار کر تیری طرف پلٹ آئے گی"
(ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر)۔

"کرتین"۔ "کر" (بروزن شر) کے مادہ سے کسی چیز کی طرف توجہ کرنے اور بازگشت کرنے کے معنی میں ہے۔ کرۃ کا معنی تکرار بھی ہے اور "کرتین" اس کا تثنیہ ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں کرتین سے تثنیہ کا معنی مراد نہیں، بلکہ اس سے مکرر، بار بار، پے در پے اور متعدد مرتبہ توجہ کرنا مراد ہے۔

اس بناء پر قرآن ان آیات میں لوگوں کو کم از کم تین مرتبہ عالم ہستی کی طرف نظر کرنے اور اسرار خلقت و آفرینش کا مطالعہ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ وہ ایک چیز میں بار بار غور کریں، پھر جب اس عجیب و غریب نظام میں معمولی سے معمولی اور کم سے کم خلل اور نقص نہ دیکھیں تو اس کارخانۂ عالم کے پیدا کرنے والے خالق اور اس کے بے پایاں علم و قدرت سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں۔

"خاسئ" "خسأ" اور "خسوء" (بروزن مدح و خشوع) کے مادہ سے۔ جب آنکھ کے لیے استعمال ہو تو خستہ اور ناتواں ہونے کے معنی میں ہے اور جب "کتے" کے بارے میں استعمال ہو تو اسے دور کرنے کے معنی میں ہے۔

"حسیر"۔ "حسر" (بروزن قصر) کے مادہ سے برہنہ کرنے کے معنی میں ہے، چونکہ انسان خستگی اور تکان کے وقت اپنی توانائی کھو بیٹھتا ہے اور گویا وہ اپنی توانائیوں سے برہنہ ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ خستگی اور ناتوانی کے معنی میں آیا ہے۔ اس بناء پر اوپر والی آیت میں "خاسئ" اور "حسیر" دونوں ایک ہی معنی میں ہیں یعنی عالم ہستی کے نظام میں کسی نقص و عیب کے دیکھنے سے آنکھ کی درماندگی اور ناتوانی کے موضوع میں تاکید کے لیے آئے ہیں۔

بعض نے ان دونوں کے درمیان اس طرح فرق کیا ہے کہ "خاسئ" ناکام ہونے کے معنی میں اور "حسیر" ناتواں کے معنی میں ہے۔

بہرحال ان آیات سے دو اہم نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں، پہلا یہ کہ قرآن راہ حق کے تمام رہروؤں کو تاکیدی طور پر یہ حکم دیتا ہے کہ ان سے جتنا ہو سکتا ہے اس عالم ہستی کے اسرار اور جہان آفرینش کے عجائبات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان میں غور و خوض کریں، نیز یہ کہ ایک مرتبہ اور دو مرتبہ پر قناعت نہ کریں، کیونکہ بہت سے ایسے اسرار ہیں جو پہلی یا دوسری نگاہ میں اپنی نشان دہی نہیں کرتے، تیز بین نگاہیں کئی مرتبہ نظر دوڑانے کے بعد ہی ان

کو دیکھ پانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ انسان اس نظام میں جتنا زیادہ غور و خوض کرے گا اتنا ہی اس کے پردوں کو بہتر طور پر درک کر سکے گا۔ ایسا نظام، ساخت اور ترتیب جو ہر قسم کے نقص، خلل، کجی اور ٹیڑھے پن سے خالی ہے۔

اگر سطحی اور ابتدائی نظر میں اس جہان کے بعض موجودات شرور و آفات اور فساد کے عنوان سے نظر آتے ہیں (مثلاً زلزلے، سیلاب، بیماریاں اور ناگوار حوادث، جو کبھی کبھی انسان کی زندگی میں رُونما ہوتے رہتے ہیں) تو زیادہ دقیق مطالعات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر بہت سے اہم اسرار و رموز رکھتے ہیں۔[1]

یہ آیات برہان نظم کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ جو کہتی ہیں: "ہر کارخانہ میں نظم و نسق کا وجود، اس کارخانہ کی پشت پر علم و قدرت کے وجود کی نشانی ہے۔ ورنہ اتفاقی حوادث جو حساب شدہ نہ ہوں اندھے بہرے تصادفات نظام و حساب کا مبدء نہیں ہو سکتے، جیسا کہ حدیث مفضل میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"ان الاھمال لا یأتی بالصواب، والتضاد لا یأتی بالنظام"

"مہمل کام کبھی درست نتیجہ نہیں دیتے، اور تضاد کبھی نظام کا مبدء نہیں ہو سکتا۔"[2]

❖ ❖ ❖

۔۔ آخری زیر بحث آیت نے صنع آسمان پر نگاہ ڈالی ہے جو خوبصورت اور چمکنے والے ستاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے: "ہم نے پچھلے آسمان کو چمکدار اور روشن ستاروں سے زینت بخشی ہے اور انھیں ہم نے شیاطین کے لیے تیر قرار دیا ہے، اور ان کے لیے جہنم کی آگ کا عذاب فراہم کیا ہے۔" (ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلناھا رجوماً للشیاطین واعتدنا لھم عذاب السعیر)۔

ایک تاریک اور تاروں بھری رات میں آسمانوں کی طرف ایک نگاہ، دور دور تک دکھائی دینے والے عوالم کی طرف توجہ اور ان نظاموں کا تصور جو ان پر حاکم ہے، اس خوب صورتی نفاست، عمدگی، عظمت ہیبت اور پُراسرار سکوت میں غور کہ جو ان کے اوپر سایہ فگن ہے۔ انسان کو ایک عرفان اور نورِ حق سے پُر جہان میں داخل کر دیتا ہے۔ اسے عشق پروردگار کے ان عوالم میں سیر کراتا ہے جن کی کسی زبان سے تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔

یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ وہ تمام ستارے جنھیں ہم دیکھ رہے ہیں، سب

---

[1] ہم نے اس مطلب کی تشریح "اثبات وجود خدا" کے مباحث میں اثبات دینیات کے سلسلہ میں ادیین کے دلائل کے جواب میں کی ہے۔ کتاب "آفریدگار جہاں" کی طرف رجوع کریں۔ [2] بحار الانوار جلد ۳ ص ۶۳

پہلے آسمان کا حصہ ہیں۔ وہ آسمان جو سات آسمانوں میں ہم سے زیادہ قریب ہے۔ اسی بناء پر اسے "السماء الدنیا" (نزدیک اور نچلے آسمان) کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"رجوم" (تیر) کی تعبیر ان شہابوں کی طرف اشارہ ہے جو تیر کی طرح آسمان کی ایک طرف سے دوسری طرف پھینکے جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ "شہب" ان ستاروں کے باقیماندہ اجزاء ہیں جو بعض حوادث میں تباہ ہو گئے ہیں۔ اس بناء پر اگر وہ کواکب (ستاروں) کو شیاطین کے لیے تیر قرار دینے کی بات کہتا ہے، تو وہ انھیں مخصوص سنگریزوں کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن شیاطین شہاب سے ان تیروں سے جو آسمانوں میں چھوٹے چھوٹے سرگرداں پتھر ہیں کس طرح نشانہ بنتے ہیں؟ ہم اس کی تشریح تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورۂ حجر کی آیت ۱۸ کے ذیل میں) اور جلد ۱۹ (سورۂ صافات کی آیت ۱۰ کے ذیل میں) تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

ایک نکتہ

عالمِ آفرینش کی عظمت

باوجودیکہ قرآن مجید عرب کے زمانۂ جاہلیت کے پسماندہ ماحول میں اُترا لیکن یہ اکثر تاکید کرتا ہے کہ مسلمان عالمِ ہستی کے باعظمت اسرار میں غور و فکر کریں، وہ مطلب جس کا زمانۂ جاہلیت میں کوئی مفہوم ہی نہیں تھا یہ خود اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ قرآن ایک دوسرے مبدء سے صادر ہوا ہے۔ جب علم و دانش جس قدر آگے بڑھتے جا رہے ہیں، اس سلسلہ میں قرآنی تاکیدوں کی عظمت اسی قدر آشکار تر ہوتی جا رہی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ کرۂ زمین جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اتنا بڑا ہونے کے باوجود منظومۂ شمسی کے مرکز یعنی سورج کی ٹکیہ کے مقابلہ میں اس قدر چھوٹی ہے کہ اگر بارہ لاکھ کرۂ زمین کو ایک دوسرے کے اوپر رکھیں تو پھر وہ سورج کی ٹکیہ کے برابر ہوگی۔

دوسری طرف سے ہمارا منظومۂ شمسی ایک عظیم کہکشاں کا ایک جزء ہے۔ وہی کہکشاں جسے راہ شیری کہتے ہیں۔[1]

---

[1] کہکشائیں ستاروں کے مجموعے ہیں جو ستاروں کے شہروں کے نام سے مشہور ہیں اور ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کے باوجود بعض اوقات ان کے درمیان کئی ملین نوری سالوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔

ماہرین علم الافلاک کے حساب کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں ایک کھرب (100,000,000,000) سے زیادہ ستارے موجود ہیں، اور ہمارا سورج اپنی تمام عظمت کے باوجود، اس کے متوسط ستاروں میں سے ایک شمار ہوتا ہے۔

تیسری طرف اس عظیم جہان میں اس قدر کہکشائیں موجود ہیں جو حساب و کتاب اور شمار و قطار سے باہر ہیں۔ نیز ستاروں کو دیکھنے والی دوربینیں جتنی عظیم اور آراستہ ہوتی جا رہی ہیں اتنی ہی نئی نئی کہکشائیں کشف ہو رہی ہیں۔

کیوں نہ عظیم و بزرگ ہو کہ جس خدا نے یہ عالم عظیم اپنے دقیق نظام کے ساتھ بنایا ہے۔

لمن الملك اليوم لله الواحد القهار

۶ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝

۷ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ۝

۸ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ۖ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ۝

۹ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۖ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ۝

۱۰ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۝

۱۱ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ۝

ترجمہ

۶ اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا، جہنم کا عذاب ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

۷ جس وقت وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس میں سے ایک وحشتناک آواز سنیں گے۔

اور وہ ہمیشہ جوش مار رہی ہوگی۔

(۸) قریب ہے کہ وہ شدتِ غضب سے پارہ پارہ ہو جائے۔ جس وقت اس میں کوئی گروہ ڈالا جاتا ہے تو دوزخ کے نگران (فرشتے) ان سے سوال کرتے ہیں کیا تمھارے پاس خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔

(۹) وہ کہیں گے، ہاں! انذار کرنے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اُسے جھٹلایا اور یہ کہا کہ خدا نے بالکل کوئی چیز نازل نہیں کی ہے اور تم ایک بہت بڑی گمراہی میں ہو۔

(۱۰) اور یہ بھی کہیں گے کہ اگر (ان کی بات) سنتے یا سمجھتے تب تو (آج) دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

(۱۱) اِس موقع پر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کر لیں گے۔ دوزخی خدا کی رحمت سے دُور رہیں۔

تفسیر

اگر ہم سننے والا کان اور بیدار فکر رکھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے۔

گزشتہ آیات میں خدا کی عظمت و قدرت کی نشانیوں اور عالمِ آفرینش میں ان کے دلائل کے بارے میں گفتگو تھی۔ لہٰذا قرآن زیر بحث آیات میں ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جنھوں نے ان دلائل کی پروا نہیں کی۔ انھوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کر لی اور شیاطین کی طرح عذابِ الٰہی خرید بیٹھے۔

پہلے فرماتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا عذابِ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے:" (وللذین کفروا بربھم عذاب جھنم وبئس المصیر)۔

* * *

اس کے بعد اس وحشتناک عذاب کے ایک گوشہ کی تشریح کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "جس وقت کفار اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اس جہنم سے ایک وحشتناک صدا سنیں گے اور وہ ہمیشہ جوش مارنے کی حالت میں رہتی ہے:" (اذا القوا فیھا سمعوا لھا شھیقًا وھی تفور)۔

ہاں! جس وقت انھیں انتہائی ذلت و حقارت کے ساتھ اس میں پھینکا جائے گا تو جہنم کی وحشتناک اور طولانی صدا بلند ہوگی جو ان کے تمام وجود کو وحشت میں غرق کر دے گی۔

"شھیق" اصل میں قبیح اور بری آواز کے معنی میں ہے جیسا کہ گدھے کی آواز ہے۔ بعض اہلِ لغت نے یہ

بعض کا کہنا ہے کہ "شہوق" کے مادے سے طولانی ہونے کے معنی سے لایا گیا ہے۔ (اسی لیے اونچے اور بلند پہاڑ کو "جبل شاہق" کہتے ہیں) اس بناء پر "شہیق" طولانی نالہ و فریاد کے معنی میں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "زفیر" تو اس آواز کو کہتے ہیں جو گلے میں پیچ کھاتی ہے اور "شہیق" وہ آواز ہے جو سینہ میں آمد و رفت کرتی ہے۔ بہرحال یہ وحشت انگیز اور بے چین کر دینے والی آوازوں کی طرف اشارہ ہے۔

* * *

اس کے بعد دوزخ کے غیظ و غضب کی شدت کو مجسم کرنے کے لیے فرماتا ہے: "قریب ہے کہ وہ شدتِ غضب سے پارہ پارہ ہو جائے"۔ (تکاد تمیز من الغیظ)[1]

ٹھیک اس عظیم برتن کی طرح جسے حد سے زیادہ تیز حرارت والی آگ کے اوپر رکھا ہوا ہو اور وہ اس طرح جوش مارتا ہوا اوپر نیچے ہو رہا ہو کہ ہر لمحہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہو۔ یا اس غصہ میں بھرے ہوئے انسان کی طرح جو چیخ چلا رہا ہو اور اس طرح کی آوازیں نکال رہا ہو جیسے ابھی پھٹ پڑے گا۔

ہاں! خدائی غضب کے اس مرکز، جہنم کا منظر ایسا ہی ہے۔

پھر وہی بات جاری ہے۔ جس وقت کافروں کا کوئی گروہ اس میں پھینکا جائے گا تو دوزخ کے نگہبان تنبیہ اور سرزنش کے طور پر اس سے سوال کریں گے "کیا تمہارا کوئی رہبر و راہنما نہیں تھا؟ کیا خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں آیا تھا؟ پھر تم اس جگہ کیوں آن پہنچے ہو؟" (کلما القی فیھا فوج سألھم خزنتھا الم یأتکم نذیر)۔

انھیں اس بات کا یقین ہی نہیں آسکے گا کہ کوئی انسان جانتے بوجھتے اور آسمانی رہبر کے ہوتے ہوئے اس قسم کی سرنوشت میں گرفتار ہو جائے۔ اور اپنے لیے اس قسم کی جگہ کا انتخاب کرے۔

* * *

لیکن وہ جواب میں کہیں گے: "ہاں ڈرانے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اس کی تکذیب کی اور کہا کہ خدا نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی۔ اور خدا نے کسی پر وحی نہیں بھیجی ہے تاکہ ہم اپنی خواہش نفس کو جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ ہم نے ان سے کہا کہ تم عظیم گمراہی میں مبتلا ہو"۔ (قالوا بلی قد جاءنا نذیر فکذبنا وقلنا ما نزل اللہ من شیء ان انتم الا فی ضلال کبیر)۔

نہ صرف یہ کہ ہم نے ان کی تصدیق نہیں کی اور ان کے حیات بخش پیغام پر کان نہیں دھرا، بلکہ ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے، ان روحانی طبیبوں کو گمراہ کہہ کر اپنے سے دور کر دیا۔

---

[1] "تمیز" متلاشی اور پراگندہ ہونے کے معنی میں ہے اور اصل میں "تتمیز" تھا۔

اس کے بعد اپنی بدبختی اور گمراہی کی اصل دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہیں گے: "اگر ہم سننے والے کان رکھتے اور اپنی عقل کو کام میں لاتے تو ہرگز دوزخیوں میں سے نہ ہوتے۔" (وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ماکنا فی اصحاب السعیر)۔

* * *

ہاں! اس موقع پر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے۔ "دور ہوں دوزخی خدا کی رحمت سے۔" (فاعترفوا بذنبھم فسحقا لاصحاب السعیر)۔

ان آیات میں دوزخیوں کی وحشت ناک سرنوشت کے بیان کے ضمن میں ان کی بدبختی کی اصل علت کی نشان دہی کرتے ہوئے کہتا ہے: ایک طرف تو خدا نے سننے والے کان اور عقل و ہوش عطا کیا اور دوسری طرف واضح دلائل کے ساتھ اپنے پیغمبر بھیجے۔ اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں تو انسان کی سعادت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر انسان کان تو رکھتا ہے مگر ان سے سنتا نہیں، آنکھیں رکھتا ہے مگر ان سے دیکھتا نہیں، اور عقل رکھتا ہے مگر اس سے سوچتا نہیں، تو اب اگر خدا کے تمام کے تمام پیغمبر اور آسمانی کتابیں اس کے پاس آجائیں تو اس پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک گروہ نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں ایک مسلمان کی مدح و ثنا کی تو رسولؐ خدا نے فرمایا:

"کیف عقل الرجل؟"

"اس کی عقل کیسی ہے؟"

انہوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! ہم تو عبادت اور طرح طرح کے نیک کاموں میں اس کی جدوجہد کی بات کر رہے ہیں اور آپ اس کی عقل کے بارے میں پوچھ رہے ہیں" تب آپ نے فرمایا:

"ان الاحمق یصیب بحمقہ اعظم من فجور الفاجر، و انما یرتفع العباد غدًا فی الدرجات، وینالون الزلفی من ربھم علی قدر عقولھم"!

"احمق کی حماقت سے جو مصیبت آتی ہے وہ فاجروں کے فجور اور بدکاروں کے گناہ سے بدتر ہوتی ہے۔ کل قیامت کے دن خدا بندوں کو ان کی عقل و خرد کے مطابق درجات عطا فرمائے گا اور وہ اسی بنیاد پر قرب خداوندی حاصل کریں گے۔"

ا مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۴

"سحق" (بروزن قفل) اصل میں پیسنے اور نرم کرنے کے معنی میں ہے اور پرانے لباس کو بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں رحمتِ خدا سے دوری کے معنی میں ہے تو اس بناء پر فسحقاً لاصحاب السعیر کا مفہوم یہ ہے کہ دوزخی رحمتِ خدا سے دور رہیں، کیونکہ خدا کی نفرین تحقق خارجی سے توام ہوتی ہے۔ تو یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ گروہ کلی طور پر رحمتِ خدا سے دور ہو گا۔

ایک نکتہ

عقل وخرد کی اونچی قدروقیمت

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ قرآن مجید عقل وخرد کی حد سے زیادہ قدروقیمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ نیز دوزخیوں کا بنیادی گناہ اور ان کی بدبختی کا اصلی عامل اس خدائی قوت سے کام نہ لینے کو شمار کرتا ہے۔ بلکہ جو شخص قرآن سے آشنائی رکھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اس نے مختلف مناسبتوں سے اس موضوع کی اہمیت کو آشکار کیا ہے۔
اس نے ان لوگوں کی دروغ بافیوں کے برخلاف، جو مذہب کو دماغوں کے مست اور سست کرنے کا ذریعہ اور عقل وخرد کی پرواہ نہ کرنے والا شمار کرتے ہیں، اسلام خداشناسی اور سعادت ونجات کی اساس وبنیاد عقل وخرد پر رکھتا ہے، بلکہ جگہ جگہ اس کا روئے سخن "اولوالالباب" (صاحبانِ عقل) اور "اولوالابصار" (صاحبانِ بصیرت، غور وفکر کرنے والے عقلاء) کی طرف ہے۔

اسلامی منابع میں اس سلسلہ میں اس قدر روایات وارد ہوئی ہیں جو حساب وشمار سے باہر ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مشہور کتاب 'کافی' جو منابعِ حدیث میں سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے وہ مختلف کتابوں پر مشتمل ہے اور اس کی پہلی کتاب کا نام کتاب 'عقل وجہل' ہے۔ جو شخص ان روایات کو ملاحظہ کرے جو اس ضمن میں اس کتاب میں نقل ہوئی ہیں، وہ اس سلسلہ میں اسلام کی نظر کی گہرائی کو پالے گا۔ ہم یہاں صرف دو روایات کے ذکر پر قناعت کریں گے۔

(اسی کتاب میں) امیر المومنین امام علیؑ سے روایت آئی ہے کہ جبرئیل آدمؑ پر نازل ہوئے اور ان سے کہا "مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آپ کو ان تین نعمتوں میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار دوں، آپ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں اور باقی دو کو چھوڑ دیں"۔
آدمؑ نے کہا: "وہ کون سی نعمتیں ہیں؟"
جبرئیل نے جواب دیا: "عقل، حیا اور دین"۔

آدم نے کہا: "میں نے عقل کا انتخاب کیا ہے"۔ جبرئیل نے حیا اور دین سے کہا: "اسے چھوڑ دو، اور اپنا کام کرو"۔

انھوں نے کہا: "ہم مامور ہیں کہ ہر جگہ عقل کے ساتھ رہیں اور اس سے جدا نہ ہوں"۔

جبرئیل نے کہا: "اب جبکہ یہ بات ہے تو پھر اپنی مامویت پر عمل کرو"۔ اور اس کے بعد وہ آسمان کی طرف صعود کر گئے۔ [1]

یہ ایک ایسی لطیف ترین تعبیر ہے جو عقل وخرد اور حیاء و دین سے اس کی نسبت کے بارے میں کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اگر عقل، دین سے جدا ہو جائے تو وہ ذرا سی بات میں برباد ہو جائے گا یا انحراف کا شکار ہو جائے گا۔ باقی رہی حیاء، کہ جو انسان کو برائیوں اور گناہوں کے ارتکاب سے روکتی ہے تو وہ بھی معرفت اور عقل وخرد کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ آدمؑ عقل کے ایک قابل ملاحظہ حصّہ کے مالک تھے جنہوں نے ان تین چیزوں کے درمیان اختیار کے موقع پر عقل کے بالاتر مرحلہ کا انتخاب کیا اور اس کے سائے میں دین کو بھی ساتھ رکھا اور حیا کو بھی۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"من کان عاقلاً کان له دین، و من کان له دین دخل الجنة"

"جو عقلمند ہوگا وہ دیندار بھی ہوگا، اور جو دیندار ہوگا وہ جنّت میں داخل ہوگا"۔

(اسی بناء پر جنّت عقلمندوں کی جگہ ہے)۔ [2]

البتہ عقل یہاں سچی معرفت کے معنی میں ہے نہ کہ شیاطین کی وہ شیطنت جو دنیا کے جابر اور ظالم سیاستدانوں میں نظر آتی ہے کہ جو امام جعفر صادقؑ کے قول کے مطابق:

"شبیهة بالعقل، ولیست بالعقل"

"عقل کے مشابہ ہے لیکن وہ عقل نہیں ہے"۔ [3]

۱۔ ۲۔ ۳۔ اصول کافی مطابق نقل نورالثقلین جلد ۵ ص ۳۸۱

۱۲ إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ○

۱۳ وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ ۖ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ○

۱۴ أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ○

ترجمہ

۱۲ وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے پوشیدہ طور سے ڈرتے ہیں ان کیلئے بخشش اور اجر عظیم ہے۔

۱۳ اپنی گفتگو کو پوشیدہ رکھو یا آشکار کرو (کچھ فرق نہیں ہے) وہ دلوں کی باتوں سے آگاہ ہے۔

۱۴ کیا وہ ہستی کہ جس نے تمام موجودات کو پیدا کیا ہے ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے؟ جب کہ وہ دقیق اسرار سے باخبر اور ہر چیز کا عالم ہے۔

تفسیر

کیا جہان کا خالق جہان کے اسرار سے آگاہ نہیں ہے؟

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قیامت کے روز کفار اور ان کی سرنوشت کے بارے میں بیان ہوئے تھے، زیر بحث آیات میں قرآن مومنین اور ان کی عظیم جزاؤں کو بیان کر رہا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے پنہاں طور پر ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم

ہے:" (ان الذین یخشون ربھم بالغیب لھم مغفرۃ واجر کبیر)۔

"غیب" کی تعبیر یہاں ممکن ہے کہ نادیدہ خدا کی معرفت یا نادیدہ معاد و قیامت یا ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہو۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ شاید یہ پوشیدہ گناہوں کے بارے میں خدا کے خوف کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اگر انسان پوشیدگی میں بھی کوئی گناہ نہ کرے تو وہ بطریق اولیٰ آشکار گناہ نہیں کرے گا۔ یا یہ تعبیر گناہوں سے پرہیز کرنے اور اوامر الٰہی کے انجام دینے میں خلوص نیت کے مقام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ پوشیدہ طور سے کیا ہوا عمل ریا اور دکھاوے سے دور ہوتا ہے۔

ان تفاسیر کے درمیان جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

"مغفرۃ" کی تعبیر کا نکرہ کی صورت میں ہونا اور اس طرح 'اجر کبیر' اس کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ مغفرت اور اجر و پاداش اتنی عظیم ہوگی جو سب کے لیے انجانی ہوگی۔

⁂

اس کے بعد تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "اگر تم اپنی گفتگو پنہاں طور پر یا آشکار کرو، خدا دلوں کی باتوں سے آگاہ ہے۔" (واسروا قولکم او اجھروا بہ انہ علیم بذات الصدور)۔

بعض مفسرین نے ابن عباس سے اس آیت کی ایک شانِ نزول نقل کی ہے کہ کفار یا منافقین کی ایک جماعت پیغمبر خدا کے پس پشت ناروا باتیں کرتی تھی۔ جبرئیل آکر پیغمبر کو خبر دے دیا کرتے تھے۔ تب ان میں سے بعض نے ایک دوسرے سے کہا: "اسروا قولکم" اپنی باتیں پوشیدہ طور پر کیا کرو تاکہ محمد کا خدا نہ سُن لے:" تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور کہا: "چاہے آشکارا باتیں کرو یا پوشیدہ طور پر خدا اُن سے آگاہ ہے۔[1]

بعد والی آیت اس چیز کے لیے جو گزشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے ایک دلیل کے طور پر آئی ہے۔ فرماتا ہے: "کیا وہ ذات جس نے موجودات کو پیدا کیا ہے ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے؟ جبکہ وہ دقیق ترین اسرار سے باخبر اور ہر چیز کا عالم ہے۔" (الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر)۔

"الا یعلم من خلق" کے جملہ کی تفسیر میں کئی احتمال دیے گئے ہیں:

بعض نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ کیا وہ خدا جس نے دلوں کو پیدا کیا ہے، وہ ان کے اندر کے امور سے آگاہ نہیں ہے؟

یا یہ کہا ہے کہ وہ خدا جس نے بندوں کو پیدا کیا ہے، کیا وہ ان بندوں کے اسرار سے بے خبر ہے؟

یا یہ کہا ہے کہ وہ خدا جس نے تمام عالم ہستی کو پیدا کیا ہے وہ تمام جہان کے اسرار سے آگاہ ہے تو کیا وہ

[1] "فخر رازی" جلد ۳ ص ۶۶، مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۸۶ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

انسان جو اس عظیم خلقت میں سے ایک موجود ہے اس کے اسرار خدا سے پوشیدہ ہوں گے؟

بہر حال اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ خدا کی خلقت دائمی ہے۔ یعنی اس کی طرف سے فیض وجود ہر لحظہ مخلوقات کو پہنچ رہا ہے۔ معاملہ اس طرح نہیں ہے کہ وہ انہیں پیدا کرکے ان کی حالت پر چھوڑ دے۔

اصولی طور پر تمام ممکنات (موجودات) اس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا رشتہ اس کی ذات پاک سے منقطع ہو جائے تو وہ فنا کی راہ اختیار کرلیں۔ اس دائمی تعلق اور خلقت کی طرف مسلسل توجہ، ہر زمانہ اور ہر مکان میں تمام موجودات کے اسرار کے بارے میں علم خدا کی ایک بہترین دلیل ہے۔

'لطیف' کے ساتھ خدا کی توصیف اس لحاظ سے ہے کہ لطیف 'لطف' کے مادہ سے ہے۔ وہ ہر دقیق و ظریف موضوع اور ہر قسم کی سریع حرکت اور جسم لطیف کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر خدا کا لطیف ہونا خلقت کے دقیق و ظریف اسرار کے بارے میں اس کے علم کی طرف اشارہ ہے۔ یہ لفظ بعض اوقات اجسام لطیف، خورد بینی ذرات اور ان سے مافوق کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری دلی نیتیں چاہے جتنی پوشیدہ ہوں اور تم اپنی باتوں کو محفلوں میں چاہے جتنا مخفی طور پر کہو یا غلط اعمال خلوت گاہوں میں انجام دو، خداوند لطیف و خبیر ان سب سے آگاہ ہے۔

بعض مفسرین نے 'لطیف' کی تفسیر میں کہا ہے: (ھو الذی یکلف الیسیر ویعطی الکثیر) "وہ ایسی ہستی ہے جو ذمہ داری تو آسان ڈالتی ہے مگر اجر و پاداش فراواں دیتی ہے۔"

حقیقت میں یہ بھی رحمت میں ایک قسم کی ظرافت و دقت ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لطیف کے ساتھ خدا کی توصیف اس بناء پر ہے کہ وہ تمام چیزوں کے اندر نفوذ رکھتا ہے اور سارے جہان میں کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے۔

لیکن یہ سب باتیں ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتی ہیں اور خدا کے علم کی گہرائی اور پوشیدہ و آشکار اسرار پر اس کے علم پر ایک تاکید ہے۔

◆ ◆ ◆

۱۵ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ ۝

۱۶ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ۝

۱۷ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ۝

۱۸ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ۝

ترجمہ

۱۵ وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمھارے لیے رام کر دیا۔ اس کے دوش پر چلو پھرو اور خدا کی روزیوں میں سے کھاؤ اور تم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

۱۶ جو آسمان پر حاکم ہے کیا تم اس کے عذاب سے خود کو امان میں سمجھتے ہو کہ زمین اس کے حکم سے پھٹ جائے اور تمھیں نگل لے اور مسلسل لرزتی اور کانپتی رہے۔

(۱۷) یا تم خداوندِ آسمان کے عذاب سے اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ وہ ایسی آندھی تم پر بھیج دے جو سنگریزوں سے بھری ہوئی ہو اور تم جلدی ہی جان لوگے کہ میری دھمکیاں کیسی ہیں۔

(۱۸) وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انھوں نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی تھی، لیکن (دیکھو) میرا عذاب کیسا تھا؟

تفسیر

کوئی مجبور اس کے عذاب وسزا سے امان میں نہیں ہے۔

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں دوزخیوں، جنتیوں، کافروں اور مومنوں کے بارے میں گزرے ہیں، زیر بحث آیات میں جنتیوں کی صفوں میں جا ملنے کی ترغیب و تشویق اور دوزخیوں کی راہ و رسم سے بچنے کے لیے چند خدائی نعمتوں کا ذکر اور پھر اس کے عذابوں کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمھارے لیے رام کر دیا ہے" (ھو الذی جعل لکم الارض ذلولاً)۔

"پس تم زمین کے دوش پر چلو پھرو، اور پروردگار کی روزیوں میں سے کھاؤ اور جان لو کہ سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ والیہ النشور)۔

"ذلول" رام ہونے کے معنی میں ایک جامع ترین تعبیر ہے جو زمین کے بارے میں ممکن ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ تیز رو سواری بہت ہی تیز اور متعدد حرکات رکھنے کے باوجود ایسی پُرسکون نظر آتی ہے گویا کہ مطلقاً ساکن ہے۔ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ زمین چودہ قسم کی مختلف حرکتیں رکھتی ہے۔ جن میں سے تین اقسام یعنی اس کی اپنے محور پر حرکت، سورج کے گرد حرکت اور منظومہ شمسی کے ہمراہ کہکشاں کے اندر حرکت ہے۔ یہ حرکات جو بہت ہی زیادہ تیز ہیں ایسی نرم اور ملائم ہیں کہ جب تک زمین کی حرکت پر قطعی دلائل قائم نہیں ہوتے تھے، کوئی شخص باور ہی نہیں کرتا تھا کہ اس میں کوئی حرکت ہے۔

دوسری طرف زمین نہ تو اس طرح کی سخت ہے کہ قابلِ زندگی ہی نہ ہو اور نہ ہی اس طرح کی ڈھیلی اور نرم ہے کہ قرار و آرام نہ پکڑتی ہو۔ بلکہ یہ مکمل طور پر انسانی زندگی کے لیے رام ہے۔ مثلاً اگر زمین زیادہ کیچڑ والی ہوتی جس میں ہر چیز دھنس جاتی، یا نرم ریت ہوتی کہ جس میں انسان کے پاؤں گھٹنوں تک دھنس جاتے

یا تیز اور سخت پتھر ہوتے جو تھوڑا سا چلنے سے انسانی بدن کو زخمی کر دیتے تو اس سے زمین کی بے آرامی کے معنی واضح ہو جاتے۔

تیسری طرف اس کا فاصلہ سورج سے نہ تو اتنا کم ہے کہ تمام چیزیں گرمی کی شدت سے جل جائیں اور نہ ہی اتنا زیادہ ہے کہ ہر چیز سردی سے خشک ہو جائے۔ زمین پر ہوا کا دباؤ اس طرح سے ہے جو انسان کو سکون و آرام مہیا کرتا ہے، وہ نہ تو اس قدر زیادہ ہے کہ انسان کا گلا گھونٹ دے اور نہ اس قدر کم ہے کہ وہ پارہ پارہ ہو جائے۔ زمین کی قوت جاذبہ نہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ہڈیوں کو توڑ دے اور نہ ہی اس قدر کم ہے کہ ایک ہی حرکت سے انسان اپنی جگہ سے اکھڑ جائے اور فضا میں جا پڑے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے 'ذلول' اور انسان کے حکم کے آگے مسخر اور رام ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ زمین کے ذلول اور مطیع ہونے کی توصیف کے بعد حکم دیتا ہے کہ اس کے کندھوں پر چلو۔ ہم جانتے ہیں کہ 'مناکب' جمع 'منکب' (بروزن مغرب) کندھے کے معنی میں ہے، گویا انسان زمین کے کندھے پر قدم رکھتا ہے اور زمین ایسی پرسکون ہے کہ وہ اپنے اعتدال کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک تم قدم نہ اٹھاؤ گے اور سعی و کوشش نہ کرو گے، زمین کی نعمتوں سے بہرہ مند نہ ہو پاؤ گے۔

'رزق' کی تعبیر بھی ایک بہت ہی جامع تعبیر ہے جو زمین کے تمام مواد غذائی کو چاہے وہ حیوانی ہو یا نباتی یا معدنی، سب کو شامل ہے۔

لیکن جان لو کہ یہ تمہاری خلقت کا مقصد اصلی نہیں ہے۔ یہ سب کے سب تو تمہارے "نشور" قیامت اور حیات ابدی کی راہ کے لیے وسائل و ذرائع ہیں۔

* * *

اس تشویق اور بشارت کے بعد تہدید و انذار کی بات کرتا ہے۔ مزید کہتا ہے: "جو آسمان پر حاکم ہے، کیا تم اس کے عذاب سے اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ زمین اس کے حکم سے پھٹ جائے، وہ تمہیں اپنے اندر نگل لے اور ہمیشہ لرزتی اور کانپتی رہے۔" (ءامنتم من فی السماء ان یخسف بکم الارض فاذا هی تمور)۔

ہاں! اگر وہ حکم دے تو یہ مطیع و ساکن زمین سرکش ہو جائے اور وحشی جانور کی صورت اختیار کر لے، زلزلے آنے شروع ہو جائیں، زمین میں شگاف پڑ جائیں اور وہ تمہیں، تمہارے گھروں اور شہروں کو نگل جائے اور پھر بھی لرزتی اور کانپتی رہے۔

"فاذا هی تمور" (وہ ہمیشہ لرزتی رہے اور بے سکون رہے) کا جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ خدا یہ حکم دے سکتا ہے کہ زمین تمہیں نگل جائے اور تمہیں مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے اندر

ہی اندر منتقل کرتی رہے۔ یہاں تک کہ تمہاری قبر بھی ساکن اور بغیر حرکت کے نہ ہو۔
یا یہ ہے کہ زمین اپنے سکون و آرام کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھے اور اس میں ہمیشہ زلزلے آتے رہیں۔
اس معنی کا ادراک ان لوگوں کے لیے آسان ہے جنہوں نے بعض زلزلہ خیز علاقوں میں زندگی بسر کی ہے۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات زمین کئی کئی دن اور راتیں بالکل بے سکون و بے آرام رہتی ہے۔ تب ان سب کا کھانا پینا، سونا اور آرام کرنا ختم ہو جاتا ہے لیکن ہم لوگوں کے لیے جنہوں نے عادتاً زمین کے آرام و سکون ہی کو دیکھا ہے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔
"من فی السماء (وہ جو آسمان میں ہے)" کی تعبیر خدا کی ذات پاک کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی حاکمیت زمین تو کیا آسمانوں پر بھی مسلّم ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ خدا کے فرشتوں کی طرف اشارہ ہے جو آسمانوں میں ہیں اور اس کے فرمان کے اجراء پر مامور ہیں۔

◆ ◆ ◆

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ضروری نہیں ہے کہ حتمی طور پر زلزلے ہی تمہاری طرف آئیں، بلکہ وہ یہ فرمان تند آندھیوں کو دے سکتا ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ آسمانوں کا حاکم خدا ایسی تیز آندھی جو سنگریزوں سے پُر ہو تم پر بھیج دے اور تمہیں اس پہاڑ کے نیچے دفن کر دے؟" (ام امنتم من فی السماء ان یرسل علیکم حاصبًا)۔
"اور تم جلدی ہی جان لو گے کہ میری تہدیدیں (اور دھمکیاں) کیسی ہیں"۔ (فستعلمون کیف نذیر)۔
اس معنی کا ادراک ان لوگوں کے لیے بہت آسان ہے جنہوں نے چلتی ہوئی ریت اور حاصب ہوائیں دیکھی ہیں۔ (یہ ہوائیں ریت کے جو تودے اپنے ساتھ لے جاتی ہیں انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں) وہ جانتے ہیں کہ چند ہی لمحوں کے اندر گھر اور آبادیاں رواں ریت کے تودوں کے نیچے دفن ہو سکتی ہیں یا وہ قافلے جو بیابان کے وسط میں چل رہے ہوتے ہیں اس کے نیچے دفن ہو سکتے ہیں۔

◆ ◆ ◆

حقیقت میں اوپر والی آیات اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ عذاب قیامت کے عذاب میں منحصر نہیں ہے۔ اس دنیا میں خدا زمین کی مختصر سی حرکت یا آندھیوں کے چلنے سے ان کی زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔ اس امکان کی بہترین دلیل گزشتہ امتوں میں ان امور کا واقع ہونا ہے:
لہٰذا آخری زیر بحث آیت میں کہتا ہے:
"وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انہوں نے خدا کی آیات اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی تھی لیکن دیکھو میری دی ہوئی سزا اور عذاب ان کے حق میں کیسا تھا؟" (ولقد کذب الذین من قبلھم فکیف کان نکیر)۔ ۱؎

(حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

ایک گروہ کو تباہ کرنے والے زلزلوں سے، کچھ قوموں کو بجلیوں سے اور ایک جماعت کو طوفان یا تیز آندھیوں کے ذریعہ سزا دی، اور ان کے تباہ شدہ خاموش شہروں کو ہم نے درسِ عبرت کے طور باقی رہنے دیا۔

* * *

(حاشیہ سابقہ صفحہ) ۱؎ نکیر انکار کے معنی میں ہے اور یہاں عذاب و سزا سے کنایہ ہے کیونکہ خدا کا انکار ان قوموں کے اعمال کے مقابلہ میں ان کی سزا کے طریقہ سے صورت پذیر ہوا۔ اس بات پر توجہ رہے کہ یہ لفظ نکیری تھا جیسا کہ گزشتہ آیت میں لفظ نذیر نذیری تھا (میرا انکار اور میرا ڈرانا) "یاء" متکلم حذف ہو گئی اور زیر جو اس پر دلالت کرتی ہے باقی رہ گئی۔

(۱۹) أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ ○

(۲۰) أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ ○

(۲۱) أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَلْ لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ ○

ترجمہ

(۱۹) کیا انھوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا، جو ان کے سروں کے اوپر کبھی اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں؟ خدائے رحمٰن کے سوا کوئی انھیں آسمان کی بلندی پر روکے ہوئے نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

(۲۰) کیا وہ جو تمھارا لشکر ہے وہ خدا کے مقابلہ میں تمھاری مدد کر سکتا ہے؟ لیکن کافر تو صرف دھوکہ میں ہیں۔

(۲۱) کیا وہ جو تمھیں روزی دیتا ہے اگر وہ اپنی روزی روک لے تو تمھاری ضروریات کو کون پورا کر سکتا ہے؟ لیکن وہ تو سرکشی اور حقیقت سے فرار کرتے ہوئے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں۔

تفسیر

اپنے سر کے اوپر ان پرندوں کی طرف دیکھو

اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں جب خدا کی قدرت اور مالکیت کے بارے میں بحث تھی تو سات آسمانوں ، ان کے ستاروں اور کواکب کے بارے میں گفتگو تھی ۔لیکن یہاں پہلی زیر بحث آیت میں اسی مسئلۂ قدرت کو عالم ہستی کے بظاہر ایک چھوٹے سے موجود کے ذکر کے ذریعہ بیان کیا جا رہا ہے ۔فرماتا ہے : "کیا انہوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو ان کے سروں کے اوپر کبھی اپنے پروں کو پھیلا ئے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں؟" (اولم یروا الی الطیر فوقھم صافات و یقبضن)۔ [1]

یہ سنگین جسم قانون جاذبہ کے برخلاف زمین سے اٹھتے ہیں اور آرام کے ساتھ آسمان کی بلندی پر گھنٹوں تک اور بعض اوقات ہفتوں اور مہینوں تک مسلسل اپنی سریع اور نرم حرکت کو جاری رکھتے ہیں، اور انھیں اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

پرواز کرتے وقت اکثر پرندے اپنے پروں کو کھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ "صافات" گویا ایک پُر اسرار قوت انھیں چلا رہی ہوتی ہے۔

جبکہ بعض ہمیشہ پر مارتے رہتے ہیں۔(ممکن ہے یقبضن اسی معنی کی طرف اشارہ ہو)

بعض دوسرے کبھی پر مارتے ہیں، اور کبھی پروں کو پھیلا لیتے ہیں۔

چوتھا گروہ ایک مدت تک پر مارتا ہے اور جب تیزی پکڑ لیتا ہے تو اپنے پروں کو کلی طور پر سمیٹ لیتا ہے اور فضا کے سمندر میں غوطہ لگا لیتا ہے (مثلاً چڑیا) خلاصہ یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ سب پرواز کرتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔

ان کے جسم کو کس نے اس طرح سے پیدا کیا ہے کہ وہ آرام و سکون کے ساتھ فضا میں سیر کرتے ہیں؟ ان کے پروں کو یہ قدرت کس نے عطا کی اور انھیں پرواز کا علم سکھایا ہے ؟ خصوصاً مہاجر پرندوں کی پیچیدہ قسم کی اجتماعی پرواز جو بعض اوقات کئی کئی ماہ تک طول کھینچتی ہے اور ہزاروں کلومیٹر کا راستہ طے کر کے بہت سے ملکوں ، پہاڑوں ، دروں ، جنگلوں اور سمندروں کے اوپر سے گزر کر اپنے مقصد تک پہنچتے ہیں۔ واقعاً ایسی قوت

---

[1] "الطیر" طائر کی جمع ہے۔ اسی لیے اس کا فعل اور صفت جمع کی صورت میں آیا ہے۔ بعض نے جو یہ تصور کیا ہے کہ طیر مفرد ہے تو یہ ارباب لغت کی تصریح کے خلاف ہے۔

اور آگاہی انھیں کس نے عطا کی ہے ؟

لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدائے رحمٰن کے سوا کوئی انھیں آسمان کی بلندی پر روکے ہوئے نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور ہر مخلوق کی نیاز اور حاجت کو جانتا ہے۔" (ما یمسکھن الا الرحمٰن انہ بکل شیء بصیر)۔

وہی تو ہے کہ جس نے انھیں پرواز کے لیے مختلف وسائل اور استعدادیں عطا کی ہیں۔ ہاں ! خدائے رحمٰن جس کی رحمتِ عامہ نے تمام موجودات کو گھیرا ہوا ہے اسی نے پرندوں کو بھی ان کی ضرورت کی چیزیں بخشی ہیں۔ جو ہستی آسمان اور فضا میں پرندوں کو روکے ہوئے ہے، وہی زمین اور دوسری موجودات کی بھی نگہدار ہے۔ جب وہ ارادہ کرلے تو نہ پرندہ پرواز کر سکتا ہے اور نہ ہی زمین اپنے سکون کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

"صافات" و "یقبضن" (پروں کو پھیلاتے اور سمیٹتے ہیں) کی تعبیر، ممکن ہے مختلف پرندوں کی طرف یا ایک ہی پرندہ کے مختلف حالات کی طرف اشارہ ہو۔[1]

ہم نے پرندوں کی دنیا اور ان کی پرواز کے عجائبات کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورۂ نحل کی آیت ۷۹ کے ذیل میں) تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

بعد والی آیت میں اس معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کفار خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کسی قسم کا کوئی یار و مددگار نہیں رکھتے، فرماتا ہے: "کیا وہ جو تمھارا لشکر ہے، وہ خدا کے مقابلہ میں تمھاری مدد کرسکتا ہے؟" (امن ھٰذا الذی ھو جند لکم ینصرکم من دون الرحمٰن)[2]

نہ صرف یہ کہ وہ مصیبتوں میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ اگر وہ چاہے تو انھیں کو تمھارے عذاب اور نابودی پر مقرر کر دے۔ کیا پانی، ہوا، مٹی اور آگ تمھارے خدمت گزار اور تمھاری زندگی کے ارکان نہیں ہیں ؟ لیکن خدا نے انھیں کو سرکش اقوام کی نابودی پر مامور کر دیا۔ نیز تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات محفوظ ہیں کہ بادشاہوں، فراعنہ اور سرکش حکمرانوں کے نزدیک ترین افراد ہی ان کی موت کا سبب بن گئے، موجودہ زمانہ کی تاریخ میں بھی یہ ماجرا دیکھنے میں آیا ہے کہ حکومتوں کی وفادار ترین طاقتوں نے ہی ان کے خلاف بغاوت کردی، اور ان کی موت کا فرمان جاری کیا۔

---

[1] اس بارے میں کہ "صافات" وصفی صورت میں اور "یقبضن" فعل مضارع کی صورت میں آیا ہے، ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ پروں کا پھیلانا ایک خاص انداز ہے جبکہ کھولنا اور بند کرنا پروں کی تکرار ہے۔

[2] "ام" اس جملہ میں حرفِ عطف ہے۔ "من" مبتدا، "ھٰذا" دوسرا مبتدا اور "الذی" اس کی خبر ہے۔ "ھو جند لکم" اس کا صلہ ہے اور "ینصرکم" "جند" کی صفت اور جملہ کے پہلے مبتدا کی خبر ہے (البیان فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۴۵۹)، لیکن مناسب یہ ہے کہ الذی عطف بیان ہو اور "ینصرکم" خبر ہو، کیونکہ اس کے بغیر جملہ ناقص ہے۔ (غور کیجیے)

لیکن کافر صرف دھوکہ، فریب اور غفلت میں گرفتار ہیں" (ان الکافرون الا فی غرور)۔

دھوکہ، فریب اور جہالت کے پردے ان کی عقلوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تاریخ کے صفحات پر یا اپنی زندگی کے گوشہ وکنار میں یہ درس عبرت دیکھیں۔

"جند" اصل میں ناہموار اور ایسی سخت زمین کے معنی میں ہے جس میں بہت زیادہ پتھر جمع ہو گئے ہوں۔ اسی مناسبت سے بہت زیادہ لشکر کو بھی "جند" کہتے ہیں۔

بعض مفسرین زیر بحث آیت میں جند کو بتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ وہ قیامت میں مشرکین کی مدد پر ہرگز قدرت نہیں رکھتے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور وہ بت بھی اس کا ایک مصداق ہو سکتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

پھر مزید تاکید کے لیے کہتا ہے: "کیا وہ ہستی جو تمہیں روزی دیتی ہے، اگر وہ اپنی روزی تم سے روک لے تو تمہیں کون بے نیاز کر سکتا ہے"؟ (امن ھذا الذی یرزقکم ان امسک رزقہ)[1]

اگر وہ آسمان کو حکم دے دے کہ وہ بارش نہ برسائے اور زمین سبزہ نہ اُگائے یا مختلف قسم کی نباتی آفات پھلوں کو نابود کر دیں تو کس میں یہ طاقت ہے کہ تمہارے لیے کوئی غذا مہیا کر دے؟ نیز اگر وہ معنوی روزیاں اور آسمانی وحی تم سے منقطع کر لے تو کس میں یہ طاقت ہے کہ تمہاری راہنمائی کرے؟

یہ واضح حقائق ہیں، لیکن ہٹ دھرمی اور گستاخی انسان کے ادراک اور شعور کے آگے ایک حجاب بن جاتی ہے۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے:

"لیکن وہ تو سرکشی اور حقیقت سے فرار کرتے ہوئے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں": (بل لجوا فی عتو ونفور)۔

اس موجودہ زمانہ میں بھی جبکہ انسان کی زندگی کے مختلف جہات میں، خصوصاً غذائی مصنوعات میں بہت ہی ترقی ہو چکی ہے، اگر صرف ایک ہی سال کے لیے مطلقاً بارش نہ ہو تو ساری دنیا میں کیسی مصیبت کھڑی ہو جائے گی، یا ٹڈی دَل کا لشکر اور آفاتِ نباتی ہر جگہ کو گھیر لیں تو کیسی مصیبت واقع ہو جائے گی۔

❖ ❖ ❖

---

[1] آیت میں جزاء کی شرط محذوف ہے اور تقدیر اس طرح ہے: "ان امسک رزقہ من یرزقکم غیرہ" (اگر وہ اپنا رزق روک لے تو اس کے علاوہ کون تمہیں رزق دے گا؟)

ایک نکتہ

انسانوں کی ناکامی کے چار عوامل

گزشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ سننے والا کان اور بیدار عقل کا نہ ہونا، وہ اہم ترین عامل ہے، جو دوزخیوں کو دوزخ کی طرف کھینچ کر لے جائے گا۔ زیرِ بحث آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ دوسرے چار عوامل یعنی "دھوکہ و فریب"، "ہٹ دھرمی"، "سرکشی" (عتو) اور "حق سے دوری اختیار کرنا" (نفور) انسان کی بدبختی اور گمراہی کا سبب ہیں۔

اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ یہ عوامل گزشتہ عوامل کے ساتھ مربوط ہیں۔ کیونکہ یہ بُری صفات انسان کے کان اور آنکھ پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اس کے لیے حقائق کے ادراک سے مانع ہو جاتی ہیں۔

* * *

۲۲ أَفَمَنْ يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّنْ يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۞

۲۳ قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ۞

۲۴ قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۞

۲۵ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۞

۲۶ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ ۖ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُبِينٌ ۞

۲۷ فَلَمَّا رَأَوْهُ زُلْفَةً سِيئَتْ وُجُوهُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَقِيلَ هَٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهِ تَدَّعُونَ ۞

ترجمہ

۲۲ کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرا ہوا چل رہا ہو ہدایت کے زیادہ نزدیک ہے یا وہ شخص جو راست قامت صراط مستقیم پر گامزن ہے؟

(۲۳) کہہ دیجئے وہی تو ہے کہ جس نے تمھیں پیدا کیا ہے ، اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل قرار دیئے ، لیکن تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔

(۲۴) کہہ دیجئے کہ وہی تو ہے کہ جس نے تمھیں زمین میں پیدا کیا ، اور اسی کی طرف تم لوٹ جاؤ گے۔

(۲۵) وہ کہتے یہ ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہو گا۔

(۲۶) کہہ دیجئے کہ اس کا علم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے ، اور میں تو صرف واضح و آشکار ڈرانے والا ہوں۔

(۲۷) جس وقت اس وعدۂ الٰہی کو قریب سے دیکھیں گے تو کافروں کے چہرے قبیح اور سیاہ ہو جائیں گے اور انھیں کہا جائے گا ، یہ وہی چیز ہے جس کا تم تقاضا کیا کرتے تھے۔

تفسیر

شاہراہِ توحید کے راست قامت افراد

گزشتہ آیات کے بعد پہلی زیرِ بحث آیت میں کفار و مومنین کے ان دونوں گروہوں کی حالت کی کیفیت ایک عمدہ مثال کے ضمن میں منعکس کرتے ہوئے فرماتا ہے : " کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرا ہوا چل رہا ہے ، ہدایت کے زیادہ نزدیک ہے یا وہ شخص جو راست قامت صراطِ مستقیم پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے"۔ (افمن یمشی مکبًّا علٰی وجھہ اھدٰی امّن یمشی سویًّا علٰی صراط مستقیم)۔

یہاں بے ایمان ، ظالم ، ہٹ دھرم اور فریبی لوگوں کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ناہموار اور پیچ و خم سے پُر راہ سے گزر رہا ہو ، وہ منہ کے بل گرا ہوا ہو ، اور ہاتھ پاؤں سے یا سینہ کے بل چل رہا ہو ، نہ ٹھیک طرح سے راستہ دیکھ سکتا ہو اور نہ ہی اپنے اوپر نظر کر سکتا ہو ، نہ رکاوٹوں سے باخبر ہو اور نہ ہی سرعت اور تیزی سے چل سکتا ہو ، تھوڑا سا رستہ چلتا ہو اور پھر تھک جاتا ہو۔

لیکن مومنین کو ایسے راست قامت افراد سے تشبیہ دیتا ہے جو ہموار، صاف اور سیدھے راستے پر سرعت، قدرت اور پوری آگاہی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہوں۔

کتنی عمدہ اور دقیق تشبیہ ہے، جس کے آثار ان دونوں گروہوں میں مکمل طور پر نمایاں ہیں اور ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔

بعض نے ان دو گروہوں کا مظہر پیغمبر اسلامؐ اور ابوجہل کو شمار کیا ہے۔ یقیناً یہ دونوں اوپر والی آیت کے روشن اور واضح مصداق ہیں، لیکن آیت کے مفہوم کی عمومیت کو محدود نہیں کرتے۔

"مکبًّا علٰی وجھہ" میں کئی ایک احتمال دیئے گئے ہیں:

جو تفسیر اس کے لغوی مفہوم کے ساتھ زیادہ سازگار ہے وہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے یعنی وہ ایسا شخص ہے جو منہ کے بل گرا ہوا ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے سینہ کے بل چل رہا ہو۔

لیکن بعض نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سیدھا چل رہا ہے لیکن سر نیچے کیے ہوئے ہے اور اپنے راستے کو کسی طرح سے نہیں دیکھتا۔

جبکہ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنے اعتدال کو محفوظ نہیں رکھتا، چند قدم چلتا ہے اور زمین پر گر پڑتا ہے، پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور مسلسل اسی کیفیت کی تکرار کرتا رہتا ہے۔

راغب کے مفردات میں بعض کلمات سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے، اس سے مراد ایسا شخص ہے جس کی پوری توجہ اپنی ہی وضع و کیفیت کی طرف ہے اور وہ اپنے غیر سے غافل ہے لیکن پہلا معنی مومنین کی وضع کے مقابلہ کے قرینہ سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ اس کی "سویا" سے تعبیر ہوئی ہے۔

بہر حال کیا کافر و مومن کی یہ وضع و کیفیت آخرت میں ہوگی؟ یا دونوں جہانوں میں؟ آیت کے معنی کے محدود ہونے پر کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ دنیاوی زندگی میں بھی اسی طرح ہوں گے اور آخرت میں بھی۔

ہاں! بے ایمان افراد چونکہ خودخواہ، خود پرست اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور اپنے مادی اور جلد گزر جانے والے منافع کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتے۔ چونکہ ان کی راہ ایک ہوا پرست کی راہ ہے۔ لہٰذا وہ اس شخص کی مانند ہیں جو سنگلاخ زمین سے گزرتے ہیں اور سینہ کے بل ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے رینگتے ہیں، لیکن وہ لوگ جو ایمان کے سائے میں ہوائے نفس کی قید سے چھوٹ چکے ہیں وہ ایک گہری بصیرت اور صاف و واضح راستہ رکھتے ہیں۔

◆ ◆ ◆

بعد والی آیت میں پیغمبرؐ کو مخاطب کر کے مزید کہتا ہے: "کہہ دیجئے، وہی تو ہے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل قرار دیئے ہیں لیکن تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو"۔ (قل ھو

الذی انشأکم وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ قلیلاً ما تشکرون)۔

خدا نے مشاہدے اور تجربے کا ذریعہ اور وسیلہ (آنکھ) بھی تمھارے اختیار میں قرار دی۔ دوسروں کے افکار سے آگاہی کا ذریعہ (کان) اور علوم عقلیہ میں غور و فکر کرنے کا ذریعہ (قلب) بھی دیا۔ خلاصہ یہ کہ سب قسم کے عقلی و نقلی علوم سے آگاہی کے لیے تمام ضروری آلات تمھارے اختیار میں دے دیئے ہیں۔ لیکن ان تمام عظیم نعمتوں کا بہت کم لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ شکرِ نعمت یہ ہے کہ ہر نعمت کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ کیا واقعاً سب لوگ کان، آنکھ اور عقل سے اسی طریقہ سے استفادہ کرتے ہیں۔؟

* * *

پھر دوبارہ پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کہہ دیجئے وہی تو ہے جس نے تمھیں زمین میں پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے اور اسی کے پاس تم جمع ہو گے"۔ (قل ھو الذی ذرأکم فی الارض والیہ تحشرون)۔

حقیقت میں پہلی آیت راستے کو مشخص کرتی ہے اور دوسری آیت کام کے آلات و وسائل کو اور یہ آیۃ ہدف و مقصد کو کہ اسلام و ایمان کے سیدھے راستے اور صراطِ مستقیم میں قدم آگے بڑھاؤ، معرفت اور شناخت کے تمام آلات سے فائدہ اٹھاؤ اور جاودانی زندگی کی طرف چل پڑو۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں انشأکم کی تعبیر ہوئی ہے اور اس آیت میں "ذرأکم" آیا، ممکن ہے ان دونوں تعبیروں کا فرق اس بات میں ہو کہ پہلا جملہ تو انسان کو عدم سے وجود میں لانے کی طرف اشارہ ہو (یعنی تم نہیں تھے اور خدا نے تمھیں پیدا کیا ہے) نیز دوسرا جملہ مادۂ خاکی سے انسان کی پیدائش کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی ہم نے تمھیں خاک سے پیدا کیا ہے۔

* * *

اس کے بعد اسی رابطہ میں منکرینِ معاد کی گفتگو اور ان کا مطالبہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ استہزاء کے طور پر کہتے ہیں، اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ قیامت کا وعدہ کس وقت پورا ہو گا"۔ (ویقولون متٰی ھٰذا الوعد ان کنتم صادقین)۔

تم اس کی کوئی یقینی تاریخ معین کیوں نہیں کرتے؟ اور اس لحاظ سے تم سب کی ذمہ داری واضح کیوں نہیں کرتے ہو۔

ھٰذا الوعد سے کیا مراد ہے۔ اس کے دو احتمال بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا قیامت کا وعدہ، دوسرا دنیا کی گوناگوں سزاؤں کا وعدہ، مثلاً زلزلے، صاعقے، بجلیاں اور طوفان۔ لیکن گزشتہ آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ اگرچہ دونوں معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

بعد والی آیت میں انھیں اس طرح جواب دیتا ہے : "کہہ دیجئے اس موضوع کا علم و آگہی تو خدا ہی کے ساتھ مختص ہے اور میں تو صرف واضح و آشکار انذار کرنے والا اور ڈرانے والا ہوں" (قل انما العلم عند الله وانما انا نذیر مبین)۔

یہ تعبیر ٹھیک اسی چیز کے مشابہ ہے جو قرآن کی متعدد آیات میں آئی ہے۔ منجملہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۷ میں آیا ہے : "قل انما علمها عند ربی" کہہ دیجئے کہ قیامت کے وقوع کے زمانہ کا علم صرف میرے پروردگار کے پاس ہے۔

❊ ❊ ❊

اور ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ اگر قیامت کی تاریخ معلوم ہوتی اور اس کا عرصہ اور فاصلہ زیادہ ہوتا تو لوگ غفلت میں پڑ جاتے اگر وہ عرصہ کم ہوتا تو اضطرار جیسی حالت پیدا کر لیتے اور دونوں حالتوں میں تربیتی اہداف نامکمل رہ جاتے۔

❊ ❊ ❊

آخری زیر بحث آیت میں مزید کہتا ہے : "جس وقت اس وعدۂ الٰہی اور عذاب کو قریب سے مشاہدہ کریں گے تو کافروں کے چہرے قبیح اور سیاہ ہو جائیں گے" جیسا کہ غم واندوہ کے آثار ان سے برس رہے ہیں۔ (فلما راوہ زلفة سیئت وجوہ الذین کفروا)۔

اور ان سے کہا جائے گا : "یہ وہی چیز ہے جس کا تم تقاضا کیا کرتے تھے۔" (وقیل هذا الذی کنتم به تدعون)۔

"تدعون" دُعا کے مادہ سے ہے۔ یعنی تم ہمیشہ اصرار اور تقاضا کیا کرتے تھے کہ قیامت واقع ہو، اب وہ واقع ہو گئی ہے۔ اور اس سے راہِ فرار ممکن نہیں ہے۔[1]

یہ مضمون حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ ذاریات کی آیت ۱۴ میں کفار کو مخاطب کرتے ہوئے آیا ہے کہ قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا :

"هذا الذی کنتم به تستعجلون" "یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے۔"

بہرحال یہ عذاب قیامت کے بارے میں ہی بیان کر رہی ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے کہا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حتی هذا الوعد کا جملہ بھی قیامت کے وعدہ کی طرف اشارہ ہے۔

❊ ❊ ❊

---

[1] تدعون "باب افتعال" سے اور "دعاء" کے مادہ سے تقاضا کرنے کے معنی میں ہے یا دعوا کے مادہ سے تقاضا یا کسی چیز سے انکار کرنے کے معنی میں ہے۔

حاکم ابوالقاسم حسکانی کہتا ہے :

"جب کافروں نے خدا کے ہاں امام علیؑ کے مقامات کو مشاہدہ کیا
تو ان کے چہرے (غیظ و غضب کی شدت سے) سیاہ ہو گئے۔[1]

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے بھی یہی مطلب نقل ہوا ہے کہ یہ آیت امیرالمومنین علیؑ اور آپ کے یار و انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔[2]

البتہ یہ تفسیر جو شیعہ اور اہل سنت کے طرق سے نقل ہوئی ہے ایک قسم کی تطبیق کے قبیل سے ہے ورنہ آیت کا محل وقوع معاد و قیامت کے ساتھ مربوط ہے اور اس قسم کی تطبیقیں روایات میں کچھ کم نہیں۔

* * *

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۰

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۸۵

(۲۸) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِيَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

(۲۹) قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

(۳۰) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۝

ترجمہ

(۲۸) کہہ دیجئے: اگر خدا مجھے اور ان تمام لوگوں کو جو میرے ساتھ ہیں ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کر دے تو بھی کافروں کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا؟

(۲۹) کہہ دیجئے: وہ خدا رحمٰن ہے، ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکّل کیا ہے، اور عنقریب تم جان لوگے کہ کون شخص واضح گمراہی میں ہے۔

(۳۰) کہہ دیجئے: مجھے بتاؤ اگر تمہاری (سرزمین کے) پانی زمین کے اندر چلے جائیں تو کون تمہارے لیے جاری پانی لا سکتا ہے؟

تفسیر

جاری پانی تمہارے اختیار میں کون دیتا ہے؟

اوپر والی آیات جو سورۂ ملک کی آخری آیات ہیں اور وہ سب لفظ "قل" سے (جو پیغمبرؐ کو خطاب ہے) شروع ہوتی ہیں، انھیں باتوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو گزشتہ آیات میں کفار کے ساتھ ہوئی ہیں اور ان کے دوسرے پہلو ان آیات میں بیان ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے ان لوگوں کے بارے میں کہ جو غالباً پیغمبرؐ اور ان کے اصحاب کی موت کے انتظار میں تھے۔ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ آپ کی وفات سے آپ کا دین ختم ہو جائے گا اور باقی کچھ نہ رہے گا۔ (عام طور پر شکست خوردہ دشمن سچے رہبروں کے بارے میں ہمیشہ یہی توقع رکھتے ہیں) فرماتا ہے: "کہہ دیجیے اگر خدا مجھے اور ان تمام کو جو میرے ساتھ ہیں ختم کر دے یا ہم پر رحم کرے تو بھی کفار کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا؟" (قل ارأیتم ان اھلکنی اللہ ومن معی او رحمنا فمن یجیر الکافرین من عذاب الیم)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ کفار مکہ پیغمبرؐ اسلام اور مسلمانوں کے لیے بددعا (نفرین) کیا کرتے اور ان کی موت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، ان کا گمان یہ تھا کہ اگر آنحضرتؐ دنیا سے چلے جائیں تو آپ کی دعوت بھی ختم ہو جائے گی، تب اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا۔

اسی معنی کے مشابہ سورۂ طور کی آیت ٣٠ میں بھی آیا ہے، جہاں کہتا ہے: ام یقولون شاعر نتربص بہ ریب المنون "وہ کہتے ہیں کہ محمد (ص) ایک شاعر ہے جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں"۔

وہ اس بات سے غافل ہیں کہ محمد مصطفیٰؐ سے الطاف حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر وہ مر بھی جائیں تو اس سے حق کا پیغام نہیں مرے گا۔ ہاں! اس دین کی کامیابی اور تمام جہان پر اس کے غلبہ کا انھیں وعدہ دیا گیا ہے، اور پیغمبر اکرمؐ کی حیات اور موت کسی چیز کو نہیں بدلے گی۔

بعض نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے کہ خدا پیغمبرؐ سے یہ فرما رہا ہے: "کہہ دیجئے، ہم خدا پر ایمان رکھنے کی بنا پر خوف و رجاء کے درمیان ہیں، تم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہو۔؟"

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

◆ ◆ ◆

اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ان سے کہہ دیجئے کہ وہ خداوند رحمٰن ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہے، اور عنقریب تم جان لوگے کہ واضح گمراہی میں کون ہے۔" (قل ھو

الرحمٰن آمنا بہ و علیہ توکلنا فستعلمون من ھو فی ضلال مبین)۔

یعنی اگر ہم خدا پر ایمان لے آئے ہیں اور اسے اپنا ولی، وکیل اور سرپرست سمجھا ہے تو اس کی دلیل واضح ہے، وہ خدائے رحمٰن ہے۔ اس کی رحمت عمومی ہر جگہ پہنچی ہوئی ہے اور اس کے انعام کے فیض نے دوست اور دشمن سب کو گھیر رکھا ہے کہ عالم ہستی اور صفحۂ زندگی پر مختصر سی نگاہ اس مدعا کی شاہد ہے۔ لیکن تمہارے معبودوں نے کون سا کام کیا ہے؟ اگرچہ تمہاری ضلالت و گمراہی اسی سے واضح ہے لیکن آخرت میں اور زیادہ واضح ہو جائے گی، یا اس دنیا میں جب اسلام خدائی امدادوں سے لشکر کفر پر کامیاب ہو جاتے گا تو اس معجزانہ کامیابی سے حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

یہ آیت حقیقت میں پیغمبر اسلام اور مومنین کے لیے ایک قسم کی تسلی ہے کہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ حق و باطل کے اس مبارزہ میں تنہا ہیں، بلکہ بخشنے والا اور مہربان خدا ان کا یار و مددگار ہے۔

◆ ◆ ◆

آخری آیت میں خدا کی رحمتِ عامّہ کے ایک مصداق کے ذکر کے عنوان سے کہ جس سے لوگ غافل ہیں، کہتا ہے: "کہہ دیجیئے: مجھے بتاؤ وہ پانی جس سے تم استفادہ کر رہے ہو، اگر وہ زمین کے اندر دور تک میں چلا جائے تو کون تمہارے لیے جاری پانی لا سکتا ہے؟" (قل ارءیتم ان اصبح ماؤکم غورا فمن یاتیکم بماء معین)۔

ہم جانتے ہیں کہ زمین دو قسم کے مختلف قشروں سے بنی ہے۔ "نفوذ پذیر قشر" جو پانی کو اپنے اندر لے جاتا ہے اور اس کے نیچے "نفوذ ناپذیر" قشر ہے جو پانی کو وہیں محفوظ رکھتا ہے۔ تمام چشمے، کنوئیں، ندی، نالے اسی خاص ترکیب کی برکت سے وجود میں آئے ہیں۔ کیونکہ اگر تمام روئے زمین زیادہ گہرائیوں تک نفوذ پذیر قشر ہوتی تو پانی اتنا نیچے چلا جاتا کہ ہرگز اس تک کسی کی رسائی نہ ہوتی۔ اگر وہ ساری کی ساری نفوذ ناپذیر ہوتی تو روئے زمین کے تمام پانی اس کے اوپر ہی کھڑے رہتے اور دلدل اور کیچڑ میں تبدیل ہو جاتے یا جلدی سمندروں میں جا پڑتے اور اس طرح سے پانی کے زیر زمین ذخیرے ہاتھ سے نکل جاتے۔

خدا کی رحمت کا یہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے کہ جس سے انسان کی موت و حیات شدت کے ساتھ وابستہ ہے۔

"معین"۔ "معن" (بروزن "طعن") کے مادہ سے پانی کے جاری ہونے کے معنی میں ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ "عین" سے لیا گیا اور اس کی میم زائدہ ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے معین کو اس پانی کے معنی میں لیا ہے جو آنکھ سے دیکھا جا سکے اگرچہ وہ جاری نہ ہو۔

لیکن اکثر نے اس کی جاری پانی کے معنی میں ہی تفسیر کی ہے۔

اگرچہ وہ پانی جو پیا جاتا ہے وہ جاری پانی میں منحصر نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جاری پانی ان کی بہترین قسم شمار ہوتا ہے، چاہے وہ دریا، نہروں، ندی، نالوں اور ابلنے والے کنوؤں کی صورت میں ہو۔

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جب ایک کافر نے یہ آیت سُنی جو یہ کہتی ہے: "اگر تمہارے استعمال میں آنے والا پانی زمین کی تہ میں چلا جائے تو کون تمہارے لیے آب جاری لا دے گا؟" تو اس نے کہا "رجال شداد ومعاول حداد!" (طاقتور مرد اور تیز کدال) پانی کو زمین کی گہرائیوں میں سے نکال لائیں گے۔ لیکن رات کو جب وہ سویا تو اس کی آنکھ میں آب سیاہ (کالا موتیا) اتر آیا، اس حال میں اس نے ایک آواز سُنی جو کہہ رہی تھی: "ان قوی پنجہ مردوں اور تیز کدالوں کو لے آ، تاکہ وہ اس پانی کو تیری آنکھ سے باہر نکالیں"۔

لیکن موجودہ زمانہ میں ہم جانتے ہیں کہ اگر زمین کا "نفوذ ناپذیر" قشر ختم ہو جائے تو کوئی قوی پنجہ انسان اور تیز کدال پانی کو نہیں نکال سکتا۔[1]

⁂ ⁂ ⁂

ایک نکتہ

جو روایات کہ ائمہ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں اس آخری آیت کی حضرت مہدیؑ کے ظہور اور ان کے وسیع عالمی عدل کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے، منجملہ ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے:

"نزلت فی الامام القائم، یقول ان اصبح امامکم غائبا عنکم لا تدرون این هو؟ فمن یأتیکم بامام ظاهر یأتیکم باخبار السماوات والارض وحلال الله وحرامه، ثم قال والله ماجاء تأویل هٰذه الآیة ولابد ان یجیء تأویلها۔"

"یہ آیت اس امام کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو عدل الٰہی کے ساتھ قیام کرے گا (حضرت مہدیؑ) وہ کہتا ہے کہ اگر تمہارا امام غائب ہو جائے اور تمہیں معلوم نہ ہو کہ وہاں کہاں ہے تو کون تمہارے لیے امام کو بھیجے گا جو آسمانوں اور زمین کی خبریں، اور خدا کے حلال و حرام کو تمہارے لیے بیان کرے؟" اس کے بعد فرمایا "خدا کی قسم اس آیت کی تاویل ابھی تک نہیں آئی اور بالآخر یہ آکر رہے گی۔"[2]

اس سلسلہ میں روایات بہت زیادہ ہیں لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ سب تطبیق کے طور پر ہیں دوسرے لفظوں میں آیت کا ظاہر تو جاری پانی کے ساتھ ہی مربوط ہے جو زندہ موجودات کی حیات و زندگی کا باعث ہے مگر آیت کا باطن امام کے وجود اور ان کے وسیع علم و عدالت کے ساتھ مربوط ہے کیونکہ وہ بھی انسانی معاشرے

---

[1] ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۲۱۹

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۸۴

کی حیات کا سبب ہے۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ آیاتِ قرآنی کے متعدد معانی اور ان کا ظاہر و باطن ہوتا ہے لیکن ہم اس نکتہ کا بھی تاکید کے ساتھ تکرار کرتے ہیں کہ بطون آیات کی تہ تک پہنچنا اور انھیں معلوم کرنا سوائے پیغمبرؐ اور امام معصوم کے ممکن نہیں اور کسی شخص کو حق نہیں ہے کہ کسی چیز کو آیت کے باطن کے عنوان سے اپنی طرف سے پیش کرے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ آیات کے ظواہر کے ساتھ مربوط ہے اور جو چیز بطون آیات کے ساتھ مربوط ہے وہ ہمیں صرف معصومینؑ ہی سے سننا چاہیے۔

* * *

سورہ ملک خدا کی حاکمیت و مالکیت سے شروع ہوئی اور اس کی رحمانیت پر کہ جو اس کی حاکمیت اور مالکیت کی ایک شاخ ہے ختم ہو رہی ہے۔ اس طرح سے اس کا آغاز و انجام مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔

خداوندا! ہمیں اپنی عام اور خاص رحمت کا مشمول قرار دے اور اپنے اولیاء کی ولایت کے آب حیات سے سیراب فرما۔

پروردگارا! حضرت مہدیؑ کا ظہور جلد فرما کہ جو آب حیات کا سرچشمہ ہے۔ ہاں ان کے جمال کے متوالوں کو ان کے ظہور سے سیراب کر دے۔

بارالٰہا! تو نے ہمیں دیکھنے والی آنکھ، سننے والے کان اور سمجھنے والی عقل مرحمت فرمائی ہے۔ پس خود خواہی اور غرور کے پردوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دے تاکہ ہم حقیقت کے چہرے کو جس طرح کا وہ ہے اسی طرح سے دیکھ سکیں اور تیری ہدایت کے صراطِ مستقیم میں راست قامت ہو کر قدم بڑھائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

* * *

سورۂ ملک کا اختتام

۱۲ رشوال ۱۴۰۶ھ

۳/ ۳/ ۱۳۶۵ ش

ترجمہ کا اختتام

بروز جمعرات ۱۰ ذی الحجہ، عید قربان ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۶ راگست ۱۹۸۷ء بوقت ½ ۱۰ بجے شب

۸۱ ای، ماڈل ٹاؤن : لاہور

سورۃ القلم

یہ سورۃ مکہ میں نازل ہوا اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز ۲۰ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

سورۂ قلم کے مضامین

اگرچہ بعض مفسرین نے اس تمام سورہ کے مکی ہونے پر شک کیا ہے یا ان کا نظریہ ہے کہ اس کا ایک حصّہ مدینہ میں اور ایک حصّہ مکہ میں نازل ہوا ہے۔ لیکن سورہ کا لب و لہجہ اور آیات کا مضمون مکمل طور پر مکی سورتوں سے ہم آہنگ ہے کیونکہ یہ سب سے زیادہ پیغمبر اسلامؐ کی نبوت اور ان دشمنوں سے مبارزہ، جو آپ کو مجنون کہتے تھے، صبر و استقامت کی دعوت اور مخالفین کو عذابِ الٰہی سے انذار و تہدید کے مسئلہ کے محور پر ہی گردش کرتی ہے۔

مجموعی طور پر اس سورۃ کے مضامین کو سات حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱: سب سے پہلے رسولِ خداؐ کی مخصوص صفات کے ایک حصّہ کے ذکر خصوصاً آپ کے عمدہ اخلاق کو پیش کرتا ہے اور ان کی مؤکد قسموں کے ساتھ تاکید کرتا ہے۔

۲: اس کے بعد آپ کے دشمنوں کی قبیح صفات اور مذموم اخلاق کے ایک حصّہ کو پیش کرتا ہے۔

۳: ایک اور حصّہ میں "اصحٰب الجنّة" کی داستان، جو حقیقت میں قبیح سیرت مشرکین کے لیے ایک تنبیہ ہے، بیان کرتا ہے۔

۴: ایک اور حصّہ میں قیامت اور اس دن کفار کے عذاب سے متعلق گوناگوں مطالب بیان ہوتے ہیں۔

۵: ایک اور حصّہ میں مشرکین کے لیے انذار اور تہدید و تخویف کا بیان ہے۔

۶: ایک اور حصّہ میں پیغمبر اسلامؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ کٹر دشمنوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کریں۔

۷: پھر سورہ کے آخر میں بھی قرآن کی عظمت اور پیغمبرؐ کے خلاف دشمنوں کی مختلف سازشوں کے بارے میں گفتگو ہے۔

اس سورہ کے لیے قلم کے نام کا انتخاب اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔ بعض نے اس کا نام سورۃ ن بھی ذکر کیا ہے۔ بعض روایات، جو اس سورہ کی فضیلت میں آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سورہ کا نام ن، والقلم ہے۔

تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من قرأ سورة 'ن والقلم' اعطاه الله ثواب الذين حسن اخلاقهم"۔

"جو شخص سورۂ ن والقلم کی تلاوت کرے گا، خدا اس کو ان لوگوں کا ثواب دے گا جو حسن اخلاق کے حامل ہیں"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من قرأ سورة "ن والقلم" فی فریضة او نافلة آمنه الله ان یصیبه فی حیاته فقر ابدا، و اعاذه اذا مات من ضمة القبر ان شاء الله"۔

"جو شخص سورۂ ن والقلم کو واجب یا مستحب نماز میں پڑھے گا خدا اسے ہمیشہ کے لیے فقر و فاقہ سے امان میں رکھے گا اور جب وہ مرے گا تو انشاء اللہ اسے فشارِ قبر سے امان دے گا"۔[2]

ان ثوابوں کا سورہ کے مضامین کے ساتھ خاص تناسب ہے۔ اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یہاں مقصد وہ تلاوت ہے جو علم و آگہی کے ساتھ ہو اور اس کے بعد اس پر عمل بھی ہو۔

❖ ❖ ❖

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۸۸

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝

(۲) مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝

(۳) وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝

(۴) وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝

(۵) فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝

(۶) بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝

(۷) اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

ترجمہ

خدائے رحمٰن و رحیم کے نام سے۔

(۱) ن، قسم ہے قلم کی اور اس کی جو کہ وہ قلم سے لکھتے ہیں۔

(۲) اپنے پروردگار کی نعمت سے تو مجنون نہیں ہے۔

(۳) اور تیرے لیے عظیم اور ہمیشہ رہنے والا اجر و ثواب ہے۔

(۴) اور تیرے اخلاق بہت ہی عمدہ اور عظیم ہیں۔

۵. اور عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔

۶. کہ تم میں سے کون مجنون ہے۔

۷. تیرا پروردگار ہر شخص سے بہتر جانتا ہے کہ اس کی راہ سے کون شخص گمراہ ہوا ہے اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے۔

تیرے اخلاق کتنے عمدہ ہیں!

یہ واحد سورہ ہے جو حرف مقطع ن سے شروع ہوا ہے۔ فرماتا ہے :(ن)۔

ہم نے حروف مقطعات کے بارے میں بارہا اور خصوصاً سورۂ بقرہ، "آلِ عمران" اور "اعراف" (تفسیر نمونہ جلد ۱، ۲، ۶) میں اس سے متعلق بحث کی ہے۔ جو چیز اب یہاں بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ بعض نے یہاں ن کو لفظ رحمٰن کا مخفف اور اس کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ بعض نے اس کی 'لوح' کے معنی میں یا 'دوات' کے معنی میں یا جنت کی ایک نہر کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ لیکن ان تفسیروں میں سے کوئی بھی واضح قرینہ اور شاہد نہیں رکھتی۔

اس بناء پر اس حرف مقطع کی تفسیر ان تمام حروف مقطع سے الگ نہیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد انسانی زندگی کے مسائل میں سے دو اہم موضوعات کی قسم کھاتے ہوئے مزید کہتا ہے: "قسم ہے قلم کی اور اس کی جسے وہ قلم کے ساتھ لکھتے ہیں" (والقلم وما یسطرون)۔

کیسی عجیب و غریب قسم ہے؟ حقیقت میں وہ چیز جس کی یہاں قسم کھائی گئی ہے۔ ظاہراً ایک چھوٹا سا موضوع ہے۔ سرکنڈے کا ایک ٹکڑا یا اس کے مشابہ کوئی چیز اور کچھ سیاہ رنگ کا مادہ اور اس کے بعد وہ سطریں جو معمولی کاغذ کے صفحہ پر لکھی جاتی ہیں۔

لیکن حقیقت میں یہ وہی چیز ہے جو تمام انسانی تمدنوں کی پیدائش، علوم کی پیش رفت، افکار کی بیداری، مذاہب کے تشکیل پانے کا سرچشمہ اور نوع بشر کی آگاہی اور ہدایت کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ انسانی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کر دیتا ہے۔ "تاریخی دور" اور "تاریخ سے پہلے کا دور"۔ تاریخ بشر کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے خط اور تحریر ایجاد ہوئے اور انسان اپنی زندگی کے واقعات کو صفحات پر نقش کرنے کے

قابل ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ دور جس میں انسان نے قلم کو ہاتھ میں لیا ہے اور اس سے "مایسطرون" یادگار کے طور پر رہ گیا ہے۔

اس قسم کی عظمت اس وقت زیادہ آشکار ہوتی ہے جب ہم اس بات کی طرف توجہ کریں کہ جس دن یہ آیات نازل ہوئیں، اس وقت لکھنے والے اور اہل قلم اس ماحول میں موجود نہ تھے۔ اگر کچھ تھوڑے بہت لوگ لکھنے پڑھنے کی کچھ آگاہی اور علم رکھتے بھی تھے تو ان کی تعداد سرزمین مکہ میں، جو حجاز کا عبادتی، سیاسی اور اقتصادی مرکز تھا، بیس افراد تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔ ہاں ایسے ماحول میں قلم کی قسم کھانا ایک خاص عظمت رکھتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے: ان پہلی آیات میں بھی جو جبل النور اور غارِ حرا میں پیغمبر کے پاک دل پر نازل ہوئی تھیں قلم کے بلند مقام کی طرف اشارہ ہوا ہے، جہاں فرماتا ہے:

"اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاکرم۔ الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم یعلم۔"

"اپنے پروردگار کے نام سے پڑھیے، جس نے مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اور انسان کو بستہ اور جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، اپنے عظیم پروردگار کے نام سے پڑھیے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا اُسے وہ سکھایا۔ (علق ۱: ۵)

سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں اس شخص کی زبان سے ادا ہو رہی تھیں جس نے خود (عالم ظاہر میں) کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی، کبھی مدرسہ نہیں گیا تھا اور کوئی تحریر نہیں لکھی تھی۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وحی آسمانی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں "قلم" کی اس قلم سے تفسیر کی ہے جس سے خدا کے عظیم فرشتے وحی آسمانی کو لکھتے ہیں یا جس سے انسانوں کے اعمال نامے رقم کرتے ہیں، لیکن مسلّم طور پر یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور یہ تفسیر اس کے ایک مصداق کو بیان کرتی ہے، جیسا کہ "مایسطرون" بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اور انسان کی عملی، اخلاقی اور فکری ہدایت اور تکامل و ارتقاء کے لیے جو کچھ بھی لکھتے ہیں ان سب کو شامل ہے۔ فقط وحی آسمانی یا انسانوں کے اعمال میں منحصر نہیں ہے۔[۱]

* * *

اس کے بعد اس چیز کو، جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کی نعمت سے تو مجنون نہیں ہے"۔ (ما انت بنعمة ربك بمجنون)۔

وہ لوگ جو یہ ناروا نسبت تیری طرف دیتے ہیں مل کے ایسے اندھے ہیں جو تیرے بارے میں خدا کی ان تمام نعمتوں کو نہیں دیکھتے، نعمت عقل و درایت، نعمت امانت و صدق و راستی، نعمت علم و دانش اور مقام نبوت

(حاشیہ [۱] اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اور مقامِ عصمت۔

دیوانے تو وہ ہیں جو عقلِ کل کے مظہر کو جنون کے ساتھ متہم کرتے ہیں اور انسانوں کے رہبر و رہنما کو اس ناروا نسبت کے ذریعہ اپنے سے دور کر رہے ہیں۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "تیرے لیے عظیم اور ہمیشہ رہنے والا اجر و ثواب ہے۔" (و ان لک لاجرا غیر ممنون)۔

تیرے لیے ایسا اجر و ثواب کیوں نہ ہو؟ جبکہ تو ایسی قبیح اور ناروا تہمتوں کے مقابلہ میں استقامت ظاہر کرتا ہے، ان کے لیے ہدایت و نجات کی آرزو رکھتا ہے اور اس راستے میں سعی و کوشش کرنے سے تھکتا نہیں ہے۔

"ممنون"۔ "من" کے مادہ سے "منقطع" ہونے کے معنی میں ہے۔ یعنی ایسا اجر و پاداش جو ہرگز منقطع نہیں ہوگا اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس معنی کی اصل اور ریشہ منت سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ منت، نعمت کے قطع ہونے کا باعث ہوتی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ غیر ممنون سے مراد یہ ہے کہ خدا اس اجرِ عظیم کے مقابلہ میں تجھ پر ہرگز منت نہیں رکھتا لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

* * *

بعد والی آیت پیغمبرؐ کی ایک اور صفت کے بارے میں کہتی ہے: "تو عظیم اور عمدہ اخلاق کا حامل ہے۔" (و انک لعلٰی خلق عظیم)۔

ایسے اخلاق جن کے مقابل عقل حیران ہے۔ بے نظیر لطف و محبت، بے مثل صفا و صمیمیت اور توصیف سے باہر صبر و استقامت اور تحمل و حوصلہ۔

اگر تو لوگوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دیتا ہے تو سب سے زیادہ عبادت بھی کرتا ہے۔ اگر برے کام سے روکتا ہے تو سب سے پہلے خود اس کام سے رکتا ہے، وہ تجھے تکلیف پہنچاتے ہیں اور تو پند و نصیحت کرتا ہے۔ وہ تجھے برا بھلا کہتے ہیں اور تو ان کے لیے دعا کرتا ہے، وہ تیرے جسم پر پتھر مارتے ہیں اور گرم مٹی تیرے سر پر پھینکتے ہیں لیکن تو ان کی ہدایت کے لیے بارگاہِ خدا میں ہاتھ اٹھاتا ہے۔

ہاں! تو محبت اور مہربانیوں کا مرکز اور رحمت کا سرچشمہ ہے۔

(حاشیہ صفحہ سابقہ) "ما یسطرون" کے "ما" کو بعض تو ما مصدریہ سمجھتے ہیں اور بعض ما موصولہ لیکن دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ یہ تقدیر میں اس طرح ہے "وما یسطرونہ" بعض اس کو لوح یا کاغذ کے معنی میں سمجھتے ہیں کہ جس پر کتابت کی جاتی ہے اور تقدیر میں یسطرون فیہ ہے۔ بعض نے یہاں قدم کو مقتول اور ان افراد کی طرف اشارہ کہا ہے جو ان سطور کو لکھتے ہیں لیکن وہی معنی زیادہ مناسب ہے جو ہم نے متن میں ذکر کیا ہے۔

"تخلق" "خلقت" کے مادہ سے ایسی صفات کے معنی میں ہے جو انسان سے جدا نہیں ہوتے اور وہ انسان کی خلقت و آفرینش کے مانند ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے پیغمبرؐ کے خلق عظیم کی راہ حق میں صبر و استقامت، سخاوت و بخشش میں وسعت، تدبیر امور، رفق و مدارا، خدا کی طرف دعوت کی راہ میں سختیوں کا برداشت کرنا، عفو و درگزر، پروردگار کی راہ میں جہاد اور حسد و حرص کو ترک کرنے کے ساتھ" تفسیر کی ہے۔ اگرچہ یہ سب کی سب صفات پیغمبرؐ میں موجود تھیں لیکن آپ کا خلق عظیم صرف انہیں میں منحصر نہیں تھا۔

بعض تفاسیر میں "خلق عظیم" کی قرآن یا دین اسلام کے ساتھ بھی تفسیر کی گئی ہے جو اوپر والے وسیع مفہوم کا ایک مصداق ہو سکتی ہے۔ بہرحال پیغمبرؐ میں اس "خلق عظیم" کا ہونا آنحضرتؐ کی عقل و درایت اور دشمنوں کی طرف سے دی گئی نسبتوں کی نفی پر ایک واضح دلیل ہے۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔" (فستبصر و یبصرون)۔

* * *

"کہ تم میں سے کون مجنون ہے۔" (بایکم المفتون)[1]

"مفتون" "فتنہ" سے اسم مفعول ہے جو ابتلاء کے معنی میں ہے اور یہاں جنون میں مبتلا ہونے کے معنی میں ہے۔

ہاں! وہ آج یہ ناروا نسبت تیری طرف دیتے ہیں تاکہ بندگانِ خدا کو تجھ سے دور کردیں، لیکن لوگ عقل و شعور رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تیری تعلیمات اور ارشادات سے آگاہی حاصل کریں گے۔ اس وقت یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا کہ یہ عمدہ تعلیمات خدائے عظیم کی طرف سے تیرے پاک اور نورانی دل پر نازل ہوئی ہیں اور خدا نے عقل و علم کا ایک عظیم حصہ تجھے بخشا ہے۔

مستقبل میں تیری تحریکیں اور طریق کار اور ان کے سایہ میں اسلام کی پیش رفت اور سریع نفوذ بھی اس بات کی نشاندہی کردے گا کہ تو عقل و درایت کا ایک عظیم منبع ہے۔ دیوانے تو وہ چمگادڑ ہیں جو اس آفتاب کے قد سے جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

پھر قیامت میں تو یہ حقائق یقینی طور پر اور بھی زیادہ روشن اور زیادہ واضح و آشکار ہو جائیں گے۔

* * *

---

[1] "بایکم" میں "با" زائدہ ہے اور "ایکم" قبل کے دو افعال کا مفعول ہے۔

نیز مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: "تیرا پروردگار سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کی راہ سے کون شخص گمراہ ہوا ہے اور ہدایت پانے والوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے" (ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ و ھو اعلم بالمھتدین)۔

کیونکہ یہ راستہ اسی کا راستہ ہے اور وہ اپنی راہ کو ہر شخص سے بہتر پہچانتا ہے۔ گویا اس طرح پیغمبر اسلامؐ کو زیادہ سے زیادہ اطمینان دلاتا ہے کہ وہ ہدایت کے راستہ پر ہیں اور ان کے دشمن ضلالت و گمراہی کی راہ پر ہیں۔

ایک مستند حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت قریش نے دیکھا کہ پیغمبر علیؑ کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور ان کی تعظیم اور احترام کرتے ہیں تو انھوں نے امام علیؑ کی مذمت شروع کر دی اور کہا کہ محمدؐ اس کا مفتون اور اس پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ اس موقع پر خدا نے نٓ والقلم نازل فرمایا اور قسم کھا کر کہا کہ اے محمدؐ! تو مفتون و مجنون نہیں ہے۔ یہاں تک فرمایا: خدا ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو گمراہ ہو گئے ہیں (یہ قریش کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو یہ باتیں کرتے تھے) اور خدا ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی بہتر طور سے جانتا ہے۔ (یہ امام علیؑ کی طرف اشارہ ہے)۔ [۱]

• • •

چند نکات

۱: انسانی زندگی میں قلم کا نقش و اثر

نوع بشر کی زندگی کا اہم ترین مرحلہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، خط کا پیدا ہونا اور قلم کا کاغذ یا پتھر پر چلنا تھا۔ یہ وہی وقت تھا کہ جس نے تاریخ کے دور کو ماقبل تاریخ سے جدا کر دیا۔

کاغذ کے صفحہ پر نوک قلم کی گردش بشر کی سرنوشت کو رقم کرتی ہے۔ لہٰذا انسانی معاشروں کی کامیابی اور شکست نوک قلم سے وابستہ ہے۔

قلم علوم و معارف کا محافظ، مفکرین کے افکار کا پاسدار، علماء کے فکری اتصال کی کڑی اور نوع بشر کے ماضی و حال کے ارتباط کے لیے ایک پُل ہے۔ یہاں تک کہ آسمان و زمین کا ارتباط بھی لوح و قلم کے ذریعہ ہی ہوا ہے۔

قلم ان انسانوں کو جو زمان و مکان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں، ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔ گویا تمام طول تاریخ اور تمام روئے زمین کے سب مفکرین نوع بشر کو

---

[۱] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۴ (طبرسی نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ اہل سنت سے نقل کیا ہے)۔

ایک کتابچہ عظیم میں دیکھ لیں گے۔

قلم رازدار بشر ہے۔ خزانہ دار علوم ہے۔ قرون و اعصار کے تجربات کو جمع کرنے والا ہے۔ اگر قرآن اس کی قسم کھاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ کیونکہ قسم ہمیشہ ایک بہت ہی عظیم اور قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی کھائی جاتی ہے۔

البتہ "قلم" "ما یسطرون" (تحریروں) کے لیے ایک وسیلہ ہے اور قرآن نے دونوں کی قسم کھائی ہے، یعنی آلہ کی بھی اور آلہ کے محصول کی بھی۔

بعض روایات میں آیا ہے :

ان اول ما خلق الله القلم

پہلی چیز جو خدا نے خلق کی وہ قلم تھا۔

اس حدیث کو شیعہ محدثین نے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے۔[1] نیز یہ اہل سنت کی کتابوں میں بھی ایک مشہور خبر کے عنوان سے آئی ہے۔[2]

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے :

"اول ما خلق الله تعالیٰ جوهرة"

پہلی چیز جس کو خدا نے خلق کیا وہ ایک گوہر تھا۔[3]

بعض اخبار میں یہ بھی آیا ہے :

"ان اول ما خلق الله العقل"

پہلی چیز جسے خدا نے خلق فرمایا وہ عقل تھی۔[4]

اس وصف کے تعلق کی طرف توجہ جو "گوہر"، "قلم" اور "عقل" کے درمیان ہے، ان سب کے اول ہونے کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے۔

جو حدیث ہم نے اوپر امام صادقؑ سے نقل کی اس میں آیا ہے کہ خدا نے قلم کو پیدا کرنے کے بعد اس سے فرمایا: "لکھ!" اور اس نے جو کچھ تھا اور جو قیامت کے دن تک ہوگا سب کچھ لکھ دیا۔

اگرچہ اس روایت میں قلم سے قلم تقدیر اور قضا و قدر کی طرف اشارہ ہے، لیکن چاہے جو کچھ بھی ہے بشر کی سرنوشت اور اس کے مقدرات میں قلم کے نقش و اثر کو واضح کرتی ہے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۸۹ حدیث ۹

[2] [3] تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۷۸

[4] تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۷۸

پیشوایان اسلام متعدد احادیث میں اپنے اصحاب کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ اپنے حافظے پر قناعت نہ کریں اور احادیث اسلامی اور علوم الٰہی کو رشتۂ تحریر میں لاکر آنے والے لوگوں کے لیے یادگار کے طور پر چھوڑ جائیں۔[1]

بعض علماء نے کہا ہے:

"البیان بیانان: بیان اللسان، وبیان البنان، وبیان اللسان تدرسہ الاعوام، وبیان الاقلام باق علی مر الایام"

"بیان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ زبان کا بیان اور قلم کا بیان۔ زبان کا بیان تو زمانہ اور سالوں کے گزرنے سے کہنہ اور پرانا ہو جاتا اور ختم ہو جاتا ہے لیکن قلموں کا بیان ابد تک باقی رہتا ہے:[2]

یہ بھی کہا گیا ہے:

"ان قوام امور الدین والدنیا بشیئین القلم والسیف والسیف تحت القلم"

"دین و دنیا کے امور کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ قلم و شمشیر، اور شمشیر قلم کے زیر سایہ قرار پاتی ہے۔[3]

اس معنی کو بعض شعرائے عرب نے اس طرح نظم کیا ہے:

کذا قضی اللہ للاقلام مذ بریت

ان السیوف لھا مذ ارھفت خدم

خدا نے قلم کے لیے اسی روز سے جب سے وہ بنایا گیا ہے

اسی طرح مقدر کیا ہے۔

کہ تیز دھار تلواریں اس کی خدمت گزار ہوں۔

(یہ تعبیر قلم کے چاقو کے ذریعہ تراشے جانے کی طرف نیز تلواروں کا ابتداء کار سے قلم کی خدمت میں ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے)[4]

ایک دوسرا شاعر، زیر بحث آیات کے استناد کے ساتھ اس سلسلہ میں کہتا ہے:

اذا اقسم الابطال یوما بسیفھم

وعدوہ مما یجلب المجد والکرم

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۵۶ (حدیث ۱۳، ۱۴، ۱۶، ۱۸، ۱۹، ۲۰)

[2-4] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۲

کفی قلم الکتاب فخرا و رفعة

مدی الدھر ان اللہ اقسم بالقلم

"جس دن بہادر جنگجو لوگ اپنی تلواروں کی قسم کھائیں اور انھیں بزرگی اور افتخار کے اسباب میں سے شمار کریں تو لکھنے والوں کے قلم کے لیے عالم کے تمام زمانوں میں یہی اعزاز اور سربلندی کافی ہے کہ خدا نے قلم کی قسم کھائی ہے۔ (نہ کہ تلوار کی) [1]

واقعاً یہی بات ہے۔ کیونکہ فوجی کامیابیوں کی اگر قومی تمدن کے ذریعہ ضمانت نہ ہو تو وہ ہرگز پائیدار نہ ہوں گی۔ مغلوں نے ایران کی تاریخ میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی لیکن چونکہ وہ ایک ایسی قوم تھی جس کا کوئی تمدن نہیں تھا، لہٰذا وہ جلدی ہی اسلام اور ایران کے تمدن میں تحلیل ہو گئے اور انھوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔

اگرچہ یہ بحث بڑی وسیع ہے لیکن اس بناء پر کہ ہم تفسیر کے راستہ سے باہر نہ ہو جائیں اس بحث کو پیغمبر اسلام کی ایک بہت ہی پُر معنی حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"ثلاث تخرق الحجب، وتنتھی الی ما بین یدی اللہ: صریر اقلام العلماء، ووطی اقدام المجاھدین وصوت مغازل المحصنات":

"تین آوازیں ایسی ہیں جو حجابوں کو توڑ کر خدا کی باعظمت بارگاہ میں پہنچ جاتی ہیں۔ لکھتے وقت علماء کے قلموں کے چلنے کی آواز، میدان جہاد میں مجاہدین کے قدموں کی چاپ، اور پاک دامن عورتوں کے چرخوں کی آواز"۔ [2]

البتہ جو کچھ بیان ہوا ہے یہ سب ان قلموں کے بارے میں ہے جو حق و عدالت کی راہ اور صراط مستقیم میں چلتی ہیں ــــــ لیکن مسموم، زہریلے اور گمراہ کرنے والے تو انسانی معاشروں کے لیے عظیم ترین بلا اور بہت بڑا خطرہ ہوتے ہیں۔

❊ ❊ ❊

---

[1] روح البیان جلد ۱۰ ص ۱۰۲

[2] الشہاب فی الحکم والآداب ص ۲۰

۲ : پیغمبرؐ کے اخلاق کا ایک نمونہ

پیغمبر اسلامؐ کی کامیابی اگرچہ خدائی تائید و امداد کے ساتھ ہوئی تھی، لیکن آپ ظاہری لحاظ سے بھی اس کے لیے کئی عوامل رکھتے تھے جن میں سے اہم ترین پیغمبرؐ کا جاذبہ اخلاقی تھا۔ اعلیٰ انسانی صفات اور مکارم اخلاق آپ میں اس طرح سے جمع تھے جو سخت ترین دشمنوں کو بھی متاثر کر دیتے، انھیں سرِ تسلیم خم کرنے پر ابھارتے اور دوستوں میں شدید جذب و محبت پیدا کر دیتے تھے۔

بلکہ اگر ہم اسے پیغمبرؐ کا اخلاقی معجزہ کہیں تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس اخلاقی معجزہ کا ایک نمونہ فتح مکہ میں نمایاں ہوا جب وہ خونخوار اور جرائم پیشہ مشرکین کہ جنہوں نے سالہا سال تک اسلام اور پیغمبرؐ کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کی تھی، مسلمانوں کے چنگل میں گرفتار ہوئے تو پیغمبر اسلامؐ نے دوستوں اور دشمنوں کے تمام اندازوں کے برخلاف ان کے لیے عام معافی کا فرمان جاری کر دیا، اور ان کے تمام جرائم کو معاف کر دیا۔ یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ "یدخلون فی دین اللہ افواجا" کے مصداق بن کر فوج در فوج مسلمان ہو جائیں۔

پیغمبرؐ کے حُسنِ خلق، عفو و درگزر، عطوفت و مہربانی، ایثار و فداکاری اور تقویٰ و پرہیزگاری کے بارے میں تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں بہت زیادہ واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ ان سب کا بیان ہمیں تفسیری بحث سے خارج کر دے گا۔ لیکن ہمارے لیے اتنا لکھنا ہی کافی ہے کہ ایک حدیث میں حضرت امام حسینؑ ابن علیؑ سے آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

"میں نے اپنے پدر بزرگوار امیرالمومنین علیؑ سے پیغمبرؐ کی زندگی کی خصوصیات اور آپ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا تو میرے والد نے تفصیل کے ساتھ مجھے جواب دیا۔ اس حدیث کے ایک حصہ میں آیا ہے:

> آپ اپنے پاس بیٹھنے والوں کے ساتھ پیغمبرؐ کی رفتار اس طرح تھی کہ آپ خوشرو، خنداں، خلیق اور نرم رہتے تھے، اور کبھی بھی سخت مزاج، سنگدل، پُرخاش رکھنے والے، سخت زبان، عیب جُو اور تعریف پسند نہ تھے۔ کوئی شخص آپ سے مایوس نہ ہوتا تھا، جو شخص بھی آپ کے گھر کے دروازے پر آتا مایوس و ناامید نہ لوٹتا تھا۔ تین چیزوں کو آپ نے اپنے سے الگ کر رکھا تھا، گفتگو میں جھگڑنا، زیادہ باتیں کرنا، اور ایسے کام میں دخل دینا جو آپ سے مربوط نہ ہو۔ اسی طرح تین چیزوں کو لوگوں کے بارے میں چھوڑ رکھا تھا، کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے، کسی کو سرزنش نہیں کرتے تھے اور لوگوں کے پوشیدہ عیوب اور لغزشوں کی جستجو نہیں کرتے تھے۔ آپ

ہرگز کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے سوائے ان امور کے بارے میں جن میں حصولِ ثواب کی اُمید رکھتے تھے۔ گفتگو ایسی مؤثر ہوتی تھی کہ تمام سننے والے لوگ سکوت اختیار کر لیتے تھے اور اپنی جگہ سے ہلتے تک نہیں تھے۔ جب آپ خاموش ہو جاتے تو پھر وہ لوگ بولتے۔ لیکن وہ آپ کے پاس نزاع اور جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ جب کوئی اجنبی اور ناواقف آدمی سختی سے بات کرتا اور درخواست کرتا تو آپ تحمل سے کام لیتے اور اپنے اصحاب سے فرماتے: جب کسی کو دیکھو کہ وہ کوئی حاجت رکھتا ہے تو اس کی حاجت پوری کرو۔ آپ ہرگز کسی کی بات کو نہیں کاٹتے تھے جب تک کہ اس کی بات ختم نہ ہو جاتی۔" [۱]

ہاں! اگر یہ اخلاق کریمہ اور یہ ملکات فاضلہ نہ ہوتے تو وہ پسماندہ اور جاہل قوم اور وہ سخت اور اثر ناپذیر گروہ آغوشِ اسلام میں ہرگز نہ آتا، اور لانفضوا من حولك کا مصداق بن کر سب پراگندہ ہو جاتے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ یہ اسلامی اخلاق آج زندہ ہوں اور ہر مسلمان میں پیغمبر اسلامؐ کے اخلاق و عادات کا عکس نظر آئے۔

اس سلسلہ میں اسلامی روایات بھی چاہے وہ خود پیغمبرؐ کے بارے میں ہوں یا سب مسلمانوں کی ذمہ داری کے بارے میں، بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند روایات کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

۱: "انما بعثت لاتمم مكارم الاخلاق"

"میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ اخلاقی فضائل کی تکمیل کروں۔" [۲]

اسی طرح پیغمبرؐ کی بعثت کا ایک اصلی ہدف یہی اخلاق فاضلہ کی تکمیل ہے۔

ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے:

۲: "انما المؤمن ليدرك بحسن خلقه درجة قائم الليل وصائم النهار" [۳]

"مومن اپنے حُسنِ خلق کی وجہ سے اس شخص کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے جو راتوں کو عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور دنوں میں روزے رکھتا ہے۔"

۱۔ معانی الاخبار ص ۸۳ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)
۲۔ ۳۔ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۳

۳ : آنحضرتؐ ہی سے یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"ما من شیء اثقل فی المیزان من خلق حسن"

"کوئی چیز میزانِ عمل میں قیامت کے دن اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی نہیں ہوگی"۔[1]

۴ : آنحضرتؐ سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"احبکم الی اللہ احسنکم اخلاقا الموطؤن اکنافا، الذین یألفون و یؤلفون، و ابغضکم الی اللہ المشاؤن بالنمیمۃ المفرقون بین الاخوان، الملتمسون للبراء العثرات"

"تم سب میں سے خدا کے ہاں زیادہ محبوب وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں، وہی لوگ جو متواضع ہیں، دوسروں سے جوشِ محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کرتے ہیں کہ بھائیوں کے درمیان جدائی ڈال دیں اور بے گناہ لوگوں کے لیے لغزش کی جستجو میں لگے رہتے ہیں"۔[2]

۵ : ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے :

"اکثر ما یدخل الناس الجنۃ تقوی اللہ و حسن الخلق"

"وہ چیز جو سب سے زیادہ لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی، تقویٰ اور حُسنِ خلق ہے"۔[3]

۶ : ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے :

"ان اکمل المؤمنین ایمانا احسنھم خلقا"

"مومنین میں سے اس کا ایمان سب سے بہتر ہے جس کے اخلاق

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۳

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۰

[3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۱۰ (یہی مضمون وسائل الشیعہ جلد ۸ ص ۵۰۴ میں بھی آیا ہے۔ اسی طرح تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۰۷ میں بھی ہے۔)

زیادہ کامل ہیں۔[1]

٧ : ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا سے آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا :

"علیکم بحسن الخلق ، فان حسن الخلق فی الجنة لا محالة و ایاکم و سوء الخلق ۔ فان سوء الخلق فی النار لا محالة."

"تمہارے لیے لازم ہے کہ حسنِ خلق اختیار کرو، کیونکہ حسنِ خلق والا انجام کار جنت میں ہے۔ سوء خلق سے بچو، کیونکہ سوءِ خلق والا انجام کار جہنم میں ہے۔[2]

اوپر والی روایات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حسن خلق جنت کی کلید اور رضائے خدا کے حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے، قدرتِ ایمانی کی نشانی ہے ، دن رات کی عبادتوں کے ہم پلہ ہے اور اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔

❖ ❖ ❖

---

[1] مجمع البیان جلد ١٠ ص ١٠٨

[2] وسائل الشیعہ جلد ٨ ص ٥٠٦ حدیث ٢١

(۸) فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ ○

(۹) وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ○

(۱۰) وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ○

(۱۱) هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ○

(۱۲) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ○

(۱۳) عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ○

(۱۴) أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ○

(۱۵) إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ○

(۱۶) سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ ○

ترجمہ

(۸) اب جب کہ یہ بات ہے تو تکذیب کرنے والوں کی اطاعت نہ کرو۔

(۹) وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرمی اختیار کرو تاکہ وہ بھی کچھ نرمی کریں (ایسی نرمی جو راہِ حق سے انحراف کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔)

(۱۰) اور ایسے پست اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے آدمی کی اطاعت نہ کرو۔

(۱۱) جو بہت ہی زیادہ عیب جو اور چغلخور ہے۔

(۱۲) نیک کاموں میں بہت زیادہ رُکاوٹیں ڈالنے والا، تجاوز گر اور گنہگار ہے۔

(۱۳) اور ان سب باتوں کے علاوہ کینہ پرور، پُرخور، سخت مزاج اور بدنام ہے۔

(۱۴) کہیں ایسا نہ ہو کہ صاحب مال اور زیادہ اولاد ہونے کی وجہ سے اس کی پیروی کرنے لگو۔

(۱۵) جب ہماری آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کے بے فائدہ افسانے ہیں۔

(۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر ننگ و عار کا داغ اور نشانی لگا دیں گے۔

ایسی صفات والوں کی پیروی نہ کرو

پیغمبرؐ کے عظیم اخلاق کا ذکر کرنے کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئے تھے، ان آیات میں ان کے دشمنوں کے اخلاق کو بیان کر رہا ہے تاکہ ان میں موازنہ کرنے سے ان دونوں کا فرق کامل طور سے آشکار ہو جائے۔

پہلے فرماتا ہے: "تکذیب کرنے والوں کی (جو خدا، پیغمبرؐ، قیامت کے دن اور خدا کے دین کی تکذیب کرتے ہیں)، اطاعت اور پیروی نہ کرو" (فلا تطع المکذبین)۔

وہ خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے لوگ ہیں اور انھوں نے حق کے تمام اصول اپنے پاؤں تلے روند ڈالے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صرف ایک بات میں اطاعت بھی گمراہی اور بدبختی کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔

* * *

اس کے بعد پیغمبرؐ کو اپنے ساتھ ملانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی ساز باز میں ان کی کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرمی اختیار کرو تاکہ وہ بھی کچھ نرمی کریں۔" (ودوا لو تدھن فیدھنون)۔

نرمی اور جھکاؤ کا معنی یہ ہے کہ ان کی خدا کے فرامین کے ایک حصہ سے صرف نظر کرے۔

مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب رؤساء مکہ نے پیغمبرؐ کو اپنے بزرگوں کے دین، شرک اور بت پرستی کی دعوت دی تو خدا نے آپ کو ان کی اطاعت سے منع کیا۔[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعض دوسروں نے یہ نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ، جو شرک کے بہت بڑے سرغنوں میں سے تھا، اس نے بہت زیادہ مال پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا اور قسم کھائی کہ اگر آپ اپنے دین سے پھر جائیں تو یہ سارا مال آپ کو دے دے گا۔[1]

آیات کے لب و لہجہ اور تاریخوں میں مندرج واقعات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جب دل کے اندھے مشرکین نے دین اسلام کی پیش رفت کی سرعت کا مشاہدہ کیا تو وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ پیغمبرؐ کو کچھ امتیازات دے کر ان سے کچھ امتیازات لے لیں اور انھیں سازش کے ذریعہ اپنی طرف کھینچ لیں۔ جیسا کہ طول تاریخ میں سب ہی طرفداران باطل کا طریقہ رہا ہے۔ لہٰذا کبھی تو بہت زیادہ مال کی، کبھی خوبصورت عورتوں کی اور کبھی اعلیٰ عہدے اور مقام کی پیش کش کرتے۔ حقیقت میں وہ روح پیغمبرؐ کو بھی اپنے وجود کے ترازو میں تول رہے تھے۔

لیکن قرآن پیغمبرؐ کو بار بار خبردار کرتا ہے کہ ان انحرافی پیشکشوں کے مقابلہ میں اپنی طرف سے معمولی سے جھکاؤ کا بھی اظہار نہ کریں اور اہل باطل کی خاطر ہرگز نرمی نہ کریں۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۴۹ میں آیا ہے: "وان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک۔" ان (اہل کتاب) کے درمیان خدا کے نازل کردہ فرمان کے مطابق حکم کرو اور ان کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور اس بات سے ڈرتے رہو کہ وہ تمھیں ان تعلیمات سے جو خدا نے تم پر نازل کی ہیں منحرف نہ کر دیں۔

"یدھنون"۔ "مداھنۃ" کے مادہ سے اصل میں 'دھن' بمعنی روغن لیا گیا ہے اور اس قسم کے موارد میں نرمی کرنے اور جھکاؤ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ تعبیر مذموم اور منافقانہ جھکاؤ کے موارد میں استعمال ہوتی ہے۔

* * *

اس کے بعد دوبارہ ان کی اطاعت سے منع کرتے ہوئے نو مذموم صفات کہ جن میں سے ہر ایک اکیلی ہی اطاعت اور پیروی کرنے سے مانع ہو سکتی ہے، ان کو شمار کرتا اور فرماتا ہے: "اور ایسے لوگوں کی جو پست اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے ہوں اطاعت نہ کرو" (ولا تطع کل حلاف مھین)۔

'حلاف' اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ قسمیں کھاتا ہو اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے قسم کھانے لگے۔ عام طور پر اس قسم کے لوگ اپنی قسموں میں سچے نہیں ہوتے۔

"مھین"۔ "مھانت" سے حقارت و پستی کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس کی کم عقل یا جھوٹے یا بہت

(حاشیہ صفحہ سابقہ) [1] فخر رازی جلد ۳۰ ص ۸۵ و مراغی جلد ۲۹ ص ۳۱

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۱۰

زیادہ شریر افراد کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

◆ ◆ ◆

اس کے بعد مزید کہتا ہے : "وہ شخص جو بہت ہی زیادہ عیب جُو اور چغلخور ہے" (ھمّاز مشّاء بنمیم)۔

"ھمّاز" ۔"ھمز" (بروزن طنز) کے مادہ سے غیبت اور عیب جُوئی کرنے کے معنی میں ہے۔

"مشّاء بنمیم" ایسا شخص جو تعلقات خراب کرنے، فساد پھیلانے اور لوگوں میں دشمنی پیدا کرنے کے لیے آمدورفت رکھتا ہو۔ (اس بات پر توجہ رکھنی چاہیئے کہ یہ دونوں اوصاف صیغۂ مبالغہ کی صورت میں آئے ہیں جو اس قسم کے قبیح کاموں میں ان کے انتہائی اصرار کی ترجمانی کرتے ہیں)

پانچویں چھٹی اور ساتویں صفت میں کہتا ہے : "وہ شخص جو نیک کاموں میں بہت زیادہ رکاوٹیں ڈالنے والا، تجاوز گر اور گنہگار ہے" (مناع للخیر معتد اثیم)۔

نہ صرف خود کوئی اچھا کام نہیں کرتا اور اچھائی کا راستہ نہیں دکھاتا، بلکہ دوسروں کی خیر و برکت کے مقابلہ میں بھی ایک رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک ایسا انسان ہے جو حدود الٰہی اور ان حقوق سے جو خدا نے ہر انسان کے لیے معین کر دیئے ہیں، تجاوز کرنے والا ہے۔ ان صفات کے علاوہ ہر قسم کے گناہ میں بھی آلودہ ہے۔ اس طرح کہ گناہ اس کی طبیعت اور مزاج کا جزو بن چکا ہے۔

◆ ◆ ◆

آخرکار ان کی آٹھویں اور نویں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : "وہ ان سب باتوں کے علاوہ پرخور و بدنام ہے" (عتل بعد ذالک زنیم)۔

"عتل" جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں کہا ہے، ایسے شخص کو کہتے ہیں جو غذا بہت زیادہ کھاتا ہو، ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہو اور دوسروں کو اس سے محروم کر دیتا ہو۔

بعض دوسروں نے "عتل" کو ایک بدخو، کینہ پرور، سخت مزاج انسان یا بے حیا اور بدخلق انسان کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔

"زنیم" ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کا حسب و نسب واضح نہ ہو اور اسے کسی قوم کی طرف نسبت دیتے ہیں، حالانکہ وہ ان میں سے نہیں ہوتا۔ اصل میں "زنمہ" (بروزن قلم) گوسفند کے کان کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ گویا وہ کان کا جز نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔

"بعد ذالک" کی تعبیر اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں صفات سابقہ صفات سے زیادہ قبیح اور مذموم ہیں جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں خدا نے جھٹلانے والوں، ان کی قبیح صفات اور اخلاقِ رذیلہ کی ایسی تصویر کشی کی ہے،

کہ شاید سارے قرآن میں اس کی مثل ونظیر نہ ہو۔ وہ اس طرح سے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اسلام وقرآن کے مخالفین اور پیغمبرؐ کی ذات کے مخالفین خود کس قسم کے لوگ تھے۔ جھوٹے، پست، عیب جو، چغلخور، حد سے تجاوز کرنے والے، گنہگار اور بے اصل ونسب افراد اور واقعاً اس قسم کے افراد کے علاوہ اور کسی سے اس قسم کے عظیم مصلح کی مخالفت کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

♦ ♦ ♦

بعد والی آیت میں خبردار کرتا ہے: "کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وہ زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں، اس بناء پر تم ان کے مقابلہ میں نرم پڑ جاؤ اور سر تسلیم خم کر کے ان کی اطاعت کرنے لگو" (ان کان ذا مال و بنین)۔

اس میں شک نہیں کہ پیغمبرؐ ہرگز ان کی اطاعت و پیروی نہ کرتے، لیکن یہ آیات حقیقت میں اس امر پر ایک تاکید ہیں تاکہ آپ کے مکتب کی راہ اور عملی روش سب پر آشکار ہو جائے اور دوست و دشمن میں سے کوئی بھی شخص اس قسم کی توقع نہ رکھے۔

اس بناء پر اوپر والا جملہ آیت ولا تطع کل حلاف مھین کا تمہ ہے، لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت حقیقت میں ان صفات کی پیدائش کی علت کا بیان ہے۔ یعنی دولت وثروت اور افرادی قوت سے پیدا ہونے والا غرور وتکبر انھیں ان اخلاقی رذائل کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سے بے ایمان دولت مندوں اور قدرت رکھنے والوں میں یہ صفات نظر آتی ہیں۔ لیکن آیات کا لب ولہجہ پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ مناسب ہے، اور اسی وجہ سے اکثر مفسرین نے بھی اس کو انتخاب کیا ہے۔

♦ ♦ ♦

بعد والی آیت میں اس قسم کی پست صفات کے حامل افراد کا آیات الٰہی کے مقابلہ میں عکس العمل دکھاتے ہوئے کہتا ہے: "جب ہماری آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو گذرے ہوئے لوگوں کے بے فائدہ افسانے ہیں" (اذا تتلٰی علیہ اٰیاتنا قال اساطیر الاولین)۔

وہ اس بہانے سے اور اس قبیح نسبت کی وجہ سے آیات خدا سے دور ہو جاتا ہے اور انھیں فراموش کر دیتا ہے۔ نیز دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اسی بناء پر اس قسم کے افراد کی اطاعت و پیروی نہیں کرنا چاہیئے اور یہ اس قسم کے افراد کی اطاعت سے نہی میں ایک تکمیل ہے۔

آخری زیر بحث آیت، اس گروہ کی ایک سزا سے پردہ اٹھاتے ہوئے مزید کہتی ہے: "ہم عنقریب اس کی ناک پر ننگ وعار کا داغ اور نشانی لگا دیں گے" (سنسمہ علی الخرطوم)۔

یہ ان کو انتہائی ذلیل کرنے کے لیے ایک منہ بولتی تعبیر ہے۔ کیونکہ اول تو ناک کی خرطوم سے تعبیر جو صرف سور اور ہاتھی کے لیے بولی جاتی ہے، ان کے لیے ایک واضح تحقیر و تذلیل ہے۔ دوسرے لغت عرب میں

ناک عام طور پر بزرگی اور عزت سے کنایہ ہوتا ہے ، جیسا کہ فارسی میں بھی جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی ناک کو مٹی میں رگڑ دو ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی عزت کو برباد کر دو ۔ (اردو میں ناک کا کٹنا بے عزتی کے معنی میں آتا ہے ۔) تیسرے نشان و علامت لگانا جانوروں کے ساتھ مخصوص ہے ۔ لیکن جانوروں میں بھی ان کے چہرے خصوصاً ان کے ناک پر علامت نہیں لگائی جاتی ۔ اور اسلام میں بھی اس کام سے روکا گیا ہے ۔ یہ سب چیزیں واضح بیان کے ساتھ کہتی ہیں کہ خدا اس قسم کے طغیان گر ، خود خواہ ، متجاوز اور سرکش افراد کو اس طرح سے ذلیل کرتا ہے اور ہر جگہ ان کی رُسوائی کا ڈھنڈورا پٹوا دیتا ہے تاکہ سب کے لیے عبرت ہو ۔

تاریخ اسلام بھی اس معنی پر گواہ ہے کہ ہٹ دھرم مخالفین کا یہ گروہ اسلام کی پیش رفت سے اس طرح ذلیل و رُسوا ہوا کہ جس کی کوئی مثال اور نظیر نہیں ملتی ۔ آخرت کی رسوائی اس سے بھی زیادہ ہے ۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سورہ کی زیادہ تر آیات شرک کے ایک مشہور سرغنہ "ولید بن مغیرہ" کے بارے میں آئی ہیں ۔ لیکن یہ بات آیات کی عمومیت ، وسعت اور اس کی تعبیرات کے شمول سے مانع نہیں ہے[1]

❊ ❊ ❊

چند نکات

۱ : اخلاقی رذائل

اوپر والی آیات اگرچہ پیغمبر اسلامؐ کے سخت مخالفین کی صفات رذیلہ کی تفصیلات کے بارے میں ہیں ، لیکن اس کے باوجود ان صفات کی تشخیص کے لیے ایک نمونہ ہمارے ہاتھ میں دیتی ہیں ۔ وہ ایسی بُری صفات ہیں جو انسان کو خدا سے دُور کر دیتی ہیں اور شقاوت و بدبختی کے گڑھے میں گرا دیتی ہیں ۔ وہ ایسی صفات ہیں کہ جن سے سچے مومنین کو بچتے رہنا چاہیے اور ان سے آلودہ نہیں ہونا چاہیے ۔ اسی لیے اسلامی روایات میں بھی اس سلسلہ میں بہت زیادہ تاکید آئی ہے ۔ منجملہ :

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ ناک پر علامت لگانا جنگ بدر میں عملی طور پر صورت پذیر ہو گیا کہ کفر کے بعض سرغنوں کی ناک پر اس طرح سے ضرب لگی کہ اس کی علامت باقی رہی ۔ اگر یہاں ولید بن مغیرہ ہی مراد ہو تو تاریخ یہ کہتی ہے کہ وہ جنگ بدر سے پہلے ہی ذلت و خواری کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا تھا ۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور شخص مراد ہو تو پھر وہ بات ممکن ہے جو امام علی بن الحسینؑ کے شام کے مشہور خطبہ میں بھی آئی ہے انا ابن من ضرب خراطیم الخلق حتی قالوا لا الٰہ الا اللہ : میں اس کا بیٹا ہوں جس نے مشرکین کی ناکوں پر ضرب لگائی ، یہاں تک کہ انہوں نے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا اس سے مراد امیرالمومنین علیؑ ہیں ۔ بحار الانوار جلد ۴۴ ص ۱۲۸) زیر بحث آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے خدا کہتا ہے ہم اس کی خرطوم پر علامت لگائیں گے یہ تعبیر ایک عمدہ معنی رکھتی اور بتاتی ہے کہ خدا کا یہ ارادہ اس کے مخصوص بندہ علیؑ کے ہاتھ سے پورا ہوا ۔

۱ : ایک حدیث میں رسول خداؐ سے آیا ہے :

"الا انبئکم بشرارکم قالوا بلیٰ یا رسول اللہ (ص) قال : المشاؤن بالنمیمۃ المفرقون بین الاحبۃ الباغون للبراء المعایب"۔

"کیا میں تمھیں تمھارے شریر ترین افراد کے بارے میں خبر دوں؟ انہوں نے کہا جی ہاں! اے رسول خداؐ! فرمایا : وہ لوگ جو بہت زیادہ چغلخور ہیں، دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں اور پاکیزہ اور بے گناہ افراد میں عیوب کی جستجو میں لگے رہتے ہیں"۔ [1]

۲ : پیغمبرؐ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ وصیت کیا کرتے اور فرماتے تھے :

لا یبلغنی احد عن احد من اصحابی شیئاً فانی احب ان اخرج الیکم و انا سلیم الصدر"

"تم میں سے کوئی بھی شخص میرے اصحاب میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ایسی بات نہ کرے جو مجھے اس کی نسبت بدظن کر دے، کیونکہ میں دوست رکھتا ہوں کہ پاک و پاکیزہ دل کے ساتھ تم سے ملا کروں"۔ [2]

۳ : نیز ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

"لا یدخل الجنۃ جواظ، ولا جعظری، ولا عتل زنیم"

"تین گروہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔ "جواظ"، "جعظری" اور "عتل زنیم"۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا "جواظ" کون ہے؟ فرمایا: "کل جماع مناع" ہر وہ شخص جو زیادہ مال جمع کرتا ہے اور دوسروں سے بخل کرتا ہے۔ میں نے پوچھا: جعظری کون ہے؟ فرمایا: سخت مزاج اور تندخو۔ میں نے پوچھا: عتل زنیم کون ہے؟ فرمایا: شکم پرور اور بد اخلاق لوگ جو زیادہ کھاتے زیادہ پیتے اور بیدادگر اور ظالم ہیں"۔ [3]

۲ : مداہنہ اور سازگاری

وہ واضح اختلافات جو راہ حق کے راہروؤں اور سیاسی بازی گروں کے درمیان موجود ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ دوسرا گروہ کسی خاص اصول پر ثابت قدم نہیں رہتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ ان امتیازات کے مقابلہ میں جو ان کو حاصل ہیں کچھ اور امتیازات حاصل کریں اور اپنے اصول

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب النمیمہ حدیث ۱

[2] سنن ابو داؤد و صحیح ترمذی (مطابق نقل فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۲۳۰)

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۳

سے کچھ منافع کی خاطر، صرفِ نظر کر لیں۔ ان کے اہداف وعقاید ان کیلئے کوئی مقدس چیز نہیں ہیں۔ اور وہ ہمیشہ ان کی قیمت پر معاملہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ٹھیک اوپر والی آیت کا مضمون ہے جو کہتی ہے: (ودّوا لو تدھن فیدھنون) وہ دوست رکھتے ہیں کہ تجھے بھی اپنے جتھے میں کھینچ لیں اور جس طرح وہ مداہنت اور معاملہ کرتے ہیں، تو بھی کرے۔"

لیکن پہلا گروہ ہرگز معاملہ گر نہیں ہوتا، وہ اپنے مقدس اہداف کو کسی بھی قیمت پر اپنے ہاتھ سے نہیں دیتے اور اس پر معاملہ نہیں کرتے۔ مداہنت و موافقت اور اس قسم کے سیاسی لین دین ان میں نہیں ہوتے۔ یہ ایک بہترین نشانی ہے جس سے پیشہ ور سیاست بازوں کو پہچانا جا سکتا ہے اور انھیں مردانِ خدا سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

❖ ❖ ❖

(۱۷) إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ۝

(۱۸) وَلَا يَسْتَثْنُونَ ۝

(۱۹) فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ ۝

(۲۰) فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۝

(۲۱) فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ۝

(۲۲) أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِن كُنتُمْ صَارِمِينَ ۝

(۲۳) فَانطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ۝

(۲۴) أَن لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُم مِّسْكِينٌ ۝

(۲۵) وَغَدَوْا عَلَىٰ حَرْدٍ قَادِرِينَ ۝

ترجمہ

(۱۷) ہم نے انھیں آزمایا جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت (حاجتمندوں کی نگاہوں سے بچاکر) چنیں گے۔

(۱۸) اور اس میں کسی چیز کا استثناء نہ کریں گے۔

(۱۹) لیکن ان کے سارے باغ پر (راتوں رات) ایک گھیر لینے والا عذاب نازل ہوگیا جبکہ وہ سورہے تھے

(۲۰) اور وہ ہرا بھرا باغ تاریک رات کی مانند ہوگیا۔

(۲۱) صبح کے وقت انھوں نے ایک دوسرے کو صدا دی۔

(۲۲) اگر تمھارا ارادہ پھلوں کو توڑنے کا ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف چلو۔

(۲۳) وہ چل پڑے اور ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ کہتے جاتے تھے۔

(۲۴) اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمھارے پاس نہ آنے پائے۔

(۲۵) انھوں نے صبح کے وقت یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ حاجت مندوں کو روکیں گے۔

تفسیر

باغ والوں کی عبرت انگیز داستان

اس بحث کی مناسبت سے جو گزشتہ آیات میں مغرور، وخودخواہ دولت مندوں کے بارے میں تھی اور وہ مال اور اولاد کی زیادتی کی وجہ سے ہر چیز کو ٹھکرا دیتے تھے۔ ان آیات میں پہلے زمانہ کے کچھ دولتمندوں کے بارے میں جو ایک سرسبز وشاداب باغ کے مالک تھے اور آخرکار وہ خودسری کی بناء پر نابود ہوگئے تھے، ایک داستان بیان کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان اس زمانہ کے لوگوں میں مشہور ومعروف تھی، اور اسی بناء پر اس کو گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "ہم نے انھیں آزمایا، جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی" (انا بلوناھم کما بلونا اصحاب الجنة)۔

یہ باغ کہاں تھا، عظیم شہر صنعاء کے قریب سرزمین یمن میں؟ یا سرزمین حبشہ میں؟ یا بنی اسرائیل کی سرزمین شام میں؟ یا طائف میں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن مشہور یمن ہی ہے۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ باغ ایک بوڑھے مرد مومن کی ملکیت تھا۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے

لیا کرتا اور باقی مستحقین اور حاجت مندوں کو دے دیتا تھا۔ لیکن جب اس نے دُنیا سے آنکھ بند کر لی (اور مرگیا) تو اس کے بیٹوں نے کہا ہم اس باغ کی پیداوار کے زیادہ مستحق ہیں، چونکہ ہمارے عیال و اطفال زیادہ ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے باپ کی طرح عمل نہیں کر سکتے۔ اِس طرح انھوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ ان تمام حاجت مندوں کو جو ہر سال اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے محروم کر دیں۔ لہٰذا ان کی سرنوشت وُہی ہوئی جو ان آیات میں بیان ہوئی۔

کہتا ہے: "ہم نے انھیں آزمایا، جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت حاجت مندوں کی نظریں بچا کر چنیں گے۔" (اذ اقسموا لیصرمنّها مصبحین)۔

"اور اس میں کسی قسم کا استثناء نہ کریں گے اور حاجت مندوں کے لیے کوئی چیز بھی نہ رہنے دیں"۔ (و لا یستثنون)۔

ان کا یہ ارادہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ کام ضرورت کی بناء پر نہیں تھا، بلکہ یہ ان کے بخل اور ضعفِ ایمان کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ انسان چاہے کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو، اگر وہ چاہے تو کثیر پیداوار والے باغ میں سے کچھ نہ کچھ حصّہ حاجت مندوں کے لیے مخصوص کر سکتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عدمِ استثناء سے مُراد یہ ہے کہ انھوں نے "الا ان یشاء اللّٰہ" نہیں کہا تھا۔ یعنی وہ اس قدر مغرور تھے کہ انھوں نے کہا ہم جائیں گے اور یہ کام ضرور کریں گے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے آپ کو انشاء اللہ کہنے سے بھی بے نیاز سمجھا، لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے۔[۱]

اس کے بعد اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "رات کے وقت جبکہ وہ سوئے ہوئے تھے، تیرے پروردگار کا ایک گھیر لینے والا عذاب ان کے سارے باغ پر نازل ہوگیا"۔ (فطاف علیها طائف من ربّك و هم نائمون)۔

ایک جلانے والی آگ اور مرگ بار بجلی اس طرح سے اس کے اوپر مُسلّط ہُوئی کہ وہ سرسبز و شاداب باغ رات کی مانند سیاہ اور تاریک ہوگیا اور مٹھی بھر راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا"۔ (فاصبحت کالصریم)۔

"طائف" "طواف" کے مادہ سے اصل میں اس شخص کے معنی میں ہے جو کسی چیز کے گرد گھومے لیکن بعض اوقات اس بلا و مصیبت سے کنایہ ہوتا ہے جو رات کو نمُودار ہو اور اس جگہ یہی مُراد ہے۔

"صریم" "صرم" کے مادہ سے قطع کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں "تاریک رات" یا "پھل کے بغیر درخت" یا "سیاہ راکھ" کے معنی میں ہے۔ کیونکہ رات دن کے آجانے سے منقطع ہو جاتی ہے، جیسا کہ دن

---

۱ یصرمن "صرم" (بروزن شرم) کے مادہ سے پھل توڑنے کے معنی میں ہے اور مطلق طور پر قطع کرنے کے معنی میں بھی ہے۔ اسی طرح کام کو محکم کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

۲ کیونکہ خاص مناسبت کے علاوہ، جو پہلا معنی اصل قصّہ کے ساتھ رکھتا ہے، اگر دوسرا معنی مراد ہوتا تو ولا یستثنون کے بجائے ولم یستثنوا کہا جاتا۔ (غور کیجیے)

رات کے آجانے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بعض اوقات رات اور دن کو "صریمان" کہتے ہیں۔ بہرحال مراد یہ ہے کہ یہ آسمانی بلا جو غالباً ایک عظیم صاعقہ (بجلی) تھی اس طرح سے اس باغ پر نازل ہوئی کہ جس نے سارے باغ کو ایک ساتھ آگ لگادی اور مٹھی بھر کوئلوں اور سیاہ راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا، کیونکہ صاعقہ (بجلیاں) جب بھی کسی چیز پر پڑتی ہیں تو ان کا حال اسی طرح کا ہو جاتا ہے۔

* * *

بہرحال باغ کے مالکوں نے اس گمان سے کہ یہ لدے پھندے درخت اب تیار ہیں کہ ان کے پھل توڑ لیے جائیں: "صبح ہوتے ہی ایک دوسرے کو پکارا" (فتنادوا مصبحین)۔[1]

* * *

انھوں نے کہا: "اگر تم اپنے باغ کے پھلوں کو توڑنا چاہتے ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف چلو" (ان اغدوا علیٰ حرثکم ان کنتم صارمین)۔

"اغدوا"۔ "غدوة" کے مادہ سے دن کے اوّل حصہ کے معنی میں ہے۔ اسی لیے اس غذا کو جو صبح سویرے کھائی جاتی ہے۔ غذا (ناشتہ) کہتے ہیں۔ (اگرچہ عربی کے موجودہ روزمرہ کی تعبیرات میں غداء دن کے کھانے کو کہا جاتا ہے۔)

* * *

"اسی طرح سے وہ اپنے باغ کی طرف چل پڑے اور وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے" (فانطلقوا وھم یتخافتون)۔

"کہ اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمھارے پاس نہ آنے پائے" (ان لا یدخلنھا الیوم علیکم مسکین)۔

اور وہ اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کی آواز کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فقیر خبردار ہو جائے اور بچے کھچے پھل چننے کے لیے یا اپنا پیٹ بھرنے کے لیے تھوڑا سا پھل لینے ان کے پاس آجائے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے باپ کے سابقہ نیک اعمال کی بناء پر فقراء کا ایک گروہ ایسے دنوں کے انتظار میں رہتا تھا کہ باغ کے پھل توڑنے کا وقت شروع ہو تو اس میں سے کچھ حصہ انھیں بھی ملے۔ اسی لیے یہ بخیل اور ناخلف بیٹے اس طرح سے مخفی طور پر چلے کہ کسی کو یہ احتمال نہ ہو کہ اس قسم کا دن آپہنچا ہے، اور

---

[1] "تنادوا" راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "نداء" (بروزن حنا) اصل میں "ندی" سے لیا گیا ہے جو رطوبت کے معنی میں ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ جن لوگوں کے منہ میں کافی رطوبت ہوتی ہے وہ آرام اور سکون سے گفتگو کر سکتے ہیں اور ان کا کلام فصیح اور آواز صاف ہوتی ہے۔

جب فقراء کو اس کی خبر ہو تو معاملہ ختم ہو چکا ہو۔

* * *

"اس طرح سے وہ صبح سویرے اپنے باغ اور کھیت میں جانے کے ارادے سے حاجت مندوں اور فقراء کو روکنے کے لیے پوری قوت اور پختہ ارادے کے ساتھ چل پڑے۔" (وغدوا علٰی حرد قادرین)۔

"حرد" (بروزن سرد) شدت وغضب سے توأم ممانعت کے معنی میں ہے۔ ہاں! وہ فقراء و مساکین کی تمنا اور انتظار سے بےخبر تھے اور پختہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ پوری قوت کے ساتھ انھیں منع کریں گے۔ (اسی لیے یہ تعبیر ان سالوں کے لیے کہ جن میں بارش نہ ہو یا اس اونٹنی کے لیے جس کا دودھ ختم ہو جانے استعمال ہوتی ہے)

اب دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

* * *

۲۶ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ

۲۷ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝

۲۸ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝

۲۹ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

۳۰ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝

۳۱ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝

۳۲ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝

۳۳ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۧ

ترجمہ

۲۶ (جب باغ میں وارد ہوئے اور) اسے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔

۲۷ (ہاں ہر چیز مکمل طور پر ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے) بلکہ ہم محروم ہیں۔

(۲۸) ان میں سے ایک (جو سب سے زیادہ عقلمند تھا) اس نے کہا: کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟

(۲۹) انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک و پاکیزہ اور منزہ ہے، یقیناً ہم ہی ظالم تھے۔

(۳۰) پھر انھوں نے ایک دُوسرے کی طرف رُخ کیا اور ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔

(۳۱) (اور ان کی فریاد بلند ہوئی) اور کہا: وائے ہو ہم پر ہم ہی طغیانگر اور سرکش تھے۔

(۳۲) ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں بخش دے اور اس کے بجائے اس سے بہتر ہمیں دے دے، کیونکہ اب ہم نے اس سے دل لگا لیا ہے۔

(۳۳) خدا کا عذاب (دنیا میں) اسی طرح سے ہوتا ہے۔ اور اگر وہ جانتے تو آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے۔

تفسیر

سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام

یہ آیات انھیں باغ والوں کی داستان کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔ وہ باغ والے اس اُمید پر کہ باغ کی فراواں پیداوار کو چنیں اور مساکین کی نظریں بچا کر اسے جمع کر لیں اور یہ سب کچھ اپنے لیے خاص کر لیں، یہاں تک کہ خدا کی نعمت کے اس وسیع دسترخوان پر ایک بھی فقیر نہ بیٹھے۔ یوں صبح سویرے چل پڑے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ رات کے وقت جب کہ وہ پڑے سو رہے تھے ایک مرگبار صاعقہ نے باغ کو ایک مٹھی بھر خاکستر میں تبدیل کر دیا ہے۔

قرآن کہتا ہے: "جب انھوں نے اپنے باغ کو دیکھا تو اس کا حال اس طرح سے بگڑا ہوا تھا کہ انھوں نے کہا یہ ہمارا باغ نہیں ہے۔ ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔" (فلما رأوها قالوا انا لضالون)۔

'ضالون' سے مراد ممکن ہے باغ کا راستہ بھول جانا ہو جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، یا راہِ حق کو بھول جانا اور گمراہ ہو جانا ہو جیسا کہ بعض نے احتمال دیا ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

پھر انھوں نے مزید کہا: "بلکہ ہم تو حقیقت میں محروم ہیں۔" (بل نحن محرومون)۔

ہم چاہتے تھے کہ مساکین اور ضرورت مندوں کو محروم کریں لیکن ہم تو خود سب سے زیادہ محروم ہو گئے ہیں، مادی منافع سے بھی محروم ہو گئے ہیں اور معنوی برکات سے بھی کہ جو راہ خدا میں خرچ کرنے اور حاجت مندوں کو دینے سے ہمارے ہاتھ آتیں۔

* * *

"اس اثنا میں ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ عقلمند تھا اس نے کہا: "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے" (قال اوسطھم الم اقل لکم لولا تسبحون)۔

کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ خدا کو عظمت کے ساتھ یاد کرو اور اس کی مخالفت سے بچو، اس کی نعمت کا شکر بجا لاؤ اور حاجت مندوں کو اپنے اموال سے بہرہ مند کرو! لیکن تم نے میری بات کو توجہ سے نہ سنا اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک مرد مومن تھا جو انھیں بخل اور حرص سے منع کیا کرتا تھا۔ چونکہ وہ اقلیت میں تھا لہٰذا کوئی بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا تھا۔ لیکن اس دردناک حادثہ کے بعد اس کی زبان کھل گئی۔ اس کی منطق زیادہ تیز اور زیادہ کاٹ کرنے والی ہو گئی۔ اور وہ انھیں مسلسل ملامت اور سرزنش کرتا رہا۔

* * *

وہ بھی ایک لمحہ کے لیے بیدار ہو گئے اور انھوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا: انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک اور منزہ ہے۔ یقیناً ہم ہی ظالم و ستمگر تھے۔ ہم نے اپنے اوپر بھی ظلم کیا اور دوسروں پر بھی۔" (قالوا سبحان ربنا انا کنا ظالمین)۔

"اوسط" کی تعبیر جو گزشتہ آیت میں آئی ہے، اس شخص کے معنی میں ہے جو عقل و خرد اور علم و دانش کے اعتبار سے سرحد اعتدال میں ہو، بعض نے اسے سن و سال میں متوسط کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن یہ معنی بہت بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ سن و سال اور اس قسم کی پُر معنی گفتگو کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ البتہ عقل و خرد اور اس قسم کی باتوں کے درمیان ارتباط ہے۔

"لولا تسبحون" (تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے) کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ تمام نیک اعمال کا ریشہ اور اصل، ایمان، معرفت خدا اور تسبیح و تنزیہ خدا ہے۔

بعض نے تسبیح خدا کا معنی شکر نعمت کیا ہے، جس کا لازمہ محروموں کو بہرہ مند کرنا اور فائدہ پہنچانا ہے، لیکن یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں اور آیت کے مفہوم میں جمع ہیں۔

لیکن گناہ کے اعتراف سے پہلے ان کی تسبیح ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ وہ یہ چاہتے ہوں کہ یہ بلائے عظیم

جو ان کے باغ پر نازل ہوئی اور جس نے اسے نابود کر دیا ہے خدا کو اس میں ہر قسم کے ظلم وستم سے منزہ سمجھیں اور یہ کہیں کہ خداوندا یہ ہم ہی تھے جنہوں نے خود اپنے اوپر اور دوسروں پر ظلم کیا، اور اس قسم کے دردناک عذاب کے مستحق ہوئے ہیں۔ لیکن تیرا کام عین عدالت وحکمت ہے۔

قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی اپنے ظلم کا اقرار کرنے سے پہلے یہی تسبیح نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت یونسؑ کی داستان میں آیا ہے۔ جب وہ اس عظیم مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو کہا: لا الٰه الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین، "تیرے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ تو منزہ ہے: میں ہی ظالموں اور ستمگروں میں سے تھا۔" (انبیاء ۸۷)

البتہ اس عظیم پیغمبرؑ کے بارے میں ظلم ترک اولیٰ کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۱۴ میں ہم اس آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

* * *

لیکن مطلب یہیں پر ختم نہیں ہو گیا: "انھوں نے ایک دوسرے کی طرف رُخ کیا اور ایک دوسرے کو ملامت وسرزنش کرنے لگے۔ (فاقبل بعضهم علیٰ بعض یتلاومون)۔

احتمال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی خطا کے اعتراف کے باوجود اصلی گناہ کو دوسرے کے کندھے پر ڈالتا اور شدت کے ساتھ اس کو سرزنش کرتا تھا کہ ہماری بربادی کا اصل عامل تو ہے! ورنہ ہم خدا اور عدالت سے اس قدر بیگانہ نہیں تھے۔

ہاں! تمام ظالموں کی سرنوشت کہ جو عذاب الٰہی کے چنگل میں گرفتار ہوتے ہیں اسی طرح ہے کہ گناہ کا اعتراف کرنے کے باوجود ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی بدبختی کا عامل دوسرے کو شمار کرے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس قسم کے مواقع پر ایک آدمی تجویز پیش کرتا ہے، دوسرا تائید کرتا ہے، تیسرا اس کا اجرا اپنے ذمہ لیتا ہے اور چوتھا اپنے سکوت اور خاموشی کے ذریعے اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کے سب شریک جرم اور گناہ میں پورا پورا دخل رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ جب وہ اپنی بدبختی کی انتہا سے آگاہ ہوئے تو ان کی فریاد بلند ہوئی اور انھوں نے کہا: "وائے ہو ہم پر کہ ہم ہی سرکشی اور طغیان کرنے والے تھے۔" (قالوا یاویلنا انا کنا طاغین)۔

انھوں نے پہلے مرحلہ میں تو ظلم وستم کا اعتراف کیا اور یہاں طغیان وسرکشی کا اعتراف ہے۔ حقیقت میں طغیان ظلم سے بالاتر ایک مرحلہ ہے، کیونکہ ظالم ممکن ہے اصل قانون کو قبول کرے لیکن ہوائے نفس کے زیر اثر ہو کر ظلم وستم کرے۔ لیکن طغیان کرنے والا تو اصلاً قانون کے زیر بار ہی نہیں ہوتا اور اسے قانون کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "ظلم" تو اپنے اوپر ظلم کرنے کی طرف اشارہ ہو اور "طغیان" دوسروں کے حق میں تجاوز کرنے کی طرف اشارہ ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ عرب جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے یا کسی چیز سے نفرت کا اظہار کرنا چاہتے تھے تو کبھی "ویس" کہتے تھے اور کبھی 'ویح' اور کبھی 'ویل' جن میں سے پہلا مصیبت میں خفیف، دوسرا زیادہ شدید اور تیسرا سب سے زیادہ شدید ہے اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ باغ والے اپنے آپ کو شدید ترین سرزنش کا مستحق سمجھتے تھے۔

* * *

انجام کار انھوں نے اس بیداری، گناہ کے اعتراف اور خدا کی طرف بازگشت کے بعد اس کی بارگاہ کی طرف مراجعہ کیا اور کہا۔ "امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے گا اور ہمیں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے گا" (عسٰی ربنا ان یبدلنا خیرا منھا)۔

"کیونکہ ہم نے اس کی طرف رُخ کر لیا ہے اور اس کی پاک ذات کے ساتھ لو لگا لی ہے۔ لہٰذا اس مشکل کا حل بھی اسی کی بے پایاں قدرت سے طلب کرتے ہیں" (انا الٰی ربنا راغبون)[1]

کیا یہ گروہ واقعاً اپنے فعل پر پشیمان ہو گیا تھا، اس نے اپنے طرزِ عمل میں تجدیدِ نظر کر لی تھی اور قطعی اور پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اگر خدا نے ہمیں آئندہ اپنی نعمتوں سے نوازا تو ہم اس کے شکر کا حق ادا کریں گے؟ یا وہ بھی بہت سے ظالموں کی طرح کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں تو وقتی طور پر بیدار ہو جاتے ہیں لیکن جب عذاب ختم ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ انھیں کاموں کی تکرار کرنے لگتے ہیں۔

اس بارے میں مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعد والی آیت کے لب و لہجہ سے احتمالی طور پر جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی توبہ شرائط کے جمع نہ ہونے کی بناء پر قبول نہیں ہوئی۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ اُنھوں نے خلوصِ نیّت کے ساتھ توبہ کی، خدا نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا اور انھیں اس سے بہتر باغ عنایت کیا جس میں خاص طور پر بڑے بڑے خوشوں والے انگور کے پُرمیوہ درخت تھے۔

* * *

آخری زیرِ بحث آیت میں کلی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے سب کے لیے ایک درس کے عنوان سے فرماتا ہے: "خدا کا عذاب اس طرح کا ہوتا ہے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے" (کذٰلک العذاب ولعذاب الاٰخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون)۔

اگر تم بھی مال و ثروت اور مادی وسائل کی بناء پر مست و مغرور ہو گئے، ذخیرہ طلبی کی رُوح نے تم پر غلبہ کر لیا، ہر چیز کو اپنے لیے ہی طلب کرنے لگو اور حاجت مندوں کو محروم کر دو تو تمھاری سرنوشت بھی ان سے بہتر نہیں،

---

[1] "راغبون"، "رغبت" کے مادہ سے ہے۔ یہ مادہ جب 'الٰی' یا 'فی' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو کسی چیز کی طرف تمایل کے معنی دیتا ہے۔ جب 'عن' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے کسی چیز سے انحراف اور بے اعتنائی کے معنی میں ہوتا ہے

ہو گی۔ البتہ وہ ایک روز تھا کہ "صاعقہ" (بجلی) آئی اور اس نے اس باغ کو آگ لگا دی۔ آج ممکن ہے کچھ اور آفتیں ہوں یا گھروں اور آبادیوں کو جلا دینے والی علاقائی یا عالمی جنگیں ان نعمتوں کو تباہ و برباد کر دیں۔

* * *

چند نکات

۱: انحصار طلبی؛ ثروت مندوں کی بہت بڑی مصیبت

انسان خواہ نخواہ مال دنیا سے لگاؤ رکھتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی کا گزارہ اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہاں یہ لگاؤ اعتدال کی حد میں مذموم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ضرورت مندوں کو بھی اپنے اموال میں شریک کرے۔ نہ صرف الٰہی حقوق واجبہ کو ادا کرے بلکہ مستحب انفاق سے بھی ہاتھ نہ روکے۔

خصوصاً باغ اور زراعت کے بارے میں اسلامی روایات میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حاضر آنے والے ضرورتمندوں کو ایک حصہ دیں، جو آیۂ شریفہ (و اٰتوا حقہ یوم حصادہ) اس کا حق فصل کاٹنے کے وقت دے دو، (انعام ۱۴۱) سے اقتباس کرتے ہوئے حق الحصاد کے عنوان سے مشہور ہوا ہے۔ وہ ایک ایسا حق ہے جو زکوٰۃ معروف کے حق سے الگ ہے اس سے مراد وہ چیز ہے جو پھل توڑنے یا زراعت کاٹنے کے موقع پر حاضر آنے والے ضرورتمندان کو دی جاتی ہے اور اس کی کوئی حد معیّن نہیں ہے۔[1]

لیکن جب مال و ثروت سے لگاؤ افراط اور انحراف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو انحصار طلبی کی صورت اختیار کر لیتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے لیے کسی چیز کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس سے محروم رہیں۔ یہ وہ عظیم مصیبت ہے خصوصیت کے ساتھ جس کے آج بھی انسانی معاشروں میں بہت سے نمونے موجود ہیں اور اس کو ایک قسم کی خطرناک بیماری شمار کیا جا سکتا ہے۔

باغ والوں کی داستان جو اوپر والی آیات میں بیان کی گئی ہے ثروت مندوں کے ایک گروہ کے انحصار طلبی کے جذبہ کی واضح طور پر تصویر کشی کرتی ہے۔ یعنی وہ کس طرح سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ ضرورت مندوں کے محروم کرنے کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ اور ان کی نظریں بچا کر عظیم منافع اور بڑے بڑے فائد حاصل کرتے ہیں، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان محروموں کی آہ جلانے والی بجلیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور ان انحصار طلب ثروت مندوں کے خرمن زندگی کو آگ لگا دیتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ بجلیاں انقلابوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور جس چیز کو وہ باور نہیں کرتے تھے اسے اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی آہ و فریاد آسمان

---

[1] اس موضوع سے مربوط روایات کو وسائل الشیعہ کی جلد ۶ ابواب زکوٰۃ الغلات باب ۱۳ میں اور سنن بیہقی جلد ۴ ص ۱۳۳ میں مطالعہ فرمائیں۔

تک بلند ہوتی ہے اور وہ گزشتہ خطاؤں اور گناہوں سے توبہ اور تلافی کا دم بھرتے ہیں لیکن معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

۲ : گناہ اور قطع رزق کے درمیان رابطہ

اوپر والی آیات سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اور قطع رزق کے درمیان قریبی رابطہ ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

"ان الرجل لیذنب الذنب فیدرأ عنه الرزق وتلا هذه الآیة : اذ اقسموا لیصرمنها مصبحین ولا یستثنون فطاف علیها طائف من ربك وهم نائمون۔

"بعض اوقات انسان گناہ کرتا ہے تو اس کی روزی منقطع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد امام نے اوپر والی آیات کی تلاوت کی :

"جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم صبح سویرے پھلوں کو توڑ لیں گے اور اپنے سوا کسی کو بھی اس سے فائدہ نہیں اٹھانے دیں گے، لیکن اس وقت کہ جب وہ سوئے ہوئے تھے تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر مسلط ہو گئی اور اسے نابود کر دیا۔"[1]

ابن عباس سے بھی یہ نقل ہوا ہے کہ گناہ اور روزی کے منقطع ہونے کا ربط سورج سے بھی زیادہ واضح ہے جیسا کہ خدا نے اسے سورۂ ن والقلم کی زیر بحث آیت میں بیان فرمایا ہے۔[2]

٭ ٭ ٭

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۵ (حدیث ۳۳)

[2] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۳۷

۳۴ إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ○

۳۵ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ○

۳۶ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ○

۳۷ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ○

۳۸ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ○

۳۹ أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ○

۴۰ سَلْهُمْ أَيُّهُمْ بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ○

۴۱ أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ ○

ترجمہ

۳۴ پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جنت کے پُرنعمت باغات ہیں۔

۳۵ کیا ہم مومنین کو مُجرمین کی طرح قرار دے دیں ؟

۳۶ تمھیں کیا ہوگیا ہے تم کِس قسم کے فیصلے کرتے ہو؟

(۳۷) کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے کہ جس سے تم درس پڑھتے ہو؟

(۳۸) کیا جسے تم انتخاب کرتے ہو وہ تمھارے لیے مخصوص ہے؟

(۳۹) یا تم نے قیامت کے دن تک کے لیے کوئی تاکیدی عہد و پیمان لے لیا ہے کہ جو کچھ تم اپنے نفع کے لیے اختیار کرو گے وہ اسے تمھارے لیے قرار دے گا؟

(۴۰) ان سے پوچھ لیجئے ان میں سے کون اس قسم کی چیز کی ضمانت لیتا ہے؟

(۴۱) یا ان کے ایسے معبود ہیں (جنھیں انھوں نے خدا کا شریک قرار دیا ہے) اور وہ ان کے لیے شفاعت کرتے ہیں۔ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو اپنے معبودوں کو سامنے لائیں۔

تفسیر

مکمل باز پرس

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی روش اور طریقہ یہ ہے کہ بُروں اور اچھوں کے حالات زندگی کو ایک دوسرے کے مقابل لاتا ہے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ میں بہتر طور پر پہچانے جائیں۔ یہ طریقہ تربیتی لحاظ سے بہت ہی مؤثر ہے۔

اسی روش کے مطابق "اصحاب الجنۃ" (سرسبز و شاداب باغ والوں) کی دردناک سرگزشت کے ذکر کے بعد، جو گزشتہ آیات میں گزری ہے، پرہیزگاروں کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جنت کے پُرنعمت باغ ہیں" (ان للمتقین عند ربھم جنات النعیم)۔

جنت کے ایسے باغات جن میں ہر وہ نعمت جس کا تصور کیا جائے اس کی کامل ترین نوع موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ نعمتیں بھی ہوں گی جو کسی انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوں گی۔

چونکہ مشرکین اور ثروت مندوں کی ایک جماعت خود خواہ تھی، جن کا دعویٰ یہ تھا کہ جس طرح دنیا میں ہماری حالت بہتر اور اعلیٰ ہے اسی طرح قیامت میں بھی بہت اچھی ہوگی۔ خدا نے بعد والی آیت میں ان کا شدت کے ساتھ مؤاخذہ کیا ہے کہ فرماتا ہے: "کیا ہم مومنین کو جو حق و عدالت کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں،

مشرکین اور مجرمین کی مانند قرار دیں گے۔" (افنجعل المسلمین کالمجرمین)۔

* * *

تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ تم کس طرح کے فیصلے کرتے ہو؟" (مالکم کیف تحکمون)۔

کیا کوئی عقلمند انسان یہ باور کرلے گا کہ عادل و ظالم، مطیع و مجرم، ایثار گر اور انحصار طلب کی سرنوشت ایک جیسی ہو گی؟ وہ بھی اس خدا کی بارگاہ میں جس کے سارے کام بچے تلے اور حکیمانہ نظام کے ماتحت ہوتے ہیں۔

سورہ حٰم سجدہ کی (آیت ۵۰) میں بھی اسی قسم کے افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (و لئن اذقناہ رحمۃ منا من بعد ضراء مستہ لیقولن ھذا لی وما اظن الساعۃ قائمۃ ولئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنٰی)۔

جب ہم اسے اپنی طرف سے تکلیف و پریشانی کے بعد رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے: یہ میری شائستگی اور استحقاق کی بناء پر تھا اور میں گمان نہیں کرتا کہ کوئی قیامت برپا ہو گی۔ اگر بالفرض قیامت ہوئی بھی تو جس وقت میں اپنے پروردگار کے پاس لوٹوں گا تو میرے لیے اس کے پاس اچھے اجر اور اچھے بدلے ہی ہوں گے۔ ہاں یہ خود پسند اور مغرور گروہ دنیا و آخرت کو اپنے لیے ہی مخصوص سمجھتا ہے۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اگر عقل و خرد نے اس قسم کے حکم میں تمھاری رہنمائی نہیں کی ہے تو کیا اس پر کوئی "نقلی" دلیل تمھارے پاس ہے؟ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے کہ جس سے تم درس لیتے ہو؟" (ام لکم کتاب فیہ تدرسون)۔

"کہ جسے تم انتخاب کرتے ہو اور اس کی طرف میلان رکھتے ہو وہ تمھارے لیے مخصوص ہے؟" (ان لکم فیہ لما تخیرون)[1]

تم یہ توقع رکھتے ہو کہ تم جیسے مجرم بھی مسلمانوں کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ یہ تو ایک ایسی بات ہے کہ جس کا نہ عقل حکم کرتی ہے اور نہ ہی کسی معتبر کتاب میں آئی ہے۔

* * *

بعد والی آیت میں بات کو اس طرح جاری رکھے ہوئے ہے:

"اگر تمھارے پاس عقل و نقل سے کوئی مدرک اپنے دعوے کے لیے نہیں ہے تو کیا تم نے کوئی تاکیدی

---

[1] "ان لکم ..." کا جملہ "تدرسون" کا مفعول ہے۔ قاعدہ کی رو سے ان کو ہمزہ کی زبر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے لیکن لام کی مناسبت سے جو "ان" کے اسم کے اوپر آئی ہے "ان" زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے کیونکہ فعل عمل کرنے سے معلق ہو جاتا ہے۔

عہد وپیمان ہم سے لے لیا ہے جو قیامت تک برقرار رہے گا کہ تم جو کچھ بھی اپنے نفع میں فیصلہ کرلو، اسے وہ تمہارے لیے قرار دے دے گا" (ام لکم ایمان علینا بالغۃ الیٰ یوم القیامۃ ان لکم لما تحکمون)۔
کون شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس نے خدا سے یہ عہد وپیمان لے لیا ہے کہ وہ جو چاہیں گے خدا اسے تسلیم کرلے گا، جو مقام ومنصب وہ چاہیں گے وہ بے چون وچرا ان کو دے دے گا؟ یہاں تک کہ مجرمین مسلمانوں کے ہم پلہ ہوجائیں۔ [1]

* * *

پھر انہیں سوالات کو جاری رکھتے ہوئے، جو ہر طرف سے ان پر راستوں کو بند کر رہے ہیں مزید کہتا ہے:
"ان سے پوچھ لیجئے کہ ان میں سے کون اس بات کا ضامن ہے کہ مجرمین اور مومنین برابر ہیں یا جو کچھ وہ چاہتے ہیں خدا ان کے اختیار میں دے دے گا" (سلھم ایھم بذالک زعیم)۔

* * *

آخری مرحلہ میں ان سے ایک عجیب سوال کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یا ان کے ایسے معبود ہیں جو خدا کے ہاں ان کی شفاعت وحمایت کریں گے۔ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو ان کو سامنے لائیں اور ان کا تعارف کرائیں": (ام لھم شرکاء فلیاتوا بشرکائھم ان کانوا صادقین)۔
کیا ان کے پاس کوئی معمولی سے معمولی دلیل ہے کہ یہ بے قدر وقیمت اور بے شعور جمادات خدا کے شریک ہیں اور اس کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے ہیں۔
بعض مفسرین نے یہاں شرکاء کو شہداء (گواہوں) کے معنی میں لیا ہے۔
اس طرح اوپر والی آیات کے مجموعہ سے نہائی طور پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انہیں اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے کہ وہ مومنین کے ہم پلہ بلکہ ان سے افضل وبرتر ہیں، چار میں سے کسی ایک وسیلہ کے ساتھ متمسک ہونا پڑے گا۔ یا عقل سے کوئی دلیل یا آسمانی کتابوں میں سے کوئی کتاب۔ یا خدا کی طرف سے کوئی عہد وپیمان، یا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اور گواہوں کی گواہی۔ چونکہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے اس بناء پر مذکورہ دعویٰ کلی طور پر بے بنیاد اور بے قدر وقیمت ہے۔

---

[1] "بالغۃ" کے لفظ کی تفسیر موکد کے معنی میں اور بعض نے جاری ومسلسل کے معنی میں کی ہے۔ لیکن دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ اس بناء پر (الیٰ یوم القیامۃ) کا جار ومجرور اس کے متعلق ہے۔

(۴۲) يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۙ

(۴۳) خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ۝

(۴۴) فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ۖ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ

(۴۵) وَأُمْلِيْ لَهُمْ ۖ إِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝

ترجمہ

(۴۲) اس دن کو یاد کرو جس میں پاؤں کی پنڈلی وحشت سے برہنہ ہو جائے گی اور انھیں سجدے کی دعوت دی جائے گی لیکن وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے۔

(۴۳) حالت یہ ہوگی کہ ان کی آنکھیں (ندامت اور شرمساری کی شدت سے) نیچے ہوں گی اور ذلت و خواری نے ان کے وجود کو گھیر رکھا ہوگا۔ انھیں اس سے پہلے بھی جبکہ وہ صحیح و سالم تھے سجدے کی دعوت دی جایا کرتی تھی۔ (لیکن آج تو ان میں اس کی توانائی ہی نہ ہوگی۔)

(۴۴) جو لوگ اس بات کی تکذیب کرتے ہیں، مجھے ان کے لیے رہنے دے۔ ہم انھیں ایسی جگہ سے جسے وہ نہیں جانتے تدریجاً عذاب کی طرف لے جائیں گے۔

(۴۵) اور میں انھیں ڈھیل دیتا رہوں گا، کیونکہ میرے منصوبے محکم اور دقیق ہیں۔

تفسیر

اس دن سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن قادر نہ ہوسکیں گے۔

گزشتہ آیات کے بعد جن میں مشرکوں اور مجرموں سے سخت بازپرس کی گئی تھی، زیر بحث آیات میں قیامت میں ان کی سرنوشت کے ایک گوشہ کی نشان دہی کر رہا ہے، تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ خود خواہ اور بڑے بڑے دعوے کرنے والا گروہ، کس قدر ذلیل و خوار ہوگا۔

فرماتا ہے: "اس دن کو یاد کرو جس دن پنڈلیاں خوف و وحشت سے برہنہ ہو جائیں گی اور انھیں سجدہ کی دعوت دی جائے گی لیکن وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے" (یوم یکشف عن ساق و یدعون الی السجود فلا یستطیعون)۔[1]

"یکشف عن ساق" (پنڈلیاں برہنہ ہو جائیں گی) کا جملہ مفسرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق ہول و وحشت کی شدت اور معاملہ کی سنگینی سے کنایہ ہے۔ کیونکہ عربوں کے درمیان یہ معمول تھا کہ جب کوئی کسی مشکل کام سے دوچار ہوتا تھا تو وہ اپنا دامن کمر پر ڈال دیتا اور پنڈلیاں برہنہ کر دیتا تھا۔ اسی لیے جب مشہور مفسر ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا: جب تمھیں قرآن میں سے کوئی بات مخفی دکھائی دے تو اشعار میں عربوں کی تعبیرات کی طرف رجوع کرو۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ ایک شاعر کہتا ہے:

"وقامت الحرب بنا علی ساق"

"جنگ نے ہمیں پاؤں کی پنڈلی پر لا کھڑا کیا"

جو جنگ کے بحران کی شدت سے کنایہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "ساق" کسی چیز کی اصل اور بنیاد کے معنی میں ہے جیسے درخت کا تنا۔ اس بناء پر "یکشف عن ساق" یعنی اس دن ہر چیز کی جڑیں اور ریشے آشکار ہو جائیں گے لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب

---

[1] "یوم" ظرف ہے اور ایک محذوف سے متعلق ہے اور تقدیر میں اذکروا یوم... ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "فلیأتوا" سے متعلق ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

اور صحیح ہے۔

ہاں! اس دن سب کو پروردگار کے سامنے سجدہ اور خضوع کی دعوت دی جائے گی۔ مومنین تو سجدے میں گر پڑیں گے لیکن مجرموں میں سجدہ کی قدرت نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ غلط جذبات و نظریات جو دنیا میں ان کے وجود میں راسخ ہو چکے ہوں گے وہ اس دن ظاہر ہو جائیں گے اور اس بات سے مانع ہوں گے کہ وہ خدا کی پاک ذات کے سامنے کمر کو خم کریں۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ قیامت کا دن تکلیف اور ذمہ داریوں کا دن نہیں ہے تو پھر سجدہ کی دعوت کس بنا پر ہوگی؟

اس سوال کا جواب اس تعبیر سے حاصل کیا جا سکتا ہے جو احادیث میں آئی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

"قیامت میں نور الٰہی سے حجاب اٹھا دیا جائے گا اور مومنین اس کی عظمت کی بنا پر سجدہ میں گر پڑیں گے۔ لیکن منافقین کی پشت ایسی سخت ہو جائے گی کہ ان میں سجدہ کرنے کی قدرت نہ رہے گی۔"[1]

دوسرے لفظوں میں اس دن خدا کی عظمت آشکار ہو جائے گی۔ یہ عظمت مومنین کو سجدہ کی دعوت دے گی لہٰذا وہ سجدہ میں گر پڑیں گے۔ لیکن کفار اس سعادت سے محروم رہ جائیں گے۔

* * *

بعد والی آیت کہتی ہے: "حالت یہ ہوگی کہ ان کی آنکھیں شدت ندامت و شرمساری سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی اور ذلت و خواری نے ان کے تمام وجود کو گھیر رکھا ہوگا" (خاشعة ابصارهم ترهقهم ذلّة)۔[2]

مجرم افراد کے خلاف جب کسی عدالت میں فیصلہ ہو جاتا ہے تو عام طور پر وہ اپنا سر نیچے کر لیتے ہیں اور ذلت و خواری ان کے سارے وجود کو گھیر لیتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "انھیں اس سے پہلے دار دنیا میں جبکہ وہ صحیح و سالم تھے سجدہ کی دعوت دی جاتی تھی" (وقد کانوا یدعون الی السجود وهم سالمون)۔

لیکن انہوں نے بالکل سجدہ نہ کیا اور استکبار، سرکشی اور روگردانی کی روح کو اپنے ساتھ ہی میدان قیامت تک لے آئے، اس حالت میں ان میں سجدہ کرنے کی قدرت کیسے ہوگی۔

واضح ہے کہ دنیا میں سجدہ کی دعوت نماز کے موقع پر اذان دینے والوں کے پیام کے ذریعہ اور نماز جماعت

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۵ حدیث ۴۹

[2] "ترهقهم" "رهق" (بروزن شفق) کے مادہ سے چھپانے اور گھیر لینے کے معنی میں ہے۔

کے اجتماعات میں اور قرآن کی آیات، پیغمبرؐ اور آئمہ معصومینؑ کی احادیث کے ذریعہ بھی صورت پذیر ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ دعوۃ ایک وسیع و عریض مفہوم رکھتی ہے جو ان سب کو شامل ہے۔

* * *

اس کے بعد روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: "مجھے اس بات (یعنی قرآن) کی تکذیب کرنے والوں کے لیے رہنے دے۔ میں ان سب کا حساب کتاب چکاؤں گا" (فذرنی ومن یکذب بھذا الحدیث)۔

یہ خداوند قادر و قہار کی طرف سے ایک شدید اور سخت تہدید ہے کہ پیغمبرؐ سے کہتا ہے کہ تمہیں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے، ان ہٹ دھرم، سرکش اور جھٹلانے والوں کے لیے مجھے ہی رہنے دے تاکہ وہ جس چیز کے مستحق ہیں میں وہ انہیں دے دوں۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ یہ بات وہ خدا کہہ رہا ہے جو ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ تعبیر ضمنی طور پر دشمنوں کی کارشکنیوں اور سازشوں کے مقابلہ میں پیغمبرؐ اور مومنین کی دلداری اور قوتِ قلب کا سبب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ہم عنقریب انہیں ایسی جگہ سے جسے وہ نہیں جانتے تدریجاً عذاب کی طرف لے جائیں گے" (سنستدرجھم من حیث لا یعلمون)۔

* * *

"اور میں انہیں مہلت دیتا رہوں گا اور ان کے عذاب میں جلدی نہ کروں گا۔ کیونکہ میرے منصوبے مستحکم اور دقیق ہیں اور میرا عذاب شدید ہے" (واملی لھم ان کیدی متین)۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"اذا احدث العبد ذنبا جدد لہ نعمۃ، فیدع الاستغفار فھو الاستدراج"

"بعض اوقات جب سرکش بندے گناہ کرتے ہیں تو خدا انہیں نعمت دیتا ہے اور وہ اپنے گناہ سے غافل ہو جاتے اور توبہ کو بھول جاتے ہیں۔ یہی استدراج اور تدریجی بلا و عذاب ہے۔"[1]

یہ حدیث اور بعض دوسری احادیث جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا بعض اوقات معاند اور ہٹ دھرم بندوں کی سزا اور عذاب کے لیے ان گناہوں کے مقابلہ میں جنہیں وہ انجام دیتے ہیں انہیں نعمت عطا کرتا ہے تو وہ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ لطفِ الٰہی ہے جو ان کی شائستگی اور لیاقت کی بناء پر ان کے شاملِ حال ہوا ہے۔ لہٰذا وہ غرور اور غفلت میں غرق ہو جاتے ہیں لیکن پھر اچانک خدا ان کی گرفت کر لیتا ہے اور ناز و نعمت سے نکال کر انہیں عذاب و بلا کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ یہ عذاب کی دردناک ترین

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۰

سکل ہے۔

البتہ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو طغیان و سرکشی کو اس کی آخری حد تک پہنچا دیتے ہیں لیکن وہ افراد جو ابھی اس حد تک نہیں پہنچے، خدا ان کے گناہوں کے مقابلہ میں ان کی گوشمالی اور تنبیہ کرتا ہے۔ پھر یہی چیز ان کی بیداری اور توبہ کا سبب بن جاتی ہے اور یہ ان کے حق میں لطفِ خدا ہے۔

دوسرے لفظوں میں جب انسان گناہ کرتا ہے تو وہ تین حالتوں سے باہر نہیں ہوتا، یا تو وہ خود ہی متوجہ ہو جاتا ہے اور واپس پلٹ آتا ہے، یا خدا اسے ابتلاء کا تازیانہ لگاتا ہے تاکہ وہ بیدار ہو جائے، یا وہ اس میں ان دونوں کے لیے کبھی میں بھی شائستگی نہیں ہوتی اور خدا بلاء و مصیبت کی بجائے اسے نعمت بخشتا ہے۔ پس یہ وہی "عذابِ استدراج" ہے جس کی طرف آیاتِ قرآنی میں اس تعبیر کے ساتھ یا دوسری تعبیروں کے ساتھ اشارہ ہوا ہے۔

لہٰذا انسان کو چاہیئے کہ خدائی نعمتوں کی فراوانی کے موقع پر یہ دیکھے کہ کہیں امر جو ظاہر میں نعمت ہے، "عذابِ استدراج" ہی نہ ہو۔ اسی وجہ سے بیدار مغز مسلمان ایسے موقعوں پر سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے اعمال کی دیکھ بھال کرتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام صادق کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا: میں نے خدا سے مال طلب کیا تو اس نے مجھے مال عطا کیا۔ میں نے اس سے اولاد طلب کی تو اس نے مجھے اولاد بخشی میں نے اس سے گھر طلب کیا تو اس نے مجھے گھر مرحمت فرمایا۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ استدراج ہو۔ امامؑ نے فرمایا:

آگر یہ سب کچھ حمد و شکرِ الٰہی کے ساتھ ہو تو پھر یہ استدراج نہیں ہے، (نعمت ہے)۔[1]

اصلی لمعہ (میں انہیں مہلت دیتا رہوں گا) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا ظالموں کی سزا میں عجلت اور جلد بازی سے کام نہیں لے گا۔ کیونکہ جلد بازی تو وہ کرتا ہے جسے فرصت کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف ہو لیکن خداوند قادرِ متعال جس وقت اور جو بھی ارادہ کرے وہ صورت پذیر ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے فرصت کے نکل جانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بہرحال یہ تمام ظالموں اور سرکشوں کو ایک تنبیہ ہے کہ سلامتی نعمت اور امن و امان ہرگز انہیں مغرور نہ کرنے پائے اور وہ ہر گھڑی و ہر لمحہ خدا کے شدید عذاب کے منتظر رہیں۔[2]

---

[1] اصول کافی بہ نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۷

[2] عذابِ استدراج کے سلسلہ میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۳ (سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۳ کے ذیل میں) اور سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۱۷۸ کے ذیل میں، بالتفصیل بیان کیا ہے۔

(۴۶) اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝

(۴۷) اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝

(۴۸) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝

(۴۹) لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝

(۵۰) فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

ترجمہ

(۴۶) یا تو ان سے کچھ اُجرت مانگتا ہے کہ جس کا ادا کرنا ان کے لیے سنگین ہے؟

(۴۷) یا ان کے پاس غیب کے اسرار ہیں کہ جنہیں وہ لکھتے رہتے ہیں (اور ایک دوسرے کو دیتے ہیں؟)

(۴۸) اب جبکہ ایسا ہے تو تم صبر کرو اور اپنے پروردگار کے حکم کے منتظر رہو اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ بنو (جس نے اپنی قوم پر عذاب کے لیے تقاضا کرنے میں جلد بازی کی اور ترک اولیٰ کی سزا میں گرفتار ہوا) جب کہ اس نے خدا کو پکارا اور وہ غم واندوہ کی حالت میں تھا۔

(۴۹) اگر خدا کی رحمت اس کی مدد کے لیے نہ آئی ہوتی تو (مچھلی کے پیٹ سے) اس حال میں باہر

پھینکا جاتا کہ وہ مذموم ہوتا۔

(۵۰) لیکن اس کے پروردگار نے اس کو برگزیدہ کر لیا اور صالحین میں سے قرار دیا۔

عذاب کا تقاضا کرنے میں جلدی نہ کرو

وہی بازپرس جو گزشتہ آیات میں مشرکین اور مجرموں سے ہوئی تھی اسے جاری رکھتے ہوئے ان آیات میں دو اور سوالوں کا اضافہ کرتا ہے۔ پہلے کہتا ہے: "یا تُو ان سے کچھ اجرت مانگتا ہے کہ جس کا ادا کرنا ان کے لیے سنگین ہے؟" (ام تسئلھم اجرًا فھم من مغرم مثقلون)۔

اگر ان کا بہانہ یہ ہے کہ تیری دعوت کو سننے کے لیے مال کی ضرورت ہے، انھیں اس کے مقابلہ میں بہت اجرت دینا پڑے گی اور ان میں اتنی طاقت نہیں ہے، تو یہ بات بالکل جھوٹ ہے اور تُو ان سے بالکل کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ہی خدا کے پیغمبروں میں سے کسی اور پیغمبر نے کبھی اجرت کا مطالبہ کیا ہے۔

"مغرم"۔ "غرامت" کے مادہ سے اس ضرر کے معنی میں ہے جو انسان کو کسی جرم یا خیانت کے بغیر پہنچتا ہے۔ اور "مثقل" "ثقل" کے مادہ سے سنگینی اور بوجھ کے معنی میں ہے۔ اس طرح سے بہانہ جوئی کرنے والے لوگوں کے ہاتھ سے ایک اور بہانہ چھین لیتا ہے۔

اوپر والی اور اس کے بعد والی آیت بعینہٖ سورۂ طور (کی آیہ ۴۰۔۴۱) میں آئی ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "یا ان کے پاس غیب کے اسرار ہیں کہ جنہیں وہ لکھتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف منتقل کرتے رہتے ہیں۔ گویا ان اسرار میں آیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ یکساں ہیں"۔ (ام عندھم الغیب فھم یکتبون)۔

یہ حقیقت میں بہت بعید احتمالات میں سے ایک احتمال ہے اور ممکن ہے کہ کفار اس بات سے متمسک ہوں۔ لہٰذا قرآن نے اسے بھی فروگزاشت نہیں کیا۔ یعنی کفار یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ وہ کاہنوں کے ذریعہ عالم غیب کے ساتھ مربوط ہیں، اس ذریعہ سے اسرارِ غیب معلوم کرتے ہیں اور انھیں لکھ لیتے ہیں، پھر وہ ایک دوسرے کو دیتے رہتے ہیں۔ یعنی اس طریقہ سے انھوں نے مسلمانوں پر اپنی برتری یا کم از کم ان کے ساتھ اپنی مساوات اور برابری کو معلوم کر لیا ہے۔

یقیناً ان کے پاس اس قسم کے دعوے پر بھی کوئی دلیل نہیں تھی اور یہ جملہ استفہام انکاری کے معنی دیتا ہے۔ بعض نے جو یہ احتمال دیا ہے کہ غیب سے مراد لوح محفوظ ہے اور لکھنے سے مراد تقدیر و قضا ہے تو یہ بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ ان کا ہرگز یہ دعویٰ نہیں تھا کہ قضاء و قدر اور لوح محفوظ کا معاملہ ان کے ہاتھ میں ہے۔

* * * *

چونکہ مشرکین اور دشمنان اسلام کی سختی اور بے عقلی بعض اوقات پیغمبرؐ کے دل کو ایسا دکھ پہنچاتی تھی کہ ممکن تھا آپ ان کے لیے بد دعا اور نفرین کر دیں۔ لہٰذا خدا نے بعد والی آیت میں اپنے پیغمبرؐ کو تسلی دی اور انہیں صبر و شکیبائی کا حکم دیا ہے۔ جیسے فرماتا ہے: "صبر کرو اور اپنے پروردگار کے حکم کے منتظر رہو"۔ (فاصبر لحکم ربک)۔

منتظر رہو یہاں تک کہ خدا تیری اور تیرے اصحاب کی کامیابی اور تیرے دشمنوں کی شکست کے اسباب فراہم کر دے۔ تم ان کے عذاب کے لیے ہرگز جلدی نہ کرنا۔ جان لو کہ یہ مہلت جو انہیں دی جا رہی ہے ایک قسم کا عذاب استدراج ہے۔

اس بناء پر "حکم ربک" سے مراد مسلمانوں کی کامیابی کے بارے میں خدا کا آخری فرمان ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم پروردگار کے احکام کی تبلیغ کی راہ میں صبر و استقامت سے کام لو۔
یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ تمہارے پروردگار نے حکم دیا ہے لہٰذا تم صبر کرو۔[1]
لیکن پہلی تفسیر سب سے مناسب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح نہ ہو جاؤ کہ جس نے اپنی قوم کے عذاب کے لیے جلدی کی اور ترک اولیٰ کی سزا میں گرفتار ہو گیا تھا۔" (ولا تکن کصاحب الحوت)۔
جب اس نے مچھلی کے پیٹ کے اندر سے خدا کو پکارا اور وہ محبوس تھا اور اس کا سینہ غم و اندوہ سے بھرا ہوا تھا" (اذ نادی وھو مکظوم)۔

ندا سے مراد وہی ہے جو سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ میں آیا ہے: فنادی فی الظلمات ان لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین: "اس نے تاریکیوں کے درمیان سے پکارا کہ تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ تو منزہ ہے۔ بیشک میں ستمگاروں میں سے تھا۔" اس طرح اپنے ترک اولیٰ کا اعتراف کیا اور خدا سے عفو و بخشش کا تقاضا کیا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ندا سے مراد وہی نفرین و بد دعا ہو جو اپنی قوم کے لیے کی تھی جبکہ وہ غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے۔ لیکن مفسرین نے پہلی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں "نادیٰ"

---

[1] اس صورت میں "لحکم ربک" کا لام تعلیل کا لام ہے۔

کی تعبیر اس تعبیر کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو سورہ انبیاء کی آیت ۸۷ میں آئی ہے۔ وہ یقیناً اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جب یونسؑ شکم ماہی میں محبوس تھے۔

بہرحال مکظوم "کظم" (بروزن ہضم) کے مادہ سے حلق کے معنی میں ہے اور "کظم سقاء" مشک کے بھر جانے پر اس کے منہ کو باندھنے کے معنی میں ہے۔ اسی مناسبت سے وہ لوگ جو بہت خشمگین یا غمناک ہوتے ہیں اور خود کو قابو میں رکھتے ہیں "کاظم" کہا جاتا ہے۔ پھر اسی مناسبت سے یہ لفظ حبس کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس بناء پر اوپر والی آیت میں مکظوم کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ غصے اور غم و اندوہ میں بھرے ہوئے ہونا یا شکم ماہی میں محبوس ہونا، لیکن پہلا معنی جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، زیادہ مناسب ہے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اگر اس کے پروردگار کی نعمت اور رحمت اس کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھتی تو وہ مچھلی کے پیٹ سے اس حال میں باہر پھینکا جاتا کہ وہ قابلِ مذمت ہوتا"۔ (لولا ان تدارکہ نعمۃ من ربہ لنبذ بالعراء وھو مذموم)[1]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ آخرکار یونسؑ مچھلی کے پیٹ سے ایک خشک بیاباں میں ڈالے گئے جسے قرآن "عراء" سے تعبیر کرتا ہے لیکن یہ اس حالت میں ہوا کہ خدا نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا اور اپنی رحمت کا مشمول قرار دے دیا تھا۔ وہ ہرگز لائقِ مذمت نہیں تھے۔

سورۂ صافات کی آیت ۱۴۵، ۱۴۶ میں بھی یہ آیا ہے: فنبذناہ بالعراء وھو سقیم و انبتنا علیہ شجرۃ من یقطین: "ہم نے اسے خشک اور خالی سرزمین میں پھینک دیا جبکہ وہ بیمار تھا اور کدو کی بیل اس کے اوپر اگا دی (تاکہ وہ اس کے لیے اور مرطوب پتوں کے سائے میں آرام کرے)۔ اور ظاہراً اوپر والی آیت میں نعمت سے مراد وہی توبہ کی توفیق اور رحمتِ الٰہی کا شمول ہوتا ہے۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں: پہلا یہ کہ سورۂ صافات کی آیت ۱۴۳، ۱۴۴ میں آیا ہے: فلولا انہ کان من المسبحین للبث فی بطنہ الٰی یوم یبعثون۔ "اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا"۔ یہ بیان اس چیز کے ساتھ منافات رکھتا ہے جو زیرِ بحث آیت میں آئی ہے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو مختلف سزائیں، ایک زیادہ شدید اور دوسری زیادہ خفیف، یونسؑ کے انتظار میں تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ دنیا کے ختم ہونے تک مچھلی کے پیٹ میں رہیں لیکن یہ تسبیح اور حمدِ الٰہی کی برکت سے برطرف ہو گئی۔ دوسری یہ کہ جب وہ شکمِ ماہی سے باہر آتے تو مذموم اور لطفِ خدا سے دور ہوتے۔ تو وہ سزا بھی

---

[1] نعمت کے مؤنث ہونے کے باوجود اس کا فعل (تدارک) مذکر کی صورت میں آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فاعل مؤنث لفظی ہے اور فعل و فاعل کے درمیان ضمیر منفول میں فاصلہ ہو گیا ہے۔ (غور کیجئے)

پروردگار کی نعمت اور اس کی رحمتِ خاص کی برکت سے برطرف ہو گئی۔

دوسرا سوال یہ کہ سورۂ صافات کی آیت ۱۴۲ میں آیا ہے: فالتقمہ الحوت وھو ملیم: "ایک بہت بڑی مچھلی نے اُسے نگل لیا جبکہ وہ قابلِ ملامت تھا۔ لیکن زیرِ بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کوئی مذمت اور ملامت نہیں تھی۔

اس سوال کا جواب بھی ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ملامت اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جبکہ وہ نئے نئے مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تھے۔ لیکن مذمت کی برطرفی اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جب انھوں نے توبہ کرلی اور خدا نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا اور انھوں نے مچھلی کے پیٹ سے نجات پائی۔

❖ ❖ ❖

اسی لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "اس کے پروردگار نے اُسے چُن لیا اور اُسے صالحین میں سے قرار دیا" (فاجتباہ ربہ فجعلہ من الصالحین)۔

اس کے بعد انھیں نئے سرے سے اپنی قوم کی ہدایت کے لیے مامور کیا۔ وہ ان کی طرف آئے وہ سب ایمان لے آئے اور خدا نے بہت زیادہ مدت تک انھیں زندگی کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا۔

ہم نے یونس اور ان کی قوم کے قصّہ اور اسی طرح ان کے ترکِ اولیٰ سے مربوط دوسرے مسائل یعنی ان کا مچھلی کے پیٹ میں جانا اور مختلف سوالات جو اس سلسلہ میں درپیش ہیں تفصیل کے ساتھ تفسیر نمونہ جلد ۱۰ (سورۂ صافات کی آیت ۱۳۹ تا ۱۴۸ کے ذیل میں) اور اسی طرح تفسیر نمونہ جلد ۷ (سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷، ۸۸ کے ذیل میں بیان کیے ہیں۔

۵۱ وَإِنْ يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ۞

۵۲ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۞

ترجمہ

۵۱ قریب ہے کہ کفار آیات قرآن کو سن کر تجھے اپنی آنکھوں سے ہلاک کر دیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے۔

۵۲ درآنحالیکہ یہ (قرآن) عالمین کے لیے پیام بیداری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

وہ تجھے نابود کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے۔

اوپر والی دونوں آیات جو سورۂ قلم کی آخری آیات ہیں حقیقت میں اسی چیز کو بیان کر رہی ہیں جو اس سورہ کے آغاز میں دشمنوں کی طرف سے پیغمبرؐ کے لیے جنون کی نسبت کے سلسلہ میں آئی تھی۔

پہلے فرمایا ہے: "قریب ہے کہ کفار آیاتِ قرآن کو سن کر تجھے اپنی آنکھوں سے ہلاک کر دیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو دیوانہ ہے"۔ (وان یکاد الذین کفروا لیزلقونك بابصارھم لما سمعوا الذکر ویقولون انہ لمجنون)۔

"لیزلقونك" "زلق" کے مادہ سے پھسلنے اور زمین پر گرنے کے معنی میں ہے اور ہلاکت و نابودی سے کنایہ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں گوناگوں نظریات پیش کیے گئے ہیں:

۱: بہت سے مفسرین نے کہا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب دشمن قرآن کی باعظمت آیات کو تجھ سے سنتے ہیں تو وہ خشمگیں اور پریشاں ہو جاتے ہیں اور دشمنی کے ساتھ تیری طرف دیکھتے ہیں گویا چاہتے ہیں کہ تجھے اپنی آنکھوں سے زمین پر گرائیں اور نابود کر دیں۔

اس معنی کی وضاحت میں ایک گروہ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تجھے نظر بد کے ذریعہ، جس کا بہت سے لوگ عقیدہ رکھتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ بعض آنکھوں میں ایک مرموز اثر چھپا ہوا ہوتا ہے؛ وہ ایک مخصوص نگاہ کے ساتھ طرف مقابل کو بیمار یا ہلاک کر سکتے ہیں، ہلاک و نابود کر دیں۔

۲: بعض نے کہا ہے یہ بہت زیادہ غضب آلود نگاہوں سے کنایہ ہے، جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس طرح بری نگاہ سے میری طرف دیکھا کہ گویا چاہتا تھا کہ مجھے اپنی نگاہ سے کھا جائے یا مار ڈالے۔

۳: اس آیت کی ایک اور تفسیر نظر آتی ہے جو شاید اوپر والی تفاسیر سے زیادہ نزدیک ہو۔ وہ یہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے اس عجیب و غریب تضاد کو جو دشمنان اسلام کی باتوں میں پایا جاتا ہے اس بیان کے ذریعہ ظاہر کر دے اور وہ یہ ہے: وہ جس وقت قرآنی آیات کو سنتے ہیں تو اس قدر مجذوب ہو جاتے ہیں اور اس پر تعجب کرتے ہیں) کہ چاہتے ہیں تجھے نظر لگائیں (کیونکہ نظر لگانا عام طور پر ایسے امور کے بارے میں ہوتا ہے جو بہت زیادہ تعجب میں ڈالنے والے ہوتے ہیں) لیکن اس کے باوجود کہتے ہیں کہ تو دیوانہ ہے۔ یہ واقعاً بڑی تعجب خیز بات ہے۔ دیوانہ اور پراگندہ باتیں کہاں اور یہ حیرت انگیز، جاذب اور پُراثر آیات کہاں؟

یہ دماغ کے ہلکے نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیسی کیسی متضاد و نقیض نسبتیں تیری طرف دے رہے ہیں۔

بہرحال اس بارے میں کہ اسلامی نظریہ کے مطابق اور موجودہ زمانہ کے علوم کے لحاظ سے نظر بد میں کچھ حقیقت ہے یا نہیں؛ انشاء اللہ نکات کی بحث میں گفتگو کریں گے۔

* * *

انجام کار آخری آیت میں مزید کہتا ہے: "یہ قرآن عالمین کے لیے بیداری کا ذریعہ ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے" (وما هو الا ذكر للعالمين)۔

اس کے معارف روشنی بخشنے والے، اس کے انذار آگاہ کرنے والے، اس کی مثالیں پُر معنی، اس کی تشویقیں اور بشارتیں روح پرور، سوتے ہوئے لوگوں کے لیے بیداری کا سبب اور غافلوں کے لیے یادآوری کا موجب؛ ان حالات میں اس کے لانے والے کی طرف جنون کی نسبت کیسے دی جا سکتی ہے۔؟

اس تفسیر کے مطابق یہاں 'ذکر' (بروزن فکر) یادآوری کے معنی میں ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے اس کی تفسیر "شرف" کے معنی کے ساتھ کی اور کہا ہے کہ یہ قرآن تمام عالمین کے لیے ایک شرافت و بزرگی ہے، جیسا کہ سورۂ زخرف کی آیۂ ۴۴ میں فرماتا ہے:

وانہ لذکر لک ولقومک : "قرآن تیرے اور تیری قوم کے لیے شرف اور آبرو کا موجب ہے"
لیکن جیسا کہ ہم نے مذکورہ آیت کے ذیل میں بھی کہا ہے کہ 'ذکر' وہاں بھی یاد آوری اور آگاہی بخشنے کے معنی میں ہے۔ نیز اصولی طور پر قرآن مجید کے ناموں میں سے ایک نام 'ذکر' ہے۔ اس بناء پر پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

ایک نکتہ

کیا نظر بد کی کوئی حقیقت ہے؟

بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بعض آنکھوں میں ایک خاص قسم کا اثر ہوتا ہے۔ جب وہ کسی چیز کی طرف توجہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ اُسے نابود کر دیں یا درہم برہم کر دیں اور اگر کوئی انسان ہے، تو اسے بیمار یا دیوانہ کر دیں۔

یہ مسئلہ عقلی لحاظ سے کوئی امر محال نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ زمانہ کے بہت سے ماہرین کا نظریہ ہے کہ بعض آنکھوں میں ایک خاص قسم کی مقناطیسی قوت چھپی ہوئی ہوتی ہے جو بہت سارے کام کرتی ہے۔ یہاں تک کہ مشق کے ذریعے اس کی پرورش ہو سکتی ہے۔ آنکھوں کی اسی مقناطیسی قوت کے ذریعہ دوسرے آدمی پر مقناطیسی نیند طاری کی جاتی ہے۔

جس دنیا میں "لیزر شعاعیں" جو غیر مرئی ہیں ایسا کام کر سکتی ہیں جو کسی انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہتھیار سے بھی نہیں نہیں ہو سکتا، تو بعض آنکھوں میں ایسی قوت کے وجود کو تسلیم کر لینا جو مخصوص لہروں کے ذریعے طرف مقابل میں اثر انداز ہو سکے، کوئی عجیب چیز نہیں ہوگی۔

بہت سے لوگ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے ایسے افراد دیکھے ہیں جو آنکھ کی اس مرموز توانائی کے حامل تھے، اور انھوں نے کچھ لوگوں، جانوروں یا پھر دوسری چیزوں کو اپنی آنکھوں کی اس خفیہ طاقت سے بیکار کر دیا تھا۔

لہٰذا نہ صرف یہ کہ ان امور کے انکار پر اصرار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے وجود کے امکان کو عقل اور علم کے لحاظ سے قبول کر لینا چاہیے۔

اسلامی روایات میں بھی ایسی بہت سی مختلف تعبیریں نظر آتی ہیں جو اس امر کی اجمالاً تائید کرتی ہیں۔
ایک حدیث میں آیا ہے کہ اسماء بنت عمیس نے پیغمبرؐ کی خدمت میں عرض کیا: "بعض اوقات جعفر کے بیٹوں کو نظر لگ جاتی ہے، کیا میں ان کے لیے "رقیہ" لے لوں۔ (رقیہ سے مراد وہ لکھی ہوئی دعائیں ہیں، جنھیں کچھ لوگ بری نظر سے بچنے کے لیے اپنے پاس رکھتے ہیں اور اسے تعویذ بھی کہتے ہیں)۔

پیغمبرؐ نے فرمایا :

"نعم، فلو کان شیء یسبق القدر لسبقة العین"

"ہاں ! کوئی حرج نہیں ہے، اگر کوئی چیز قضاء و قدر پر سبقت لے سکتی ہے تو وہ نظرِ بد کا لگنا ہے"۔[1]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امیرالمومنینؑ نے فرمایا :

"پیغمبرؐ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے لیے ایک تعویذ بنایا اور آپ نے یہ دعا پڑھی :

"اعیذ کما بکلمات التامة واسماء الله الحسنیٰ کلما عامة،
من شر السامة والهامة ومن شر کل عین لامة، ومن شر
حاسد اذا حسد"

"میں تمہیں تمام کلمات اور خدا کے اسمائے حسنیٰ کے سپرد، موذی جانوروں کے شر اور ہر بُری آنکھ اور حسد کرنے والے کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے، سپرد کرتا ہوں"
اس کے بعد پیغمبرؐ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا : حضرت ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ کے لیے اسی طرح سے تعویذ بنایا تھا"۔[2]

نہج البلاغہ میں بھی آیا ہے : "العین حق والرقی حق": نظرِ بد بھی حق ہے اور اس کے دفع کرنے کے لیے دعا و تعویذ سے متوسل ہونا بھی حق ہے"۔[3]

اس نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ دعائیں اور وسیلے حکمِ خدا سے آنکھ کی مرموز مقناطیسی قوت و توانائی کی تاثیر کو روک دیں، جیسا کہ دعائیں بہت سے دوسرے مخرب عوامل پر اثر انداز ہوتی ہیں اور انہیں خدا کے حکم سے بے اثر کر دیتی ہیں۔

* * *

یہ بات بھی یاد دلانی ضروری ہے کہ اجمالی طور سے نظرِ بد کی تاثیر کو قبول کرنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس قسم کے موارد میں بیہودہ کاموں اور عامیانہ اعمال کی پناہ لی جائے جو احکامِ شریعت کے برخلاف ہیں اور اصل موضوع میں بے خبر لوگوں کے شک و تردد کا باعث بھی ہیں۔ جیسا کہ بہت سے حقائق کے ان خرافات کے ساتھ آلودہ

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۱

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۰

[3] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۴۰۰ (یہ حدیث صحیح بخاری جلد ۷ ص ۱۷۰، باب العین حق میں بھی اس صورت میں نقل ہوئی ہے العین حق، "المعجم المفهرس لالفاظ الحدیث النبوی" میں یہی معنی مختلف منابع سے نقل ہوا ہے۔ (جلد ۴ ص ۴۵۱)

ہونے سے یہ غیر مطلوب تاثیر ذہنوں میں بیٹھ گئی ہے۔

٭ ٭ ٭

خداوندا! ہمیں شر اشرار اور دشمنوں کے مکروں سے اپنی پناہ میں محفوظ رکھ!

پروردگارا! ہمیں وہ صبر و استقامت مرحمت فرما جس کے سائے میں ہم تیری رضا کو حاصل کرسکیں۔

بارِ الٰہا! ہمیں اپنی بے پایاں نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مرحمت فرما۔ اس سے پہلے کہ ناشکریاں اسے ہم سے سلب کریں۔ آمین یا رب العالمین۔

سورۂ قلم کا اختتام

۲۸ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

ترجمہ کا اختتام

۱۵ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۸۷ء

بروز منگل بوقت صبح ساڑھے پانچ بجے

۱۸، ای، ماڈل ٹاؤن

لاہور

سورۂ

حاقّہ

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز

۲۸ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

سورۂ حاقہ کے مضامین

اس سورہ کے مباحث تین محوروں پر گردش کرتے ہیں :

پہلا محور : جو اس سورہ کی بحث کا اہم ترین موضوع ہے وہ قیامت سے مربوط مسائل اور اس کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ اسی لیے قیامت کے تین نام 'حاقہ' 'قارعہ' اور 'واقعہ' اس سورہ میں آئے ہیں۔

دُوسرا محور : وہ مباحث ہیں جو گزشتہ کافر اقوام خصوصاً قوم عاد، ثمود اور قوم فرعون کی سرنوشت کے بارے میں ہیں۔ جو تمام کفار اور منکرین قیامت کے لیے قوی اور مؤکد انذاروں پر مشتمل ہیں۔

تیسرا محور : وہ مباحث ہیں جو قرآن کی عظمت، پیغمبرؐ کے مقام نیز تکذیب کرنے والوں کی سزا اور عذاب کے بارے میں ہیں۔

* * *

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے :

"من قرأ سورة الحاقة حاسبه الله حسابًا یسیرًا"

جو شخص سورہ حاقہ کی تلاوت کرے گا خدا قیامت میں اس کے حساب کو آسان کر دے گا"۔ [1]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

"اکثروا من قرائة الحاقة، فان قرائتها فی الفرائض والنوافل من الایمان بالله و رسوله ولم یسلب قارئها دینه حتی یلقی الله"

سورہ حاقہ کی بہت زیادہ تلاوت کیا کرو، کیونکہ فرائض و نوافل میں اس کی قرأت خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان کی نشانی ہے، اور جو شخص اسے پڑھے گا اس کا دین محفوظ رہے گا، یہاں تک کہ وہ اللہ سے جا ملے۔ [2]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۲

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) اَلْحَآقَّةُ ۝

(۲) مَا الْحَآقَّةُ ۝

(۳) وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝

(۴) كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ ۝

(۵) فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝

(۶) وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝

(۷) سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝

(۸) فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ ۝

* * *

ترجمہ

رحمن و رحیم خدا کے نام سے

(۱) وہ دن جو یقیناً واقع ہوگا۔

(۲) اور یہ واقع ہونے والا دن کیا ہے؟

(۳) اور تجھے کیا معلوم کہ وہ واقع ہونے والا دن کیا ہے؟

(۴) قوم ثمود و عاد نے خدا کے سرکوبی کرنے والے عذاب کا انکار کیا۔

(۵) تو قوم ثمود تو سرکش عذاب سے ہلاک ہوئی۔

(۶) اور قوم عاد طغیانی کرنے والی ٹھنڈی اور زور دار اور تیز آندھی سے ہلاک ہوئی۔

(۷) خدا نے بنیادوں کو اکھاڑنے والی اس تیز آندھی کو سات راتیں اور آٹھ دنوں تک پے در پے ان پر مسلط رکھا (اور اگر تو وہاں ہوتا تو دیکھتا کہ وہ قوم بوسیدہ تنوں اور کھجور کے کھوکھلے درختوں کی مانند اس تیز آندھی کے درمیان زمین پر پڑی ہے اور ہلاک ہو گئی ہے۔

(۸) کیا ان میں سے تو کسی کو باقی دیکھتا ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

سرکشی کرنے والی قوم کے لیے سرکش عذاب

یہ سورۃ مسئلہ قیامت سے اور وہ بھی ایک نئے عنوان کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ فرماتا ہے:

"وہ تحقق پانے والا دن" (الحاقۃ)۔

❖ ❖ ❖

"وہ تحقق پانے والا دن کیا ہے؟" (ما الحاقۃ)۔[1]

❖ ❖ ❖

"اور تجھے کیا معلوم کہ وہ تحقق پانے والا دن کیا ہے؟" (وما ادراک ما الحاقۃ)۔

تقریباً تمام مفسرین نے "حاقۃ" کی قیامت کے دن کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسا دن ہے قطعی اور یقینی طور پر واقع ہوگا، جیسا کہ سورہ "واقعہ" میں "الواقعۃ" کی تعبیر ہے۔ یہی تعبیر اسی سورہ کی آیت ۱۶ میں بھی آئی ہے اور یہ سب اس عظیم دن کے یقینی ہونے کی حکایت بیان کرتی ہیں۔

---

[1] اس جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیے گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ یکہا جائے۔ "الحاقۃ" مبتداء ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

"ما الحاقۃ" کی تعبیر اس دن کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ ہم روزمرہ کی تعبیروں میں کہتے ہیں: فلاں شخص انسان ہے، کیا ہی انسان ہے؟ یعنی اس کی انسانیت کی تعریف و توصیف کے لیے کوئی حد نہیں ہے۔ (یعنی بہت اچھا انسان ہے)

* * *

"ما ادرٰىك ما الحاقۃ" کی تعبیر دوبارہ اس عظیم دن کے حوادث کی عظمت پر مزید تاکید ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر سے خطاب ہوتا ہے کہ تو نہیں جانتا وہ دن کس قسم کا ہے؟ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے حقائق کو درک کرنا ہم دنیاوی زندان کے قیدیوں کے لیے امکان پذیر نہیں ہے، جیسا کہ دنیا سے مربوط مسائل کا درک کرنا شکم مادر کے جنین کے لیے کسی بھی بیان سے میسر نہیں ہے۔[1]

ایک اور احتمال جو ان آیات کی تفسیر میں ہے، اگرچہ بہت کم مفسرین نے اسے قبول کیا ہے، یہ ہے کہ "الحاقۃ" ان عذابوں کی طرف اشارہ ہے جو سرکش، طاغی، خودخواہ و خود پسند مجرموں کو اچانک اور ناگہانی طور پر اس دنیا میں دامن گیر ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت میں "القارعۃ" بعض مفسرین کے کلام میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہی تفسیر آئندہ والی آیات کے ساتھ جو قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون اور قوم لوط کی سرکوبی کرنے والے عذابوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں، زیادہ مناسب نظر آتی ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی آیا ہے۔ "الحاقۃ، الحذر بنزول العذاب"۔ جیسا کہ (سورۂ مؤمن کی آیت ۴۵ میں) آل فرعون کے بارے میں فرماتا ہے: وحاق بآل فرعون سوء العذاب۔ بُرا عذاب آلِ فرعون پر نازل ہوا اور اس نے انھیں گھیر لیا۔[2]

* * *

اس کے بعد ان قوموں کی سرنوشت کو بیان کرتا ہے جنھوں نے قیامت کے دن (یا دنیا میں عذاب الٰہی کے نزول) کا انکار کیا لہٰذا مزید کہتا ہے: "قوم عاد و ثمود نے خدا کے سرکوبی کرنے والے عذاب کا انکار کیا"۔ (کذبت ثمود وعاد بالقارعۃ)۔

* * *

(بقیہ صفحہ سابقہ) اور ما استفہامیہ دوسرا مبتداء ہے۔ اس کے بعد والا "الحاقۃ" خبر ہے دوسرے مبتداء کی اور ان کا مجموعہ خبر ہے پہلے مبتداء کی۔

[1] بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "ما ادرٰىك" کا جملہ قرآن میں اس جگہ کہا گیا ہے جہاں مطلب معلوم اور مسلّم ہے۔ لیکن "وما يدريك" ان موارد میں آیا ہے جہاں مطلب نامعلوم ہے۔ (مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۴) بعض دوسرے مفسرین مثلاً قرطبی نے بھی اسی معنی کو نقل کیا ہے۔

[2] تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۳۸۳۔

(توجہ رکھیں کہ "حاقۃ" اور "حاق" کا مادہ ایک ہی ہے۔)

"پس قوم ثمود تو سرکش عذاب کے ذریعہ ہلاک ہوئی۔" (فاما ثمود فاھلکوا بالطاغیۃ)۔

ثمود وہ قوم تھی جو حجاز و شام کے درمیان کوہستانی علاقہ میں آباد تھی۔ حضرت صالحؑ ان کی طرف مبعوث ہوئے لیکن وہ ہرگز ایمان نہ لائے اور ان سے مبارزہ کے لیے تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے حضرت صالحؑ سے کہا کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو وہ عذاب جس کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے اسے نازل کر دے۔ اس وقت ایک تباہ کرنے والی بجلی ان پر مسلط ہو گئی جس نے چند لمحوں کے اندر ان کے مضبوط گھروں اور مستحکم محلوں میں لرزہ پیدا کر دیا۔ ان سب کو تہس نہس کر دیا اور ان کے بے جان جسم زمین پر پڑے رہ گئے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اس نافرمان قوم کی نابودی کے عامل کو سرکش عذاب شمار کرتا ہے۔ "الطاغیۃ" اور یہ سرکش عذاب سورہ اعراف کی آیت ۷۸ میں "رجفۃ" (زلزلہ) کے عنوان سے ذکر ہوا۔ سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۱۳ میں "صاعقۃ" اور سورہ ہود کی آیت ۶۷ میں "صیحۃ" کے نام سے مذکور ہے۔ یہ سب الفاظ حقیقت میں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں۔ کیونکہ صاعقہ (بجلی) ہمیشہ ایک مہیب آواز کے ساتھ ہوتی ہے۔ (کڑکتی ہے) جس جگہ آکر گرتی ہے اس میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے اور وہ سرکش عذاب بھی ہے۔[1]

اس کے بعد قوم عاد کی سرگزشت بیان کرتا ہے۔ وہ قوم جو سرزمین احقاف (جزیرہ نمائے عرب یا یمن) میں آباد تھے۔ ان کے قد و قامت طویل، بدن قوی، شہر آباد، زمینیں سرسبز و شاداب اور ہرے بھرے باغات تھے۔ ان کے پیغمبر حضرت ہودؑ تھے۔ ان لوگوں نے بھی اپنے طغیان و سرکشی کو اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ خدا نے ایسے دردناک عذاب کے ساتھ جس کی تشریح انھیں آیات میں آئی ہے، ان کی زندگی کے دفتر کو لپیٹ دیا۔ پہلے فرماتا ہے: "باقی رہی قوم عاد تو وہ ایک تیز و سرکش، زناٹے دار، اونچی آواز والی سرد اور زہریلی آندھی کے ذریعہ ہلاک ہو گئی۔" (و اما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیۃ)۔

"صرصر" (بروزن دفتر) سرد یا زناٹے دار آواز والی یا زہریلی ہواؤں کو کہا جاتا ہے۔ مفسرین نے اس کی تفسیر میں یہ تینوں معانی ذکر کیے ہیں، اور ان کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

"عاتیۃ" "عتو" (بروزن غلو) کے مادہ سے سرکش کے معنی میں ہے۔ البتہ فرمانِ خدا سے سرکش نہیں بلکہ معمولی اور سبک رفتار ہواؤں کے معیار سے سرکش۔

* * *

اس کے بعد اس تیز سرکوبی کرنے والی آندھی کی ایک دوسری توصیف کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "خدا نے اس کو اس قوم پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن ان کی بنیادیں اکھاڑنے کے لیے مسلط کیے رکھا": (سخرھا علیھم سبع لیال و ثمانیۃ ایام حسوما)۔

---

[1] قوم ثمود کی سرگزشت تفسیر نمونہ کی جلد ۴ میں تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔

حسوماً۔ حسم (بروزن اسم) کے مادہ سے کسی چیز کے آثار ختم کرنے کے معنی میں ہے۔ اگر تلوار کو حسام (بروزن غلام) کہا جاتا ہے تو وہ اسی مناسبت سے ہے۔ بعض اوقات زخم کی جڑ کو جلانے کے لیے اس پر داغ لگانے کو بھی حسم کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ سخت آندھی نے سات راتوں اور آٹھ دنوں میں اس عظیم قوم کی وسیع اور بارونق زندگی کو یکسر تباہ و برباد کیا، اور ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پراگندہ کر دیا۔[1]

نتیجہ وہ ہوا کہ قرآن کہتا ہے: "اگر تو وہاں ہوتا تو مشاہدہ کرتا کہ وہ ساری کی ساری قوم منہ کے بل گری پڑی ہے: (فتری القوم فیہا صرعٰی کانہم اعجاز نخل خاویۃ)۔

کتنی عمدہ تشبیہ ہے، جو ان کے طویل قد و قامت کو بھی مشخص کرتی ہے، ان کے جڑ سے اکھڑ جانے کو بھی ظاہر کرتی ہے اور خدا کے عذاب کے مقابلہ میں ان کے اندر سے خالی ہونے کو بھی بیان کرتی ہے۔ اس طرح کہ وہ تیز آندھی جدھر چاہتی ہے انہیں آسانی کے ساتھ لے جاتی ہے۔

"خاویۃ" "خواء" (بروزن ہوا) کے مادہ سے اصل میں خالی ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ تعبیر بھوکے شکموں، (زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے عقیدے کے مطابق) بارش سے خالی ستاروں اور بے مغز اخروٹ کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

آخری آیت میں مزید کہتا ہے: "کیا تم ان میں سے کسی کو باقی دیکھتے ہو" (فہل تری لہم من باقیۃ)۔[2]

ہاں! آج نہ صرف قوم عاد کا کوئی نام و نشان باقی نہیں بلکہ ان کے آباد شہروں اور پرشکوہ عمارتوں کے کھنڈرات اور ان کے سرسبز کھیتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں ہے۔

قوم عاد کی سرگزشت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۵ (سورۃ ہود کی آیت ۵۸ تا ۶۰ اور اسی طرح جلد ۱۱ میں بھی تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں)

• • •

---

[1] توجہ رہے کہ "حسوماً"، "سبع لیال و ثمانیۃ ایام" (سات راتیں اور آٹھ دن) کی صفت ہے اور بعض نے اسے ریح سے حال یا مفعول ذکر کیا ہے۔

[2] "باقیۃ" ایک مقدر موصوف کی صفت ہے اور اصل میں "نفس باقیۃ" ہے۔

(۹) وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝

(۱۰) فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝

(۱۱) اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝

(۱۲) لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝

ترجمہ

(۹) اور فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے اور تہ و بالا ہونے والے شہروں کے لوگ (قوم لوط) بہت بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔

(۱۰) انھوں نے اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول کی مخالفت کی اور خدا نے بھی انھیں شدید عذاب میں گرفتار کیا۔

(۱۱) ہم نے اس وقت، جب پانی میں طغیانی آئی، تو تمھیں کشتی میں سوار کر دیا۔

(۱۲) تاکہ ہم اسے تمھارے لیے تذکّر کا وسیلہ قرار دیں اور سننے والے کان اسے یاد رکھتے ہیں۔

تفسیر

سننے والے کان کہاں ہیں؟

قوم عاد و ثمود کی سرگزشت کے ایک گوشہ کو بیان کرنے کے بعد دوسری اقوام جیسے قوم نوح اور قوم لوط کی طرف

توجہ کرتا ہے تاکہ ان کی زندگی سے بیدار دل افراد کو ایک اور درس عبرت دے، فرماتا ہے: فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے اور تہ و بالا ہونے والے شہروں کے لوگ (قوم لوط) بہت بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے: (وجاء فرعون ومن قبلہ والمؤتفکات بالخاطئۃ)۔

"خاطئۃ" "خطا" کے معنی میں ہے (دونوں مصدری معنی رکھتے ہیں) اور یہاں خطا سے مراد شرک و کفر، ظلم و فساد اور انواع و اقسام کے گناہ ہیں۔

"مؤتفکات" "مؤتفکہ" کی جمع ہے۔ "ائتفاک" کے مادہ سے الٹ پلٹ اور تہ و بالا ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں قوم لوط کے شہروں کی طرف اشارہ ہے جو ایک شدید زلزلے کی وجہ سے تہ و بالا ہو گئے۔

"من قبلہ" سے مراد وہ قومیں ہیں جو فرعون سے پہلے تھیں۔ مثلاً قوم شعیب اور قوم ثمود جیسے سرکش لوگ۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے اور خدا نے انہیں شدید عذاب میں گرفتار کر لیا": (فعصوا رسول ربھم فاخذھم اخذۃ رابیۃ)۔

فرعونی، موسیٰ اور ہارون کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سدوم کے شہروں میں رہنے والوں نے لوطؑ کی مخالفت کی اور دوسری اقوام نے بھی اپنے پیغمبروں کے فرمان سے روگردانی کی۔ ان سرکشوں میں سے ہر گروہ ایک خاص قسم کے عذاب میں گرفتار ہوا۔ فرعونی نیل کی موجوں میں، جو ان کی حیات و آبادی اور ملک کی برکت کا سبب تھا، غرق ہو گئے، اور قوم لوطؑ کے لوگ شدید زلزلہ اور اس کے بعد پتھروں کی بارش سے تباہ و برباد اور نابود ہو گئے۔

"رابیۃ" اور "ربا" ایک ہی مادہ سے ہیں اور آزمائش اور اضافہ کے معنی میں ہیں۔ یہاں وہ عذاب مراد ہے، جو بہت ہی سخت اور شدید تھا۔

قوم فرعون کی داستان کی تفصیل قرآن کی بہت سی سورتوں میں آئی ہے۔ سب سے زیادہ تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۸ سورہ شعراء کی آیت (۱۰ تا ۶۸) میں، تفسیر نمونہ جلد ۴ (سورہ اعراف آیت ۱۰۳ تا ۱۲۶) میں اور تفسیر نمونہ جلد ۷ (سورہ طٰہٰ آیہ ۴۲ سے ۷۹ تک) میں آئی ہے۔

قوم لوطؑ کی داستان بھی قرآن کی بہت سی سورتوں میں ہے، چنانچہ تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورہ حجر آیت ۶۱ تا ۷۷) اور تفسیر نمونہ جلد ۵ (سورہ ہود آیت ۷۷ تا ۸۳) میں آیا ہے۔

آخر میں قوم نوحؑ کی سرگزشت اور ان کے دردناک عذاب کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

"ہم نے اس وقت جب پانی میں طغیانی آئی تو تمہیں کشتی میں سوار کر دیا": (انا لما طغا الماء حملناکم فی الجاریۃ)۔

پانی کی طغیانی اس طرح تھی کہ تیرہ و تاریک بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایسی بارش ہوئی کہ گویا آسمان کی طرف سے سیلاب گر رہا ہے اور زمین سے بھی چشمے اُبلنے لگے۔ پھر یہ دونوں طرف کے پانی ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے اور ہر چیز پانی میں ڈوب گئی بس باغات، کھیتیاں اور سرکش قوم کے محلات اور مکانات سب غرقاب ہو گئے۔ جن لوگوں نے نجات پائی ان میں صرف وہ مومنین تھے جو نوحؑ کے ہمراہ کشتی میں سوار ہو گئے تھے۔

"حملناکم" (تمہیں کشتی میں سوار کیا) کی تعبیر ہمارے اسلاف اور بڑوں سے کنایہ ہے، کیونکہ اگر انھوں نے نجات حاصل نہ کی ہوتی تو آج ہم موجود نہ ہوتے۔[1]

* * *

اس کے بعد ان سزاؤں کے ہدف اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "مقصد یہ تھا کہ اسے تمہاری یاد آوری اور تذکر کے لیے دلیل قرار دیں" (لنجعلہا لکم تذکرۃ)۔

"اور سننے والے کان اس کی حفاظت کریں" (وتعیہا اذن واعیۃ)۔

ہم ہرگز ان سے انتقام لینا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ہدف انسانوں کی تربیت اور راہِ کمال میں ان کی ہدایت، رشد و کمال اور مطلوب تک پہنچانا تھا۔

"تعیہا" "وعی" (بروزن سعی) کے مادہ سے ہے جس طرح راغب نے 'مفردات' میں اور 'ابن منظور' نے 'لسان العرب' میں کہا ہے۔ اصل میں کسی چیز کو دل میں محفوظ رکھنے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ہر برتن کو 'وعاء' کہا گیا، کیونکہ وہ اپنے اندر کسی چیز کو محفوظ رکھتا ہے۔

زیر بحث آیت میں یہ صفت کانوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ وہ کان جو حقائق کو سنتے ہیں اور اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔

یا دوسرے لفظوں میں بعض اوقات انسان ایک بات کو سنتا ہے اور فوراً اُسے کان سے باہر نکال دیتا ہے، جیسا کہ عام لوگوں کی تعبیروں میں کہا جاتا ہے: "ایک کان سے سُنی اور دوسرے کان سے نکال دی"۔ لیکن بعض اوقات وہ اس بات میں غور و فکر کرتا ہے، اسے اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور اس کو اپنی زندگی کی راہ کا چراغ شمار کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے 'وعی' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

* * *

---

[1] اس طرح بعض نے لکھا ہے کہ آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں حملنا اٰباءکم تھا۔

چند نکات

۱: علیؑ کے فضائل میں سے ایک اور فضیلت

بہت سی مشہور اسلامی کتابوں میں آیا ہے وہ تفسیر کی ہوں یا حدیث کی یہ آیا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ نے اوپر والی آیہ (وتعیها اذن واعیة) کے نزول کے وقت فرمایا:

"سألت ربی ان یجعلها اذن علیؑ"

"میں نے خدا سے سوال کیا ہے کہ علیؑ کے کان کو ان سننے والے حقائق کو محفوظ رکھنے والے کانوں میں سے قرار دے۔"

اس کے بعد امام علیؑ فرماتے تھے:

"ما سمعت من رسول اللهؐ شیئًا قط فنسیته الا وحفظته"

"میں نے رسولِ خداؐ سے کوئی چیز نہیں سنی جسے بھول گیا ہوں، بلکہ وہ ہمیشہ میرے حافظہ میں رہی ہے۔"[1]

"غایة المرام" میں اس سلسلہ میں سولہ احادیث شیعہ اور اہلِ سنت کے طرق سے نقل ہوئی ہیں، اور محدث بحرانی نے تفسیر "البرہان" میں محمد بن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس سلسلہ میں تیس احادیث عامہ اور خاصہ کے طرق سے نقل ہوئی ہیں۔

ہاں! یہ اسلام کے عظیم پیشوا اور امام علیؑ کی ایک عظیم فضیلت ہے کہ وہ اسرارِ پیغمبرؐ کے خزینہ اور رسولِ خداؐ کے تمام علوم کے وارث ہیں۔ اسی بناء پر آنحضرتؐ کے بعد ان مشکلات میں جو اسلامی معاشرے کو پیش آتی تھیں، موافق و مخالف سبھی لوگ آپ کی پناہ لیتے، اور آپ سے ہی مشکل کا حل چاہتے تھے۔ یہ واقعات کتبِ تواریخ میں تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔

* * *

۲: گناہ اور سزا میں تناسب

جو تعبیریں اوپر والی آیات میں آئی ہیں قابلِ توجہ ہیں۔ قوم ثمود کے عذاب کے بارے میں "طاغیتہ"، قوم عاد

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۴۳۔ مجمع البیان، روح البیان، روح المعانی، ابو الفتوح رازی، المیزان میں زیرِ بحث آیات کے ذیل میں، نیز یہ حدیث "مناقب ابن مغازلی شافعی" ص ۲۶۵ (طبع اسلامیہ، م ۱۳۹۴) آئی ہے۔

کے بارے میں "عاتیۃ" قوم فرعون اور قوم لوط کے بارے میں "رابیۃ" اور قوم نوح کے بارے میں "طغا الماء" کی تعبیر لاتا ہے۔ ان سب میں طغیان اور سرکشی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ اس طرح سے اس سرکشی کرنے والی قوم کے عذاب میں زندگی کی بعض نعمتوں کے سرکش ہونے کو شمار کیا گیا ہے۔ چاہے وہ پانی، ہوا یا مٹی اور آگ۔

یہ تعبیریں اس حقیقت پر ایک تاکید ہیں کہ دنیا و آخرت کے عذاب خود ہمارے اعمال ہی کا تجسّم ہیں اور یہ خود انسانوں کا کردار ہی ہے جو انہیں کی طرف لوٹایا جائے گا۔

◆ ◆ ◆

۱۳ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۝

۱۴ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝

۱۵ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝

۱۶ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۝

۱۷ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓی اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝

ترجمہ

۱۳ جونہی کہ ایک مرتبہ صور میں پھونکا جائے گا۔

۱۴ اور زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھا لیے جائیں گے، اور وہ یکایک ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جائیں گے۔

۱۵ اس دن (یہ عظیم واقعہ) واقع ہوگا۔

۱۶ آسمان پھٹ جائیں گے اور کمزور ہو کر گر پڑیں گے۔

۱۷ فرشتے آسمانوں کی طرفوں اور کناروں پر ہوں گے۔ (اور مامورینوں کی انجام دہی کے لیے تیار ہوں گے)، اور اس دن تیرے پروردگار کے عرش کو آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائیں گے۔

تفسیر

وہ دن جس میں وہ عظیم واقعہ رونما ہوگا۔

اس سورۃ کی ابتدائی آیات کو جاری رکھتے ہوئے جو معاد اور قیامت کے مسئلہ کو بیان کرتی تھیں، زیرِ بحث آیات اس عظیم قیامت کے حوادث کے مباحث کو پیش کرتی ہیں، ایسی ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی تعبیروں کے ساتھ جو انسان کو ان وقائع کی عظمت سے آشنا کرتی ہیں جو اسے درپیش ہوں گے۔

پہلے فرماتا ہے، "جب ایک دفعہ صور میں پھونکا جائے گا" (فاذا نفخ فی الصور نفخة واحدة)۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے اختتام اور دوسرے جہان کے آغاز میں، ناگہاں اور اچانک ایک عظیم صدا پیدا ہوگی، جسے "نفخ صور" (ناقوس میں پھونکنے سے) تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ زمانہ میں اور آج بھی لشکر کو اکٹھا اور تیار کرنے کے لیے یا اُسے آرام گاہ یا چھاؤنی کی طرف بھیجنے کے لیے بگل سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ جب آرام کرنے اور سونے کا بگل بجایا جاتا ہے تو سب سپاہی آرامگاہ میں چلے جاتے ہیں اور جب جمع کرنے اور تیاری کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے تو تمام سپاہی اپنی جگہ سے چل پڑتے ہیں اور اپنی صفوں کو منظم کرتے ہیں۔ گویا خدا یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس جہان کے ختم کرنے اور دوسرے جہان کے آغاز کا مسئلہ میری قدرت کے مقابلہ میں ایک بگل میں پھونکنے جتنا آسان ہے۔ ایک ہی فرمان سے ایک لمحہ کے اندر اندر تمام اہلِ آسمان اور سب اہلِ زمین مر جائیں گے۔ پھر ایک دوسرے فرمان کے ساتھ سب کے سب زندہ ہو جائیں گے اور حساب کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

"صُور" کی خصوصیات اور اس میں "نفخ" کی کیفیت، پھونکنے کی تعداد اور ان کے درمیان فاصلہ کے بارے میں بہت سے مطالب ہیں۔ وہ ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۱۱ سورہ زمر کی آیت ۶۸ کی تفسیر میں بیان کر دیئے ہیں۔ یہاں ان کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک چیز کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ نفخِ صور، جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہوا ہے دو نفخے ہیں، "موت کا نفخہ" اور "حیاتِ جدید کا نفخہ"۔ اس بارے میں کہ زیرِ بحث آیت میں جو نفخہ آیا ہے پہلا نفخہ ہے یا دوسرا، مفسرین کا اس سلسلہ میں کوئی ایک نظریہ نہیں ہے کیونکہ جو آیات بعد میں آئی ہیں ان میں سے بعض موت کے نفخہ سے اور بعض حیات و معاد اور قبروں کے اُٹھنے کے نفخہ سے مناسبت رکھتی ہیں، لیکن مجموعی طور پر یہ آیات پہلے نفخہ کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہیں اور وہ اختتامِ جہان کا نفخہ ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور جب زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھا لیے جائیں گے اور ایک ہی ضرب

کے ساتھ درہم برہم اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔" (وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ)۔
"دک" جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے: اصل میں صاف اور نرم زمین کے معنی میں ہے چونکہ ایک ناہموار زمین کو صاف کرنے کے لیے اسے کوٹنا پیٹنا پڑتا ہے۔ لہٰذا بہت سے موارد میں یہ لفظ شدت سے کوٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

لیکن بعض منابع لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ "دک" کا اصل معنی کوٹنا اور ویران کرنا ہے۔ چونکہ کوٹنے اور ویران کرنے کا لازمہ صاف اور ہموار کرنا ہے لہٰذا یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[1]

بہرحال زیربحث آیت میں یہ لفظ پہاڑوں اور ناہموار زمینوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور کوٹے جانے کے معنی میں ہے، اس طرح کہ ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ ہو کر ہموار ہو جائیں۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس دن جہان میں واقعۂ عظیم رُونما ہوگا اور قیامت برپا ہوگی" (فیومئذ وقعت الواقعۃ)۔

* * *

نہ صرف زمین اور پہاڑ بکھر کر پراگندہ ہو جائیں گے بلکہ "آسمانوں اور زمینوں میں بھی شگاف پڑ جائیں گے اور وہ کمزور اور غیرمحکم ہو جائیں گے۔" (وانشقت السماء فھی یومئذ واھیۃ)۔

عظیم آسمانی کرّے بھی اس ہولناک اور وحشتناک حادثہ سے بچ کر نہیں رہ سکتے، وہ بھی شگافتہ اور پراگندہ ہو کر بکھر جائیں گے اور اپنی مضبوطی اور استحکام کے باوجود وہ اس قدر کمزور ہو جائیں گے کہ سورہ الرحمٰن کی آیت ۳۷ میں قرآن کے قول کے مطابق: "آسمان پھٹ کر پگھلے ہوئے روغن کی طرح سرخ ہو جائیں گے۔" فاذا انشقت السماء فکانت وردۃ کالدھان"

یا دوسرے لفظوں میں موجودہ زمین و آسمان ویران ہو جائیں گے اور ان کے ویرانوں اور کھنڈرات پر ایک نیا جہان برپا ہوگا جو موجودہ جہاں سے برتر، بالاتر اور کامل تر ہوگا۔

* * *

اور فرشتے آسمانوں کی طرفوں اور کناروں پر ہوں گے۔" (والملک علی ارجائھا)۔
"ارجاء" "رجا" کی جمع ہے جو کسی چیز کے اطراف و جوانب کے معنی میں ہے۔ "ملک" اگرچہ یہاں صیغۂ مفرد میں آیا ہے۔ لیکن اس سے مراد جنس و جمع ہے۔

گویا فرشتے اس دن مامورین کی طرح جو کسی میدان کے اطراف میں کھڑے ہوں اور کام انجام دینے کے لیے

---

[1] اقرب الموارد مادہ "دک"۔

فرمان کے منتظر ہوں، آسمان کے گرد، گروصف باندھے ہوئے ہوں گے اور حق تعالےٰ کے فرمان کے منتظر ہوں گے۔

٭ ٭ ٭ ٭

اس کے بعد فرماتا ہے: "اور اس دن آٹھ فرشتے اپنے پروردگار کا عرش اٹھائے ہوئے ہوں گے۔" (ویحمل عرش ربك فوقهم يومئذ ثمانية)۔

یہ حاملین عرش اگرچہ صراحت کے ساتھ اس آیت میں متعین نہیں ہوئے ہیں کہ وہ فرشتوں میں سے ہوں گے یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں گے لیکن پوری آیت کی تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ فرشتوں میں سے ہوں گے۔ لیکن یہ مشخص نہیں ہے کہ وہ آٹھ فرشتے ہوں گے یا وہ فرشتوں کے آٹھ چھوٹے یا بڑے گروہ ہوں گے۔

البتہ اسلامی روایات میں آیا ہے کہ اس وقت بھی حاملین عرش چار نفر ہیں۔ لیکن قیامت میں وہ دگنے ہو جائیں گے۔ جیسا کہ پیغمبر گرامیؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

"انهم اليوم اربعة فاذا كان يوم القيامة ايدهم باربعة اخرين، فيكونون ثمانية"

"وہ اس وقت چار افراد ہیں اور قیامت کے دن دوسرے چار افراد سے ان کو تقویت دے گا اور وہ آٹھ ہو جائیں گے۔"[1]

لیکن عرش کیا ہے؟ اور یہ فرشتے کون ہیں؟ مسلّم طور پر عرش سے مراد ایک جسمانی تخت سلطنت نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لفظ عرش کی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ جہان ہستی کے مجموعہ کے معنی میں ہے جو خدا کی حکومت کا عرش ہے۔ پس ان فرشتوں کے ذریعہ، جو خدا کے حکم و فرمان کو جاری کرتے ہیں، اس کا ارادہ و تدبیر کی جاتی ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک روایت میں آیا ہے قیامت میں عرش خدا کے اٹھانے والے چار افراد اوّلین میں سے اور چار آخرین میں سے ہوں گے۔ اوّلین میں سے تو نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ ہوں گے اور آخرین میں سے محمدؐ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہوں گے۔[2]

یہ تعبیر ممکن ہے ان حضرات کے اوّلین و آخرین میں مقام شفاعت کی طرف اشارہ ہو، لیکن یہ شفاعت ایسے افراد کے بارے میں ہو گی جو شفاعت کے لائق ہوں گے۔ بہرحال یہ تعبیر عرش کے مفہوم کی وسعت کو بتاتی ہے۔

البتہ اگر عرش کے اٹھانے والے آٹھ گروہ ہوں تو پھر ممکن ہے کہ کچھ گروہ تو فرشتوں کے ہوں اور کچھ گروہ انبیاء اور اولیاء کے ہوں کہ جو اس اہم مقام کے عہدہ دار ہوں گے۔ گویا اس طرح اس دن کے نظام کی تدبیر کے ایک حصہ کو تو فرشتے چلا رہے ہوں گے اور ایک حصہ کے عہدہ دار انبیاء و اولیاء ہوں گے۔ لیکن یہ سب حکم خدا کے ساتھ ہوگا۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۲۸۳

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۶

اس بارے میں کہ فوقھم (ان کے اوپر) میں ھم کی ضمیر انسانوں کی طرف لوٹتی ہے یا فرشتوں کی طرف، کئی احتمال دیئے گئے ہیں۔ چونکہ اس سے قبل کے جملہ میں گفتگو فرشتوں کے بارے میں ہے لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ یہ ضمیر انہیں کی طرف لوٹتی ہے۔ اس طرح سے فرشتے سارے جہان کو ہر طرف سے گھیر لیں گے۔ اور (مقام کے لحاظ سے) ان کے اوپر آٹھ فرشتے خدا کے عرش کو اٹھانے والے ہوں گے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ خدا کے عرش کو اٹھانے والے ایسے افراد ہیں جو فرشتوں سے برتر و بالاتر ہیں۔ اس صورت میں یہ بیان گذشتہ حدیث جو خدا کے عرش کو اٹھانے والے انبیاء و اولیاء میں سے آٹھ افراد کو شمار کرتی ہے کے مطابق ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ اس دن عرش کو اٹھانے والوں کا تو کہنا ہی کیا قیامت سے مربوط حوادث بھی اس قسم کی چیزیں نہیں ہیں جو ہم اس محدود و تاریک جہان کے رہنے والوں کے لیے دقیق طور پر واضح و روشن ہوں، جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ ایک شبح (سایہ یا ہیولا سا) ہے جسے ہم آیاتِ الٰہی کے سائے میں بہت دور سے دیکھتے ہیں، ورنہ ان کی حقیقت تو ہمیں وہاں جانے کے بعد ہی نظر آئے گی۔[1]

اس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ پہلے "نفخۂ صور" میں آسمانوں اور زمین کے تمام ذی روح مر جائیں گے۔ اس بنا پر عرش کے اٹھانے والوں کے بارے میں جو بحث ہے وہ نفخۂ دوم کے ساتھ مربوط ہے جس میں سب زندہ ہو جائیں گے۔ اگرچہ آیت میں دوسرے نفخہ کے بارے میں گفتگو نہیں ہے۔ لیکن قرائن سے واضح ہوتا ہے کہ جن مطالب کو ہم بعد کی آیات میں پڑھتے ہیں وہ بھی اسی نفخۂ دوم کے ساتھ ہی مربوط ہیں۔[2]

---

[1] لغت اور قرآن مجید کے لحاظ سے عرش کے معانی کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ میں کئی مرتبہ بحث کی ہے۔ منجملہ ان کے جلد ۶ سورۂ اعراف آیت ۵۴ کے ذیل میں گفتگو کی گئی ہے۔

[2] حقیقت میں آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: "ثم نفخ فیہ اخریٰ" (پھر اس میں دوبارہ پھونکا جائے گا)

(۱۸) يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ ۝

(۱۹) فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ ۝

(۲۰) إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ۝

(۲۱) فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝

(۲۲) فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝

(۲۳) قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ۝

(۲۴) كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝

ترجمہ

(۱۸) اس دن تم سب کے سب بارگاہِ خداوندی میں پیش کیے جاؤ گے اور تمھارے کاموں میں سے کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔

(۱۹) لیکن وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔ (وہ فرطِ مسرت اور فخر کے ساتھ) پکار اُٹھے گا کہ (اے اہلِ محشر) لو میرا نامۂ اعمال پڑھو۔

(۲۰) مجھے یقین تھا کہ (قیامت آ کے رہے گی اور) میرے اعمال کا حساب ہوگا۔

(۲۱) وہ ایک کامل پسندیدہ زندگی میں قرار پائے گا۔

(۲۲) ایک عالی جنت

(۲۳) جس کے پھل دسترس میں ہوں گے۔

(۲۴) (اور ان سے کہا جائے گا) مزے مزے سے کھاؤ اور پیو، یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جنھیں تم نے گذشتہ ایام میں انجام دیا تھا۔

تفسیر

اے اہل محشر میرا نامۂ اعمال پڑھو

گذشتہ آیات کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ "نفخ صور" دو مرتبہ پھونکا ہوگا۔ پہلی دفعہ سب ذی روح مر جائیں گے اور نظام زندگی بکھر کر رہ جائے گا۔ دوسری مرتبہ ایک نیا جہان اور ایک نیا عالم برپا ہوگا، انسان اور فرشتے ایک نئی زندگی حاصل کریں گے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ان آیات کا آغاز تو پہلے نفخہ کی اور ان کا آخر دوسرے نفخہ کی خبر دیتا ہے۔

اسی مطلب کو جاری رکھتے ہوئے زیربحث آیات میں فرماتا ہے: "اس دن تم سب کے سب بارگاہِ خداوندی میں پیش کیے جاؤ گے اور تمھارے اعمال میں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہے گی" (یومئذ تعرضون لا تخفی منکم خافیة)۔

تعرضون، عرض کے مادہ سے کسی چیز کو دکھانے اور پیش کرنے کے معنی میں ہے۔ چاہے معاملہ کے وقت مال اور جنس ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو۔ البتہ انسان اور ان کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس دنیا میں بھی ہمیشہ اس کے سامنے ہیں۔ لیکن یہ بات قیامت میں زیادہ سے زیادہ نمایاں اور ظاہر ہوگی جیسا کہ خدا کی حاکمیت عالم ہستی پر دائمی ہے لیکن یہ حاکمیت اس دن ہر زمانہ اور وقت سے زیادہ واضح اور آشکار ہوگی۔

"لا تخفی منکم خافیة" کا جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس دن غیب اور لوگوں کے اسرار، شہود و ظہور میں بدل جائیں گے، جیسا کہ قرآن قیامت کے بارے میں کہتا ہے: یوم تبلی السرائر: وہ ایسا دن ہوگا جس میں سارے پوشیدہ صفات ظاہر ہو جائیں گے۔ (طارق-۹)

نہ صرف انسانوں کے مخفی اعمال، بلکہ ان کے صفات، جذبات، اخلاق اور نیتیں، سب کھل کر سامنے آجائیں گی۔

یہ ایک عظیم حادثہ ہے اور بعض مفسرین کے مطابق پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے اور آسمانوں کے کرتوں کے پھٹ جانے سے زیادہ عظیم، بدکاروں کی عظیم رسوائی اور مؤمنین کی بے مثال سربلندی کا دن ہے۔ وہ ایسا دن ہوگا جس میں انسان اس میدان میں، اعمال اور اندرونی اسرار کے لحاظ سے عریاں ظاہر ہوگا۔ ہاں! اس دن ہمارے وجود کی کوئی چیز پنہاں اور مخفی نہیں رہے گی۔

ممکن ہے کہ یہ اس دن خدا کے ہر چیز پر احاطۂ علمی کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

* * *

لہٰذا اس کے بعد کہتا ہے: "لیکن وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا وہ فرطِ مسرت میں پکار اٹھے گا۔ لو آؤ اور میرا نامۂ اعمال پڑھو" (فاما من اوتی کتابه بیمینه فیقول هاؤم اقرءوا کتابیه)۔[1]

گویا خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور ان سب نعمتوں، توفیقات اور ہدایت کی وجہ سے جو خدا نے اسے دی ہیں اس کے وجود کا ہر ہر ذرہ شکرگزار ہے اور وہ بے ساختہ 'الحمدللہ' پکار رہا ہے۔

* * *

اس کے بعد اپنے عظیم ترین افتخار کو اس کلمہ میں خلاصہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "مجھے یقین تھا کہ قیامت آکے رہے گی اور مجھے اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا" (انی ظننت انی ملاق حسابیه)۔[2]

'ظن' اس قسم کے موارد میں 'یقین' کے معنی دیتا ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ مجھے جو کچھ نصیب ہوا ہے، وہ [اس] پر ایمان کی وجہ سے ہے۔ واقعاً بات یہی ہے کہ حساب و کتاب پر ایمان، انسان کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی روح عطا کرتا ہے، تعہد اور مسئولیت کا احساس پیدا کرتا ہے اور انسان کی تربیت کا اہم ترین عامل ہے۔

* * *

بعد والی آیت میں اس قسم کے افراد کے اجر و ثواب کے ایک گوشہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ایک کامل اور پسندیدہ زندگی میں قرار پائے گا" (فهو فی عیشة راضیة)۔[3]

---

[1] 'هاؤم' ارباب لغت کے قول کے مطابق، 'لے لو' کے معنی میں ہے۔ اگر مخاطب مردوں کی جماعت ہو تو 'هاؤم' کہا جاتا ہے۔ عورتوں کی جماعت ہو تو هاؤن اور اگر مفرد مذکر ہو تو 'ها' (زبر کے ساتھ) اور مفرد مؤنث ہو تو "هاء" (زیر کے ساتھ) اور تثنیہ کے لیے "هاؤما" کہا جاتا ہے۔
راغب مفردات میں کہتا ہے "ها" لینے کے معنی میں اور 'هات' دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

[2] "حسابیه" میں ها، استراحت کی یا سکتہ کی ہے اور اس کا کوئی خاص معنی نہیں ہے، جیسا کہ کتابیہ میں بھی ایسا ہی ہے۔

[3] اگرچہ "رضایت اور خوشی" اس زندگی والوں کی ایک صفت ہے لیکن اوپر والی آیت میں اسے خود زندگی کی صفت قرار دیا ہے۔ یہ چیز اختلافِ تاکید کا فائدہ دیتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی زندگی ہے جو ساری کی ساری رضایت و خوشی ہے۔

اگرچہ اس نے اسی ایک جملہ کے ساتھ تمام کہنے کی باتیں کہہ دی ہیں لیکن مزید وضاحت کے لیے کہتا ہے:
"وہ عالی مرتبہ بہشت میں ہوگا" (فی جنۃ عالیۃ)۔
وہ بہشت جو اتنی بلند و بالا اور رفیع و والا قدر ہے کہ نہ کسی شخص نے دیکھی ہے نہ سنی ہے اور نہ ہی کبھی اس کا تصور کیا ہے۔

* * *

ایسی بہشت جس کے پھل دسترس میں ہوں گے" (قطوفها دانیۃ)۔
نہ پھلوں کو توڑنے کی زحمت اٹھانا پڑے گی، نہ ہی اس کے لمبے چھدرے درختوں کے قریب ہونے میں کوئی مشکل ہو گی اور اصولی طور پر اس کی تمام نعمتیں بغیر کسی انتشار کے دسترس میں ہوں گی۔[1]

* * *

آخری زیر بحث آیت میں، ان بہشتیوں کے لیے خدا کے محبت آمیز خطاب کو اس طرح بیان کیا ہے:
"مزے مزے سے کھاؤ اور پیو، یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جنہیں تم نے گزشتہ ایام میں انجام دیا تھا" (کلوا واشربوا هنیئا بما اسلفتم فی الایام الخالیۃ)۔
ہاں! یہ عظیم نعمتیں بے حساب نہیں ملیں گی۔ یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے جنہیں تم نے دنیا میں آج کے لیے ذخیرہ کیا اور آگے بھیجا ہے۔ لیکن یہ ناچیز اعمال جب فضل و رحمت الٰہی کے افق میں قرار پاتے ہیں تو اس قسم کے ثمرات و نتائج تک منتہی ہوتے ہیں۔

چند نکات

۱: لفظِ عرش کی ایک اور تفسیر

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:
حملۃ العرش۔ والعرش العلم۔ ثمانیۃ اربعۃ منا، واربعۃ ممن شاء اللہ۔
حاملین عرش۔ عرش سے مراد علم خدا ہے۔ آٹھ افراد میں چار تو ہم میں سے ہیں اور چار ان میں سے جنہیں خدا نے چاہا ہے۔[2]

---

[1] قطوف، قطف (بروزن حرب) کی جمع ہے جو چنے ہوئے پھلوں کے معنی میں ہے اور کبھی چننے کے لیے تیار پھلوں کے لیے بھی آیا ہے۔
[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۶ حدیث ۲۸

ایک اور حدیث میں امیرالمومنین علیؑ سے آیا ہے :

"فالذین یحملون العرش ، ھم العلماء ، الذین حملھم اللہ علمہ۔"

"حاملین عرش وہ علماء اور دانش مند ہیں جنہیں خدا نے اپنے علم کی تعلیم دی ہے۔" [1]

ایک اور حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے آیا ہے :

"العرش لیس ھو اللہ والعرش اسم علم وقدرۃ۔"

"عرش خدا نہیں ہے، بلکہ اس کے علم و قدرت کا نام ہے۔" [2]

ان احادیث سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ عرش کی اس تفسیر کے علاوہ، جو ہم نے پہلے بیان کی تھی، ایک اور تفسیر بھی ہے۔ یعنی وہ خدا کے "علم وقدرت" جیسی صفات ہیں۔ اس بناء پر عرش الٰہی کے حامل اس کے علم کے حامل ہیں۔ پس انسان یا فرشتے جتنا زیادہ علم رکھتے ہوں گے، اتنا ہی زیادہ حصہ اس عظیم عرش کا اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اس طرح یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، کہ عرش تختِ سلطنت کے مشابہ کسی جسمانی تخت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ جب خدا کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو مختلف کنائی معانی رکھتا ہے۔

۲ : علیؑ اور ان کے شیعوں کا مقام

کئی روایات میں آیا ہے آیت فاما من اوتی کتابہ بیمینہ ... علیؑ کے بارے میں ہے، یا علیؑ اور ان کے شیعوں کے بارے میں ہے۔ [3]

حقیقت میں یہ واضح مصادیق کے بیان کے قبیل سے ہے۔ اس سے آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

۳ : ایک سوال کا جواب

ممکن ہے یہاں ایک سوال کیا جائے کہ کیا وہ مومنین جو اوپر والی آیات کے مطابق پکاریں گے۔ "اے

---

[1] نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۰۵ حدیث ۲۴

[2] نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۰۵ حدیث ۲۷

[3] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۹۷

اہل محشر آؤ اور ہمارے نامۂ اعمال کو پڑھو، تو کیا ان کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

اس سوال کا جواب بعض احادیث سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ منجملہ ان کے پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہے:

"خدا قیامت میں پہلے اپنے بندوں سے ان کے گناہوں کا اقرار لے لے گا پھر فرمائے گا، میں نے تمہارے یہ گناہ دنیا میں بھی مستور اور پوشیدہ رکھے ہیں اور آج بھی میں انھیں بخشتا ہوں"۔ اس کے بعد (صرف) ان کے حسنات اور نیکیوں کا دفتر ان کے دائیں ہاتھ میں دے دے گا۔ [1]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس دن خدا مومنین کے سیئات اور برائیوں کو حسنات اور نیکیوں میں بدل دے گا۔ اسی وجہ سے ان کے سارے نامۂ اعمال میں کوئی ضعیف نقطہ نہیں ہوگا۔

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۲۵۶

(۲۵) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۚ

(۲۶) وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۚ

(۲۷) يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۚ

(۲۸) مَاۤ اَغْنٰى عَنِّىْ مَالِيَهْ ۚ

(۲۹) هَلَكَ عَنِّىْ سُلْطٰنِيَهْ ۚ

ترجمہ

(۲۵) لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا: اے کاش! میرا نامۂ اعمال مجھے ہرگز نہ دیا جاتا۔

(۲۶) اور میں یہ نہ ہی جانتا کہ میرا حساب کیا ہے؟

(۲۷) اے کاش! مجھے تو موت ہی آجاتی۔

(۲۸) میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا۔

(۲۹) میری قدرت بھی ہاتھ سے نکل گئی۔

تفسیر

اے کاش مجھے موت آجاتی۔

گزشتہ آیات میں گفتگو "اصحاب الیمین" اور ان مومنین کے بارے میں تھی کہ جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ فخریہ اہل محشر کو پکاریں گے اور انھیں اپنے اعمال کو پڑھنے کی دعوت دیں گے۔ اس کے بعد بہشت جاوداں میں پہنچ جائیں گے۔

لیکن زیر بحث آیات ٹھیک ان کے نقطۂ مقابل یعنی "اصحاب شمال" کو پیش کرتی ہیں اور ایک موازنہ میں ان دونوں کی کیفیت کو کامل طور پر واضح کر دیتی ہیں۔ پہلے فرماتا ہے: "لیکن جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: اے کاش میرا نامۂ اعمال کبھی بھی مجھے نہ دیا جاتا۔" (واما من اوتی کتابہ بشمالہ فیقول یالیتنی لم اوت کتابیہ)[1]

"اور اے کاش! میں اپنے حساب کتاب سے ہرگز خبردار نہ ہوا ہوتا۔" (ولم ادر ما حسابیہ)۔

"اور اے کاش مجھے موت آجاتی جو میری اس حسرت ناک زندگی کو ختم کر دیتی۔" (یالیتھا کانت القاضیۃ)۔[2]

ہاں! اس عظیم عدالت میں، اس "یوم البروز" اور "یوم الظہور" میں جب اپنے تمام قبیح اعمال کو برملا دیکھے گا تو اس کی فریاد بلند ہوگی۔ وہ دل سے پے در پے آہِ سوزاں کھینچے گا۔ ایسی آہ جو حسرت بار ہوگی اور ایسا نالہ جو شرربار ہوگا۔ وہ یہ آرزو کرے گا کہ اس کا اپنے ماضی سے کلی طور پر رابطہ ختم ہو جائے۔ وہ خدا سے موت و نابودی اور اس عظیم رسوائی سے نجات کی آرزو کرے گا، جیسا کہ سورۂ "نبا" کی آیت ۴۰ میں بھی آیا ہے: "ویقول الکافر یالیتنی کنت ترابا"؛ "کافر اس دن یہ کہے گا، اے کاش! میں مٹی ہوتا اور ہرگز انسان نہ بنتا۔"

"یالیتھا کانت القاضیۃ" کے جملہ کی اور تفاسیر بھی بیان کی گئی ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ "قاضیۃ" سے

---

[1] کتابیہ میں اور اسی طرح حسابیہ و مالیہ و سلطانیہ میں "ھا" جو بعد میں آیات میں آئے گا ھاء سکت یا ھاء استراحت ہے۔ نیز جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کا کوئی خاص معنی نہیں ہے بلکہ یہ اس قسم کے کلمات میں ایک خوبصورت وقف شمار ہوتا ہے۔ یہ ان اشخاص کے حالات اور نفس کی کیفیت کے ساتھ ایک قسم کی مناسبت رکھتا ہے، جو یہ بات کریں گے۔

[2] "کانت القاضیۃ" کے جملہ میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ (کانت ھذہ الحالۃ القاضیۃ)

مراد پہلی موت ہے۔ یعنی اے کاش! جب ہم دنیا میں مرہی گئے تھے تو پھر دوبارہ زندہ نہ ہوتے۔ نیز اس حالت میں ہے کہ دنیا میں کوئی چیز اس کی نظر میں موت سے زیادہ ناخوش آئند نہیں تھی۔ لیکن قیامت میں آرزو کرے گا، اے کاش وہ موت ہی برقرار رہتی۔

بعض نے اسے صُور کے پہلے نفخ کے بارے میں سمجھا ہے، جسے قارعة سے بھی تعبیر کیا گیا۔ یعنی اے کاش! دوسرا نفخ واقع ہی نہ ہوتا۔

لیکن وہ تفسیر جو ہم نے ابتداء میں بیان کی ہے سب سے زیادہ مناسب ہے۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ گنہگار مجرم اعتراف کرتے ہوئے کہے گا: "میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا، اور آج کی مصیبت میں جو میری بیچارگی کا دن ہے، میرے کچھ کام نہ آیا" (ما اغنٰی عنی مالیہ)۔

* * *

نہ صرف میرے مال و دولت نے مجھے بے نیاز نہیں کیا اور میری کسی مشکل کو حل نہیں کیا، "بلکہ میری قدرت و سلطنت بھی نابود ہو گئی اور ہاتھ سے چلی گئی" (ھلک عنی سلطانیہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مال ہی کام آیا اور نہ ہی مقام و منصب، آج خالی ہاتھ، انتہائی ذلّت و شرمساری کے ساتھ دادگاہِ عدلِ الٰہی میں حاضر ہوں، نجات کے تمام اسباب منقطع ہو گئے ہیں، میری طاقت و قدرت برباد ہو گئی ہے اور میری اُمید ہر جگہ سے ختم ہو چکی ہے۔

بعض نے یہاں سلطان کو دلیل و بُرہان کے معنی میں سمجھا ہے جو انسان کی کامیابی کا سبب ہوتا ہے یعنی آج میرے پاس کوئی ایسی دلیل اور حجت نہیں ہے جس کے ذریعے میں بارگاہِ خدا میں اپنے اعمال کی توجیہ کر سکوں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "سلطان" سے مُراد سلطہ و حکومت نہیں ہے، کیونکہ وہ سب لوگ جو دوزخ میں وارد ہوں گے کسی ملک کے بادشاہ یا کچھ شہروں کے امیر تو نہیں تھے بلکہ اس سے مُراد انسان کا اپنے نفس اور اپنی زندگی پر تسلط ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بہت سے دوزخی اس جہان میں تسلط و نفوذ رکھتے تھے یا وہ سردار اور امیر کبیر لوگ تھے، لہٰذا یہ صحیح نظر آتا ہے۔

ایک نکتہ

چند عبرت انگیز داستانیں

یہاں بہت سے واقعات نقل ہوئے ہیں جو سب کے سب اوپر والی آیات کے مضمون پر ایک تاکید اور

ان لوگوں کے لیے ایک درس عبرت ہیں جنہوں نے مال و مقام اور منصب پر تکیہ کیا اور سرتا پا غرور و غفلت اور گناہ میں آلودہ ہیں، منجملہ :

۱ : سفینۃ البحار میں کتاب نصائح سے اس طرح سے نقل ہوا ہے۔ "خراسان میں جب ہارون الرشید کی بیماری شدید ہوگئی تو اس نے طوس سے کسی طبیب کو بلانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے کہا کہ اس کا پیشاب دوسرے چند بیماروں اور کچھ صحیح و سالم افراد کے پیشاب کے ساتھ طبیب کے سامنے پیش کیا جائے طبیب ان شیشیوں کو یکے بعد دیگرے دیکھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ ہارون الرشید کے پیشاب والی شیشی تک پہنچ گیا۔ چنانچہ یہ جانے بغیر کہ یہ شیشی کس کی ہے اُس نے کہا : اس شیشی والے سے کہہ دیں کہ وہ اپنی وصیت کر دے۔ کیونکہ اس کی طاقت و قوت مضمحل ہو چکی ہیں اور اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ ہارون الرشید طبیب کی اس بات کو سُن کر اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا، اور یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے۔

ان الطبیب بطبہ و دوائہ
لا یستطیع دفاع خطب قد أتی
ما للطبیب یموت بالداء الذی
قد کان یبرء مثلہ فیما مضی

"طبیب اپنی طبابت اور دواؤں کے ذریعے اس موت کا دفاع کرنے کی قدرت نہیں رکھتا جو آپہنچی ہے۔"

"اگر وہ یہ قدرت رکھتا ہوتا تو پھر وہ خود اُسی بیماری سے کیوں مرتا کہ جس کا وہ پہلے علاج کیا کرتا تھا۔"

اسی اثناء میں اُسے خبر ملی کہ لوگوں نے اس کی موت کی خبر پھیلا دی ہے۔ اس شہرت کو ختم کرنے کے لیے اس نے ایک سواری لانے کا حکم دیا اور کہا کہ مجھے اس پر سوار کر دو۔ لیکن اچانک اس جانور کا زانو کمزور ہو گیا۔ تب اس نے کہا : مجھے سواری سے اُتار دو کیونکہ اس خبر کو اُڑانے والے سچ کہتے ہیں تو اس کے بعد اس نے وصیت کی کہ اس کے لیے کئی کفن لائے جائیں، ان میں سے اس نے ایک کو پسند کر کے رکھ لیا اور کہا "میرے بستر کے قریب ہی میری قبر تیار کرو"۔ پھر اس نے قبر کی طرف دیکھا اور ان آیات کی تلاوت کی : ما اغنی عنی مالیہ۔ ہلک عنی سلطانیہ اور اسی دن دنیا سے رخصت ہو گیا۔ [1]

---

[1] سفینۃ البحار جلد اول ص ۵۲۳ مادہ رشد

۲ : اسی کتاب میں عالم بزرگوار شیخ بہائیؒ سے بھی اسی طرح نقل ہوا ہے :

"ایک شخص جس کا نام 'توبہ' تھا اور غالباً وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہتا تھا، ایک دن اس نے اپنی گزری ہوئی عمر کا حساب لگایا تو وہ ۲۱۵۰۰ دن تھے۔ تب اس نے کہا : وائے ہو مجھ پر! اگر میں نے ہر دن کے مقابلہ میں صرف ایک ہی گناہ کیا ہو تو وہ بھی اکیس ہزار سے زیادہ بنتے ہیں۔ تو کیا میں خدا سے اکیس ہزار گناہوں کے ساتھ ملاقات کروں گا۔ اسی وقت اس نے ایک چیخ ماری، زمین پر گر پڑا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔[1]

۳ : 'ثعالبی' کی کتاب 'یتیمہ' میں اس طرح آیا ہے :

"جب عضد الدولہ کی موت کا وقت آن پہنچا تو اس کی زبان سے سوائے اس آیت کی تلاوت کے کچھ نہ نکلتا تھا : ما اغنی عنی مالیہ. ھلک عنی سلطانیہ۔ "میرا مال بھی میرے کچھ کام نہ آیا اور میری سلطنت بھی برباد ہو گئی"

[1] سفینۃ البحار جلد اول ص ۴۰۰ مادہ ذنب (اقتباس کے ساتھ)

(۳۰) خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝

(۳۱) ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝

(۳۲) ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝

(۳۳) اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝

(۳۴) وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝

(۳۵) فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝

(۳۶) وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝

(۳۷) لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ۝

ترجمہ

(۳۰) اسے پکڑو اور طوق و زنجیر میں جکڑ دو۔

(۳۱) پھر اسے جہنم میں پھینک دو۔

(۳۲) اس کے بعد اسے ایسی زنجیر میں باندھ دو جو ستر ہاتھ ہے۔

(۳۳) کیونکہ وہ ہرگز خداوند عظیم پر ایمان نہیں لاتا تھا۔

(۳۴) اور مساکین کو کھانا کھلانے کی لوگوں کو تشویق نہیں کرتا تھا۔

(۳۵) لہٰذا آج یہاں اس کا کوئی مہربان اور یار و یاور نہیں ہے۔

(۳۶) اور نہ ہی پیپ اور خون کے علاوہ کوئی اور کھانا ہے۔

(۳۷) ایسی غذا جسے خطاکاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں کھاتا۔

تفسیر

اسے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دو۔

گزشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے جو اصحاب شمال کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، ان کے آہ و نالہ کی فریاد بلند ہوگی اور وہ موت کی آرزو کریں گے۔ زیر بحث آیات میں ان کے عذاب کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس وقت عذاب کے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا: "اسے پکڑ لو اور طوق و زنجیر میں جکڑ دو" (خذوہ فغلوہ)۔

غلوہ، غل کے مادہ سے، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے، ایسی زنجیر کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بعض اوقات مجرموں کے ہاتھ پاؤں ان کی گردن کے ساتھ باندھ دیئے جاتے ہیں اور وہ بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

✤ ✤ ✤

اس کے بعد کہا جائے گا: "اس کو جہنم کی آگ میں داخل کر دو" (ثم الجحیم صلوہ)۔

✤ ✤ ✤

"پھر اسے اتنی لمبی زنجیر میں جکڑ دو جو ستر ہاتھ ہے" (ثم فی سلسلة ذرعها سبعون ذراعا فاسلکوہ)۔

"سلسلۃ" زنجیر کے معنی میں ہے اور اصل میں تسلسل کے مادہ سے لیا گیا ہے جو ہلنے اور لرزنے کے معنی میں ہے کیونکہ زنجیر کے حلقے اور کڑیاں لرزتی اور ہلتی رہتی ہیں۔

"ستر ہاتھ" کی تعبیر ممکن ہے تکثیر کے عنوان سے ہو، کیونکہ ستر کا عدد ایسے اعداد میں سے ہے جو عام طور پر کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ستر کا عدد ہی مراد ہو۔ بہر حال اس قسم کی زنجیر کو مجرموں کے گرد اس طرح سے لپیٹ دیں گے کہ وہ انھیں سر سے لے کر پاؤں تک گھیر لے گی۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ طولانی زنجیریں ایک ہی شخص کے لیے نہیں ہوں گی، بلکہ ہر گروہ کو ایک

زنجیر میں باندھیں گے۔ گزشتہ آیات میں غل و زنجیر کے ذکر کے بعد اس سزا کا ذکر اسی معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ذراع کہنی سے لے کر انگلیوں کی نوک تک کے فاصلہ کے معنی میں ہے (جو تقریباً آدھا میٹر ہوتا ہے) اور یہ عربوں کے نزدیک ایک ہی طول تھا جو ایک طبیعی پیمانہ ہے لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ عام ذراع سے مختلف ہے۔ اس طرح کہ اس کی ایک ذراع بہت زیادہ فاصلوں کو گھیر لیتی ہے اور سارے کے سارے دوزخیوں کو اسی ایک زنجیر کے ساتھ باندھ دیں گے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ قیامت سے مربوط مسائل کو ہم دنیا کے رہنے والوں کی زبان میں پورے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ آیات و روایات میں آیا ہے وہ صرف اس کی ایک شبح (سایہ یا ہیولے) کی تصویرکشی کرتا ہے۔

اس آیت میں ثم کی تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ وہ جہنم میں داخل ہونے کے بعد ستر ذراع کی زنجیر میں جکڑے جائیں گے اور یہ ان کے لیے ایک نئی سزا ہوگی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تمام انفرادی اور اجتماعی زنجیریں جہنم میں وارد ہونے سے پہلے ہوں گی اور ثم اصطلاح کے مطابق ذکر میں تاخیر کے لیے ہے۔

⁂

بعد کی دو آیات میں اس سخت و شدید عذاب کی اصلی علت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیونکہ وہ خدائے عظیم پر ایمان نہ لانے پر مصر تھا" (انه کان لا یؤمن بالله العظیم)۔

انبیاء و اولیاء اور پروردگار کے رسول اسے جس قدر خدا کی طرف دعوت دیتے تھے وہ اسی قدر انکار کرتا اور قبول نہیں کرتا تھا۔ اس طرح اپنے خالق سے اس کا رشتہ کلی طور پر منقطع ہو گیا تھا۔

⁂

"اور وہ لوگوں کو مساکین کو کھانا کھلانے کی تشویق نہیں کرتا تھا" (ولا یحض علی طعام المسکین)۔

اس طرح سے اس نے مخلوق سے بھی اپنا رشتہ توڑا ہوا تھا۔

اس بناء پر اس کی بدبختی کا سبب سے بڑا عامل خالق و مخلوق سے رابطے کا منقطع ہونا تھا۔

اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ عمدہ اطاعتوں، عبادتوں اور شرعی احکام کو انہیں دو اعمال میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز "اطعام مساکین" کا ایمان پر عطف، اس عظیم انسانی عمل کی حد سے زیادہ اہمیت کی طرف اشارہ ہے اور واقعاً ایسا ہی ہے، کیونکہ بعض کے قول کے مطابق بدترین عقیدہ کفر ہے اور رذائل اخلاقی میں سے بدترین بخل ہے۔

قابل توجہ بات ہے کہ یہ نہیں کہتا، "وہ کھانا نہیں کھلاتا تھا" بلکہ یہ کہتا ہے کہ دوسروں کو کھانا کھلانے

پر آمادہ نہیں کرتا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے :

اولاً : صرف ایک شخص کا کھانا کھلانا فقراء و مساکین کی مشکل کو حل نہیں کر سکتا ، لہٰذا دوسروں کو بھی اس کارِ خیر کی دعوت دینا چاہیے تاکہ وہ عمومیت کا پہلو اختیار کرے ۔

ثانیاً : ممکن ہے کہ انسان شخصی طور پر کھانا کھلانے کی توانائی اور قدرت نہ رکھتا ہو لیکن ہر شخص دوسروں کو ترغیب دلانے کی قدرت تو رکھتا ہے ۔

ثالثاً : بخیل افراد اس قسم کے ہوتے ہیں جو نہ صرف خود عطاء اور بخشش نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے عطاء اور بخشش سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتے ۔

بعض قدماء سے نقل ہوا ہے جو اپنی بیوی کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ وہ کھانا زیادہ پکایا کرے تاکہ وہ فقراء و مساکین کو بھی دے سکیں ، اس کے بعد یہ کہا کرتے :

" اس زنجیر کا آدھا حصّہ خدا پر ایمان لانے کی وجہ سے ہم نے باہر نکال دیا ہے اور اس کا دوسرا آدھا حصّہ کھانا کھلا کر باہر نکالتے ہیں ۔" [1]

+ + +

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " چونکہ اس کا کوئی عقیدہ و عمل ایسا نہ تھا ، لہٰذا آج یہاں اس کا کوئی مہربان اور مددگار نہیں ہے ۔" (فلیس له الیوم ھھنا حمیم)۔

اور نہ ہی پیپ اور خون کے علاوہ اس کے لیے یہاں کوئی اور کھانا ہے ۔" (ولا طعام الا من غسلین)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان کی جزا اور عمل کامل طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں ۔ خالق سے رشتہ توڑنے کی وجہ سے وہاں ان کا کوئی گرم جوش اور گہرا دوست نہیں ہوگا ۔ نیز فقراء اور مساکین کو کھانا نہ کھلانے کی وجہ سے ، پیپ اور خون کے سوا اور کوئی کھانے کی چیز ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گی ، کیونکہ وہ سالہا سال تک لذیذ ترین کھانے کھاتے رہے تھے جبکہ بے نوا اور بے کس لوگوں کے پاس خونِ دل کے سوا اور کوئی کھانا نہیں تھا ۔

" راغب " مفردات میں کہتا ہے کہ " غسلین " اس پانی کے معنی میں ہے جو کفار کے بدن کو دھونے سے جہنم میں گرے گا ۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ اس سے مراد وہ پیپ اور خون ہے جو دوزخیوں کے بدن سے گرے گی ، شاید راغب کی مراد بھی یہی ہو اور طعام کی تعبیر بھی اسی معنی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ سورہ غاشیہ کی آیت ۶ میں آیا ہے ، لیس لھم طعام الا

---

[1] روح المعانی جلد ۲۹ ص ۵۱

من ضریع : ان کا کھانا "ضریع کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا" اور ضریع کی تفسیر ایک قسم کے کانٹے سے کی ہے۔ سورہ دخان کی آیت ۴۳، ۴۴ میں آیا ہے : ان شجرت الزقوم طعام الاثیم : "درخت زقوم گنہگاروں کا کھانا ہے۔ اور "زقوم" کی ایک کڑوے بدبودار اور بدذائقہ نبات کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے۔ جس کا نمونہ سرزمین 'تہامہ' میں اگا کرتا تھا جو تلخ اور جلانے والا شیرہ رکھتا تھا۔ پس ان آیات اور زیر بحث آیت کو کیسے جمع کیا جاسکتا ہے ؟

اس سوال کے جواب میں بعض نے تو یہ کہا ہے : یہ تینوں الفاظ 'ضریع'، 'زقوم'، غسلین' ایک ہی چیز کی طرف اشارہ ہیں۔ (اور وہ ایک سخت اور ناگوار نبات ہے جو اہل دوزخ کی غذا ہے۔)

بعض دوسروں نے یہ کہا ہے : دوزخیوں کے مختلف طبقات ہیں، ان تینوں چیزوں میں سے ایک ایک چیز ایک گروہ کی غذا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ ان کی غذا تو 'زقوم وضریع' ہے، پینے کے لیے غسلین ہے اور مشروب کے بارے میں 'طعام' کی تعبیر نئی نہیں ہے۔

⁂

آخری زیر بحث آیت میں تاکید کے لیے مزید کہتا ہے : "اس غذا کو خطاکاروں کے سوا اور کوئی نہیں کھائے گا" (لا یأکلہ الا الخاطئون)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ خاطی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو جان بوجھ کر غلط کام کرے، لیکن "مخطی" عمداً خطا کرنے والے اور سہواً خطا کرنے والے کو بھی کہا جاتا ہے ——— اس بنا پر دوزخ کی یہ غذا ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے، جو جانتے بوجھتے عمداً طغیان و سرکشی کے عنوان سے شرک و کفر اور بخل کی راہ پر چلتے ہیں۔

⁂

ایک نکتہ

حروفِ قرآن پر اعراب لگانے کی ابتداء

ایک حدیث میں آیا ہے کہ "صعصعہ بن صوحان جو امام علیؑ کے اصحاب میں سے تھے کہتے ہیں : "ایک عرب امام علیؑ کی خدمت میں آیا اور آیت " لا یأکلہ الا الخاطئون" کے بارے میں سوال کیا اور اس نے خاطئون یعنی خطاکاروں کی بجائے "خاطون" (جو قدم اٹھانے والوں کے معنی میں ہے) پڑھا اور پوچھا کہ قدم تو سب ہی لوگ اٹھاتے ہیں، تو کیا خدا ان سب ہی کو یہ غذا دے گا ؟

امام نے تبسم فرمایا اور کہا: اے مردِ عرب! اس آیت کے صحیح الفاظ لا یأکلہ الّا الخاطئون ہیں۔ اس نے عرض کیا: اے امیر المومنینؑ! آپ نے سچ فرمایا ہے، خدا کسی بے خطا بندے کو عذاب کے سپرد نہیں کرے گا۔ اس کے بعد امامؑ نے "ابوالاسودؓ" کی طرف جو ایک ادیب شخص تھا رُخ کیا اور فرمایا: اس وقت عربی زبان سے بیگانہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے ہیں۔ ایسا کام کرو کہ وہ اپنی زبان کی اصلاح کر سکیں۔ اس حکم کے بعد ابوالاسود نے الفاظِ قرآن پر نصب اور کسر (زبر، زیر، پیش) کی علامت لگائی۔

◆ ◆ ◆

(۳۸) فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝

(۳۹) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝

(۴۰) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝

(۴۱) وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝

(۴۲) وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

(۴۳) تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

ترجمہ

(۳۸) قسم کھاتا ہوں میں اس کی جسے تم دیکھ رہے ہو۔

(۳۹) اور اس کی جسے تم نہیں دیکھتے۔

(۴۰) کہ یہ قرآن، ایک بزرگوار رسُول کی زبان سے نکلا ہوا کلام ہے۔

(۴۱) اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے، لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔

(۴۲) اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ لیکن تم بہت ہی کم متذکر ہوتے ہو۔

(۴۳) (بلکہ یہ وہ کلام ہے جو) عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہُوا ہے۔

تفسیر

یہ قرآن یقیناً خدا کا کلام ہے۔

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قیامت اور مومنین وکفار کی سرنوشت کے بارے میں بیان ہوئے تھے، ان آیات میں قرآن مجید اور نبوت کے بارے میں ایک فصیح و بلیغ بحث کرتا ہے تاکہ "نبوۃ" اور "معاد" کی بحث ایک دوسرے کی تکمیل کریں۔

پہلے فرماتا ہے: "قسم کھاتا ہوں میں اس کی جسے تم دیکھتے ہو" (فلا اقسم بما تبصرون)۔

"اور اس کی جسے تم نہیں دیکھتے" (وما لا تبصرون)۔

مشہور یہ ہے کہ لفظ لا اس قسم کے موارد میں زائدہ اور تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ لا یہاں بھی نفی کے معنی دیتا ہے۔ یعنی میں ان امور کی قسم نہیں کھاتا، کیونکہ اولاً تو اس قسم کی ضرورت نہیں اور ثانیاً، قسم خدا کے نام کی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے اور مناسب وہی پہلا معنی ہے کیونکہ قرآن مجید میں خدا کے نام اور غیر خدا کے نام کی قسمیں بہت زیادہ ہیں۔

ماتبصرون وما لا تبصرون کا جملہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ان تمام چیزوں کو جنہیں انسان دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے، گھیر لیتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ سارے عالم "شہود" اور "غیب" کو شامل ہے۔

ان دو آیات کی تفسیر میں دیگر احتمال بھی دیئے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے: "ماتبصرون" سے مراد عالم خلقت ہے اور "ما لا تبصرون" سے مراد خالق ہے، یا یہ کہ اس سے مراد ظاہری اور باطنی نعمتیں، یا انسان اور فرشتے، یا اجسام و ارواح، یا دنیا و آخرت ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ان دونوں تعبیروں کے مفہوم کی وسعت اس کے معنی کو محدود کرنے سے مانع ہے۔ اس بناء پر افق نگاہ میں جو کچھ آتا ہے اور جو نہیں آتا وہ سب اس سوگند و قسم میں داخل ہے لیکن اس کا شمول خدا کی نسبت بعید نظر آتا ہے، کیونکہ خالق کو مخلوق کے ساتھ قرار دینا مناسب نہیں ہے، خصوصاً "ما" کی تعبیر کے ساتھ کہ جو عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کچھ انسان آنکھ سے نہیں دیکھتا وہ بہت کچھ ہے: موجودہ علم و دانش نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ محسوسات، موجودات کے ایک محدود دائرے کو ہی شامل ہوتے ہیں اور جو کچھ افق حس میں نہیں آتا، چاہے وہ رنگ ہوں یا آوازیں، ذائقے ہوں یا امواج وغیرہ، وہ کئی درجے زیادہ ہیں۔

وہ ستارے جو کرۂ ارض کے دونوں آدھے حصّوں کے مجموعہ میں آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں، ماہرین کے حساب کے مطابق تقریباً پانچ ہزار ستارے ہیں جبکہ وہ ستارے جو آنکھ سے دیکھے نہیں جاتے وہ اربوں کھربوں سے بھی زیادہ ہیں۔

وہ صوتی امواج (آواز کی لہریں) جن کا ادراک کرنے پر انسان کے کان قدرت رکھتے ہیں بہت ہی محدود لہریں ہیں جبکہ ہزارہا دوسری ایسی صوتی لہریں موجود ہیں کہ جن کے سننے کی انسانی کان قدرت نہیں رکھتے۔

وہ رنگ جنھیں ہم دیکھ سکتے ہیں سات مشہور رنگ ہیں لیکن آج یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بنفشئی اور قرمزی رنگوں کے علاوہ بے شمار دُوسرے ایسے رنگ ہیں کہ جن کے مشاہدے کی ہماری آنکھ میں بالکل ہی قدرت نہیں ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے جانداروں کی تعداد جو آنکھ سے دیکھے نہیں جا سکتے اس قدر زیادہ ہے کہ اس نے تمام دنیا کو پُر کر رکھا ہے، بعض اوقات وہ پانی کے ایک قطرے میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ اس حال میں یہ بات کتنی دردناک ہے کہ ہم اپنے آپ کو محسوسات کے زندان میں قید کر لیں اور محسوسات کی دنیا کے باہر سے بے خبر ہو جائیں یا اس کا انکار کر دیں؟

عالمِ ارواح ایک ایسا عالم ہے جو دلائلِ عقلی بلکہ تجرباتی دلائل سے بھی ثابت ہو چکا ہے۔ وہ عالم ہمارے عالمِ جسم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں محسوسات کی چار دیواری میں کس طرح قید رہا جا سکتا ہے؟

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد والی آیہ میں اس عظیم و بے نظیر سوگند وقسم کے نتیجہ اور جواب کو ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ قرآن ایک بزرگوار رسُول کی گفتگو ہے" (انه لقول رسول کریم)۔

"رسُول" سے مُراد یہاں بلاشبک وشبہ اسلام کے پیغمبر گرامیؐ ہیں نہ کہ جبریلؑ، کیونکہ بعد والی آیات وضاحت کے ساتھ اس معنی کی گواہی دیتی ہیں۔

اور یہ جو کہتا ہے کہ یہ ایک بزرگوار رسُول کی گفتگو ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ اس کی تبلیغ کرنے والے ہیں، خصوصاً جبکہ ان کی 'رسالت' کے وصف کا ذکر ہوا ہے جیسا کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ رسُول جو کچھ لاتا ہے وہ بھیجنے والے کی بات ہوتی ہے، اگرچہ وہ رسُول کی زبان سے جاری اور اس کے لب ہائے مُبارک سے سُنا جاتا ہے۔

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو" (وما هو بقول شاعر قليلا ما تؤمنون)[1]

(حاشیہ [1] اگلے صفحہ پر)

اور یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں ہے، اگرچہ تم بہت ہی کم متذکر ہوتے ہو": (ولا بقول کاهن قلیلا ما تذکرون)۔

حقیقت میں یہ دونوں آیات ان ناروا نسبتوں کی نفی ہیں، جو مشرکین اور مخالفین ذات پیغمبرؐ کی طرف دیتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ وہ شاعر ہے اور یہ آیات اس کے اشعار ہیں، کبھی کہتے کہ وہ کاہن ہے اور یہ آیات اس کی کہانت ہیں کیونکہ کاہن ایسے لوگ ہوتے تھے جو بعض اوقات جن یا شیاطین سے ارتباط کی بناء پر غیب کے بعض اسرار بیان کیا کرتے۔ اور خصوصیت کے ساتھ اپنے الفاظ کو سجع اور موزوں جملہ بندی کے ساتھ پیش کرتے تھے، چونکہ قرآن میں غیب کے اخبار بھی ہیں اور مخصوص نظم و ترتیب بھی ہے، لہٰذا وہ پیغمبرؐ پر یہ تہمت لگاتے تھے، حالانکہ کہانت اور قرآن کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بعض نے ان آیات کے شانِ نزول میں نقل کیا ہے کہ جس شخص نے پیغمبرؐ کی طرف شعر و شاعری کی نسبت دی وہ ابوجہل تھا اور کہانت کی نسبت دینے والا "عقبہ" یا "عتبہ" تھا اور دوسرے لوگ ان کی پیروی کرتے ہوئے ان تہمتوں کی تکرار کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کے الفاظ میں ہم آہنگی اور ایسی خوبصورت موزونیت ہے، جو کانوں کو بھلی لگتی ہے اور روح کو سکون بخشتی ہے۔ لیکن یہ چیز نہ تو شاعروں کے شعر سے کوئی ربط رکھتی ہے اور نہ ہی کاہنوں کے سجع و قوافی سے اس کا واسطہ ہے۔

"شعر" عام طور پر تخیلات کی پیداوار اور برافروختہ احساسات و عاطفی ہیجانات کو بیان کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں نشیب و فراز اور اٹھنے اور گرنے کا عمل زیادہ ہوتا ہے، جبکہ قرآن زیبائی اور جاذبیت کے باوجود، کامل طور پر استدلالی، منطقی اور عقلاتی مضامین کا حامل ہے۔ اگر بعض اوقات یہ آئندہ کی پیش گوئیاں کرتا ہے تو یہ پیش گوئیاں قرآن کی اصلیت نہیں ہیں، نیز یہ کاہنوں کی خبروں کے برخلاف سب کی سب سچی ہوتی ہیں۔

"قلیلا ما تؤمنون" اور "قلیلا ما تذکرون" کے جملے ایسے افراد کی توبیخ و سرزنش کے لیے ہیں جو اس آسمانی وحی کو واضح نشانیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں، لیکن کبھی اسے شعر قرار دیتے ہیں اور کبھی کہانت اور بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

* * *

آخری زیر بحث آیت میں تاکید کے عنوان سے صراحت کے ساتھ کہتا ہے: "یہ قرآن عالمین کے پروردگار

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

قلیلا اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں ایک محذوف "مفعول مطلق" کی صفت ہے اور "ما" زائدہ ہے، تقدیر میں اس طرح ہے: (تؤمنون ایماناً قلیلا)

کی طرف سے نازل ہوا ہے: (تنزیل من رب العالمین) [1]

اس بناء پر قرآن نہ شعر ہے نہ کہانت، نہ پیغمبر اسلامؐ کے ذہن کی پیداوار اور نہ ہی جبریل کا کلام ہے بلکہ وہ خدا کا کلام ہے جو بیشک وحی کے ذریعہ پیغمبر کے پاک دل پر نازل ہوا ہے، یہی تعبیر تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں گیارہ مقامات پر آئی ہے۔

◆ ◆ ◆

---

[1] تنزیل مصدر ہے، اسم مفعول کے معنی میں اور ایک محذوف جملہ کی خبر ہے، تقدیر میں اس طرح ہے "ھو منزل من رب العالمین"۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ ﴿۴۴﴾

لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ﴿۴۵﴾

ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ ﴿۴۶﴾

فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝ ﴿۴۷﴾

وَإِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ۝ ﴿۴۸﴾

وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِينَ ۝ ﴿۴۹﴾

وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝ ﴿۵۰﴾

وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِينِ ۝ ﴿۵۱﴾

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ ۝ ﴿۵۲﴾

ترجمہ

﴿۴۴﴾ اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا

﴿۴۵﴾ تو ہم اسے پوری قدرت کے ساتھ پکڑ لیتے۔

﴿۴۶﴾ اس کے بعد ہم اس کے دل کی رگ کو کاٹ دیتے۔

﴿۴۷﴾ اور تم میں سے نہ کوئی روک سکتا نہ اس کی حمایت کرتا۔

(۴۸) یہ یقیناً پرہیزگاروں کے لیے ایک تذکرہ ہے۔

(۴۹) اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

(۵۰) اور یہ کافروں کے لیے مایۂ حسرت ہے۔

(۵۱) اور وہ خالص یقین ہے۔

(۵۲) (اب جبکہ ایسا ہے تو) تم اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کرو۔

تفسیر

اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا تو ہم اسے مہلت نہ دیتے۔

قرآن سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے ان آیات میں اس کی اصالت پر ایک واضح دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا ہے" (ولو تقوّل علینا بعض الاقاویل)۔

"تو ہم پوری قدرت کے ساتھ اس کو پکڑ لیتے" (لاخذنا منہ بالیمین)۔

"پھر ہم اس کے دل کی رگ کو کاٹ دیتے۔" (ثم لقطعنا منہ الوتین)۔

"اور تم میں سے کوئی بھی اس کام میں مانع نہ ہوتا اور نہ ہی اس کی حمایت کرتا۔" (فما منکم من احد عنہ حاجزین)[1]

اقاویل جمع ہے اقوال کی اور اقوال اپنی نوبت میں جمع ہے قول کی تو اس بناء پر اقاویل جمع ہے اور یہاں اس سے مراد جھوٹی باتیں ہیں۔

"تقوّل" تقوّل (بروزن تکلّف) کے مادہ سے ان باتوں کے معنی میں ہے جنھیں انسان خود اپنی طرف سے گھڑے اور ان کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

لاخذنا منہ بالیمین (ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور سزا دیتے۔ کیونکہ انسان بہت سے کام

---

[1] "منکم" میں "من" زائدہ اور تاکید کے لیے ہے۔

و دائیں ہاتھ سے انجام دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں زیادہ قدرت ہوتی ہے۔ اس طرح "یمین" قدرت سے کنایہ ہے۔[1]

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اور احتمالات بھی دیئے ہیں، چونکہ وہ غیر مانوس اور غیر موزوں تھے لہٰذا ہم نے ان سے صرفِ نظر کیا ہے۔

"وتین" "دل کی رگ" کے معنی میں ہے، یعنی شہ رگ جو تمام اعضاء میں خون پہنچاتی ہے۔ اگر وہ کٹ جائے تو انسان کو فوراً اور ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر موت آجاتی ہے۔ یہ وہ سریع ترین سزا ہے جو کسی شخص کے بارے میں انجام پا سکتی ہے۔

بعض نے اس کی تفسیر اس رگ سے کی جس کے ساتھ دل آویزاں ہوتا ہے یا اس رگ سے جو جگر کو خون پہنچاتی ہے، یا رگِ نخاع جو مہروں کے ستون کے وسط میں ہوتی ہے۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے صحیح نظر آتی ہے۔

"حاجزین" حاجز کی جمع ہے جو مانع اور رکاوٹ کے معنی میں ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر کوئی شخص خدا پر جھوٹ بولے اور خدا فوراً اس کو سزا دے اور اسے ہلاک کر دے تو پھر نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کو تیزی کے ساتھ نابود ہو جانا چاہیے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے، اور ان میں بہت سے سالہا سال زندہ رہے ہیں، یہاں تک کہ ان کا باطل مذہب ان کے بعد بھی باقی رہا ہے۔

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ "ہر مدعی" بلکہ یہ کہتا ہے کہ اگر پیغمبر اسلامؐ اس طرح کا کام کرے، یعنی وہ پیغمبرؐ جسے خدا نے معجزہ دیا، اور حقانیت کے دلائل نے اس کی تائید کی ہے۔ اگر وہ طریقِ حق سے منحرف ہو جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی اُسے مہلت نہیں دی جائے گی، کیونکہ یہ چیز لوگوں کی گمراہی اور ضلالت کا سبب بنے گی۔[2]

لیکن جو شخص باطل دعویٰ کرتا ہے اور کوئی معجزہ یا واضح دلیل اپنی حقانیت پر نہیں رکھتا تو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ خدا اُسے فوراً ہلاک کرے۔ کیونکہ اس کی باتوں کا بطلان ہر اس شخص کے لیے جو حق کا طالب ہے واضح اور روشن ہے۔ مشکل وہاں آپڑتی ہے جہاں نبوت کا مدعی دلائل و معجزات کے ہمراہ ہو اور وہ حق کی راہ سے منحرف ہو جائے۔

اِس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض گمراہ فرقے اپنے پیشواؤں کے دعوے کے اثبات کے لیے اس

---

[1] اوپر والے جملہ میں "من" زائدہ اور تاکید کے لیے ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ "لاخذناہ بالیمین"

[2] یہ وہی چیز ہے جو علمِ کلام کی کتب میں جھوٹے کے ہاتھ میں معجزہ قرار دینے کے عنوان سے پیش ہوتی ہے اور اس کو قبیح قرار دیا جاتا ہے۔

آیت سے تمسک کرتے ہیں وہ بالکل غلط ہے، ورنہ مسیلمہ کذاب جیسے افراد اور دوسرے جھوٹے مدعی بھی اس آیت سے اپنی حقانیت پر استدلال کر سکتے ہیں۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں تاکید اور یاد آوری کے لیے فرماتا ہے: "یہ قرآن یقینی طور پر پرہیزگاروں کے لیے ایک نصیحت ہے۔" (وانه لتذكرة للمتقين)۔

ان کے لیے جو اپنے آپ کو گناہ سے پاک کرنے کے لیے تیار ہوں، راہِ حق کو طے کرنے پر آمادہ ہوں، ان کے لیے جو جستجو میں لگے رہتے ہیں، حقیقت کے طالب ہیں، قرآن ان کے لیے ذکر اور نصیحت ہے۔لیکن جو لوگ تقویٰ کی یہ حد نہیں رکھتے وہ یقیناً قرآنی تعلیمات سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اس لحاظ سے قرآن جو گہری، عمیق اور حد سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے وہ اس کی حقانیت کی ایک اور دلیل ہے۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد کہتا ہے: "اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے ایک گروہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔" (و انا لنعلم ان منكم مكذبين)۔

لیکن ہٹ دھرم جھٹلانے والوں کا وجود ان کے حق پر نہ ہونے کی دلیل میں رکاوٹ نہیں بن سکتا ہے، کیونکہ پرہیزگار اور حقیقت کے طالب ہی اس سے متذکر ہوتے ہیں۔وہ اس میں حق کی نشانیاں دیکھتے ہیں اور راہِ خدا میں قدم رکھ دیتے ہیں۔

اس بناء پر جس طرح ایک روشن چراغ سے فائدہ اٹھانے کے لیے کم از کم یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی آنکھ کو کھلا رکھے اسی طرح نورِ قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی دل کی آنکھ اس کے اوپر کھلی رکھنی چاہیے۔

٭ ٭ ٭

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اور یہ قرآن کافروں کے لیے حسرت کا باعث ہے۔" (و انه لحسرة على الكافرين)۔

آج یہ اس کی تکذیب کر رہے ہیں لیکن کل جو "یوم الظہور" اور "یوم البروز" ہونے کے ساتھ ساتھ "یوم الحسرت" بھی ہے وہ سمجھ لیں گے کہ انھوں نے ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے کتنی عظیم نعمت کو ہاتھ سے دے دیا ہے اور کیسے کیسے دردناک عذاب اپنے لیے خرید لیے ہیں، وہ دن جس میں وہ مومنین کی بلندیاں اور پستیاں دیکھیں گے اور ان کا آپس میں موازنہ کریں گے تو حسرت کے ساتھ انگلی منہ میں داب لیں گے اور غصہ اور غصہ کی شدت سے اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹیں گے۔ "و يوم يعض الظالم على يديه يقول يا ليتني اتخذت مع الرسول سبيلا۔" اس دن کو یاد کرو جب ظالم اپنے دونوں ہاتھوں کو شدتِ حسرت سے کاٹے گا اور کہے گا کہ اے کاش! میں رسول کے راستے پر چلتا۔" (فرقان۔۲۷)

اس بناء پر کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ منکرین کا شک و تردید یا تکذیب، قرآن کے مفاہیم کے ابہام کی وجہ سے ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "یہ قرآن یقین خالص اور حق یقین ہے۔" (وانه لحق الیقین)۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق حق الیقین کی تعبیر کسی چیز کی اپنی ذات کی طرف نسبت کی قبیل سے ہے کیونکہ 'حق' عین یقین ہے اور یقین عین حق ہے، جیسا کہ ہم کہتے ہیں 'مسجد الجامع' اور 'یوم الخمیس' اور یہ اضافت اصطلاح کے مطابق اضافت بیانیہ ہے۔

لیکن بہتر ہے یہ کہا جائے کہ یہ موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔ یعنی قرآن ایک خالص یقین ہے، یا دوسرے لفظوں میں یقین کے کئی مراحل ہوتے ہیں۔

کبھی وہ دلیل عقلی سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ہم دھوئیں کو دور سے دیکھتے ہیں تو اس سے آگ کے وجود کا یقین حاصل ہوجاتا ہے۔ حالانکہ ہم نے آگ کو نہیں دیکھا، اس کو "علم الیقین" کہتے ہیں۔

بعض اوقات ہم اور نزدیک جاکر آگ کے شعلوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ اس سے یقین اور زیادہ محکم ہو جاتا ہے اور اس کو عین الیقین کا نام دیتے ہیں۔

بعض اوقات ہم اس سے بھی زیادہ نزدیک چلے جاتے ہیں، آگ کے پاس یا آگ کے اندر داخل ہوجاتے ہیں اور اس کی سوزش کو اپنے ہاتھ سے لمس کرتے ہیں۔ یقیناً یہ یقین کا بالاتر مرحلہ ہے اور اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔

اوپر والی آیت کہتی ہے کہ قرآن یقین کے اس قسم کے مرحلہ میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود دل کے اندھے اس کا انکار کرتے ہیں۔

⁂

پھر آخری زیر بحث آیت جو سورۂ حاقہ کی آخری آیت ہے، اس میں فرماتا ہے: "اب جبکہ ایسا ہے، تو اپنے عظیم پروردگار کی تسبیح کر اور اس کو ہر قسم کے عیب و نقص سے منزہ شمار کر (فسبح باسم ربك العظيم)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت کا مضمون تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سورۃ واقعہ کے آخر میں بھی آیا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ یہاں گفتگو قرآن مجید کے بارے میں ہے اور اس کی توصیف "حق الیقین" کے ساتھ ہوئی ہے، لیکن سورۃ واقعہ کے آخر میں قیامت میں نیکوکاروں کے مختلف گروہوں کے بارے میں گفتگو ہے۔

⁂

ایک نکتہ

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں قرآن کی توصیف چار صفات کے ساتھ کی گئی ہے۔

پہلے کہتا ہے: یہ رب العٰلمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

اس کے بعد کہتا ہے: یہ متقین کے لیے یاد آوری اور تذکر ہے۔

پھر کہتا ہے: کافروں کے لیے حسرت و ندامت کا باعث ہے۔

اور آخری مرحلہ میں مزید کہتا ہے: یہ "حق الیقین" ہے۔

ان میں سے پہلی صفت تمام لوگوں کے لیے ہے۔

دوسری صفت پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

تیسری صفت کفار کے ساتھ مربوط ہے۔

اور چوتھی صفت خاصانِ خدا اور مقربین سے مربوط ہے۔

✧ ✧ ✧

خداوندا! تو خود جانتا ہے کہ کوئی چیز سرمایۂ یقین سے برتر نہیں ہے، ہمیں ایسا ایمان اور یقین مرحمت فرما جو "حق الیقین" کا مصداق ہو۔

پروردگارا! قیامت کا دن یوم الحسرت ہے، ہمیں کم از کم ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جنہیں طاعتوں کی کمی پر حسرت ہو، نہ کہ کثرتِ گناہ اور ترکِ طاعت پر حسرت و ندامت ہو۔

بارِ الٰہا! ہمارا نامۂ اعمال ہمارے دائیں ہاتھ میں دینا اور ہمیں اپنی جنتِ عالیہ اور عیشۂ راضیہ (پسندیدہ زندگی) میں داخل فرمانا۔ آمین یا رب العالمین۔

✧ ✧ ✧

سورہ حاقہ کا اختتام ۵ رذی القعدہ ۱۴۰۶ھ

تفسیر نمونہ جلد ۲۴ کا اختتام

اختتام ترجمہ

بروز اتوار بوقت ساڑھے پانچ بجے دوپہر

بتاریخ ۱۰ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۶ راگست ۱۹۸۷ء

بدست حقیر پُر تقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم

بر مکان سیٹھ نوازش علی ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن، لاہور

الحمد للہ اولاً و آخراً و صلی اللہ علی محمد و آلہ سرمداً ابداً

سورۂ معارج

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۴۴ آیات ہیں

تاریخ شروع

۵ ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ

سورۂ معارج کے مطالب

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ سورہ معارج مکی سورتوں میں سے ہے اور "فہرست ابن ندیم" و "کتاب نظم الدرر" و "تناسق الایات والسور" کی بنیاد پر، ابو عبداللہ زنجانی کی "تاریخ القرآن" کے مطابق، یہ سورہ (۷۰) سترہواں سورہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا۔

لیکن یہ چیز اس سے مانع نہیں ہے کہ اس کی بعض آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور یہ بات سورہ معارج پر ہی منحصر نہیں ہے کیونکہ قرآن کے بہت سے سورے ایسے ہیں جو مکی ہیں لیکن ان میں ایک یا کئی آیات ایسی ہیں جو مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور اسی طرح اس کے برعکس بعض مدنی سورتوں میں مکی آیات موجود ہیں۔

اس موضوع کے بہت سے نمونے "علامہ امینی" نے "الغدیر" میں پیش کیے ہیں[1]

اس بات کی دلیل کہ اس سورہ کی ابتدائی آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، وہ بہت سی روایات ہیں جو ان شاء اللہ ان آیات کی تفسیر میں بیان کی جائیں گی۔

بہرحال مکی سورتوں کی خصوصیات، مثلاً اصولِ دین کے بارے میں بحث، خاص طور پر معاد اور مشرکین و منافقین کو ڈرانے کے بارے میں اس سورہ میں کامل طور سے نمایاں ہے اور مجموعی طور سے یہ سورہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حصہ: اس شخص کے لیے جلدی ہونے والے عذاب کی بات کرتا ہے جس نے پیغمبر کے بعض ارشادات کا انکار کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اگر یہ بات حق ہے تو مجھ پر عذاب نازل فرما اور عذاب نازل ہو گیا۔ (آیہ ۱ تا ۳)

دوسرا حصہ: قیامت کی بہت سی خصوصیات اور اس کے مقدمات، اور اس دن کفار کے حالات کے بارے میں آیا ہے (آیہ ۴ تا ۱۸)۔

تیسرا حصہ: اچھے اور بُرے انسانوں کی صفات کے ان حصوں کو بیان کرتا ہے جو انہیں جنتی اور دوزخی بنا دیتے ہیں۔ (آیہ ۱۹ تا ۳۴)

چوتھا حصہ: مشرکین و منکرین کو ڈرانے والی باتوں پر مشتمل ہے اور پھر دوبارہ مسئلہ قیامت کی طرف لوٹتا اور سورہ کو ختم کرتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرؐ سے آیا ہے:

---

[1] الغدیر جلد اص ۲۵۵ تا ۲۵۷

"من قرأ "سأل سائل" اعطاه الله ثواب الذین هم لاماناتهم وعهدهم راعون و الذین هم علی صلواتهم یحافظون"،

"جو شخص سورہ "سأل سائل" کو پڑھے تو خدا اسے ان لوگوں کا ثواب دے گا جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی حفاظت کرتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں"[1]

ایک اور حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے:

"من ادمن قرأته "سأل سائل" لم یسأله الله یوم القیامة عن ذنب عمله واسکنه جنته مع محمد (ص)"،

جو ہمیشہ سورہ "سأل سائل" کو پڑھے تو خدا قیامت کے دن اس سے اس کے گناہوں کی باز پرس نہیں کرے گا اور اس کو جنت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سکونت عطا فرمائے گا[2]

یہی مضمون امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ وہ بات جو انسان کو ان سب عظیم ثوابوں کا مشمول قرار دیتی ہے، وہ ایسی تلاوت ہے جو عقیدہ و ایمان کے ساتھ ہو اور اس کے ساتھ ساتھ عمل بھی ہو، نہ یہ کہ وہ آیات اور سورہ کو تو پڑھے لیکن اس کی روح اور فکر و عمل میں کسی قسم کا انعکاس نہ ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۰

[2] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ○

۲۔ لِّلۡکٰفِرِیۡنَ لَیۡسَ لَہٗ دَافِعٌ ○

۳۔ مِّنَ اللّٰہِ ذِی الۡمَعَارِجِ ○

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

ترجمہ

۱۔ ایک سوال کرنے والے نے عذاب کا سوال کیا جو واقع ہو گیا۔

۲۔ یہ عذاب کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی بھی شخص اسے دفع نہیں کر سکتا۔

۳۔ یہ ذی المعارج خدا کی طرف سے ہے (وہ خدا جس کے فرشتے آسمانوں کی طرف چڑھتے ہیں)۔

شانِ نزول

بہت سے مفسرین اور محدثین نے ان آیات کی ایک شانِ نزول بیان کی ہے، جس کا ماحصل اس طرح ہے:

"جب رسولِ خدا نے علی کو "غدیر خم" کے دن خلافت پر نصب فرمایا تو ان کے بارے میں یہ ارشاد کیا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ" "جس جس کا میں مولیٰ و ولی ہوں، اس اس کے علی مولیٰ و ولی ہیں"۔ زیادہ دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ یہ بات سارے شہروں اور بستیوں میں پھیل گئی۔ نعمان بن حارث فہری، پیغمبر کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم یہ گواہی دیں کہ خدا واحد و یگانہ ہے اور آپ اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں تو ہم نے گواہی دی۔ اس کے بعد آپ نے ہمیں جہاد، حج، روزہ، نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہم نے ان سب کو قبول کر لیا لیکن آپ ان سب چیزوں پر راضی نہ ہوئے، یہاں تک کہ اس جوان کو (علی کی طرف اشارہ کیا) اپنی جانشینی اور خلافت پر نصب فرمایا اور یہ کہا کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کیا یہ بات خود آپ نے اپنی طرف سے کہی ہے یا یہ خدا کی جانب سے ہے۔ پیغمبر نے فرمایا: قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے یہ بات خدا کی طرف سے ہے"۔

نعمان نے منہ پھیر لیا اور یہ کہتا جاتا تھا:

اللّٰھم ان کان ھٰذا ھوالحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء:

خداوندا! اگر یہ بات حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو آسمان سے ہم پر پتھر برسا"

اسی وقت ایک پتھر آسمان سے اس کے سر پر گرا اور اسے مار ڈالا، اسی موقع پر آیہ سأل سائل بعذاب واقع للکافرین لیس لہ دافع" نازل ہوئی۔

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے، یہ اس عبارت کا خلاصہ ہے جو "مجمع البیان" میں "ابوالقاسم حسکانی" سے اس کے سلسلہ سند کے ساتھ "امام صادق" سے نقل ہوئی ہے۔[1]

اس مضمون کو اہل سنت کے بہت سے مفسرین اور راویان حدیث نے بھی مختصر فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

مرحوم "علامہ امینی" نے "الغدیر" میں اسے اہل سنت کے تیس مشہور علماء سے نقل کیا ہے (حوالہ اور اصل عبارت کے ساتھ) منجملہ ان کے:

- تفسیر "غریب القرآن"۔ حافظ ابوعبید ہروی۔
- تفسیر "شفاء الصدور"۔ ابوبکر نقاش موصلی۔
- تفسیر "الکشف والبیان"۔ ابواسحاق ثعالبی۔
- تفسیر "ابوبکر یحییٰ"۔ القرطبی۔
- تذکرہ "ابواسحاق"۔ ثعلبی۔
- کتاب "فرائد السمطین"۔ حموینی۔
- کتاب "درر السمطین"۔ شیخ محمد زرندی۔
- تفسیر "سراج المنیر"۔ شمس الدین شافعی۔
- کتاب "سیرۂ حلبی"
- کتاب "نور الابصار" سید مومن شبلنجی۔
- کتاب "شرح جامع الصغیر سیوطی" شمس الدین شافعی۔ وغیرہ[2]

ان کتابوں میں سے بہت سی میں یہ تصریح ہوئی ہے کہ اوپر والی آیات اس سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، البتہ اس سلسلہ میں کہ یہ شخص حارث بن نعمان" تھا یا "جابر بن نضر" یا "نعمان بن حارث فہری" اختلاف ہے، اور ہم یہ جانتے ہیں کہ اس بات کا اصل مطلب پر کوئی مختلف اثر نہیں پڑتا۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۵۲

[2] الغدیر، جلد ۱ ص ۲۳۹ تا ۲۴۶

البتہ بعض مفسرین و محدثین جو علی کے فضائل کو خوشی سے قبول نہیں کرتے، انھوں نے اس شانِ نزول پر مختلف اعتراضات کیے ہیں جن کی طرف انشاء اللہ بحث کے آخر میں اشارہ ہوگا۔

تفسیر

فوری عذاب

سُورۂ معارج یہاں سے شروع ہوتی ہے: "ایک سوال کرنے والے نے عذاب کا تقاضا کیا جو واقع ہوگیا (سأل سائل بعذاب واقع)۔

یہ سوال کرنے والا جیسا کہ ہم نے شانِ نزول میں بیان کیا ہے "نعمان بن حارث" یا "نضر بن حارث" جو علی کے "غدیرِ خم" کے مقام پر خلافت و ولایت پر منصوب ہونے، اور اس خبر کے تمام شہروں میں منتشر ہونے پر بہت غصہ میں بھرا ہوا تھا، پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور کہا: کیا یہ بات آپ نے اپنی طرف سے کہی ہے یا یہ خدا کی طرف سے ہے؟ پیغمبرؐ نے صراحت کے ساتھ فرمایا: یہ بات خدا کی طرف سے ہے تو وہ اس سے اور بھی زیادہ پریشان ہوگیا اور اس نے کہا: خداوندا! اگر یہ بات حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر نازل فرما، اسی وقت ایک پتھر گرا اور اس کے سر پر لگا اور اسے مار ڈالا[1]

اس تفسیر کے مقابلہ میں ایک اور تفسیر بھی ہے۔ اس تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے پیغمبرؐ سے سوال کیا کہ یہ عذاب جو آپ کہتے ہیں کس پر واقع ہوگا تو بعد والی آیت جواب دیتی ہے کہ کافروں کے لیے ہوگا۔

اور تیسری تفسیر کے مطابق یہ سوال کرنے والے خود پیغمبر ہیں جنھوں نے کفار کے لیے عذاب کا تقاضا کیا اور وہ نازل ہوا۔

لیکن پہلی تفسیر علاوہ اس کے کہ خود آیت کے ساتھ سازگار ہے، ان متعدد روایات پر منطبق بھی ہے جو شانِ نزول میں وارد ہوئی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ عذاب کافروں کے لیے مخصوص ہے اور کوئی بھی اسے نہیں روک سکتا" (للکافرین لیس له دافع)۔[2]

بعد والی آیت میں اس ذات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جس کی طرف سے یہ عذاب ہے، کہتا ہے: "یہ عذاب اس خدا کی طرف

---

[1] اس تفسیر کے مطابق "بعذاب واقع" میں "باء" زائد اور تاکید کے لیے ہے اور بعض کے نظریہ کے مطابق "عن" کے معنی میں ہے اور یہ دوسری تفسیر کے مطابق ہے (اس پر توجہ رہے کہ اگر سوال، تقاضا اور درخواست کے معنی میں ہو تو پھر دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوگا اور اگر "استخبار" کے معنی میں ہو تو پھر اس کا دوسرا مفعول یقیناً "عن" کے ساتھ ہوگا)

[2] "واقع" عذاب کی صفت ہے اور "للکافرین" دوسری صفت ہے اور "لیس له دافع" تیسری صفت۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "للکافرین" "عذاب" سے متعلق ہو اور اگر "لام" "علی" کے معنی میں ہو تو پھر "واقع" سے متعلق ہوگا۔

سے ہے، جو ان آسمانوں کا مالک ہے جن کی طرف فرشتے صعود کرتے ہیں (من اللہ ذی المعارج)۔

"معارج" "معرج" کی جمع ہے، جو سیڑھی یا اس جگہ کے معنی میں ہے جہاں سے صعود کرتے اور اوپر جاتے ہیں اور چونکہ خدا نے فرشتوں کے لیے مختلف مقامات قرار دیئے ہیں کہ وہ مراتب کے لحاظ سے قربِ خدا کی طرف پیش رفت کرتے ہیں، لہٰذا خدا کی "ذی المعارج" کے ساتھ توصیف کی گئی ہے۔

اس فرشتے ہی کافروں اور مجرموں کے عذاب پر مامور ہوتے ہیں اور وہ بھی فرشتے ہی تھے جو ابراہیم خلیل پر نازل ہوئے تھے اور انہیں یہ خبر دی تھی کہ ہم قوم لوط کی بربادی پر مامور ہوئے ہیں اور صبح کے وقت انہوں نے اس آلودہ گناہ قوم کے شہروں کو تہ و بالا کر دیا لہٰذا یہی فرشتے دوسرے مجرموں پر عذاب نازل کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔

بعض مفسرین نے "معارج" کی فضائل و مواہب الٰہیہ کے معنی میں اور بعض نے "فرشتوں" کے بارے میں تفسیر کی ہے لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب اور اس لفظ کے لغوی معنی کے ساتھ زیادہ سازگار ہے۔

ایک نکتہ

بہانہ تراشوں کے بے ہودہ اعتراضات

عام طور پر وہ موارد، جن میں آیات و روایات، امیر المومنین علی کے مخصوص فضائل کی طرف اشارہ کرتی ہیں، ان میں بعض لوگ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے مطلب کو اہمیت نہ دی جائے، یا تو اسے نظر انداز کر دیا جائے یا اس کی کوئی انحرافی توجیہ کر دی جائے اور ایک خاص وسوسہ اور باریکی کے ساتھ مسئلہ کو بیان کیا جائے، حالانکہ اگر یہ فضائل دوسرے لوگوں کے ہوتے تو وہ بڑی آسانی اور سہولت کے ساتھ انہیں قبول کرتے۔

اس بات کا زندہ ثبوت اور واضح نمونہ وہ ساتھ اعتراضات ہیں جو "ابن تیمیہ" نے کتاب "منہاج السنہ" میں ان احادیث کے بارے میں کیے ہیں جو اوپر والی آیات کے شانِ نزول میں آئی ہیں، جنہیں ہم اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ غدیر کا واقعہ، پیغمبر کے حجۃ الوداع سے لوٹنے کے بعد یعنی سن دس ہجری میں واقع ہوا جبکہ سورۂ معارج مکی سورتوں میں سے ہے، ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔

جواب: جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں بہت سے سورے ایسے ہیں جو مکی کے نام سے موسوم ہیں جبکہ ان کی بعض ابتدائی آیات مفسرین کی تصریح کے مطابق مدینہ میں نازل ہوئی ہیں اور اس کے برعکس کچھ سورتیں ایسی ہیں جو مدنی کے نام سے موسوم ہیں لیکن ان کی بعض آیات (مکہ) میں نازل ہوئی ہیں۔[1]

۲۔ اس حدیث میں آیا ہے کہ "حارث بن نعمان" پیغمبر کی خدمت میں "ابطح" میں پہنچا اور ہم جانتے ہیں کہ "ابطح"

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۶ ص ۲۰۲ تا ۲۱۰ کی طرف رجوع کریں۔

کہ میں ایک شہر ہے اور یہ امر واقعہ غدیر کے بعد آیت کے نزول کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

جواب:۔ اوّلاً: "ابطح" کی تعبیر صرف بعض روایات میں ہے نہ کہ سب میں۔ ثانیاً: "ابطح" و "بطحاء" ہر اس وسیع زمین کے معنی میں ہے جس میں سیلاب کا پانی جاتا ہو اور اتفاقاً مدینہ کی سرزمین میں ایسے علاقے موجود ہیں جنہیں "ابطح" یا "بطحاء" کہا جاتا ہے اور اشعار عرب اور روایات میں ان کی طرف بہت زیادہ اشارہ ہوا ہے۔

۳۔ آیۂ (واذ قالوا اللّٰھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء) (انفال ـــــ ۳۲) سلّم طور پر جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی اور یہ واقعہ غدیر سے کئی سال پہلے ہے۔

جواب: کسی نے یہ نہیں کہا ہے کہ مذکورہ آیت کا شانِ نزول واقعہ غدیر ہے۔ بلکہ بحث آیۂ (سأل سائل بعذاب واقع) کے بارے میں ہے۔

لیکن سورۂ انفال کی آیہ ۳۲ ایک ایسی چیز ہے جس سے حارث بن نعمان نے اپنے کلام میں استفادہ کیا ہے اور اس بات کا شانِ نزول کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے، لیکن داخلی تعصبات کے سبب سے، انسان ایسے واضح مطلب سے غافل ہو جاتا ہے۔

۴۔ قرآن مجید کہتا ہے: وما کان اللّٰہ لیعذبھم وانت فیھم وما کان اللّٰہ معذبھم وھم یستغفرون)۔ خدا انہیں عذاب نہیں کرے گا جبکہ تم ان میں موجود ہو اور خدا انہیں عذاب نہیں کرے گا، درآنحالیکہ وہ استغفار کرتے ہوں۔ (انفال ـــــ ۳۳)۔ یہ آیت کہتی ہے کہ، پیغمبرؐ کی موجودگی میں ہرگز کوئی عذاب نازل نہیں ہوگا۔

جواب: وہ بات جو قابلِ قبول ہے، یہ ہے کہ پیغمبر کے ہوتے ہوئے عمومی اور سب لوگوں کے لیے عذاب نہیں تھا۔ لیکن خصوصی اور شخصی عذاب بارہا بعض لوگوں پر نازل ہوئے، جیسا کہ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ کئی افراد مثلاً "ابو زمعہ" و "مالک بن طلالہ" و "حکم بن ابی العاص" وغیرہ پیغمبر کی نفرین سے یا اس کے بغیر عذاب میں گرفتار ہوئے۔

علاوہ ازیں اوپر والی آیت کی اور تفاسیر بھی ہیں، جن کے مطابق اس مقام پر اس آیت سے استدلال ممکن نہیں ہے (تفسیر نمونہ جلد ۷ ص ۱۵۴ میں اسی آیہ ۳۳ انفال کے ذیل میں رجوع کیا جائے)۔

۵۔ اگر اس قسم کا شانِ نزول صحیح ہوتا تو اصحاب فیل کی داستان کی طرح مشہور ہوتا۔

جواب:۔ یہ شانِ نزول بقدر کافی مشہور و معروف ہے اور ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کم از کم تیس کتب تفسیر و حدیث میں آیا ہے اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ ہم یہ توقع رکھیں کہ ایک شخصی واقعہ، اصحاب فیل جیسے عمومی واقعہ کی طرح مشہور ہو، کیونکہ وہ داستان ایک عمومی پہلو رکھتی تھی سارا مکہ اس کی لپیٹ میں تھا اور ایک بہت بڑا لشکر اس کے نتیجہ میں نابود ہوا تھا۔ لیکن "حارث بن نعمان" کا واقعہ صرف ایک ہی شخص کے ساتھ مربوط تھا۔

۶۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ "حارث بن نعمان" کہ صحابی یا مسلمان تھے، تو کسی مسلمان کا عصرِ پیغمبرؐ میں، اس قسم کے عذاب میں گرفتار ہو جانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

جواب:۔ یہ اعتراض بھی شدید تعصب کی پیداوار ہے کیونکہ اوپر والی احادیث اچھی طرح سے بتاتی ہیں کہ وہ نہ صرف پیغمبرؐ کے ارشاد کو قبول نہیں کرتا تھا بلکہ خدا پر بھی معترض تھا کہ اس نے اس قسم کا حکم علیؑ کے بارے میں کیوں دیا ہے، یہ کفر و ارتداد کا شدید ترین مرتبہ

شمار ہوتا ہے۔

۷۔ "استیعاب" جیسی مشہور کتاب، جس میں "صحابہ" کے نام آئے ہیں "حارث بن نعمان" کا نام نہیں ہے۔

جواب: اس کتاب میں یا اسی جیسی دوسری کتابوں میں صحابہ کے جتنے نام آئے ہیں وہ صحابہ کے صرف ایک حصہ کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً کتاب "اسد الغابہ" میں جو ایک اہم ترین کتاب ہے جس نے اصحاب پیغمبرؐ کو شمار کیا ہے صرف سات ہزار پانچ سو چون (۷۵۵۴) افراد کے نام آئے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ صرف حجۃ الوداع میں ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ افراد بارگاہ پیغمبرؐ میں حاضر تھے۔ اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے اصحاب پیغمبرؐ کے نام ان کتب میں نہیں آئے ہیں[1]

---

[1] اوپر والے جوابات کے سلسلے میں، اور ہر ایک کے تاریخی یا روایتی شواہد کے بارے میں کتاب نفیس "الغدیر" کی جلد ۱ ص ۲۴۷ تا ۲۶۶ کا مطالعہ فرمائیں۔

۴۔ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ

۵۔ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝

۶۔ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ۝

۷۔ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝

ترجمہ

۴۔ فرشتے اور روح (مخصوص فرشتے) اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہو گی۔ اس کی طرف عروج کریں گے۔

۵۔ اس بناء پر صبر جمیل اختیار کر۔

۶۔ کیونکہ وہ تو اس دن کو دور سمجھتے ہیں۔

۷۔ اور ہم اسے نزدیک سمجھتے ہیں۔

تفسیر

پچاس ہزار سال کے برابر دن

ایک شخص کے دنیاوی عذاب کے واقعہ کو بیان کرنے کے بعد۔ جس نے عذاب الٰہی کا تقاضا کیا تھا۔ خداوند مجرموں کے اس دن کے اخروی عذابوں کے مباحث کا بیان شروع کرتا ہے، پہلے فرماتا ہے: وہ فرشتے اور روح، اس دن جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہو گی، اس (خدا) کی طرف عروج کریں گے (تعرج الملائکة والروح الیہ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنة)۔

مسلم طور سے "فرشتوں کے عروج" سے مراد جسمانی عروج نہیں ہے بلکہ اس سے مراد روحانی عروج ہے، یعنی وہ خدا کے مقام قرب کی طرف بڑھیں گے، اور اس دن، جو قیامت کا دن ہے، فرمان خداوندی کو حاصل کرنے اور اس کے اجراء کے لیے آمادہ ہوں گے۔ جیسا کہ ہم نے سورہ "حاقہ" کی آیہ ۱۷ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "والملک علیٰ ارجائھا۔ (فرشتے آسمان کے اطراف میں قرار پائیں گے)" کے جملے سے مراد یہ ہے کہ اس دن وہ آسمانوں کے گرداگرد کھڑے ہوں گے اور ہر قسم کے فرمان کو انجام دینے کے لیے

آمادہ ہوں گے [1]

"روح" سے مراد وہی "روح الامین" ہے جو سب فرشتوں سے بزرگ ہے اور جس کی طرف سُورۂ "قدر" میں بھی اشارہ ہوا ہے، جہاں کہتا ہے: تنزل الملائکة والروح فیھا باذن ربھم من کل امر۔

"شب قدر میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے امور کی تقدیر کے لیے نازل ہوتے ہیں" (قدر ـــــ ۴)

البتہ "روح" کے مختلف معانی ہیں اور ممکن ہے کہ وہ ہر موقع پر موجود قرائن کی مناسبت سے ایک خاص مفہوم رکھے۔ روح انسان، روح بمعنی قرآن، روح بمعنی روح القدس اور روح بمعنی فرشتۂ وحی، یہ سب روح کے معانی ہیں۔ جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں اشارہ ہوا ہے [2]

اب رہی پچاس ہزار سال کی تعبیر تو وہ اس لحاظ سے ہے کہ زیرِ بحث دن دنیا کے سالوں کے حساب سے اتنا طولانی ہوگا اور یہ بات اس چیز سے کہ جو سُورۂ سجدہ کی آیہ ۵ میں آئی ہے کہ اس کی مقدار ایک ہزار سال ہے، اختلاف نہیں رکھتی، کیونکہ ـــــ جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے ـــــ قیامت میں پچاس موقف ہوں گے اور ہر موقف ایک ہزار سال کی مقدار کے برابر ہوگا [3]

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "پچاس ہزار سال" کا مقصد تکثیر کے لیے ہے نہ کہ تعدد کے لیے، یعنی وہ دن بہت طولانی ہوگا ہر حال یہ مجرموں، ظالموں اور کافروں کے لیے ہوگا، اسی لیے ایک حدیث میں "ابوسعید خدری" سے آیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد کسی نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ! وہ دن کتنا طولانی ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ انہ لیخف علی المؤمن حتی یکون اخف علیہ من صلاة مکتوبة یصلیھا فی الدنیا

"اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے وہ دن مومن کے لیے بہت ہی ہلکا اور آسان ہوگا، یہاں تک کہ وہ ایک واجب نماز سے بھی زیادہ آسان ہوگا، جو وہ دنیا میں پڑھا کرتا تھا" [4]

بعد والی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: صبرِ جمیل اختیار کر اور ان کے استہزاء، تکذیب اور آزار کے مقابلہ میں صبر سے کام لے (فاصبر صبراً جمیلاً)۔

---

[1] ان فرشتوں کے عروج کی اور بھی تفاسیر بیان کی گئی ہیں جن میں سے کوئی بھی مناسب نظر نہیں آتی ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے نزول و صعود کا زمانہ ہے جو آغاز دنیا سے لے کر اس کے اختتام تک ہے جو مجموعی طور پر پچاس ہزار سال ہے، یعنی دنیا کی تمام عمر ہے لیکن بعد والی آیات اچھی طرح بتاتی ہیں کہ گفتگو قیامت کے دن کے بارے میں ہے نہ کہ دنیا کے متعلق (غور کیجیے)۔

[2] تفسیر نمونہ جلد ۱۲ ص ۲۵۰ تا ۲۵۲ کی طرف رجوع کریں۔

[3] یہ حدیث امالی شیخ میں امیر المومنین علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۱۷

[4] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۵۲، اور "قرطبی" جلد ۱۰ ص ۶۷۴۳

"صبرِ جمیل" کا معنی خوبصورت اور قابلِ توجہ صبر و شکیبائی ہے اور وہ وہی صبر و استقامت ہے جس میں دوام و استمرار ہو جس میں یاس و ناامیدی نہ ہو، اور وہ بے تابی، جزع و فزع و شکوہ اور آہ و نالہ سے توأم نہ ہو، اس صورت کے علاوہ وہ جمیل نہیں ہے۔[1]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "کیونکہ وہ اس قسم کے دن کو بعید اور دور سمجھتے ہیں (انهم یرونه بعیدًا)۔

اور ہم اسے قریب اور نزدیک سمجھتے ہیں (و نراہ قریبًا)۔

وہ بالکل باور ہی نہیں کرتے کہ اس قسم کا دن بھی ہوگا جس میں تمام مخلوق کا حساب لیا جائے گا اور ان کی چھوٹی سے چھوٹی گفتار و رفتار کا بھی محاسبہ ہوگا۔ وہ بھی ایسے دن میں جو پچاس ہزار سال طولانی ہوگا لیکن حقیقت میں ایسے لوگوں نے خدا کو پہچانا نہیں اور وہ اس کی قدرت میں شک اور تردد رکھتے ہیں۔

وہ یہ کہتے ہیں: کیا یہ ممکن ہے کہ بوسیدہ ہڈیاں اور وہ مٹی جس کا ہر ذرہ مختلف گوشوں میں پراگندہ ہو چکا ہے دوبارہ جمع ہو کر زندگی کا لباس زیب تن کر لیں گی۔ (جیسا کہ قرآن نے اپنی آیات میں یہ تعبیریں ان سے نقل کی ہیں)۔ اس کے علاوہ کیا پچاس ہزار سال کا دن ممکن ہے ؟!۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کا علم یہ کہتا ہے کہ آسمانی کرات میں، دن کی مقدار ہر کُرہ کی دوسرے کُرہ سے مختلف ہے، کیونکہ وہ اس زمانہ کی مقدار کے تابع ہوتی ہے، جس میں وہ کُرہ اپنے محور کے گرد ایک مرتبہ چکر لگاتا ہے، اسی لیے چاند کے کُرہ کا دن زمین کے دو ہفتوں کے برابر ہے، یہاں تک کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ زمین زمانہ کے گزرنے کے ساتھ اپنی وضعی حرکت کی سرعت اور تیزی میں کمی کر دے اور اس کے ایک دن کی مقدار ایک ماہ یا ایک سال یا کئی سو سال کے برابر ہو جائے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ قیامت کا دن اس طرح ہوگا، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ پچاس ہزار سال کے برابر دن، اس دنیا کے معیاروں کے ساتھ بھی کوئی عجیب و غریب چیز نہیں ہے۔

---

[1] "صبرِ جمیل" کے سلسلہ میں ہم نے تفسیر نمونہ (جلد ۵) میں یعقوب و یوسف کی داستان میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

۸۔ يَوْمَ تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ

۹۔ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ

۱۰۔ وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا ۚ

۱۱۔ يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۙ

۱۲۔ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۙ

۱۳۔ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۙ

۱۴۔ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ ۙ

۱۵۔ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۙ

۱۶۔ نَزَّاعَةً لِلشَّوَىٰ ۚ

۱۷۔ تَدْعُو مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ ۙ

۱۸۔ وَجَمَعَ فَأَوْعَىٰ

ترجمہ

۸۔ اس دن آسمان پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہو جائے گا۔

۹۔ اور پہاڑ رنگین بکھری ہوئی اون کی طرح ہو جائیں گے۔

۱۰۔ اور کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبر گیری نہیں کرے گا۔

۱۱۔ وہ انھیں دکھائے جائیں گے (لیکن ہر شخص اپنے کام میں گرفتار ہوگا) گنہگار چاہے گا کہ اس دن کے عذاب کے بدلے میں اپنی اولاد کو فدا کر دے۔

۱۲۔ اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی (کو بھی)

۱۳۔ اور اپنے اس قبیلہ کو بھی جو ہمیشہ اس کی حمایت کرتا تھا۔

۱۴۔ اور روئے زمین کے تمام لوگوں کو بھی، تاکہ وہ اس کی نجات کا سبب بن جائے۔

۱۵۔ لیکن ہرگز ایسا نہیں ہوگا، آگ کے جلانے والے شعلے ہوں گے۔

۱۶۔ جو ہاتھ پاؤں اور سر کے چمڑے کو اکھاڑ کرلے جائیں گے۔

۱۷۔ اور وہ ان لوگوں کو، جنھوں نے حکم خدا کی طرف سے روگردانی کی تھی، پکاریں گے؛

۱۸۔ اور انھیں بھی کہ جنھوں نے مال کو جمع کیا اور ذخیرہ کیا

تفسیر

وہ دن کہ جس میں کوئی مخلص دوست اپنے دوست کی خبرگیری نہیں کریگا

ان آیات میں، قیامت کے بارے میں، گزشتہ مباحث کو، مزید تشریح و توضیح کے ساتھ جاری رکھا گیا ہے، فرماتا ہے:
"اس دن آسمان پگھلی ہوئی دھات کے مانند ہو جائے گا (یوم تکون السماء کالمھل)[1]

اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کے مانند ہو جائیں گے (و تکون الجبال کالعھن)۔

"مھل" (بروزن قفل) پگھلی ہوئی دھات کے معنی میں ہے اور کبھی ایک خاص قسم کی تلچھٹ کے معنی میں ہوتا ہے جو زیتون کے تیل کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے اور یہاں وہی پہلا معنی ہی مناسب ہے، اگرچہ تشبیہ کے اعتبار سے آپس میں کوئی خاص فرق نہیں رکھتے۔

"عھن" دھنکی ہوئی رنگین اون کے معنی میں ہے۔

ہاں! اس دن آسمان ایک دوسرے سے جدا ہو کر پگھل جائیں گے اور پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے اور پھر تیز آندھی سے فضا میں بکھر جائیں گے، اس اون کی طرح جسے تیز ہوا اپنے ساتھ اڑا کرلے جاتی ہے، اور چونکہ پہاڑوں کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، اس لیے انھیں رنگین اون سے تشبیہ دی گئی ہے اور اس ویرانی کے بعد، ایک نیا عالم ایجاد ہوگا اور انسان اپنی حیات کو نئے سرے سے حاصل کرے گا۔

---

[1] "یوم" کے محل اعراب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ وہ "قریبا" سے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے بدل ہو یا ایک فعل محذوف سے متعلق ہو، مثلاً "اذکر"

جب اس جہانِ نو میں قیامت برپا ہوگی تو اس طرح سے حساب کتاب اور اعمال کی جانچ پڑتال کی کیفیت وحشت ناک ہوگی، اور ہر شخص کو اپنی ہی فکر ہوگی، کوئی دوسرے کی خبر نہیں لے گا اور کوئی گہرا اور مخلص دوست اپنے دوست کا حال نہیں پوچھے گا (ولا یسئل حمیم حمیما)[۱]

سب کے سب اپنے کام میں مشغول ہوں گے، ہر ایک کو اپنی ہی نجات کی فکر ہوگی، جیسا کہ سورۂ عبس کی آیہ ۳۷ میں آیا ہے: (لکل امرئ منهم یومئذ شأن یغنیه) اس دن ان میں سے ہر ایک اس طرح گرفتار ہوگا کہ اسے صرف اپنی ہی اپنی فکر ہوگی[۲]

ایسا نہیں ہوگا کہ دوست وہاں پر دوستوں کو پہچانیں گے نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ "ان کے دوست انہیں دکھائے جائیں گے، لیکن اس کے باوجود ہر شخص اپنی ہی مصیبت میں مبتلا ہوگا" (یبصرونهم)[۳]

مسئلہ یہ ہے کہ ہول و وحشت اس سے کہیں زیادہ ہوگی کہ کوئی دوسرے کی فکر کرسکے۔

گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے اور اس وحشت ناک منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: حالت یہ ہوگی کہ مجرم و گنہگار یہ چاہے گا کہ اپنی اولاد کو اس دن کے عذاب کے بدلے میں فدا کر دے (یود المجرم لو یفتدی من عذاب یومئذ ببنیه)۔

نہ صرف اپنی اولاد کو، بلکہ وہ یہ چاہے گا کہ "اپنی بیوی کو بھی اور اپنے بھائی کو بھی فدا کر دے (وصاحبته واخیه)۔

اور اسی بناء پر اس خاندان اور قبیلہ کو بھی جو اس سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی حمایت کیا کرتا تھا (وفصیلته التی تؤویه)۔

بلکہ تمام لوگوں کو جو روئے زمین میں ہیں، سب کو فدا کر دے تاکہ اس کی نجات ہوجائے (ومن فی الارض جمیعا

---

۱ "حمیم" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، اصل میں گرم اور جلانے والے پانی کے معنی میں ہے، اس کے بعد یہ لفظ گرم جوشی دکھانے والے مخلص اور دلی دوستوں پر بھی بولا جانے لگا۔

۲ اوپر والی آیت کے لیے اور دوسری تفاسیر بھی بیان کی گئی ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے حالات کے متعلق سوال نہیں کرے گا کیونکہ سب کی وضع و کیفیت ان کے چہرے سے عیاں ہوگی (در نگاہ عیاں است چہ حاجت بہ بیان است)! دوسری یہ کہ کوئی شخص دوسرے سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ اس کے اعمال کی ذمہ داری اٹھائے، کیونکہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے، لیکن پہلی ہی زیادہ مناسب تفسیر ہے۔

۳ باوجود اس کے کہ "حمیم" دونوں مرتبہ مفرد کی صورت میں ہے، لیکن "یبصرونهم" میں دونوں ضمیریں جمع کی صورت میں آئی ہیں، کیونکہ وہ جنس کے معنی میں ہے۔

ثم ینجیہ)۔

ان: اس دن خدا کا عذاب اتنا ہولناک ہوگا، کہ انسان یہ چاہے گا کہ وہ اپنے عزیز ترین رشتہ داروں کو ـــــــ جن کا یہاں چار گروہ (اولاد، بیویاں، بھائی اور قریبی رشتہ دار جو اس کے یار و مددگار تھے) میں ذکر کیا گیا ہے ـــــــ اپنی نجات کے لیے قربان کر دے، نہ صرف انہیں کو، بلکہ وہ تو اس بات کے لیے بھی تیار ہوگا کہ روئے زمین کے تمام انسان اس کی عذاب سے رہائی کے لیے قربان ہو جائیں۔!

"یود" "ود" کے مادہ سے (جو حب کے وزن پر ہے)۔ "تمنی" سے توأم "دوست رکھنے" کے معنی میں ہے اور بقول "راغب" ان دونوں معانی میں سے ہر ایک کے لیے (بلکہ دونوں معانی میں) بھی استعمال ہوتا ہے۔

"یفتدی" "فداء" کے مادہ سے، کوئی چیز دے کر اپنے آپ کو مصائب و مشکلات سے محفوظ کرنے کے معنی میں ہے۔

"فصیلۃ" بر معنی "عشیرہ" اس خاندان اور قبیلہ کو کہتے ہیں جس سے انسان متصل اور پیدا ہوا ہو۔

"تئویہ" "ایواء" کے مادہ سے، ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ضم کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد پناہ دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "ثم ینجیہ" کے جملہ میں "ثم" کی تعبیر یہ بتاتی ہے کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ان فدیوں اور قربانیوں کا اثر کرنا بہت بعید ہے (کیونکہ "ثم" عام طور پر، بعد، فاصلہ اور تراخی کے لیے آتا ہے)۔

لیکن ان تمام تمناؤں اور آرزوؤں کے مقابلہ میں فرماتا ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہوگا" کوئی فدیہ اور قربانی قبول نہیں کی جائے گی۔ (کلا)۔ "وہ تو آگ کے جلانے والے شعلے ہیں" (انہا لظی)۔

ہمیشہ اس کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں اور جو چیز بھی اس کے پاس یا اس کی راہ میں آتی ہے اسے جلا دیتی ہے۔ "ہاتھ، پاؤں اور سر کے چمڑے کو اکھاڑ کر اپنے ساتھ لے جاتی ہے" (نزاعۃ للشوی)۔

"لظی" آگ کے خالص شعلہ کے معنی میں ہے اور جہنم کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے، اور اوپر والی آیات میں دونوں معنی ممکن ہیں۔

"نزاعۃ" اس چیز کے معنی میں ہے جو پے در پے جدا کرتی ہے۔

اور "شوی" ہاتھ، پاؤں اور اطراف بدن کے معنی میں ہے اور بعض اوقات بریاں کرنے اور بھوننے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن یہاں وہی پہلا معنی مراد ہے، کیونکہ جس وقت جلانے والی اور شعلہ ور آگ کسی چیز کو لگتی ہے تو پہلے اس کے اطراف و جوانب اور شاخ و برگ کو جلاتی ہے اور اس سے جدا کر دیتی ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں "شوی" کی بدن کی جلد کے معنی میں، اور بعض نے سر کی جلد کے معنی میں، اور بعض نے پنڈلی کے گوشت کے معنی میں تفسیر کی ہے، اور یہ سب معانی، اس وسیع مفہوم میں جو ہم نے بیان کیا ہے، جمع ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس ساری مصیبت اور تکلیف کے باوجود موت اور مرنا درمیان میں نہیں ہے۔

کے لیے آمادگی کی ایک آسمانی دعوت ہے کہ جسے پہلے سے خود کو تیار کیے بغیر انجام دینا ممکن نہیں ہے، فرماتا ہے: "اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے" (یا ایھا المزمل)[1]

"رات کو تھوڑے سے حصہ کے سوا قیام کیا کر" (قم الّیل الّا قلیلًا)۔

"آدھی رات یا اس میں سے تھوڑا سا کم کر دے" (نصفہ او انقص منہ قلیلًا)۔

"یا آدھی رات پر کچھ اضافہ کر دے" (او زد علیہ)۔

"اور قرآن کو انتہائی غور و خوض سے اور انتہائی وضاحت و فصاحت کے ساتھ تلاوت کیا کر" (و رتل القراٰن ترتیلًا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب پیغمبرؐ ہیں لیکن "یا ایھا الرسول" اور "یا ایھا النبی" کے عنوان سے نہیں بلکہ "یا ایھا المزمل" کے عنوان سے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اپنے اوپر کپڑا لپیٹ کر گوشہ تنہائی میں بیٹھ رہنے کا دور نہیں ہے، بلکہ یہ کھڑے ہونے اور خود کو تیار کرنے اور عظیم رسالت کو انجام دینے کے لیے آمادگی کا دور ہے۔

اور اس کام کے لیے رات کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ:

اولًا دشمنوں کی آنکھ اور کان نیند کی حالت میں ہیں، اور

ثانیًا زندگی کے کاروبار بند ہیں، اور اس بناء پر انسان غور و فکر اور تربیتِ نفس کے لیے زیادہ سے زیادہ آمادگی رکھتا ہے۔

اسی طرح اس پروگرام کے لیے متن اصلی کے عنوان سے "قرآن" کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ یہ اس سلسلہ کے تمام ضروری اسباق کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور یہ ایمان کی تقویت، استقامت، تقویٰ اور پرورشِ نفوس کا بہترین وسیلہ ہے۔

"ترتیل" کی تعبیر جو اصل میں "موزوں" "تنظیم" و "ترتیب" کے معنی میں ہے اور یہاں آیاتِ قرآنی کو تأنی (ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا) ضروری نظم، حروف کی صحیح ادائیگی، الفاظ کو وضاحت کے ساتھ پڑھنا، آیات کے مفاہیم میں دقت و تأمل اور ان کے نتائج میں غور و فکر کرنا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کی اس طرح سے تلاوت انسان کو معنوی نشو و نما، اخلاقی شہامت اور تقویٰ و پرہیزگاری سرعت کے ساتھ بخش سکتی ہے اور اگر بعض مفسرین نے اس کی نماز پڑھنے کے معنی میں تفسیر کی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کا ایک اہم حصہ "تلاوتِ قرآن" ہی ہے۔

"قم اللیل" کے جملہ میں "قیام" کی تعبیر، سونے کے مقابلہ میں کھڑا ہونے کے معنی میں ہے، نہ کہ صرف پاؤں پر

---

[1] "مزمل" اصل میں "متزمل" تھا۔ "تزمل" کے مادہ سے جس کا معنی اپنے اوپر کپڑا لپیٹنا ہے اور "زمیل" جو ہم ردیف کے معنی میں ہے (وہ شخص جو کسی کے پیچھے سواری پر ہو) اور اس کے بعد رفیق اور ساتھی کے معنی میں آیا ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ وہ ارتباط اور قریبی تعلق رکھتا ہے۔

کھڑا ہونے کے معنی میں ہے ۔

لیکن ان آیات میں " شب زندہ داری " کی مقدار کے بارے میں جو مختلف تعبیریں آئی ہیں ، وہ حقیقت میں " اختیار " کو بیان کرنے کے لیے ہیں ، اور وہ پیغمبر کو یہ اختیار دیتی ہیں کہ آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ بیدار رہیں اور قرآن کی تلاوت کریں ۔ پہلے مرحلہ میں " ساری رات " سوائے تھوڑی سی مقدار کے ذکر کرتا ہے ، اور اس کے بعد اس میں تخفیف کرکے آدھی رات تک پہنچاتا ہے ، اور اس کے بعد آدھے سے بھی کم ۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے " دو تہائی " " آدھی " اور " ایک تہائی " رات کے درمیان تخییر مراد ہے ۔ اس آیت کے قرینہ سے جو اسی سورہ کے آخر میں آئے گی جس میں فرماتا ہے : (ان ربك یعلم انك تقوم ادنٰی من ثلثی الیل و نصفه و ثلثه)

ضمنی طور پر سورہ کے آخر کی اسی آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اس رات کے قیام میں اکیلے نہیں تھے ، بلکہ مومنین کا ایک گروہ بھی اس خود سازی و تربیتی اور آمادگی کے پروگرام میں پیغمبر کے ساتھ تھا اور انھوں نے اس راہ میں آپ کو ایک اسوہ اور نمونہ کے طور پر قبول کیا ہوا تھا ۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ " قم الیل الا قلیلاً " کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ بعض راتوں کے سوا تمام راتوں میں قیام کیا کر ، اور اس طرح سے استثناء رات کے حصول میں نہیں ہے ، بلکہ راتوں کے افراد میں ہے ۔ لیکن یہ تفسیر " " کے مفرد ہونے اور " نصف " (آدھی) اور اس سے کمتر کی تعبیر کے ساتھ درست نظر نہیں آتی ۔

اس کے بعد اس سخت اور اہم حکم کے " جعف تہائی " اور " مقصد اصلی " کو اس طرح بیان کرتا ہے : ہم عنقریب ایک سخت بات تجھ کو القاء کریں گے " (انا سنلقی علیك قولاً ثقیلاً) ۔

اگرچہ مفسرین " قول ثقیل " کے بارے میں الگ الگ بیان رکھتے ہیں ، جو مسئلہ کے ایک ہی پہلو کو پیش کرتے ہیں ، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قول کا سنگین ہونا ، جس سے بلاشک و شبہ قرآن مجید مراد ہے ، مختلف پہلوؤں سے ہے ۔

آیات کے مفہوم اور مطالب کے لحاظ سے سنگین ۔

دلوں پر تحمل کے لحاظ سے سنگین ، یہاں تک کہ خود قرآن کہتا ہے : لو انزلنا هٰذا القرآن علی جبل لرأیته خاشعاً متصدعاً من خشیة الله ؛ " اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کرتے ، تو تو اسے خاشع اور شگافتہ دیکھتا (حشر ــــ ۲۱)

وعدوں اور وعیدوں ، ذمہ داریوں اور مسؤلیتوں کے بیان کے لحاظ سے سنگین ۔

تبلیغ اور دعوت کی راہ کی مشکلات کے لحاظ سے سنگین ۔

ترازوئے عمل اور عرصۂ قیامت میں سنگین

اور آخر میں پروگرام پیش کرنے اور اس کے مکمل اجراء کے لحاظ سے سنگین ۔

ہاں ! اگرچہ قرآن کا پڑھنا سہل و آسان اور زیادہ دلنشیں ہے لیکن اس کے مفاد اور معانی کو عمل میں لانا اسی نسبت سے سنگین اور مشکل ہے

۲۷۔ اور وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔
۲۸۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو پروردگار کے عذاب سے ہرگز امان میں نہیں سمجھتے۔

تفسیر

شائستہ انسانوں کے اوصاف

قیامت کے عذابوں کے ایک گوشہ کا ذکر کرنے کے بعد، بے ایمان افراد کے اوصاف اور ان کے مقابلہ میں سچے مومنین کے اوصاف بیان کرتا ہے، تاکہ معلوم ہو جائے کہ ایک گروہ اہلِ عذاب کیوں ہے اور ایک گروہ اہلِ نجات کیوں ہے؟

پہلے فرماتا ہے: "انسان حریص اور کم طاقت پیدا کیا گیا ہے" (ان الانسان خلق هلوعًا)۔

جب اسے کوئی برائی پہنچے تو جزع و فزع اور بیتابی کرتا ہے (اذا مسه الشر جزوعًا)۔

اور جب اسے کوئی بھلائی پہنچے تو دوسروں سے دریغ کرتا ہے (اور روکتا ہے)۔ (واذا مسه الخیر منوعًا)۔

بہت سے مفسرین اور اربابِ لغت نے "هلوع" کا معنی حریص کیا ہے اور ایک گروہ نے اس کی "کم طاقت" کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ پہلی تفسیر کی بناء پر یہاں اس قسم کے انسانوں کے وجود میں تین منفی اخلاقی شکلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے "حرص" و "جزع" و "بخل" ، کیونکہ دوسری اور تیسری آیت "هلوع" کے معنی کی تفسیر ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس لفظ میں دونوں معانی اکٹھے مراد ہوں، کیونکہ یہ دونوں صفات ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں، حریص افراد عام طور پر بخیل ہوتے ہیں اور بڑے حوادث میں کم تحمل ہوتے ہیں اور اس کا عکس بھی صادق اور سچا ہے۔

یہاں ایک یا کئی سوالات سامنے آتے ہیں، کہ اگر خدا نے انسان کو سعادت و کمال کے لیے پیدا کیا ہے، تو پھر اس کی طبیعت میں شر اور بدی کو کیوں قرار دیا ہے؟

اور پھر یہ بات بھی ہے، کہ اگر خدا کسی چیز کو، کسی صفت کے ساتھ پیدا کرے، تو کیا یہ ممکن ہے کہ پھر اپنی خلقت کی مذمت بھی کرے؟

اور ان تمام باتوں سے قطع نظر، قرآن سورہ "تین کی آیہ ۴ میں صراحت کے ساتھ کہتا ہے: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم "ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت اور ساخت میں پیدا کیا ہے"۔

مسلم طور پر اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان کا ظاہر تو اچھا ہے لیکن اس کا باطن قبیح اور بُرا ہے، بلکہ انسان کی تمام کی تمام خلقت "احسن تقویم" کی صورت میں ہے۔ اسی طرح وہ دوسری آیات جو انسان کے بلند مقام کی تعریف کرتی ہیں، تو یہ سب کی سب آیات زیرِ بحث آیت کے ساتھ کس طرح سازگار ہیں؟

ان تمام سوالات کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے انسان میں ایسی قوتیں، طرز اور صفات خلق فرمائی ہیں، جو اس کے تکامل و ارتقاء اور سعادت کا بالقوہ ذریعہ شمار ہوتی ہیں۔ اس بناء پر مذکورہ صفات و طرز ذاتی طور پر بُری نہیں ہیں، بلکہ کمال کا وسیلہ اور ذریعہ ہیں، لیکن جب یہی صفات انحرافی راہ اختیار کریں اور ان سے سوء استفادہ ہونے لگے، تو نکبت، بدبختی اور شر و فساد کا سبب بن جاتی ہیں۔

مثلاً یہ حرص ایک ایسی قوت ہے جو انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ جلد ہی سعی و کوشش سے رُک جائے اور کسی نعمت تک پہنچ کر سیر ہو جائے۔ یہ تو ایک بھڑکی ہوئی پیاس ہے، جو انسان کے وجود پر مسلط ہے۔ اگر یہی صفت تحصیل علم و دانش کی راہ میں استعمال ہو اور انسان علم کے حصول میں حریص ہو جائے یا دوسرے لفظوں میں علم کا پیاسا اور عاشق بے قرار ہو جائے تو مسلم طور پر یہ بات، اس کے کمال کا سبب بنے گی، لیکن اگر وہ مادیات کی راہ میں استعمال ہونے لگے، تو پھر شر و بدبختی اور بخل کا سبب بنے گی۔

دوسرے لفظوں میں، یہ صفت حبِ ذات کی ایک شاخ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ حبِ ذات ایک ایسی چیز ہے، جو انسان کو کمال کی طرف لے جاتی ہے، لیکن اگر یہ انحرافی راہ پر پڑ جائے تو انحصار طلبی (خود غرضی)، بخل و حسد وغیرہ کی طرف لے جاتی ہے۔

دوسرے مواہب کے بارے میں بھی مطلب اسی طرح سے ہے، خداوند تعالیٰ نے ایٹم کے اندر ایک عظیم قدرت پیدا کی ہے، جو مسلم طور پر مفید اور سودمند ہے لیکن اگر ایٹم کی اس اندرونی قوت سے سوء استفادہ ہونے لگے اور اس سے ویران و تباہ کرنے والے ایٹم بم بنائے جانے لگیں، نہ کہ بجلی کے پاور ہاؤس اور دوسری صنعتوں کے وسائل، تو پھر یہی شر و فساد کا سبب بن جائے گا۔

اوپر والے بیان کی طرف توجہ کرتے ہوئے، ان تمام آیات کے معانی و مطالب کو ——— جو قرآن مجید میں انسان کے بارے میں آئی ہیں ——— جمع کیا جا سکتا ہے[1]

اس کے بعد شائستہ اور لائق انسانوں کا بیان ——— ایک استثنائی صورت میں ——— نو (۹) عمدہ صفات کے ضمن میں پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مگر نماز پڑھنے والے" (الا المصلین)۔

وہی نماز گزار جو اپنی نمازوں کو دوام بخشتے ہیں (الذین ھم علیٰ صلاتھم دائمون)۔

---

[1] ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۵ کے ص ۹۶ تا ۹۸ پر "انسان در قرآن مجید" کے عنوان کے تحت (یونس آیہ ۱۲ کے ذیل میں)، ایک اور وضاحت بھی کی ہے۔

بیان کی پہلی خصوصیت ہے، جو خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں مسلسل اور دائمی طور پر ارتباط رکھتے ہیں اور یہ ارتباط نماز کے ذریعے پیدا ہوتا ہے وہ نماز جو انسان کو فحشاء و منکر سے روکتی ہے، وہ نماز جو انسان کی روح اور جان کی پرورش کرتی ہے، اور اس کو ہمیشہ خدا کی یاد دلاتی رہتی ہے اور یہ مسلسل اور دائمی توجہ، غفلت و غرور اور دنیا کے شہوات میں ڈوب جانے، اور شیطان اور ہوائے نفس کے چنگل میں اسیر ہونے سے باز رکھتی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نماز پر مداومت سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ حالتِ نماز میں رہیں، بلکہ مراد یہ ہے، کہ وہ معین اوقات میں نماز کو انجام دیتے ہیں۔

اصولی طور پر ہر کارِ خیر اسی وقت انسان میں مثبت اثر کرتا ہے، جب کہ اس کی مداومت ہو، اور اسی لیے پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

ان احب الاعمال الی الله ما دام و ان قل

خدا کے ہاں محبوب ترین عمل وہ ہے کہ جس میں مداومت ہو چاہے وہ کم ہی کیوں نہ ہو۔[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے یہ آیا ہے کہ: "اس سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی انسان نوافل میں سے کوئی چیز اپنے اوپر فرض کرے تو ہمیشہ اس کی مداومت کرتا ہے"۔[2]

ایک اور حدیث میں اسی امام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یہ آیت نافلہ کی طرف اشارہ ہے اور آیہ والذین هم علی صلاتهم یحافظون)
(جو کچھ آیات کے بعد آئے گی) نمازِ فریضہ کو بیان کرتی ہے۔[3]

یہ فرق ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ محافظت کی تعبیر تو واجب نمازوں کے ساتھ مناسب ہے اور انھیں خاص طور پر معین اوقات میں ہی انجام دینا چاہیے۔ باقی رہی دام کی تعبیر تو یہ مستحب نمازوں کے ساتھ مناسب ہے، کیونکہ انسان انھیں انجام بھی دے سکتا ہے اور کبھی چھوڑ بھی سکتا ہے۔

بہرحال نماز کے ذکر کے بعد ـــــ جو بہترین عمل اور مومنین کی بہترین حالت ہے ـــــ ان کی دوسری خصوصیت پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ لوگ کہ جن کے اموال میں ایک حق معلوم ہے" (والذین فی اموالهم حق معلوم)۔

سوال کرنے والوں اور محروموں کے لیے" (للسائل والمحروم)۔

---

[1] المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث، جلد ۲ ص ۱۶۰ (مادہ دوام)

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۱۵

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۱۶

اس طرح سے وہ خالق سے اپنے ارتباط کی بھی حفاظت کرتے ہیں، اور مخلوقِ خدا کے ساتھ بھی اپنے رشتہ اور تعلق کو برقرار رکھتے ہیں۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں "حق معلوم" سے مراد یہی "زکات" ہے۔ جس کی ایک مقدار معین ہے اس کے مصارف میں سے "سائل" اور "محروم" ہیں، جبکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ سورہ مکی ہے، اور زکوٰۃ کا حکم مکہ میں نازل نہیں ہوا تھا یا اگر نازل ہوا تھا تو اس کی کوئی مقدار معین نہیں تھی، لہٰذا بعض دوسروں کا نظریہ یہ ہے کہ "حق معلوم" سے مراد زکات کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، جسے انسان اپنے اوپر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ حاجت مندوں کو دے گا۔ اس تفسیر کا شاہد و گواہ وہ حدیث ہے جو امام صادقؑ سے نقل ہوئی ہے، کہ جس وقت لوگوں نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا کہ کیا وہ زکات کے علاوہ کوئی چیز ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

"هوالرجل يؤتيه الله الثروة من المال فيخرج منه الالف والالفين والثلاثة آلاف والاقل والاكثر، فيصل به رحمه، ويحمل به الكل عن قومه"

ہاں! یہ اس شخص کے بارے میں ہے، جسے خدا مال و ثروت عطا فرماتا ہے، اور وہ اس میں سے ایک ہزار، دو ہزار اور تین ہزار یا اس سے زیادہ یا کم الگ کر دیتا ہے اور اس سے صلہ رحمی کرتا ہے، اور اس کے ذریعے اپنی قوم سے مشقت اور بوجھ کو اٹھا لیتا ہے[1]

"سائل" اور "محروم" کے درمیان فرق یہ ہے کہ سائل تو اس شخص کو کہتے ہیں، جو اپنی حاجت پیش کر کے تقاضا اور سوال کرتا ہے اور "محروم" وہ شخص ہے جسے شرم و حیا، سوال و تقاضا کرنے سے مانع ہوتی ہے، اور ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"محروم" وہ شخص ہے جو کسب و کار میں زحمت و تکلیف اٹھاتا ہے لیکن اس کی زندگی پیچیدہ ہو گئی ہے[2]

مذکورہ حق کی مزید تشریح اور "سائل" و "محروم" کی تفسیر، تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ ص ۲۷۵ میں آچکی ہے۔ (ذاریات آیہ ۱۹ کے ذیل میں)۔

بہر حال اس کام کا انجام دینا ایک طرف تو اجتماعی اثر رکھتا ہے اور فقر و فاقہ اور محرومیت کے ساتھ مبارزہ کرتا ہے، اور دوسری طرف ان لوگوں پر جو اس پر عمل کرتے ہیں، اخلاقی اثر چھوڑتا ہے اور ان کے دل و جان کو حرص و بخل اور دنیا پرستی سے پاک کرتا ہے۔

بعد والی آیت ان کی تیسری خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "وہ لوگ جو روز جزا پر ایمان رکھتے ہیں"۔ (والذين يصدقون بيوم الدين)۔

اور چوتھی خصوصیت میں کہتا ہے: "اور وہ لوگ جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے ہیں" (والذين هم من

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۱۷ (حدیث ۲۵ - ۲۷)

[2] ایضاً

عذاب ربھم مشفقون)۔

"کیونکہ وہ کسی شخص کو پروردگار کے عذاب سے امان میں نہیں سمجھتے" (ان عذاب ربھم غیر مامون)۔

وہ ایک طرف تو روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں، اور "یصدقون" کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو فعل مضارع ہے اور استمرار پر دلالت کرتا ہے، وہ ہمیشہ اس بات پر توجہ رکھتے ہیں کہ حساب و کتاب اور جزا و سزا سے واسطہ پڑے گا۔

بعض مفسرین نے اس کی "تصدیقِ عملی" کے معنی میں، یعنی انجام وظائف اور ترکِ محرمات سے تفسیر کی ہے، لیکن آیت کا ظاہر مطلق ہے جو علمی اور عملی دونوں تصدیقوں کو شامل ہے۔

لیکن چونکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص روزِ جزا پر ایمان تو رکھتا ہو، لیکن وہ اپنے آپ کو سزا کا مشمول نہ سمجھتا ہو، اس لیے کہتا ہے: وہ ہرگز اپنے آپ کو امان میں نہیں سمجھتے۔ یعنی وہ ہمیشہ بازپرس کا احساس رکھتے ہیں۔ اپنے حسنات اور نیکیوں کو ناچیز اور اپنی برائیوں کو بڑا شمار کرتے ہیں۔ اسی لیے ایک حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے آیا ہے کہ آپ نے اپنے فرزند کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

خف اللہ خوفاً انك لو اتيته بحسنات اهل الارض لم يقبلها منك و
ارج اللہ رجاءً انك لو اتيته بسيئات اهل الارض غفرها لك،

اے میرے فرزند! تو خدا سے اس طرح خائف رہ کہ اگر تو روئے زمین کے لوگوں کی نیکیاں لے کر بھی آئے تو بھی یہ احتمال دے کہ (شاید) خدا تجھ سے قبول نہ کرے، اور اس طرح اس سے امیدوار رہ کہ اگر تو تمام اہلِ زمین کے گناہ بھی رکھتا ہو تو بھی یہ احتمال دے کہ وہ تجھے بخش دے۔[1]

یہاں تک کہ خود پیغمبر یہ فرمایا کرتے تھے:

لن يدخل الجنة احدًا عمله قالوا ولا انت يا رسول اللہ؟ قال ولا انا، الا ان يتغمدني اللہ برحمته!

"کوئی شخص اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل نہیں ہوگا، لوگوں نے عرض کیا اے رسولِ خدا کیا آپ بھی؟ فرمایا: ہاں! میں بھی اسی طرح ہوں مگر یہ کہ خدا کی رحمت میرے شاملِ حال ہو"

---

[1] جامع الاخبار، ص ۱۱۲

۲۹۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝

۳۰۔ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝

۳۱۔ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝

۳۲۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝

۳۳۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝

۳۴۔ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝

۳۵۔ اُولٰٓئِكَ فِىْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۹۔ اور وہ لوگ جو اپنے دامن کو بے عفتی سے محفوظ رکھتے ہیں۔

۳۰۔ اور اپنی بیویوں اور کنیزوں کے سوا (جو بیویوں کے حکم میں ہیں) وہ کسی سے جنسی آمیزش نہیں رکھتے، اور ان سے بہرہ مند ہونے پر ان کی کوئی ملامت نہیں ہوگی۔

۳۱۔ اور جو شخص اس سے زیادہ طلب کرے تو وہ تجاوز کرنے والا ہے۔

۳۲۔ اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد کی رعایت کرتے ہیں۔

۳۳۔ اور وہ لوگ جو شہادتِ حق کے ادا کرنے کے لیے قیام کرتے ہیں۔

۳۴۔ اور وہ لوگ جو نماز کو پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔

۳۵۔ یہی لوگ جنت کے باغات میں عزت و تکریم سے رہیں گے۔

تفسیر

بہشتیوں کی خصوصیات کا ایک اور حصّہ

گزشتہ آیات میں مومنین اور ان لوگوں کی، جو قیامت میں اہل جنت ہوں گے، مخصوص اوصاف میں سے چار صفات کا بیان ہوا تھا اور ان آیات میں دوسری پانچ صفات کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو مجموعی طور پر نو صفات ہو جاتی ہیں۔

پہلی توصیف کے بارے میں فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی عفت[1] کی حفاظت کرتے ہیں" (والذین ھم لفروجھم حافظون)۔

"مگر اپنی بیویوں اور کنیزوں کی نسبت، جن سے فائدہ اٹھانے میں انھیں کسی قسم کی ملامت اور سرزنش نہیں ہے (الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ خواہش جنسی، انسان کی سرکش خواہشات میں سے ہے اور بہت سے گناہوں کا سرچشمہ ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ تمام اہم جرائم کے اعمال ناموں میں، اسی خواہش کا اثر نظر آتا ہے، اس لیے اس پر کنٹرول کرنا اور اس کے حدود کی حفاظت کرنا، تقویٰ و پرہیزگاری کی اہم نشانیوں میں سے ہے، اسی بناء پر نماز، ضرورت مندوں کی مدد، قیامت کے دن پر ایمان اور عذاب الٰہی سے خوف کے ذکر کے بعد، اسی خواہش پر کنٹرول کا ذکر ہوا ہے۔

وہ استثناء جو اس کے ذیل میں بیان ہوا ہے، وہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام کی ہرگز یہ منطق نہیں ہے کہ یہ غریزہ اور خواہش کلی طور پر محو اور نابود ہو جائے اور کوئی شخص راہبوں اور پادریوں کی طرح قانونِ خلقت کے برخلاف قدم اٹھائے، کیونکہ یہ عمل غالباً غیر ممکن ہے اور یہ فرض امکان غیر منطقی ہے، اسی لیے راہب بھی اس خواہش کو زندگی کے منظر سے حذف نہیں کر سکے اور اگر وہ رسمی طور پر شادی بیاہ نہیں کرتے، تو ان میں سے بہت سے "چون بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند" (جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو پھر دوسرا ہی کام کرتے ہیں)۔

اور اس طریقہ سے جو رسوائیاں ہوئی ہیں وہ کم نہیں ہیں، جیسی مورخین "ویل دورانت" وغیرہ نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔

"ازدواج" کی تعبیر دائمی اور موقت دونوں بیویوں کے لیے استعمال ہوتی ہے اور یہ جو بعض نے گمان کیا ہے کہ یہ آیت "ازدواج موقت (متعہ) کی نفی کرتی ہے، اس بناء پر ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ (عقد متعہ) بھی ازدواج (شادی) کی ایک قسم ہے۔

بعد والی آیت میں اس موضوع پر مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: "اور جو لوگ اس کے علاوہ طلب کریں وہ تجاوز کرنے والے، اور خدائی حدود سے خارج ہیں" (فمن ابتغٰی وراء ذالک فاولئک ھم العادون)۔

---

[1] "فروج" "فرج" کی جمع ہے۔ عضو تناسل کی طرف کنایہ ہے۔

اور اس طرح سے اسلام ایک ایسے معاشرے کی داغ بیل ڈالتا ہے کہ جس میں فطری غرائز و خواہشات کا جواب بھی مل سکے اور فحشا و فساد جنسی اور اس سے پیدا ہونے والے مفاسد سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔

البتہ کنیزیں اسلام کے نقطۂ نظر سے بیوی کے بہت سے شرائط اور قانونی ضابطوں کی حامل ہیں، اگرچہ ہمارے زمانے میں ان کا موضوع نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس کے بعد ان کے دوسرے اور تیسرے اوصاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، "وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی رعایت کرتے ہیں" (والذین ھم لاماناتھم و عھدھم راعون)۔

البتہ "امانت" کا ایک وسیع معنی ہے، جو صرف لوگوں کی ہر قسم کی مادی امانتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے نہیں ہے، بلکہ خدا، پیغمبروں اور ائمہ معصومین کی امانتوں کو بھی شامل ہے۔

خدا کی نعمتوں میں سے ہر نعمت اس کی ایک امانت ہے، اجتماعی مناصب خصوصاً حکومت کا منصب اہم ترین امانتوں میں سے ہے، اسی لیے امام باقرؑ اور امام صادقؑ کی مشہور حدیث میں آیۂ "ان اللہ یأمرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا" کی تفسیر میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ "ولایت و حکومت کو اس کے اہل کے سپرد کرو"۔[1]

سورۂ احزاب کی آیہ ۷۲ میں بھی یہ آیا ہے کہ تکلیف و مسئولیت (فرائض و واجبات) کا مسئلہ، خدا کی ایک عظیم امانت ہے: (انا عرضنا الامانۃ علی السماوات والارض) اور سب سے اہم ترین، خدا کا دین و آئین اور اس کی کتاب قرآن، اس کی عظیم امانت ہے، جس کی حفاظت کی کوشش کرنا چاہیے۔

"عھد" بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، جو لوگوں کے عہد اور پیمانوں کو بھی شامل ہے اور خدا کے عہد اور پیمانوں کو بھی۔ کیونکہ "عہد" ہر وہ اقرار اور وعدہ ہے جو انسان دوسرے کے ساتھ کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاتا ہے، تو اس نے اس ایمان کے ساتھ ہی بہت وسیع ذمہ داریوں کو قبول کر لیا ہے۔

اسلام میں امانت کی حفاظت اور معاہدوں کا پابند ہونے کو بہت ہی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور اسے اسلام کی اہم ترین نشانیوں میں سے بتایا گیا ہے۔

ہم اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۲ سورۂ نساء کی آیہ ۵۸ کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

چوتھی صفت کے بارے میں مزید کہتا ہے، "وہ لوگ جو شہادتِ حق کی ادائیگی کے لیے قیام کرتے ہیں" (والذین ھم بشھاداتھم قائمون)۔

کیونکہ عادلانہ شہادت کو قائم کرنا اور اس کو نہ چھپانا انسانی معاشرے میں قیام عدالت کی اہم ترین بنیادوں میں سے ہے۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۱ ص ۳۸۰

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں، کہ ہم کسی کے خلاف گواہی دے کر ان کی عداوت و دشمنی مول کیوں لیں، اور اپنے لیے درد سر کیوں پیدا کریں، ایسے لوگ حقوق انسانی کی طرف سے بے اعتنا، روح اجتماعی کے فاقد اور اجرائے عدالت کے سلسلہ میں غیر ذمہ دار ہوتے ہیں۔

اسی لیے قرآن نے مسلمانوں کو کئی آیات میں شہادتِ حق کی دعوت دی ہے اور شہادت کے چھپانے کو گناہ قرار دیا ہے[1] فقہ اسلامی میں بھی شہادت ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، اور بہت سے انفرادی اور اجتماعی حقوق کے اثبات کے لیے بنیاد شمار ہوتی ہے، اور اس کے لیے خاص احکام ہیں۔

آخری صفت میں جو حقیقت میں اس مجموعہ صفات کی نویں صفت ہے، پھر دوبارہ نماز کے مسئلہ کی طرف لوٹتا ہے، جیسا کہ ان کا آغاز بھی نماز ہی سے ہوا تھا، فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں (والذین ھم علٰی صلاتھم یحافظون)۔

اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں، بعض قرآن کی طرف توجہ کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "نماز" "واجب نماز" کی طرف اشارہ ہے اور گزشتہ آیت میں "نماز نافلہ" کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ پہلی صفت میں، نماز کے ہمیشہ قائم رکھنے کی طرف اشارہ تھا، لیکن یہاں اس کے آداب و شرائط، ارکان و خصوصیات کی حفاظت کے متعلق گفتگو ہے، ایسے آداب جو نماز کے ظاہر کو بھی اس چیز سے کہ جو باعثِ فساد ہے، محفوظ رکھتے ہیں اور روح نماز کو بھی، جو حضورِ قلب ہے۔ تقویت دیتے ہیں اور اخلاقی رکاوٹوں کو بھی جو اس کی قبولیت کی راہ میں مانع ہوتے ہیں، دور کر دیتے ہیں، تو اس بناء پر یہ ہرگز تکرار شمار نہیں ہوگا۔

یہ آغاز و اختتام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے، کہ ان تمام اوصاف میں، نماز کی طرف توجہ، ان سب سے زیادہ برتر اور سب سے زیادہ اہم ہے، ایسا کیوں نہ ہو، جبکہ "نماز تربیت کا عالی مکتب" اور تہذیب نفوس اور معاشرہ کی پاکیزگی کا اہم ترین وسیلہ ہے۔

اور اس گفتگو کے آخر میں، ان اوصاف والوں کی اصلی راہ کو بیان کرتا ہے، جیسا کہ گزشتہ آیات میں مجرموں کی اصلی راہ کی تشریح کی تھی یہاں ایک مختصر اور پرمعنی جملہ میں فرماتا ہے: "وہ لوگ جو ان اوصاف کے حامل ہیں، ان کا ٹھکانا جنت کے باغات میں اور انھیں ہر لحاظ سے عزت و احترام سے رکھا جائے گا۔ (اولئک فی جنات مکرمون)[2]

وہ محترم اور معزز کیوں نہ ہوں؟ جبکہ وہ خدا کے مہمان ہیں اور خدائے قادر و رحمن نے، تمام ضروری وسائل ان کے لیے فراہم کر دیئے ہیں، اور حقیقت میں یہ دونوں تعبیریں ("جنات" و "مکرمون") مادی و معنوی دونوں قسم کی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس گروہ کے شاملِ حال ہوں گی۔

---

[1] بقرہ ۲۸۲ - ۱۴۰ مائدہ ۱۰۶ و طلاق ۲

[2] "فی جنات"، "اولئک" کی خبر ہے اور "مکرمون" دوسری خبر ہے یا یہ کہ "مکرمون" خبر ہے اور "فی جنات" اس سے متعلق ہے (غور کیجیے)

۳۶۔ فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۝

۳۷۔ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝

۳۸۔ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۝

۳۹۔ كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

۴۰۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝

۴۱۔ عَلٰٓي اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ ان کفار کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں۔

۳۷۔ دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی (جنت کی طمع ہے)۔

۳۸۔ کیا ان میں سے ہر ایک کو یہ طمع ہے کہ وہ اللہ کی نعمتوں والی جنت میں داخل ہو جائے۔

۳۹۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، ہم نے انھیں اس چیز سے پیدا کیا ہے، جس کا انھیں خود علم ہے۔

۴۰۔ مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم، ہم اس بات پر قادر ہیں۔

۴۱۔ کہ ہم ان کی جگہ ایسے لوگوں کو دے دیں، جو ان سے بہتر ہیں اور ہم ہرگز مغلوب نہیں ہوں گے۔

تفسیر

کس منہ سے جنت کی طمع؟

اس سورہ کی گزشتہ آیات میں، مومنین اور کفار کی نشانیوں اور ان دونوں گروہوں کی سرنوشت کے بارے میں مختلف مباحث آئے ہیں، اوپر والی آیات میں پھر کفار کی وضع و کیفیت اور مقدسات اسلام کے بارے میں ان کے استہزاء اور تمسخر کی تفصیل کی طرف لوٹتا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آیات مشرکین کے ان گروہوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں، اس وقت جبکہ پیغمبر معاد کی آیات کو

مسلمانوں کے سامنے پڑھتے تھے، تو وہ ہر گوشہ و کنار سے آجاتے تھے اور یہ کہتے تھے، کہ اگر معاد ہوئی تو ہماری وضع و کیفیت اس عالم میں بھی، ان افراد سے جو محمد پر ایمان لائے ہیں، بہتر ہوگی، جیسا کہ اس دنیا میں بھی ہماری وضع و کیفیت ان سے بہتر ہے۔

قرآن ان کے جواب میں اس طرح کہتا ہے،

" ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے، جو سرعت کے ساتھ تیرے پاس آتے ہیں۔ (فمال الذین کفروا قبلک مھطعین)۔

دائیں طرف سے بھی اور بائیں طرف سے بھی گروہ در گروہ آتے ہیں اور جنت کی طمع رکھتے ہیں"۔ (عن الیمین و عن الشمال عزین)۔

"کیا ان میں سے ہر ایک یہ طمع رکھتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں والی جنت میں داخل ہو جائے گا" (ایطمع کل امرئ منھم ان یدخل جنة نعیم)۔

یہ کون سے ایمان اور کون سے عمل کی بناء پر اپنے لیے اس قسم کی شائستگی اور لیاقت کے قائل ہیں؟!

" مھطعین" "مھطع" کی جمع ہے جو اس شخص کے معنی میں ہے، جو گردن اٹھا کر تیزی کے ساتھ چلتا ہے اور کسی چیز کی جستجو میں ہوتا ہے اور کبھی صرف خبر معلوم کرنے کے لیے گردن اٹھانے کے معنی میں آتا ہے۔

"عزین" "عزۃ" (بروزن ہبہ) کی جمع ہے، جو پراگندہ جماعتوں اور گروہوں کے معنی میں ہے اور اس کا ریشہ اور اصلی جڑ " عزو" (بروزن جذب) نسبت دینے کے معنی میں ہے اور چونکہ وہ گروہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے ساتھ نسبت اور ارتباط رکھتے ہیں، یا ان کا ہدف اور مقصد ایک ہی ہوتا ہے لہٰذا جماعت اور گروہ کو "عزہ" کہا گیا ہے۔

بہر حال خود غرض اور خود پرست مشرکین اس قسم کے بہت سے بے بنیاد دعوے رکھتے تھے اور اپنی مادی زندگی کے مرفہ اور خوشحال ہونے کو ـــــ جو عموماً ناجائز اور لوٹ مار وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتی تھی، خدا کی بارگاہ میں اپنے مقام کی بلندی اور پروردگار کے نزدیک اپنی محبوبیت کی دلیل سمجھتے تھے، اور اس کے بعد ایک بے معنی موازنہ کے ساتھ قیامت میں اپنے لیے بلند مقامات کے قائل تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ "معاد" پر اس طرح سے جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے، عقیدہ نہیں رکھتے تھے، لیکن کبھی کبھی احتمال کی بناء پر معاد پر بحث کیا کرتے تھے کہ اگر ایسا ہوا تو ہم اس دوسرے جہان میں اس طرح اور ایسے ہوں گے، شاید وہ یہ بات استہزاء اور تمسخر کے طور پر بھی کہتے تھے۔

یہاں قرآن ان کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ وہ بہشت میں داخل ہو جائیں، کیونکہ ہم نے انھیں جس چیز سے پیدا کیا ہے، اس کا انھیں خود علم ہے"۔ (کلا انا خلقناھم مما یعلمون)۔

درحقیقت خدا یہ چاہتا ہے کہ پہلے تو اس جملہ کے ذریعہ ان کا غرور اور تکبر توڑ دے، کیونکہ وہ کہتا ہے: "تم خود اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم نے تمھیں کس چیز سے پیدا کیا ہے"؟ ایک بے قدر وقیمت نطفہ سے، ایک گندے اور پست پانی سے، تو پھر یہ اتنا غرور و نخوت کس بناء پر ہے؟۔

دوسرے معاد کا مذاق اڑانے والوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر تم معاد و قیامت کے بارے میں شک رکھتے ہو، تو جاؤ اور نطفہ کی حالت کی تحقیق کرو اور دیکھو کہ ہم ایک بے قدر وقیمت پانی کے قطرے سے کس طرح ایک نیا اور عمدہ وجود پیدا کر دیتے ہیں، جو جنین کی صورت میں ہر روز ایک نئی خلقت اختیار کرتا ہے۔

تو کیا نطفہ سے انسان کو پیدا کرنے والا، اس بات پر قادر نہیں ہے، کہ وہ مٹی ہو جانے کے بعد، انسان کے بدن پر لباسِ حیات پہنا دے۔

"تیسرے" یہ لوگ کس طرح جنت کی طمع رکھتے ہیں، جبکہ وہ اپنے صحیفۂ اعمال میں اس قدر اعمال گناہ رکھتے ہیں، کیونکہ وہ موجود جو ایک بے قدر وقیمت نطفہ سے پیدا ہوا ہے، مادی لحاظ سے تو کوئی شرافت وعظمت نہیں رکھتا، اگر کوئی شرف ہے تو وہ ایمان اور عملِ صالح کی وجہ سے ہے اور وہ ان کے پاس نہیں ہے، تو پھر یہ لوگ کس طرح توقع رکھتے ہیں کہ وہ جنت کے باغوں میں قدم رکھیں گے[1]

اس کے بعد اس مطلب کی تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم ہم اس بات پر قادر ہیں ...." (فلا اقسم برب المشارق والمغارب انا لقادرون)۔

"کہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہیں، اور ہم ہرگز بھی اس کام میں مغلوب نہیں ہوں گے" (علیٰ ان نبدل خیرًا منهم وما نحن بمسبوقین)۔

یہ جملہ ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہم نہ صرف اس بات پر قادر ہیں کہ انھیں مٹی ہو جانے کے بعد نئی زندگی اور حیات کی طرف پلٹا دیں، بلکہ ہم انھیں ایک زیادہ کامل اور بہتر موجودات میں بھی تبدیل کر سکتے ہیں، اور اس کام میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

اس طرح سے اوپر والی تعبیر قیامت کی بحث کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ ہمارے لیے کوئی مانع نہیں ہے کہ ہم تمھیں تمھارے کیفرِ کردار کی بناء پر نابود کریں اور شائستہ، آگاہ اور مومن افراد کو تمھارا جانشین بنا دیں، تاکہ وہ ہمارے پیغمبر کے یار و مددگار ہوں، ہمیں اس کام سے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔

اس بناء پر اگر ہم تم سے یہ اصرار کرتے ہیں کہ تم ایمان لے آؤ، تو وہ کسی حاجت یا عجز کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ بشر کے لیے

---

[1] اوپر والی آیت کی تفسیر میں دوسرے احتمال بھی دیئے گئے ہیں، منجملہ ان کے یہ ہے کہ "مما یعلمون" کے جملے سے مراد یہ ہے کہ ہم نے انھیں عقل و شعور کے ساتھ پیدا کیا ہے، نہ کہ حیوانات اور بہائم کی طرح، اس بناء پر وہ اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے جس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے انھیں ایسے اہداف و مقاصد کے لیے جنھیں وہ خود جانتے ہیں۔ یعنی انھیں فرائض کی ادائیگی اور اطاعت کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن یہ سب احتمال بعید نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اکثر مفسرین نے وہی معنی جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے، قبول کیا ہے۔

ہدایت و تربیت کی مصلحت کلی کا تقاضا ہے۔

"رب المشارق والمغارب" (مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار) کی تعبیر ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کر دہی خدا جو اس بات پر قادر ہے، کہ اتنے عظیم سورج کو ہر روز ایک نئے مشرق اور ایک نئے مغرب میں قرار دیتا ہے، اور یہ حساب کتاب استادقیق ہو کر وہ کئی ملین سال سے اپنے سالانہ دورے کو بے کم وکاست طے کرے، تو وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ ایک دفعہ پھر انسان کو زندگی کی طرف لوٹا دے، اور اسے ایک نئی زندگی بخش دے، یا ایک گروہ کو لے جائے اور کسی دوسرے شائستہ اور لائق گروہ کو ان کا جانشین بنا دے۔

ایک نکتہ

"مشارق" و "مغارب" کا خدا

قرآن مجید کی آیات میں کبھی تو "مشرق و مغرب" کی تعبیر مفرد کی صورت میں آئی ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۱۵ میں وللہ المشرق والمغرب "مشرق و مغرب خدا ہی کے لیے ہے اور کبھی تثنیہ کی صورت میں آئی ہے، مثلاً سورۂ رحمٰن کی آیہ ۱۷ میں "رب المشرقین ورب المغربین"، "دو مشرقوں کا پروردگار اور دو مغربوں کا پروردگار" اور کبھی "جمع" کی صورت میں المشارق و المغارب جیسے زیر بحث آیت ہے۔

بعض کوتاہ نظر لوگوں نے ان تعبیروں کو متضاد خیال کیا ہے، حالانکہ وہ سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، اور ہر ایک کسی ایک نکتہ کی طرف اشارہ ہے، اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ سورج ہر روز ایک نئے نقطہ سے طلوع اور ایک نئے نقطہ میں غروب کرتا ہے، اس بناء پر سال کے دنوں کی تعداد کے برابر مشرق و مغرب ہیں اور دوسری طرف ان تمام مشرقوں اور مغربوں میں دو مشرق اور دو مغرب ممتاز ہیں، جن میں سے ایک موسم گرما کے آغاز میں یعنی مدار شمالی میں، خورشید کی بلندی کی زیادہ سے زیادہ حد کے موقع پر اور ایک موسم سرما کے آغاز میں، یعنی مدار جنوبی میں سورج کے پہنچ جانے کی آخری حد (جن میں سے ایک کو "مدار راس السرطان" سے اور دوسرے کو "مدار راس الجدی" سے تعبیر کرتے ہیں اور چونکہ یہ دونوں پورے مدار پر مشخص ہیں لہٰذا خصوصیت کے ساتھ ان کی بات ہوئی ہے، ان کے علاوہ دوسری دو مشرقیں اور دو مغربیں بھی ہیں، جنہیں مشرق اعتدالی اور مغرب اعتدالی کا نام دیتے ہیں (اوّل بہار اور اوّل خزاں میں جبکہ ساری دنیا میں رات دن برابر ہوتے ہیں) یہ بھی مشخص ہیں اور بعض نے "رب المشرقین و رب المغربین" کو اس کی طرف اشارہ سمجھا ہے، اور یہ بھی قابلِ توجہ ہے۔

لیکن جہاں یہ مفرد کی صورت میں ہے تو وہاں جنس کا معنی رکھتا ہے، کہ توجہ صرف اصل مشرق و مغرب پر ہے، قطع نظر اس سے کہ افراد پر نظر کی جائے، اس طرح سے او پر والی مختلف تعبیروں میں، ہر کوئی ایک نکتہ رکھتی ہے اور انسان کو سورج کے طلوع و غروب کے مختلف تغیرات، اور سورج کے مداروں کے منظم تغیرات کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

۴۲۔ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِىْ يُوْعَدُوْنَ ۝

۴۳۔ يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ يُّوْفِضُوْنَ ۝

۴۴۔ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِىْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۲۔ انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے، تاکہ وہ اپنے باطل میں غوطہ زن رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے یوم موعود سے ملاقات کریں۔

۴۳۔ وہی دن جب وہ اپنی قبروں سے تیزی کے ساتھ نکلیں گے، گویا وہ اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔

۴۴۔ درآنحالیکہ ان کی آنکھیں شدت وحشت سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی اور ذلت وخواری کے پردہ نے انھیں ڈھانپ رکھا ہوگا (اور ان سے کہا جائے گا) یہ وہی دن ہے جس کا تھیں وعدہ دیا جاتا تھا۔

تفسیر

گویا اپنے بتوں کی طرف دوڑ رہے ہیں

ان آیات میں جو سورۂ معارج کی آخری آیات ہیں، ہٹ دھرم، ٹھٹھہ کرنے والے اور سخت کافروں کو انذار وتہدید کے عنوان سے فرماتا ہے: "انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دے، تاکہ وہ اپنے باطل مطالب میں ڈوبے رہیں اور کھیل کود میں لگے رہیں یہاں تک کہ وہ اپنے یوم موعود سے ملاقات کریں" (فذرهم يخوضوا ويلعبوا حتّٰى يلاقوا يومهم الذى يوعدون)[1]۔

---

[1] "یخوضوا" "خوض" (بروزن حوض) کے مادہ سے اصل میں پانی میں چلنے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد کنایہ کے طور پر ان موارد میں جہاں انسان باطل مطالب میں غوطہ زن ہو، استعمال ہوا ہے۔

اس سے زیادہ استدلال اور موعظہ کی ضرورت نہیں ہے، وہ نہ تو اہل منطق ہیں اور نہ ہی بیدار ہونے کے لیے آمادگی رکھتے ہیں، چھوڑ دانھیں بھائی باطل اور بے ہودہ باتوں میں غوطہ زن ہیں اور بچوں کی طرح کھیل کود میں لگے رہیں، یہاں تک کہ ان کا موعود دن، قیامت کا دن آن پہنچے اور وہ ہر چیز کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔

یہ آیت اسی تعبیر کے ساتھ اور کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر سورۂ زخرف کی آیہ ۸۳ میں بھی آئی ہے۔

اس کے بعد اس موعود دن کا تعارف کراتے ہوئے اس دہشت ناک اور ہولناک دن کی نشانیاں بیان کرتا ہے، اور فرماتا ہے "وہی دن جس میں وہ اپنی قبروں سے تیزی کے ساتھ خارج ہوں گے اور اس طرح تیزی سے چل رہے ہوں گے، گویا کہ وہ اپنے بتوں کی طرف جا رہے ہیں" (یوم یخرجون من الاجداث سراعًا کانھم الی نصب یوفضون)۔

کیسی عجیب تعبیر ہے؟ قیامت میں ان کی حالت کی کیفیت کی، جبکہ وہ تیزی کے ساتھ دادگاہ عدل الٰہی کی طرف چل رہے ہوں گے ان کے کسی جشن یا عزا کے دن بتوں کی طرف، ہجوم کرنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، لیکن وہ کہاں اور یہ کہاں؟ اور حقیقت میں یہ ان بے ہودہ عقائد کے بارے میں، جو وہ دنیا میں رکھتے تھے، ایک تمسخر اور استہزاء ہے۔

"اجداث" "جدث" (بروزن عبث) کی جمع ہے جو "قبر" کے معنی میں ہے۔

"سراع" "سریع" کی جمع ہے (جیسے ظراف وظریف) اس شخص یا چیز کے معنی میں ہے، جو جلدی سے چلے۔

"نصب" "نصیب" کی جمع ہے اور وہ بھی بعض کے قول کے مطابق "نصب" (بروزن سقف) کی جمع ہے، یہ اصل میں اس چیز کے معنی میں ہے جو کسی جگہ نصب ہوئی ہو اور ان بتوں کو بھی کہتے ہیں، جنھیں ایک پتھر کے ٹکڑے کی صورت میں کسی جگہ نصب کر کے اس کی پرستش کرتے تھے، اور اس کے اوپر قربانی کر کے اس کا خون اس پر ڈال دیتے تھے اور اس میں اور "صنم" میں یہ فرق تھا کہ "صنم" تو وہ بت تھا، جس کی کوئی خاص شکل وصورت ہوتی تھی، لیکن "نصب" پتھر کے ایسے ٹکڑے ہوتے تھے جن کی کوئی شکل وصورت نہیں ہوتی تھی جن کی وہ کسی سبب سے پرستش کرتے تھے، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۳ میں آیا ہے کہ وہ حرام گوشتوں میں سے اس جانور کے گوشت کو بھی شمار کرتے تھے جو ان بتوں پر ذبح ہوتے تھے (وما ذبح علی النصب)

"یوفضون" "افاضہ" کے مادہ سے، تیز چلنے کے معنی میں ہے، پانی کے چشمے سے چھلنے کی تیزی سے مشابہ۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ زیر بحث آیت میں نصب سے مراد وہ پرچم ہیں جنھیں لشکروں یا قافلوں کے درمیان کسی ایک جگہ نصب کر دیتے ہیں اور ہر شخص تیزی سے اپنے آپ کو ان تک پہنچاتا ہے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد دوسری نشانیاں پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "یہ اس حالت میں ہوگا کہ ان کی آنکھیں ہول اور دہشت کی وجہ سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی اور وہ خضوع کے ساتھ دیکھ رہے ہوں گے" (خاشعۃ ابصارھم)۔

"اور ذلت وخواری کے پردہ نے انھیں ڈھانپ رکھا ہوگا" (ترھقھم ذلۃ)[1]

---

[1] "ترھقھم" "رھق" (بروزن شفق) کے مادہ سے، بری طرح ڈھانپنے کے معنی میں ہے۔

آیت۔ کہ آخر میں مزید کہتا ہے: "یہ وہی دن ہے جس کا انہیں وعدہ دیا جاتا تھا"۔ (ذالک الیوم الذی کانوا یوعدون)۔

ہاں! یہ وہی موعود دن ہے، جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے اور بعض اوقات یہ کہا کرتے تھے: فرض کریں کوئی ایسا دن ہو بھی تو پھر بھی ہماری حالت مومنین سے بہتر ہوگی، لیکن اس دن ان میں شدت خوف، وحشت و شرمساری کی وجہ سے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی، ذلت کا گرد و غبار ان کے سر اور چہرہ پر پڑا ہوا ہوگا، اور وہ غم و اندوہ کے دائرے میں گھرے ہوئے ہوں گے، یقیناً اس دن وہ نادم و پشیماں ہوں گے، لیکن کیا فائدہ؟

خداوندا! اس ہولناک دن ہمیں اپنی رحمت کے پردے میں ڈھانپ لینا۔

پروردگارا! شیطان کے جال سخت، ہوائے نفس غالب اور لمبی چوڑی آرزوئیں فریب دینے والی ہیں، تو خود ہی بیداری و آگاہی اور اوہام سے عدم انحراف کی ہمیں توفیق مرحمت فرما۔

بارالٰہا: ہمیں ان مومنین میں سے قرار دے، جنھوں نے اپنے عہد کو وفا کرنے، اور تیری اطاعت کے لیے کمر ہمت باندھی ہوئی ہے

آمین یا رب العالمین

اختتام سورۂ معارج۔ ۲۱ ذی الحجۃ الحرام

۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۱۵ محرم ۱۴۰۸ مطابق ۹ ستمبر ۱۹۸۷ء بروز بدھ
بوقت تقریباً ساڑھے سات بجے صبح۔ ۸۱ رای ماڈل ٹاؤن

لاہور

صفدر حسین نجفی

سورۂ نوح

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۲۸ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲ ذی الحجۃ الحرام ۱۴۰۶ھ

سورۂ نوح کے مطالب و مضامین

یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، نوح پیغمبر کی سرگزشت بیان کرتی ہے، قرآن مجید کی کئی سورتوں میں اس عظیم پیغمبر کی سرگزشت کی طرف اشارہ ہوا ہے، ان میں سے سورۂ شعراء، مومنون، اعراف اور انبیاء ہیں، اور سب سے زیادہ تفصیل سورۂ ہود میں آئی ہے۔ جس میں تقریباً ۲۵ آیات اس "اولوالعزم" پیغمبر کے بارے میں ہیں (آیہ ۲۵ تا ۴۹)۔

لیکن سورۂ نوح میں جو کچھ آیا ہے، وہ ان کی زندگی کا ایک خاص حصہ ہے، جو دوسری جگہ پر اس طرح سے نہیں آیا، اور یہ حصہ ان کی توحید کی طرف دعوت دینے، اس کی کیفیت، اس دعوت کے عناصر، اور ان جزئیات کے بارے میں جو اس اہم مسئلہ میں بروئے کار آئے ہیں ——— اور وہ بھی اس ہٹ دھرم، خود غرض اور متکبر قوم کے مقابلہ میں جو حق کے سامنے سر جھکانے کے لیے بالکل تیار نہ تھی ——— پے در پے اور مسلسل دعوتِ حق دینے کے ساتھ مربوط ہے۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ اور اس زمانہ کے تھوڑے سے مسلمان، نوح اور ان کے اصحاب کے زمانہ کے حالات سے مشابہ حالات رکھتے تھے، انھیں بہت سے مسائل کی تعلیم دیتا ہے اور اس واقعہ کے بیان کرنے کا اہداف و مقاصد میں سے ایک یہی ہے، منجملہ ان کے ؛

۱۔ انھیں یہ بتانا ہے کہ منطقی استدلال کے طریقے سے، جو دشمنوں کے ساتھ محبت اور مکمل دلسوزی سے توأم ہو، کس طرح تبلیغ کریں اور اس راہ میں ہر مفید اور موثر ذریعہ سے کیسے فائدہ اٹھائیں۔

۲۔ انھیں یہ سکھاتا ہے کہ خدا کی طرف دعوت دینے کی راہ میں ہرگز نہ تھکیں، چاہے سالہا سال گزر جائیں اور دشمن کتنا ہی مصر کیوں نہ ہو۔

۳۔ انھیں یہ سبق دیتا ہے کہ ایک طرف تو شوق دلانے کے وسائل ہوں اور دوسری طرف ڈرانے کے عوامل، اور دعوت کرنے کے لیے دونوں طریقوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔

۴۔ اس سورہ کی آخری آیات، ہٹ دھرم مشرکین کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ اگر وہ حق کے سامنے نہ جھکے اور خدا کے حکم کے سامنے انھوں نے گردن خم نہ کی، تو ان کا انجام بہت دردناک ہوگا۔

۵۔ ان سب باتوں کے علاوہ یہ سورۂ پیغمبر اور پہلے مومنین اور ان سے مشابہ افراد کے لیے دل کی تسلی کا سبب ہے کہ وہ خدا کے لطف و کرم سے اپنے پروگراموں میں سرگرم اور مشکلات اور سختیوں میں صابر و شکیبا رہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ سورہ، حق و باطل کے طرف داروں میں دائمی مبارزہ کے بیان اور ان پروگراموں کی، جن پر حق کے طرف داروں کو اپنی راہ میں کاربند ہونا چاہیے، تصویر کشی کرتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلامؐ سے آیا ہے:

"من قرأ سورة نوح كان من المؤمنين الذين تدركهم دعوة نوح"

جو شخص سورۂ "نوح" کو پڑھے گا، وہ ان مومنین میں سے ہو جائے گا جنہیں نوح کی دعوت کی شعاع ڈھانپ لیتی ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من كان يؤمن بالله واليوم الآخر ويقرأ كتابه فلا يدع ان يقرأ سورة "انا ارسلنا نوحًا" فاى عبد قرأها محتسبا صابرًا فى فريضة او نافلة اسكنه الله مساكن الابرار واعطاه ثلاث جنان مع جنته كرامة من الله"

جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی کتاب کو پڑھتا ہے، وہ سورۂ نوح کی تلاوت کو ترک نہ کرے، جو شخص اس سورہ کو، صبر و استقامت کے ساتھ، خدا کے لیے، واجب یا مستحب نماز میں پڑھے گا تو خدا اسے نیک افراد کی منازل میں جگہ دے گا اور جنت کے باغوں میں سے تین باغ، اس کے اپنے باغ کے علاوہ، اس کے احترام میں اسے مرحمت فرمائے گا۔[2]

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ اس کی تلاوت کا ہدف اور مقصد یہ ہے کہ اس عظیم پیغمبر کے طور طریقوں، اور حق کی طرف دعوت کی راہ میں ان کے یار و انصار کے صبر و استقامت سے ہدایت حاصل کرے اور اس کی دعوت کی شعاع سے روشنی حاصل کرے، نہ کہ ایسا پڑھنا کہ جس میں غور و فکر نہ ہو، اور نہ ہی ایسا غور و فکر کہ جس میں عمل نہ ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰، ص ۳۵۹

[2] ایضاً

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ○

۲۔ قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ○

۳۔ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ○

۴۔ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَ یُؤَخِّرۡکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ ۘ لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اور ہم نے ان سے کہا: اس سے پہلے کہ دردناک عذاب ان کی طرف آئے، اپنی قوم کو ڈراؤ۔

۲۔ انھوں نے کہا اے قوم! میں تمھارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں۔

۳۔ کہ تم خدا کی عبادت کرو اور اس کی مخالفت سے پرہیز کرو، اور میری اطاعت کرو۔

۴۔ (اگر) تم ایسا کرو گے تو خدا تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور ایک معین وقت تک کیلئے تمھیں زندہ رکھے گا، لیکن جب خدائی اجل آگئی تو پھر تاخیر نہیں ہوگی، اگر تم سمجھو!

تفسیر
نوح کا پہلا پیغام

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ سورۂ نوح کے حالات کے اس حصّہ کو بیان کرتا ہے، جو ان کی دعوت سے مربوط ہے، اور وہ راہِ حق کے تمام راہروؤں کو، خصوصاً ہٹ دھرم قوموں کے مقابلہ میں، حق کی طرف دعوت کے سلسلہ میں، بہت سے عمدہ نکات سکھاتی ہے۔

سب سے پہلے ان کی بعثت کے مسئلہ کو شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، اور ہم نے اس سے کہا: اس سے پہلے کہ دردناک عذاب ان کی طرف آئے تم اپنی قوم کو ڈراؤ" (انّا ارسلنا نوحًا الی قومہ ان انذر قومك من قبل ان یأتیھم عذاب الیم)۔

یہ دردناک عذاب، ممکن ہے دنیا کا عذاب ہو، یا آخرت کا عذاب ہو، اور زیادہ مناسب یہ ہے کہ دونوں مراد ہوں، اگرچہ اس سورہ کی آخری آیات کے قرینہ سے زیادہ تر مراد دنیا کا عذاب ہے۔

"انذار" (اور ڈرانے) پر تکیہ، باوجودیکہ انبیاء ڈرانے والے بھی تھے، اور بشارت دینے والے بھی، اس بناء پر ہے کہ انذار اور ڈرانا، غالبًا زیادہ قوی تاثیر رکھتا ہے، جیسا کہ تمام دنیا میں قوانین کے اجراء کی ضمانت کے لیے انذار اور سزا پر تکیہ ہوتا ہے۔

نوح ایک "اولوالعزم" پیغمبر، جو پہلی شریعت اور دینِ الٰہی کے حامل تھے، عالمی دعوت رکھتے تھے، یہ فرمان حاصل کرنے کے بعد اپنی قوم کی طرف آئے اور ان سے کہا: "اے میری قوم! میں تمھارے لیے ایک واضح ڈرانے والا ہوں"۔ (قال یا قوم انی لکم نذیر مبین)۔

ہدف و مقصد یہ ہے کہ تم خدائے یکتا و یگانہ کی پرستش کرو، اور جو کچھ اس کے علاوہ ہے اسے دور پھینک دو، تقویٰ اختیار کرو اور میرے احکام کی جو خدا کے احکام ہیں اطاعت کرو (ان اعبدوا اللہ واتقوہ واطیعون)۔

حقیقت میں نوح نے اپنی دعوت کے مضمون کا تین جملوں میں خلاصہ بیان کیا: خدائے یکتا کی پرستش، تقویٰ کی رعایت اور ان قوانین و احکام کی، جو وہ خدا کی طرف سے لائے تھے اور جو عقائد و اخلاق و احکام کا مجموعہ تھے، اطاعت۔

اس کے بعد انھیں شوق دلاتے ہوئے، اور اس دعوت کو قبول کرنے کے اہم نتائج کو دو مختصر سے جملوں میں بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اگر تم میری دعوت کو قبول کرو تو خدا تمھارے گناہوں کو بخش دے گا (یغفر لکم من ذنوبکم)[1]۔

---

[1] "من" اس جملہ میں زائدہ اور تاکید کے لیے ہے، کیونکہ خدا پر ایمان تمام گزشتہ گناہوں کے بخشے جانے کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں)

حقیقت میں مشہور قاعدہ کلیہ " الاسلام یجب ما قبلہ " (اسلام اپنے سے پہلے کی چیزوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور انھیں ختم کر دیتا ہے) ایک ایسا قانون ہے جو تمام توحیدی اور الٰہی دینوں میں ہے اور اسلام پر ہی منحصر نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے ، اور تمھیں ایک معین زمانہ تک تاخیر میں ڈالتا ہے اور تمھاری عمر کو طولانی کر کے تم سے عذاب کو دور رکھتا ہے (و یؤخرکم الی اجل مسمّی)۔

" کیونکہ جب خدا کی طرف سے اصلی اور آخری اجل آجاتی ہے ، تو اس میں تاخیر نہیں ہوتی ، اگر تم جانتے ہو " (ان اجل الله اذا جاء لا یؤخر لو کنتم تعلمون)۔

اس آیت سے اچھی طرح معلوم ہوجاتا ہے کہ " اجل " اور انسانی عمر کی مدت دو قسم کی ہے ، " اجل مسمّی " اور " اجل نہائی یا اخری " یا دوسرے لفظوں میں " اجل ادنی " (نزدیک کی مدت والی) اور " اجل اقصی " (دُور کی مدت والی) یا " اجل معلق " (مشروط) اور " اجل حتمی " (مطلق)

پہلی قسم کی عمر کی مدت تو وہ ہے جو قابلِ تغیر ہے اور وہ انسان کے غلط اعمال کے نتیجے میں ممکن ہے کہ بہت جلدی آجائے جن میں سے ایک خدائی عذاب بھی ہے اور اس کے برعکس تقویٰ نیکوکاری اور تدبیر کی وجہ سے ممکن ہے کہ وہ بہت پیچھے اور تاخیر میں پڑ جائے ۔

لیکن عمر کی اصلی اور آخری مدت کسی طرح بھی قابلِ تغیر نہیں ہے ، اس موضوع کو ایک مثال کے ذریعے مشخص کیا جاسکتا ہے ، اور وہ یہ ہے کہ انسان عمر جاودانی اور ہمیشہ کی زندگی کی استعداد نہیں رکھتا ، اگر انسانی بدن کے تمام کل پُرزے اور مشینری اچھی طرح سے کام کرتے رہیں تو آخر کار ایک ایسا وقت آجائے گا ، جب کہ فرسودہ اور کہنہ ہونے کی وجہ سے اس کا دل خود بخود کام کرنے سے رُک جائے گا ، لیکن حفظانِ صحت کے اصولوں کی رعایت ، اور بیماریوں کو وقت پر روکنے سے ، انسان کی عمر کو طولانی کر سکتے ہیں ، جبکہ ان امور کی رعایت نہ کرنے سے ممکن ہے کہ اس کی عمر بہت کم ہو جائے اور بہت جلدی اس کو ختم کر دے۔[1]

بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا :

باعث ہے ، مگر وہ کہ جو حق الناس سے مربوط ہے ، لیکن گناہ کے لحاظ سے اور حرمت کے حکم کی وجہ سے بخشا جاتا اس کو بھی شامل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے (مثلاً فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور علامہ طباطبائی نے المیزان میں) احتمال دیا ہے کہ " من " تبعیضیہ ہے ۔ یہ گزشتہ گناہوں کے بارے میں ہے ، نہ کہ آئندہ والے گناہوں کے بارے میں ، یہ بعید نظر آتا ہے ، کیونکہ آیت میں آئندہ کے گناہوں کے بارے میں تو بات ہی نہیں ہو رہی ۔

[1] حاشیہ صفحہ ھٰذا : " اجل نہائی " اور " اجل معلق " کے بارے میں ہم نے سورۂ انعام کی آیہ ۲ (جلد ۵ ص ۱۲۸) کے ذیل میں ایک اور بحث کی ہے ۔

ایک نکتہ

عمر کی زیادتی اور کمی کے معنوی اسباب

ایک دوسرا نکتہ جو اس آیت سے بخوبی معلوم ہوتا ہے، وہ عمر کے کم ہونے میں گناہوں کی تاثیر ہے، کیونکہ ارشاد ہوتا ہے، اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو، تو خدا تمھاری عمر کو طولانی کر دے گا اور تمھاری موت کو تاخیر میں ڈال دے گا۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہمیشہ انسان کے جسم اور روح پر ہولناک ضربیں وارد کرتے ہیں، اس مطلب کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

روایات اسلامی میں بھی اس معنی پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔ ان میں سے ایک پرمعنی حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

من یموت بالذنوب اکثر ممن یموت بالاجال، ومن یعیش بالاحسان اکثر ممن یعیش بالاعمار۔

وہ لوگ جو گناہ کے اثر سے مرتے ہیں ان سے بہت زیادہ ہیں، جو طبعی موت سے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں، اور وہ لوگ جو نیکوکاری کی بناء پر طولانی عمر پاتے ہیں، ان سے بہت زیادہ ہیں، جن کی عمر طبعی عوامل کی بناء پر زیادہ ہوتی ہے:

۵۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۟ۙ

۶۔ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۟

۷۔ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۟ۚ

۸۔ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۟ۙ

۹۔ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۟ۙ

ترجمہ

۵۔ "نوح" نے کہا، پروردگارا! میں نے اپنی قوم کو رات دن (تیری طرف) دعوت دی۔

۶۔ لیکن میری دعوت نے حق سے فرار کے علاوہ ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔

۷۔ اور میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ وہ ایمان لے آئیں تاکہ تو انھیں بخش دے، تو انھوں نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں، اور اپنے لباس سے چہروں کو ڈھانپ لیا، اور مخالفت پر اصرار کیا، اور شدت کے ساتھ استکبار کیا۔

۸۔ اس کے بعد میں نے انھیں ظاہر بظاہر (توحید اور تیری بندگی کی طرف) دعوت دی۔

۹۔ پھر میں نے علی الاعلان بھی اور پوشیدہ طور پر بھی انھیں تیری طرف بلایا۔

تفسیر

ان کی ہدایت کیلئے ہر طرح سے کوشش کی، مگر......

ان آیات میں، اپنی قوم کو دعوت دینے کے لیے، نوح کی رسالت اور ماموریت کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے، خود انھیں کی زبان سے

کچھ باتیں نقل ہوئی ہیں، جو انھوں نے خدا کی بارگاہ میں شکایت کے طور پر کہی تھیں، جو بہت ہی سبق آموز ہیں۔

نوحؑ کی باتیں ایسی باتوں کے سلسلہ میں ہیں، جو تمام دینی مبلغین کے لیے رہنما بن سکتی ہیں، ارشاد ہوتا ہے: "نوحؑ نے کہا: پروردگار! میں نے اپنی قوم کو رات دن تیری طرف دعوت دی ہے" (قال رب انی دعوت قومی لیلاً و نهاراً)۔

اور ان کی ہدایت و تبلیغ میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوتاہی نہیں کی۔

لیکن میری اس دعوت وارشاد نے، حق سے فرار کرنے کے سوا، ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا" (فلم یزدهم دعاءی الا فراراً)۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ کسی چیز کی دعوت، اسی سے بھاگنے کا سبب بن جائے، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرنے سے کہ دعوتوں کی تاثیر، ایک قسم کی آمادگی اور کشش متقابل کی محتاج ہے، تعجب کی کوئی بات باقی نہیں رہ جاتی کہ وہ غیر آمادہ دلوں میں معکوس اور منفی اثر ڈالے دوسرے لفظوں میں ہٹ دھرم اور حق کے دشمن افراد، جب مردانِ حق کی دعوت کو سنتے ہیں تو وہ اس کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور ان کا یہی مقابلہ کے لیے کھڑے ہوجانا، انھیں راہِ حق سے زیادہ دور کردیتا ہے، اور ان کے کفر و نفاق کو اور بھی زیادہ راسخ بنا دیتا ہے۔

یہ بات ٹھیک اسی چیز کے مانند ہے جو سورۂ اسراء کی آیہ ۸۲ میں آئی ہے: "و ننزل من القراٰن ما هو شفاء و رحمة للمؤمنین ولا یزید الظالمین الا خساراً) ہم نے قرآن میں ایسی آیات نازل کی ہیں جو مومنین کیلیے شفا اور رحمت کا سبب ہیں، لیکن ظالموں میں سوائے خسارے اور نقصان کے کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتیں"۔

اور قرآنی آیات میں جو یہ آیا ہے کہ یہ آسمانی کتاب پرہیزگاروں کے لیے باعثِ ہدایت ہے "هدًى للمتقين" (بقرہ — ۲) اسی وجہ سے ہے کہ انسان میں کچھ نہ کچھ تقویٰ کا وجود ہونا چاہیے تاکہ وہ حق کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو، یہ مرحلہ ہی "حقیقت جوئی کی روح" اور حق کی گفتگو کو قبول کرنے کی آمادگی ہے۔

اس کے بعد نوحؑ اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتے ہیں "خداوندا! میں نے جب بھی انھیں دعوت دی کہ وہ ایمان لے آئیں اور تو انھیں بخش دے، تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں، اپنے لباسوں کو اپنے اوپر لپیٹ لیا اور مخالفت کرنے اور ایمان نہ لانے پر اصرار کیا اور شدت کے ساتھ استکبار کیا" (و انی کلما دعوتهم لتغفر لهم جعلوا اصابعهم فی اٰذانهم واستغشوا ثیابهم و اصروا واستکبروا استکباراً)۔

کانوں میں انگلیاں ڈالنا اس لیے تھا کہ حق کی آواز کو نہ سنیں، اور ان کا اپنے اوپر لباس لپیٹ لینا، یا تو اس معنی میں تھا کہ وہ لباس کو سر پر ڈال لیتے تھے تاکہ وہ کانوں میں ڈالی ہوئی انگلیوں کو ڈھانپ لیں اور آواز کی معمولی سے معمولی لہر بھی کانوں کے پردے سے نہ ٹکرائے، اور وہاں سے کوئی پیغام دماغ کی طرف منتقل نہ ہو، یا وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے چہرے کو ڈھانپ لیں، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی نگاہیں اس بزرگ پیغمبر نوحؑ کے ملکوتی چہرے پر جا پڑیں۔ حقیقت میں انھیں یہ اصرار تھا، کہ نہ تو وہ اپنے کانوں سے ان کی کوئی بات سنیں، اور نہ ہی اپنی آنکھوں سے

انھیں دیکھیں ۔

واقعاً یہ ایک حیرت انگیز چیز ہے کہ انسان حق کی عداوت اور دشمنی میں اس حد تک پہنچ جائے کہ خود کو دیکھنے، سننے اور سوچنے تک کی بھی اجازت نہ دے ۔

بعض اسلامی تفاسیر میں آیا ہے کہ اس منحرف قوم میں سے بعض لوگ اپنے بیٹوں کے ہاتھ پکڑ کر نوح کے پاس لے جایا کرتے تھے اور ان سے یہ کہتے تھے : اس شخص سے ڈرتے رہنا کہیں یہ تمہیں گمراہ نہ کردے ، یہ وہ وصیت ہے جو میرے باپ نے مجھے کی تھی اور میں اب یہی وصیت تمہیں کر رہا ہوں (تاکہ میں وصیت اور خیر خواہی کا حق ادا کر دوں) [1]

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نوح اپنی طولانی عمر میں ، کئی نسلوں کے درمیان اسی طرح دعوتِ الٰہی کی تبلیغ کرتے رہے تھے اور بالکل نہیں تھکتے تھے ۔

اور ضمنی طور پر اس بات کی بھی نشاندہی کرتی ہے کہ ان کی بدبختی کا ایک اہم عامل استکبار اور غرور تھا ، کیونکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بالاتر سمجھتے تھے کہ اپنے جیسے انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں ، چاہے وہ خدا کا نمائندہ ہو اور اس کا دل علم و دانش اور تقویٰ و پرہیزگاری کا مرکز ہو ۔ یہ کبر و غرور ہمیشہ ہی حق کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ رہا ہے اور ہم نے بشر کی تمام تاریخ میں اس کا شوم و منحوس نتیجہ بے ایمان افراد کی زندگی میں مشاہدہ کیا ہے ۔

نوح اپنی باتوں کو پروردگار کی بارگاہ میں جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں :

"خداوندا! میں نے انھیں آشکار اور ظاہر طور پر تیری توحید اور عبادت کی طرف دعوت دی ۔ (ثم انی دعوتھم جھاراً) ۔

میں نے انھیں عمومی جلسوں میں اور بلند آواز کے ساتھ ایمان کی طرف بلایا ۔

اس پر ہی قناعت نہیں کی ۔ " آشکار اور پنہاں ، توحید و ایمان کی حقیقت ان سے بیان کی ہے " (ثم انی اعلنت لھم واسررت لھم اسراراً) ۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق ، نوح نے اس ہٹ دھرم اور خود غرض جمعیت میں اپنی دعوت کے نفوذ کے لیے تین مختلف طریقے اختیار کیے ۔ کبھی تو صرف مخفی طور پر دعوت کرتے تھے ، تو چار قسم کے ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ (کانوں میں انگلیاں ڈال لیں ، اپنے اوپر کپڑے لپیٹ لیے ، کفر پر اصرار کیا اور استکبار و غرور سے کام لیا) کبھی علی الاعلان اور آشکارا دعوت دیتے اور کبھی آشکار اور پنہاں دونوں طریقوں کی دعوت سے فائدہ اٹھاتے ، لیکن ان میں سے کوئی بھی موثر ثابت نہیں ہوئی [2]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۱

[2] تفسیر "فخر رازی" جلد ۳۰ ص ۱۳۶

اصولی طور پر انسان کی ساخت اور بناوٹ کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر وہ باطل کی راہ میں اس قدر آگے بڑھ جائے، کہ فساد کی جڑیں اس کے وجود میں مستحکم ہو جائیں، اور اس کے وجود کی گہرائیوں میں نفوذ کرتے ہوئے طبیعت ثانوی کی شکل اختیار کر لیں، تو پھر نہ تو مردانِ حق کی دعوت کچھ اثر کرتی ہے اور نہ ہی خدا کے پیغامہائے رسالت کے لیے فائدہ مند ہوتے ہیں۔

چند نکات

۱۔ تبلیغ کے طریقے:

اوپر والی آیات میں، نوح کی دعوت کے سلسلہ میں جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ پیغمبر اور مکہ میں رہنے والے ان تھوڑے سے مومنین کے لیے، جو آپ کے ساتھ مل گئے تھے، دلی تسلی کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ راہِ خدا کے تمام مبلغین کے لیے ایک عمومی پروگرام بھی پیش کیا گیا ہے۔

نوح کو ہرگز اس بات کی توقع نہ تھی کہ لوگ آپ کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے شہر کے ایک عمومی مرکز میں جمع ہو جائیں گے، پھر وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ، اس حالت میں کہ وہ سب کے سب آپ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اور کان آپ کی باتوں پر لگائے ہوئے ہوں گے اور پھر وہ خدا کا پیغام انھیں پہنچائیں گے۔ بلکہ آیات کے لب ولہجہ سے معلوم ہوتا ہے (اور بعض روایات میں آیا بھی ہے) کہ آپ بعض اوقات لوگوں کے گھروں میں ان کے پاس جاتے، یا کوچہ و بازار میں خصوصی طور پر انھیں آواز دیتے اور حوصلہ کے ساتھ اور محبت آمیز لب ولہجہ میں انھیں تبلیغ کرتے اور کبھی آپ ان عمومی مجالس میں، جو دوسرے مقاصد مثلاً جشن یا تعزیت کے لیے قائم ہوئی تھیں چلے جاتے اور بلند آواز میں آشکارا خدا کا فرمان ان کے سامنے پڑھتے، لیکن ہمیشہ نامطلوب ردِ عمل، توہین و استہزاء اور بعض اوقات مارنے اور زخمی کرنے کا سامنا ہوتا لیکن اس کے باوجود وہ ہرگز اپنے کام سے دستبردار نہیں ہوئے۔

یہ عجیب و غریب حوصلہ اور اتنی عجیب دلسوزی اور بے نظیر استقامت اور کام کی لگن، دینِ حق کی راہ میں دعوت کے لیے ان کا سرمایہ تھی۔

اور سب سے بڑھ کر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ آپ کی دعوت و تبلیغ سے نو سو سال کی طویل مدت میں، تقریباً (۸۰) اسی افراد آپ پر ایمان لائے۔ اگر ہم ان دونوں اعداد کو ایک دوسرے پر تقسیم کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ ایک شخص کی ہدایت کے لیے اوسطاً تقریباً ۱۲ سال تبلیغ کی۔

اگر مبلغین اسلام اس قسم کی استقامت اور کام کی لگن رکھتے ہوں، تو کیا اسلام ایسے مالامال اور عمدہ مطالب و مضامین کے ہوتے ہوئے، عالمگیر نہیں ہو جائے گا؟!

۲۔ حقیقت سے فرار کیوں؟

بعض اوقات انسان اس بات پر تعجب کرتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اس آسمان کے نیچے ایسے لوگ بھی پیدا ہو جائیں، جو حق کی بات

تک سننے کے لیے تیار نہ ہوں، اور اس سے دور بھاگیں؟ بات قبول کرنے کی نہیں ہے، بات صرف سننے کی ہے۔
لیکن تاریخ بتلاتی ہے کہ اس قسم کے افراد بہت زیادہ تھے۔

صرف قوم نوح ہی ایسی نہیں تھی کہ جب آپ انہیں توحید کی دعوت دیتے تھے، تو وہ کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے تھے، اور سر اور چہرے کو کپڑے سے ڈھانپ لیتے تھے، تاکہ نہ تو حق کی بات کو سنیں اور نہ ہی آپ کو دیکھیں، بلکہ قرآن کی صراحت کے مطابق، پیغمبر اسلام کے زمانہ میں بھی ایسا گروہ موجود تھا، جب پیغمبرؐ دل انگیز بلند آواز کے ساتھ آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرتے، تو وہ شور و غوغا کرکے اور سیٹیاں بجا کر اس قسم کا ہنگامہ کھڑا کر دیتے تھے کہ کوئی شخص آپ کی آواز کو نہ سن پائے، "وقال الذین کفروا لا تسمعوا لهٰذا القراٰن والغوا فیه لعلکم تغلبون" کافروں نے کہا: اس قرآن پر کان نہ دھرو اور اس کی تلاوت کے وقت شور و غوغا بلند کرو، تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ (حٰم السجدہ ــــــ ۲۶)

کربلا کی خونی تاریخ میں بھی یہ آیا ہے کہ جب امام حسینؑ سالار شہیدان نے منحرف اور کج فہم دشمنوں کو، ہدایت و ارشاد، اور بیدار کرنا چاہا، تو انھوں نے اس طرح شور و غوغا کیا، کہ امام کی آواز ان میں گم ہو کر رہ گئی۔[1]

آج بھی یہ پروگرام اسی طرح جاری و ساری ہے۔ البتہ دوسری شکلوں اور صورتوں میں، باطل کے طرفداروں نے، قسم قسم کی غلط سرگرمیوں، فاسد اور خراب کرنے والی موسیقیوں، خراب مواد اور منشیات کے ذریعہ، اس قسم کی فضا فراہم کر رکھی ہے، کہ لوگ خصوصاً نوجوان، مردانِ حق کی دلنواز آواز سن ہی نہ سکیں۔

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۴۵ ص ۸۔

۱۰۔ فَقُلۡتُ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ

۱۱۔ يُّرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا ۙ

۱۲۔ وَّيُمۡدِدۡكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ جَنّٰتٍ وَّيَجۡعَلۡ لَّكُمۡ اَنۡهٰرًا ؕ

۱۳۔ مَا لَكُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ۚ

۱۴۔ وَقَدۡ خَلَقَكُمۡ اَطۡوَارًا

ترجمہ

۱۰۔ میں نے ان سے کہا: اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو، وہ بہت بخشنے والا ہے۔

۱۱۔ تاکہ وہ آسمان کی پُر برکت بارشیں پے در پے تم پر بھیجے۔

۱۲۔ اور تمھاری فراواں مال و دولت سے مدد کرے، اور تمھارے لیے سرسبز باغات اور نہریں جاری کرے۔

۱۳۔ تم خدا کی عظمت کے قائل کیوں نہیں ہوتے؟

۱۴۔ حالانکہ اس نے تمھیں مختلف مرحلوں میں پیدا کیا ہے۔

تفسیر

ایمان کی دنیاوی جزا

نوحؑ اس ہٹ دھرم اور سرکش قوم کی ہدایت کے لیے، اپنے مؤثر بیانات کو جاری رکھتے ہوئے، اس مرتبہ بشارت و تشویق پر تکیہ کرتے ہیں اور انھیں تاکید کے ساتھ یہ وعدہ دیتے ہیں کہ اگر وہ شرک و گناہ سے توبہ کرلیں، تو خدا ان پر اپنی رحمت کے دروازے ہر طرف سے کھول دے گا ارشاد ہوتا ہے: "خداوندا! میں نے ان سے کہا ہے کہ تم اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو وہ بہت ہی بخشنے والا ہے (فقلت استغفروا ربکم انه کان غفارًا)۔

نہ صرف یہ کہ وہ تمھیں گناہوں سے پاک کردے گا، بلکہ "اگر تم ایسا کرو تو وہ تم پر آسمان سے برکت والی بارشیں پے در پے نازل

کرے گا" (یرسل السماء علیکم مدرارًا)۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ اس کی معنوی رحمت کی بارش بھی، اور مادی برکت پر برکت بارش بھی تم پر نازل ہوگی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ کہتا ہے: "آسمان کو تم پر بھیجے گا" یعنی اس قدر بارش ہوگی کہ گویا آسمان برس رہا ہے! لیکن چونکہ وہ رحمت کی بارش ہوگی، لہٰذا نہ تو اس سے کوئی ویرانی اور تباہی ہوگی، اور نہ ہی کوئی تکلیف پہنچے گی، بلکہ وہ ہر جگہ خوشی و خرمی اور سرسبزی و شادابی کا باعث ہوگی۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور تمھارے مال و اولاد میں زیادتی کرے گا" (و یمددکم باموال و بنین)۔

"اور تمھارے لیے سرسبز و شاداب باغ، اور رواں پانی کی نہریں قرار دے گا" (و یجعل لکم جنات و یجعل لکم انھارًا)۔

اس طرح سے انھیں ایک عظیم معنوی نعمت، اور پانچ عظیم مادی نعمتوں کی وعدہ دی ہے۔ معنوی عظیم نعمت تو گناہوں کی بخشش اور کفر و عصیان کی آلودگی سے پاک ہونا ہے۔ باقی رہی مادی نعمتیں تو وہ مفید، برموقع اور پر برکت بارشوں کا نازل ہونا، مال کی زیادتی، اولاد کی فراوانی، (انسانی سرمایہ) پر برکت باغات اور جاری پانی کی نہریں۔

ہاں قرآن مجید کی گواہی کے مطابق، ایمان و تقویٰ، دنیا کی آبادی کا سبب بھی ہے اور آخرت کی آبادی کا موجب بھی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب اس ہٹ دھرم قوم نے نوحؑ کی دعوت کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیا، تو خشک سالی اور قحط نے انھیں گھیر لیا، اور ان کے بہت سے اموال و اولاد تباہ و ہلاک ہوگئے، عورتیں بانجھ ہوگئیں اور ان کے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا تو نوحؑ نے ان سے کہا: اگر تم ایمان لے آؤ تو یہ تمام مصیبتیں اور بلائیں تم سے دور ہوجائیں گی، لیکن انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی اور اسی طرح سے سختی پر قائم رہے، یہاں تک کہ آخری عذاب آپہنچا جس نے سب کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد پھر دوبارہ ڈرانے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں: "تم خدا سے ڈرتے کیوں نہیں اور خدا کی عظمت کے قائل کیوں نہیں ہوتے"؟! (مالکم لا ترجون للہ وقارًا)۔[2]

"حالانکہ خدا نے تمھیں گوناگوں طریقے کی خلقتیں دی ہیں" (وقد خلقکم اطوارًا)۔

۱۔ "مدرار" "در" (بروزن حر) کے مادہ سے اصل میں پستان مادر سے "دودھ" کے گرنے کے معنی میں ہے اور پھر بارش برسنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ "مدرار" مبالغہ کا صیغہ ہے۔

۲۔ "وقار" وزن اور عظمت کے معنی میں ہے اور "ترجون" "رجاء" کے مادہ سے، امید کے معنی میں ہے جو بعض اوقات خوف سے توأم ہوتا ہے۔ اور سارے جملہ کا معنی یہ ہے کہ تم عظمت خدا کے مقابلہ میں خضوع کیوں نہیں کرتے۔

پہلے تو ایک بے قدر و قیمت "نطفہ" تھے، زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ تمہیں "علقہ" بنادیا اور اس کے بعد "مضغہ" کی صورت میں لے آیا، اس کے بعد اس نے تمہیں انسانی شکل و صورت اور جسم عطا کیا، پھر تمہارے جسم کو لباس حیات پہنایا اور تمہیں روح اور حس و حرکت دی، اسی طرح سے تم نے یکے بعد دیگرے مختلف جنینی مراحل طے کیے، یہاں تک کہ تم ایک کمل انسان کی شکل و صورت میں، ماں سے پیدا ہو گئے اس کے بعد زندگی کے مختلف اطوار اور زندگی کی مختلف شکلیں شروع ہو گئیں۔ تم ہمیشہ اس کی ربوبیت کے ماتحت رہے ہو اور ہمیشہ نئی سے نئی حالت اختیار کرتے ہو اور ایک جدید خلقت حاصل کرتے ہو، تو پھر تم اپنے خالق کے باعظمت آستانے پر سر تعظیم کیوں نہیں جھکاتے۔

نہ صرف جسمانی لحاظ سے تم مختلف شکلیں بدلتے ہو بلکہ تمہاری روح اور جان بھی ہمیشہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ تم میں سے ہر ایک، ایک نئی استعداد رکھتا ہے، اور ہر سر میں ایک نیا ذوق اور ہر دل میں ایک نیا شوق ہے اور تم سب کے سب ہمیشہ بدلتے رہتے ہو۔ بچپنے کے احساسات اپنی جگہ جوانی کو دے دیتے ہیں اور جوانی اپنے احساسات ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کے احساسات کے حوالے کر دیتی ہے۔

اس طرح وہ ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے اور ہر قدم پر تمہاری رہبری اور ہدایت کرتا ہے اور اس کے اس سارے لطف و عنایت کے باوجود یہ کفران اور بے حرمتی کس بناء پر ہے۔؟

ایک نکتہ

"تقویٰ" اور "عمران و آبادی" میں ربط:

قرآن کی مختلف آیات سے، منجملہ ان کے اوپر والی آیات سے یہ نکتہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے، کہ ایمان و عدالت، معاشروں کی آبادی کا باعث ہیں اور کفر، ظلم اور گناہ ویرانی و تباہی کا سبب ہیں۔

سورۂ اعراف کی آیہ ۹۶ میں آیا ہے، ولو ان اھل القری اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض "اگر شہروں اور بستیوں میں رہنے والے ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم آسمان و زمین کی برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیتے۔

اور سورۂ روم کی آیہ ۴۱ میں آیا ہے، ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس۔ "خشکی اور سمندر میں، لوگوں کے اعمال کی وجہ سے فساد برپا ہو گیا ہے۔

اور سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۰ میں آیا ہے: وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم۔ "جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے، وہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے"۔

اور سورۂ مائدہ کی آیہ ۶۶ میں آیا ہے ولو انھم اقاموا التوراۃ والانجیل وما انزل الیھم من ربھم لاکلوا من فوقھم ومن تحت ارجلھم "اگر وہ تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے ان پر نازل ہوا ہے اسے قائم رکھتے، تو وہ آسمان و زمین سے روزی کھاتے" (اور آسمان اور زمین کی برکتیں انھیں گھیر لیتیں)، اور اسی قسم کی دوسری آیات مزید ہیں۔

یہ "رابطہ" صرف ایک باطنی ومعنوی رابطہ ہی نہیں ہے، بلکہ معنوی رابطہ کے علاوہ ـــــــ جس کے آثار ہمیں اچھی طرح دکھائی دیتے ہیں ـــــــ ایک واضح مادی رابطہ بھی ہے۔

کفر و بے ایمانی، مسئولیت کے عدم احساس، قانون شکنی اور اخلاقی اقدار کو فراموش کرنے کا سرچشمہ بھی ہے اور یہ امور معاشروں کی وحدت کے ختم ہونے، اعتماد و اطمینان کے پایوں کے متزلزل ہونے، اقتصادی و انسانی قوتوں کے ضائع ہونے، اور اجتماعی اعتدال کے درہم برہم ہونے کا سبب بھی ہیں۔

واضح رہے کہ وہ معاشرہ جس پر ان امور کی حکمرانی ہو وہ بہت جلد پیچھے چلا جاتا ہے، اور سقوط و نابودی کی راہ پر چل پڑتا ہے اور اگر ہم کچھ معاشروں کو دیکھتے ہیں، کہ وہ ایمان وتقویٰ کے نہ ہونے کے باوجود، مادی حالت کے سلسلہ میں، پیش رفت کر رہے ہیں تو اسے بھی بعض اخلاقی اصولوں کی رعایت کا مرہونِ منت سمجھنا چاہیے، جو گزشتہ انبیاء کی میراث اور خدائی رہبروں، علماء اور دانش مندوں کی صدیوں کی طویل زحمتوں کا نتیجہ ہے۔

اوپر والی آیات کے علاوہ اسلامی روایات میں بھی اس معنی پر بہت زیادہ تکیہ ہوا ہے کہ استغفار اور ترکِ گناہ، روزی کی کثرت اور زندگی کی بہبود کا سبب ہیں، منجملہ ان کے:

ایک حدیث میں علیؑ سے آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

اکثر الاستغفار تجلب الرزق

زیادہ استغفار کر، تاکہ تو روزی کو جلب کرے[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے اس طرح نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

من انعم الله علیه نعمة فلیحمد الله تعالٰی، ومن استبطأ الرزق فلیستغفر الله، ومن حزنه امر فلیقل، لاحول ولا قوة الا بالله

"جسے خدا نے کوئی نعمت بخشی ہے، وہ خدا کا شکر بجا لائے، اور جس کی روزی میں کچھ تاخیر ہو تو وہ استغفار اور طلبِ بخشش کرے، اور جو کسی حادثہ کی وجہ سے غمگین ہو تو وہ "لاحول ولا قوة إلا بالله" کہے[2]

نہج البلاغہ میں بھی یہ آیا ہے کہ:

وقد جعل الله سبحانه الاستغفار سببًا لدرور الرزق ورحمة الخلق، فقال سبحانه استغفروا ربکم انه کان غفارًا یرسل السماء علیکم مدرارًا ......"

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۴

[2] ایضاً

" خداوند سبحان نے استغفار کو روزی کی زیادتی ، اور مخلوق کے لیے رحمت قرار دیا ہے ، اور فرمایا ہے کہ اپنے پروردگار سے بخشش طلب کرو ، کہ وہ بہت بخشنے والا ہے ، اور وہ آسمانوں کی برکتوں والی بارش تم پر برساتا ہے "[1]

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے گناہوں کی سزا ، اسی جہان کی محرومیاں ہیں اور جب انسان اس سے توبہ کر کے پاکیزگی اور تقویٰ کی راہ اختیار کر لیتا ہے تو خدا اس عذاب اور سزا کو اس سے برطرف کر دیتا ہے ۔[2]

---

[1] " نہج البلاغہ " خطبہ ۱۴۳

[2] ہم نے اس سلسلہ میں " گناہ اور معاشروں کی تباہی " کے عنوان کے تحت ، سورۂ ہود کی آیہ ۲۰ کے ذیل میں ، ایک اور تشریح بھی کی ہے
تفسیر نمونہ جلد ۹ ص ۱۲۱

۱۵۔ أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ۝

۱۶۔ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝

۱۷۔ وَاللَّهُ أَنْبَتَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا ۝

۱۸۔ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا ۝

۱۹۔ وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًا ۝

۲۰۔ لِتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝

ترجمہ

۱۵۔ کیا تم دیکھتے نہیں، کہ خدا نے سات آسمانوں کو، ایک دوسرے کے اوپر کس طرح سے خلق کیا ہے؟

۱۶۔ اور چاند کو آسمانوں کے درمیان روشنی کا باعث اور سورج کو چراغ فروزاں قرار دیا۔

۱۷۔ اور خدا نے تمھیں نباتات کی طرح سے زمین سے اگایا ہے۔

۱۸۔ پھر تمھیں اسی زمین کی طرف لوٹائے گا اور پھر تمھیں دوبارہ نکال کھڑا کرے گا۔

۱۹۔ اور خدا نے زمین کو تمھارے لیے بچھا ہوا فرش قرار دیا ہے۔

۲۰۔ تاکہ تم اس کے وسیع راستوں اور درّوں سے گزرو (اور جہاں جانا چاہو..... چلے جاؤ)۔

تفسیر

باغبانِ ہستی نے تمھیں ایک پھول کی طرح پالا ہے

حضرت "نوحؑ" ہٹ دھرم مشرکین کے مقابلہ میں، اپنے گہرے اور استدلالی بیانات کے ذریعہ، پہلے تو ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کے وجود کی گہرائیوں میں لے گئے، تاکہ وہ آیات انفسی کا مشاہدہ کریں (جیسا کہ گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے۔ اس کے بعد جیسا کہ زیر بحث آیات میں بیان ہوا ہے، انھیں خلقت و آفرینش کے عالم بزرگ میں خدا کی نشانیوں کے مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔ اور انھیں آفاق کی سیر کی طرف لے جاتے ہیں [1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

پہلے آسمان سے شروع کرتے ہوئے کہتا ہے: "کیا تم دیکھتے نہیں کہ خدا نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر کس طرح سے پیدا کیا ہے" (الم تروا کیف خلق اللہ سبع سماوات طباقاً)۔[1]

"طباق" باب "مفاعلہ" کا مصدر ہے جو "مطابقہ" کے معنی میں ہے جو بعض اوقات ایک چیز کے دوسری چیز پر قرار پانے کے معنی میں آتا ہے، اور کبھی دو چیزوں کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور مطابقت کے معنی میں ہوتا ہے، اور یہاں دونوں معنی صادق آتے ہیں۔

پہلے معنی کے مطابق ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں، اور ساتوں آسمانوں کی تفسیر میں جس طرح پر ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ایک قابل توجہ تفسیر یہ ہے کہ وہ تمام ثوابت و سیار ستارے، جنہیں ہم خوردبینوں کے ذریعے یا بغیر خوردبینوں کے آنکھ سے دیکھتے ہیں، وہ سب کے سب پہلے آسمان کا حصہ ہیں اور دوسرے چھ عالم اس کے بعد ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں، جو موجودہ زمانہ کے انسان کی پہنچ سے باہر ہیں اور ممکن ہے کہ آئندہ کسی زمانہ میں انسان یہ لیاقت و استعداد پیدا کرے کہ وہ ان عجیب اور وسیع عوالم کو بھی ایک دوسرے کے بعد معلوم کرے۔[2]

اور دوسرے احتمال کی بناء پر، قرآن سات آسمانوں کی نظم و ضبط اور عظمت و زیبائی میں، ایک دوسرے سے ہم آہنگی اور مطابقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: خدا نے چاند کو سات آسمانوں کے درمیان، تمہارے لیے نور اور روشنی کا سبب اور سورج کو چراغ فروزاں قرار دیا ہے۔[3] (وجعل القمر فیھن نوراً و جعل الشمس سراجاً)۔

یہ ٹھیک ہے کہ سات آسمانوں میں لاکھوں اور اربوں چمکنے والے ستارے ہیں، جو ہمارے سورج اور چاند سے بھی زیادہ روشن ہیں، لیکن جو ہمارے لیے اہم ہے اور ہماری زندگی میں اثرانداز ہے وہ نظام شمسی کا یہی سورج اور چاند ہے۔ جن میں سے ایک تو ہماری فضائے زندگی کو دنوں میں اور دوسرا راتوں میں روشن کرتا ہے۔[4]

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) [1] اس بارے میں کہ یہ باتیں نوح کے کلام کا تتمہ اور آخری حصہ ہے یا ایسے مستقل جملے ہیں جو خدا کی طرف سے مسلمانوں کے خطاب کے لیے بطور جملہ معترضہ کے صادر ہوتے ہیں۔ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن ان میں سے بعض نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ نوح کے کلام کا تتمہ ہے اور آیات کا ظاہر بھی اسی بات کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اگر ان آیات کے بعد "و قال نوح" کا جملہ آیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نوح لوگوں سے اپنی بات ختم کرنے کے بعد بارگاہ خدا کی طرف رخ کرکے ان کی شکایت کرتے ہیں۔

حاشیہ صفحہ ھٰذا، [1] "طباقاً" ممکن ہے مفعول مطلق ہو، یا حال ہو۔

[2] سات آسمانوں کی گوناگوں تفاسیر کے بارے میں ہم سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۹ کے ذیل میں (جلد اول تفسیر نمونہ میں) تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

[3] یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ "فیھن" کی ضمیر جو کہ "سبع سماوات" کی طرف لوٹتی ہے کوئی مشکل پیدا نہیں کرتی، کیونکہ گفتگو ہمارے لیے نور اور روشنی کی ہے۔ اس لیے ہمارے لیے لازم نہیں ہے کہ ہم "فی" کو "مع" کے معنی میں یا "ھن" کی ضمیر کو "پہلے آسمان" کے معنی میں لیں۔

" سراج " (چراغ) کی سورج کے لیے تعبیر اور " نور" کی " چاند " کے لیے تعبیر اس بناء پر ہے کہ " سورج " کی روشنی تو خود چراغ کی طرح اسی کے اندر سے پھوٹتی ہے، لیکن چاند کا نور خود اسی میں سے نہیں ہے، بلکہ وہ اس عکس کے مشابہ ہے جو آئینہ سے منعکس ہوتا ہے اسی لیے لفظ " نور " جو ایک عام مفہوم رکھتا ہے اس کے بارے میں استعمال ہوا ہے۔

تعبیر کا یہ فرق قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتا ہے۔

ہم اس سلسلے میں سورۂ یونس کی آیہ ۵ کے ذیل میں (جلد ۸ ص ۴۰۶) بہت زیادہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

اس کے بعد دوبارہ انسان کی خلقت کی طرف لوٹتا ہے اور مزید کہتا ہے: " خدا نے تمہیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا ہے"

(واللہ انبتکم من الارض نباتاً)۔[1]

انسان کے بارے میں " انبات " کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ اولاً انسان کی پہلی خلقت مٹی سے ہے اور ثانیاً تمام غذائیں جو انسان کھاتا ہے اور جن کی وجہ سے نشوونما پاتا ہے، وہ سب زمین سے ہیں۔ یا تو وہ براہِ راست زمین سے ہوتی ہیں جیسے سبزیاں، غلے اور پھل یا غیر مستقیم طور پر مثلاً جانوروں کے گوشت اور ثالثاً انسان اور نباتات کے درمیان بہت زیادہ مشابہت ہے اور بہت سے ایسے قوانین جو نباتات کی غذا، تولید مثل اور نشوونما میں کار فرما ہیں وہ انسان پر بھی لاگو ہیں۔

یہ تعبیر انسان کے بارے میں بہت پُر معنی ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ مسئلہ ہدایت میں خدا کا کام صرف ایک معلم واستاد کا کام ہی نہیں ہے، بلکہ اس کا کام ایک باغبان کی طرح ہے جو نباتات کے بیج کو ایک مساعد ماحول میں قرار دیتا ہے تاکہ ان میں چھپی ہوئی استعداد ظہور میں آئے۔

سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۳۷ میں حضرت مریم کے بارے میں بھی یہ آیا ہے: وانبتھا نباتاً حسناً: " خدا نے بہت ہی اچھے طریقے سے مریم کے وجود کو پیدا کیا اور اس کی پرورش کی " یہ سب اسی لطیف نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد مسئلہ معاد کی طرف، جو مشرکین کے لیے پیچیدہ مسائل میں سے ایک ہے، متوجہ ہوتا ہے اور فرماتا ہے: " اس کے بعد وہ تمہیں اسی زمین کی طرف، جس سے اس نے تمہیں اگایا تھا، دوبارہ پلٹا دے گا اور پھر دوبارہ تمہیں اس سے نکال کھڑا کرے گا (ثم یعیدکم فیھا و یخرجکم اخراجاً)۔

ابتداء میں بھی تم مٹی ہی تھے، پھر دوبارہ مٹی کی طرف لوٹ جاؤ گے اور وہی ذات جس میں یہ قدرت تھی کہ تمہیں ابتداء میں مٹی سے پیدا کرے، یہ قدرت رکھتی ہے کہ دوبارہ مٹی ہو جانے کے بعد، تمہارے جسم پر دوبارہ لباسِ حیات پہنا دے۔

مسئلہ " توحید " سے " معاد " کی طرف یہ انتقال، جو اوپر والی آیات میں بہت ہی عمدہ طریقہ پر منعکس ہوا ہے، ان دونوں مسئلوں کے نزدیکی ربط کو بیان کرتا ہے اور اس طرح نوحؑ، مخالفین کے مقابلہ میں، نظامِ آفرینش کے طریق سے، توحید پر بھی استدلال کرتے ہیں،

---

[1] اس آیت میں ایک قاعدے کے لحاظ سے تو " انباتا " کہا جانا چاہیے تھا، لیکن آیت میں کچھ مقدر ہے اور وہ اس طرح ہے انبتکم من الارض فنبتم نباتاً " (تفسیر فخر رازی و ابو الفتوح رازی)

اور اسی طریقہ سے معاد پر بھی استدلال کرتے ہیں ۔

اس کے بعد پھر نئے سرے سے آیاتِ آفاقی اور عالمِ کبیر میں توحید کی نشانیوں کی طرف لوٹتا ہے اور زمین کے وجود کی نعمت کے متعلق گفتگو کرتا ہے، فرماتا ہے: "خدا نے زمین کو تمھارے لیے بچھا ہوا فرش قرار دیا۔ (و اللہ جعل لکم الارض بساطًا)۔[1]

یہ نہ تو ایسی سخت ہے کہ اس پر آرام اور آمد و رفت ہی نہ کرسکو اور نہ ایسی نرم کہ تم اس میں دھنس جاؤ اور اس پر چل پھر ہی نہ سکو ۔

اور نہ یہ ایسی گرم اور جلانے والی ہے کہ اس پر گرمی کی وجہ سے تکلیف اٹھاؤ اور نہ ایسی سرد اور بے حرارت ہے کہ اس پر زندگی بسر کرنا تمھارے لیے مشکل ہو جائے۔ اس کے علاوہ وہ ایک ایسا وسیع آمادہ و تیار فرش ہے۔ جس میں تمھاری زندگی کی تمام ضروریات موجود ہیں ۔

نہ صرف ہموار زمینیں ہی فرش کی طرح بچھی ہوئی ہیں بلکہ پہاڑ بھی، ان دروں اور شگافوں کی وجہ سے، جو ان کے درمیان موجود ہیں اور عبور کرنے کے قابل ہیں، بچھے ہوئے فرش ہی ہیں ۔ ہدف و مقصد یہ ہے کہ تم ان وسیع راستوں اور دروں سے، جو اس زمین میں موجود ہیں، گزر سکو اور جس علاقہ میں جانا چاہو جا سکو" (لتسلکوا منها سبلًا فجاجا)۔

" فجاج " (بروزن مزاج) جمع ہے " فج " (بروزن حج) کی ، اس درہ کے معنی میں ہے جو دو پہاڑوں کے درمیان ہوتا ہے ۔ اور وسیع و کشادہ راستہ کو بھی کہا جاتا ہے ۔[2]

اس طرح " نوح " اپنی گفتگو کے اس حصہ میں، کبھی تو آسمانوں اور آسمان کے ستاروں میں خدا کی نشانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کبھی گرتا زمین میں اس کی گوناگوں نعمتوں کی طرف، اور کبھی انسان کی ساخت اور اس کی حیات کے مسئلہ کی طرف جو خدا کی شناخت کی بھی ایک دلیل ہے اور مسئلہ معاد کے اثبات کے لیے بھی ۔

لیکن نہ تو پہلے انذاروں، بشارتوں اور تشویقوں نے اس ہٹ دھرم قوم کے سیاہ دلوں میں کوئی اثر کیا اور نہ ہی کسی منطقی استدلال نے، وہ اسی طرح سے مخالفت اور کفر پر ٹکے رہے اور حق کو قبول کرنے سے پہلو تہی کرتے رہے، جیسا کہ بعد والی آیات میں ان کی خیرہ سری کا انجام بیان ہوا ہے ۔

---

[1] " بساط " " بسط " کے مادہ سے کسی چیز کو پھیلانے کے معنی میں ہے، اس لیے لفظ " بساط " ہر پھیلی ہوئی وسیع چیز کو کہا جاتا ہے جس کا ایک مصداق فرش ہے ۔

[2] مفردات " راغب " مادہ " فج "

۲۱۔ قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا ۚ

۲۲۔ وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا ۚ

۲۳۔ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا یَغُوْثَ وَیَعُوْقَ وَنَسْرًا ۚ

۲۴۔ وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِیْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ○

۲۵۔ مِمَّا خَطِیْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا ○

ترجمہ

۲۱۔ نوحؑ نے (ان کی ہدایت سے مایوس ہونے کے بعد) عرض کیا: پروردگارا! انھوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کی پیروی کی، جن کے مال اور اولاد نے خسارے کے سوا ان میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔

۲۲۔ اور (ان گمراہ راہبروں نے) ایک عظیم مکر کیا۔

۲۳۔ اور انھوں نے یہ کہا کہ: اپنے خداؤں اور بتوں سے دستبردار نہ ہونا خصوصاً "ود" و "سواع" و "یغوث" و "یعوق" و "نسر" کو نہ چھوڑنا۔

۲۴۔ اور انھوں نے بہت سے گروہوں کو گمراہ کر دیا۔ خداوندا! ظالموں میں ضلالت اور گمراہی۔ کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہ کرنا۔

۲۵۔ (ہاں! آخرکار) وہ سب کے سب اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہوگئے اور جہنم کی آگ میں داخل ہوئے اور انھیں اپنے لیے خدا کے سوا اور کوئی یار ومددگار نہ ملا۔

تفسیر

خدا کا لطف تجھ سے مدارات کرتا ہے

جب نوح نے سینکڑوں سال تک اپنی پوری کوشش کر کے دیکھ لی اور وہ قوم ایک چھوٹے سے گروہ کے سوا، اسی طرح کفر بت پرستی، گمراہی اور فساد پر ڈٹی رہی، تو وہ ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے اور بارگاہِ خدا کی طرف رخ کیا، اور ایک استدلالی مناجات کے ضمن میں خدا سے ان کے لیے عذاب کا تقاضا کیا، جیسا کہ زیر بحث آیت میں آیا۔

نوح نے کہا: پروردگارا! انھوں نے میری نافرمانی کی اور ایسے شخص کی پیروی کی جس کے مال و اولاد نے خسارے کے سوا اس میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا (قال نوح رب انھم عصونی واتبعوا من لم یزدہ مالہ وولدہ الا خسارًا)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس قوم کے رہبر ایسے لوگ ہیں جن کا امتیاز مال و اولاد کی زیادتی ہے اور وہ مال و اولاد بھی ایسے جو فساد و خسرانی کے سوا کسی کام نہیں آتے، نہ تو وہ مخلوق ہی کی خدمت کرتے ہیں اور نہ ہی خالق کے سامنے خضوع و خشوع کرتے ہیں اور یہ کثرت وسائل و امکانات ان کے غرور و طغیان اور سرکشی کا سبب بن گئے ہیں۔

اگر ہم نوعِ بشر کی تاریخ کی طرف نگاہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ مختلف قوموں کے بہت سے رہبر اسی قماش کے تھے، وہ ایسے لوگ تھے جن کا تنہا امتیاز، مالِ حرام جمع کرنا اور غیر صالح اولاد کو وجود میں لانا اور اس کے بعد سرکشی اور طغیان اور آخر میں اپنے افکار و نظریات، مستضعف اور کمزور لوگوں پر لادنا اور انھیں زنجیروں میں جکڑنا تھا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ان گمراہ راہبروں نے مکرِ عظیم کیا" (و مکروا مکرًا کبارًا)۔

"کبار" "کبیر" سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہاں نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو گمراہ کرنے اور نوح کی دعوت کو قبول کرنے سے روکنے کے لیے بہت عظیم اور وسیع شیطانی منصوبے بنا رکھے تھے۔ لیکن وہ منصوبے کیا تھے، ٹھیک طور پر مشخص نہیں ہیں۔

احتمال یہ ہے کہ وہی بت پرستی کا مسئلہ ہوگا، کیونکہ بعض روایات کے مطابق، بُت پرستی نوح سے پہلے موجود نہیں تھی۔ بلکہ نوح کی قوم نے ہی اسے ایجاد کیا تھا۔ اس مسئلہ کا سرچشمہ یہ تھا کہ آدم اور نوح کے درمیانی زمانہ میں کچھ ایسے نیک اور صالح افراد ہو گزرے تھے۔ جن سے لوگ اظہار محبت کیا کرتے تھے۔ شیطان (اور شیطان صفت انسانوں) نے لوگوں کے اس لگاؤ اور محبت سے سوءِ استفادہ کیا اور انھیں ان بزرگوں کے مجسمے بنانے، اور ان مجسموں کی عزت و احترام کرنے کا شوق دلایا۔

لیکن کچھ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ بعد میں آنے والی نسلیں اس موضوع کے رابطہ تاریخی کو بھول گئیں اور انھوں نے خیال کیا کہ یہ مجسمے ایسے محترم موجودات ہیں، جن کی پرستش اور عبادت کرنا چاہیے اور اس طرح سے وہ بتوں کی پرستش میں سرگرم ہو گئے اور ظالم مستکبرین نے انھیں غفلت میں رکھ کر اس طریقے سے انھیں اپنی قید و بند میں لے لیا اور ایک عظیم مکر و فریب واقع ہوا۔

ہو سکتا ہے کہ بعد والی آیت اس مطلب کی گواہ ہو۔ کیونکہ اس عظیم مکر کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرنے کے بعد مزید کہتا ہے، "ان کے رؤسا نے کہا، اپنے خداؤں اور بتوں سے دستبردار نہ ہو" (و قالوا لا تذرن الھتکم)۔

اور خدائے یگانہ کے بارے میں نوح کی دعوت ہرگز قبول نہ کرنا، وہ خدا جو نہ تو دکھائی ہی دیتا ہے اور نہ ہی ہاتھ کے ساتھ چھونے کے قابل ہے۔

انھوں نے خصوصیت کے ساتھ انہیں پانچ بتوں کے بارے میں تاکید کی اور کہا: "ود"، "سواع"، "یغوث"، "یعوق" اور "نسر" کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ ان کے دامن کو چھوڑنا" (ولا تذرن وداً ولا سواعا ولا یغوث ویعوق ونسرا)۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانچوں بت کچھ خاص امتیازات رکھتے تھے اور وہ گمراہ قوم ان کی طرف خاص طور پر متوجہ تھی اور اسی بناء پر ان کے فرصت طلب رہبر بھی ان کی عبادت پر تکیہ کرتے تھے۔

یہ بات کہ یہ پانچ بت کہاں سے آئے؟ اس سلسلہ میں گوناگوں روایات ہیں۔

۱۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ پانچ نیک اور صالح افراد کے نام ہیں، جو نوح سے پہلے دنیا میں ہو گزرے ہیں، جب وہ دنیا سے چل بسے تو ابلیس کی تحریک پر لوگوں نے یادگار کے طور پر ان کے مجسمے بنا لیے اور ان کا احترام و عزت کرنے لگے اور آہستہ آہستہ بت پرستی کی صورت اختیار کر لی۔

۲۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ آدم کے پانچ بیٹوں کے نام ہیں، ان میں سے جب بھی کوئی دنیا سے جاتا تو اس کا مجسمہ یادگار کے طور پر بنا لیتے۔ لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد یہ تعلقات فراموش ہو گئے اور نوح کے زمانہ میں ان کی پرستش کی لہر دوڑ گئی۔

۳۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ یہ ان بتوں ہی کے نام ہیں جو خود نوح کے ہی زمانہ میں بنائے گئے تھے، اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ نوح لوگوں کو آدم کی قبر کے گرد طواف کرنے سے روکتے تھے تو ایک گروہ نے ابلیس کی تحریک پر اس کے کچھ مجسمے بنا لیے اور ان کی پرستش میں مشغول ہو گئے۔[1]

اتفاقاً یہ پانچوں بت زمانہ جاہلیت کے عربوں کی طرف منتقل ہو گئے، پھر ہر قبیلہ نے ان بتوں میں سے ایک کو اپنے لیے انتخاب کر لیا، البتہ یہ بات بہت بعید نظر آتی ہے کہ خود وہ بت منتقل ہوئے ہوں بلکہ ظاہر یہ ہے کہ ان کے نام منتقل ہوئے، اور انھوں نے ان ناموں کے بت بنا لیے، لیکن بعض مفسرین نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں بت طوفانِ نوح میں دفن ہو گئے تھے اور عربوں کے زمانۂ جاہلیت میں شیطان نے انھیں باہر نکالا اور لوگوں کو ان کی پرستش کی دعوت دی۔[2]

پھر اس بارے میں کہ زمانہ جاہلیت کے عرب قبائل میں یہ بت کس طرح تقسیم ہوئے، اختلاف ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ "ود" بت تو "بنی کلب" کے قبیلہ سے متعلق تھا جو سرزمین "دومۃ الجندل" میں رہتا تھا (وہ شہر جو تبوک کے نزدیک ہے اور جسے موجودہ زمانہ میں "جوف" کہتے ہیں) اور "سواع" "قبیلہ" ہذیل" سے جو سرزمین "رہاط" میں تھا، متعلق تھا، اور

---

[1] مجمع البیان، تفسیر علی بن ابراہیم، تفسیر ابو الفتوح رازی اور دوسری تفاسیر (زیر بحث آیات کے ذیل میں)
[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۰۷

"یغوث" بت "بنی قطیف" کے قبیلے سے یا "بنی مذحج" کے قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور "یعوق" قبیلہ ہمدان سے، اور "نسر" "ذی الکلاع" قبیلے سے جو حمیر کے قبائل میں سے تھا۔[۱]

مجموعی طور پر ان پانچ بتوں میں سے تین بت (یغوث، یعوق اور نسر) سرزمین یمن میں تھے۔ جو "ذو نواس" کے یمن پر تسلط سے ختم ہوگئے اور اس علاقہ کے لوگ دین یہود سے وابستہ ہوگئے۔[۲]

"واقدی" مشہور مؤرخ کہتا ہے کہ "ود" بت مرد کی شکل میں تھا اور "سواع" عورت کی شکل میں "یغوث" شیر کی صورت میں اور "یعوق" گھوڑے کی شکل اور "نسر" "باز" کی صورت میں (جو ایک معروف پرندہ ہے)۔[۳]

البتہ زمانہ جاہلیت کے عربوں ـــــ خصوصاً اہل مکہ ـــــ کے پاس اور بت بھی تھے۔ جن میں سے ایک بت "ہبل" تھا۔ جو ان کے بتوں میں سے سب سے بڑا تھا اور وہ خانہ کعبہ کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اس کا طول ۱۸ ہاتھ تھا۔ بت "اساف" حجر اسود کے مقابل تھا، اور بت "نائلہ" (خانہ کعبہ کے جنوبی کونہ میں) رکن یمانی کے سامنے تھا اور اسی طرح "لات" و "عزیٰ" بت تھے۔

اس کے بعد نوح مزید کہتے ہیں: "خداوندا! ان گمراہ اور خود غرض رہبروں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کردیا۔" (وقد اضلوا کثیراً)۔[۴]

"خداوندا! ظالموں میں ضلالت و گمراہی کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر" (ولا تزد الظالمین الا ضلالاً)۔

ظالموں اور ستم گروں میں ضلالت و گمراہی کو زیادہ کرنے سے مراد وہی ان سے توفیق الٰہی کا سلب ہونا ہے جو ان کی بدبختی کا سبب بن جاتا ہے جسے وہ اپنے ظلم کی وجہ سے پاتے ہیں، کیونکہ خدا نور ایمان کو ان سے چھین لیتا ہے اور کفر کی تاریکی کو اس کا جانشین بنا دیتا ہے۔

یہ ان کے اعمال کی خاصیت ہے۔ جس کی خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے، کیونکہ ہر موجود جو تاثیر بھی رکھتا ہے، وہ اسی کے حکم سے ہے (غور کیجیے)۔

جو کچھ بھی ہو، کفر و ایمان اور ہدایت و ضلالت کے سلسلہ میں وہ خداوند تعالیٰ کی حکمت کے ساتھ کسی قسم کی منافات نہیں رکھتا اور اختیار کے سلب ہونے کا سبب نہیں بنتا۔

آخر کار آخری زیر بحث آیت میں، اس سلسلہ میں آخری بات خدا یہ فرماتا ہے: "وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے غرق ہوگئے اور انھیں آگ میں

---

[۱] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۴ و اعلام القرآن ص ۶۲۱

[۲] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۴

[۳] "اضلوا" کی ضمیر اس گروہ کے دولت مند رؤسا اور رہبروں کی طرف لوٹتی ہے اور قرینہ اس کا گزشتہ آیت ہے جو یہ کہتی ہے: وقالوا لا تذرن اٰلھتکم "انھوں نے کہا کہ اپنے بتوں کو نہ چھوڑو" لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ ضمیر بتوں کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ وہی گمراہی کا سبب تھے (البتہ اسی کے مشابہ سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۶ میں بھی آیا ہے، لیکن جمع مذکر کی صورت میں نہیں بلکہ جمع مونث کی ضمیر کی صورت میں) لیکن یہ احتمال زیر بحث آیت میں بہت بعید نظر آتا ہے۔

داخل کر دیا گیا اور انھیں خدا کے سوا اور کوئی یار و مددگار نہ ملا جو اس کے خشم و غضب سے ان کا دفاع کرے"۔ (مما خطیئاتھم اغرقوا فادخلوا نارًا فلم یجدوا لھم من دون اللہ انصارًا)۔[1]

آیت کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ غرق ہونے کے بعد بلا فاصلہ آگ میں داخل کردیئے گئے اور یہ عجیب بات ہے کہ پانی میں سے فورًا آگ میں داخل ہوں، اور یہ آگ وہی برزخ والی آگ ہے، چونکہ قرآن مجید کی آیات کی گواہی کے مطابق ایک گروہ کو موت کے بعد عالم برزخ میں سزا ملے گی اور بعض روایات کے مطابق "قبر" یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس سے مراد قیامت کی آگ ہے لیکن چونکہ قیامت کا وقوع قطعی اور یقینی ہے اور اس میں کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے، لہٰذا فعل ماضی کی صورت میں ذکر ہوا ہے۔[2]

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اس سے مراد دنیا کی آگ ہے، کہتے ہیں کہ خدا کے حکم سے، طوفان کی انھیں موجوں کے درمیان ایک آگ ظاہر ہوئی اور انھیں نگل گئی۔[3]

---

[1] "مما خطیئاتھم" میں "من" یا سببیت یا لام تعلیل کے معنی میں ہے اور "ما" یہاں زائدہ اور تاکید کے لیے ہے۔

[2] "فخر رازی" نے اپنی تفسیر میں اسے ایک قول کے عنوان سے نقل کیا ہے جلد ۳۰ ص ۱۴۵

[3] تفسیر "ابوالفتوح رازی" جلد ۱۱ ص ۳۰۰

۲۶۔ وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝

۲۷۔ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝

۲۸۔ رَّبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۖ وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ۝

ترجمہ

۲۶۔ نوح نے کہا: پروردگارا! روئے زمین پر کفار میں سے کسی ایک کو بھی زندہ نہ رہنے دے۔

۲۷۔ کیونکہ اگر تو انھیں رہنے دے گا، تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور ایک فاجر و کافر نسل کے سوا کچھ وجود میں نہیں لائیں گے۔

۲۸۔ پروردگارا! مجھے بخش دے، اور اسی طرح میرے ماں باپ کو اور ان تمام لوگوں کو، جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ وارد ہوئے، اور تمام مومن مرد اور مومن عورتوں کو بخش دے، اور ظالموں میں ہلاکت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہ فرما۔

تفسیر

اس فاسد و مفسد قوم کو چلے جانا چاہیے!

یہ آیات اسی طرح سے، نوح کی گفتگو اور خدا کی بارگاہ میں قوم کی شکایت اور ان کے بارے میں بددعا اور نفرین کو جاری رکھے ہوئے ہیں، فرماتا ہے: "پروردگارا! کفار میں سے کسی کو روئے زمین پر زندہ نہ رہنے دے" (وقال نوح رب لا تذر علی

الارض من الکافرین دیارًا)۔

یہ بات انھوں نے اس وقت کہی جب وہ مکمل طور پر ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے تھے اور اپنی آخری کوشش ان کے ایمان لانے کے سلسلہ میں کر چکے تھے۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، اور صرف تھوڑے سے لوگ ان پر ایمان لائے۔

"علی الارض" (صفحۂ زمین پر) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ نوح کی دعوت بھی عالمی اور جہانی تھی اور وہ طوفان اور عذاب بھی جو بعد میں آیا عالمی تھا۔

"دیار" (بروزن سیار) "دار" کے مادہ سے، اس شخص کے معنی میں ہے جو گھر میں رہائش رکھتا ہو، یہ لفظ عام طور پر نفی عموم کے موارد میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے (ما فی الدار دیار) (گھر میں کوئی نہیں رہتا) [1]

اس کے بعد نوحؑ اپنی نفرین اور بد دعا کرنے کے بارے میں استدلال کرتے ہیں اور مزید کہتے ہیں: "کیونکہ اگر تو انھیں چھوڑ دے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کر دیں گے اور فاجر و کافر نسل کے سوا اور کچھ وجود میں نہیں لائیں گے"۔ (انك ان تذرھم یضلوا عبادك ولا یلدوا الا فاجرًا کفارًا)

یہ گفتگو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ انبیاء کی نفرین و بد دعا، جن میں نوح بھی ہیں، غیظ و غضب، انتقام جوئی اور کینہ پروری کی بناء پر نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ وہ ایک منطقی حساب کی صورت میں ہوتی تھی اور نوح کم حوصلہ افراد کی طرح نہیں تھے کہ تھوڑی سی بات کے لیے آپے سے باہر ہو جائیں اور نفرین و بد دعا کرنے لگ جائیں، بلکہ آپ نے نوسو پچاس (۹۵۰) سال کی دعوت، صبر و شکیبائی اور خون دل پینے اور مکمل مایوسی کے بعد نفرین کے لیے زبان کھولی تھی۔

اس بارے میں کہ نوحؑ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ اب یہ ایمان نہیں لائیں گے اور اس کے ساتھ وہ ان بندگانِ خدا کو جو اس ماحول میں رہتے تھے گمراہ کریں گے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کی آنے والی نسل بھی فاسد و مفسد ہو گی۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ اس غیب پر اطلاع و آگاہی کی بناء پر تھا جو خدا نے انھیں دیا تھا۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ نوحؑ نے اس مطلب کا وحی الٰہی سے استفادہ کیا تھا، جہاں فرماتا ہے: واوحی الی نوح انه لن یؤمن من قومك الا من قد اٰمن ۔ "نوح کی طرف وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے کوئی بھی شخص سوائے ان کے جو ایمان لا چکے ہیں، ایمان نہیں لائیں گے" سورہ ہود آیہ ۳۶) [2]

لیکن یہ احتمال بھی قابلِ قبول ہے کہ نوحؑ نے فطری عادت اور عمومی حساب سے اس حقیقت کو معلوم کر لیا تھا، کیونکہ وہ قوم جسے ساڑھے نوسو سال تک مؤثر ترین بیانات کے ساتھ تبلیغ کی گئی ہو، اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے ہوں، اس کی ہدایت کی امید نہ تھی اور چونکہ یہ کافر گروہ

---

[1] بعض کا کہنا ہے کہ اصل میں "دیوار" (بروزن حیوان) تھا، اس کے بعد "واؤ" "یاء" میں بدل گئی، اور یاء کا یاء میں ادغام ہو گیا (التبیان فی غرائب القرآن جلد ۲ ص ۴۶۵ و تفسیر فخر رازی، زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] اس معنی کی طرف بہت سی روایات میں اشارہ ہوا ہے (نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۸)

معاشرے میں قطعی اکثریت رکھتا تھا اور تمام وسائل و امکانات ان کے اختیار میں تھے۔ لہٰذا طبعاً وہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس قسم کی قوم کی آئندہ نسل قطعی طور پر فاسد اور خراب ہوتی۔ ان تینوں احتمالات کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

"فاجر" اس شخص کے معنی میں ہے جو بُرے اور قبیح گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور "کفار" "کفر" میں مبالغہ ہے۔ اس بناء پر ان دو الفاظ کے درمیان فرق یہ ہے کہ ان میں سے ایک عملی کاموں سے مربوط ہے اور دوسرا اعتقادی پہلوؤں سے۔

ان آیات کے مجموعہ سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے عذاب "حکمت" کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ وہ جمعیت جو فاسد و مفسد ہو اور ان کی آئندہ آنے والی نسلیں بھی فساد و گمراہی کے خطرے سے دوچار ہوں، وہ خدا کی حکمت میں زندگی اور حیات کا حق نہیں رکھتیں، طوفان یا صاعقہ (بجلی) یا زلزلہ یا کوئی اور دوسری بلا نازل ہوگی اور انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دے گی، جیسا کہ طوفانِ نوح نے زمین کو اس بری قوم کے وجود کی گندگی سے پاک کر دیا۔

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ قانونِ الٰہی کسی خاص زمانہ اور مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ ہمیں متوجہ رہنا چاہیے کہ اگر اس وقت بھی کوئی فاسد و مفسد قوم اور اس کی اولاد "فاجر" "کفار" ہو تو انہیں بھی عذابِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہیے، کیونکہ ان امور میں کوئی تبعیض نہیں ہے اور یہ ایک سنت الٰہی ہے۔

"یضلوا عبادك" (تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے) کی تعبیر ممکن ہے اس چھوٹے سے مومنین کے گروہ کی طرف اشارہ ہو، جو اس طویل مدت میں نوحؑ پر ایمان لایا تھا اور یہ بھی ممکن ہے کہ عامۃ الناس میں سے مستضعف لوگوں کی طرف اشارہ ہو جو گمراہ رہبروں کے دباؤ اور فشار سے ان کے دین و مذہب کی پیروی کرتے ہیں۔

آخر میں نوحؑ اپنے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائے تھے اس طرح دعا کرتے ہیں: پروردگارا! مجھے بخش دے اور اسی طرح میرے ماں باپ اور ان تمام لوگوں کو جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں داخل ہوئے تھے اور تمام مومنین و مومنات کو بھی بخش دے اور ظالموں کے لیے ہلاکت کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہ کر" (رب اغفر لی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنا وللمؤمنین والمؤمنات ولا تزد الظالمین الا تبارا[1])۔

یہ طلب مغفرت اس لیے ہے کہ نوحؑ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگرچہ میں نے صدہا سال مسلسل تبلیغ کی ہے، اور اس راہ میں ہر قسم کی تکلیف اور مصیبت جھیلی ہے، لیکن چونکہ ممکن ہے کہ اس مدت میں مجھ سے کوئی ترکِ اولیٰ سرزد ہو گیا ہو، تو میں اس کے بارے میں بھی عفو و بخشش کا تقاضا کرتا ہوں، اور تیری بارگاہ مقدس میں ہرگز خود کو بَری قرار نہیں دیتا۔

اور "اولیاء اللہ" کی حالت اسی طرح ہے کہ وہ راہِ خدا میں ہر قسم کی زحمت و تکلیف اور سعی و کوشش کے بعد بھی اپنے آپ کو مقصر سمجھتے ہیں اور ہرگز غرور و تکبر اور خود کو بڑا سمجھنے میں گرفتار نہیں ہوتے۔

نوحؑ حقیقت میں چند افراد کے لیے طلب مغفرت کرتے ہیں۔

---

[1] "تبار" ہلاکت کے معنی میں ہے اور "زیان اور خسارے" کے معنی میں بھی اس کی تفسیر ہوئی ہے۔

اوّل: اپنے لیے، اگر کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی قصور یا ترکِ اولیٰ ان سے سرزد ہو گیا ہو۔

دوم: اپنے ماں باپ کے لیے، ان کی زحمتوں کی قدر دانی کے باعث اور حق شناسی کے پیشِ نظر۔

سوم: تمام ان لوگوں کے لیے جو ان پر ایمان لائے، اگرچہ وہ بہت تھوڑے سے تھے اور پھر وہ آپ کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے کہ وہ کشتی بھی نوح کا گھر تھی۔

چہارم: تمام جہان اور طول تاریخ میں ایمان لانے والے مردوں اور عورتوں کے لیے، اور یہاں سے اپنا رابطہ سارے عالم کے مومنین سے برقرار کر رہے ہیں۔

لیکن آخر میں پھر ظالموں کی نابودی کی تاکید کرتے ہیں، جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے ظلم کی بناء پر اسی قسم کے عذاب کے مستحق ہیں۔

چند نکات

نوح پہلے اولوالعزم پیغمبر

قرآن مجید بہت سی آیات میں نوح کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور مجموعی طور پر قرآن کی انتیس سورتوں میں اس عظیم پیغمبر کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے، اور ان کا نام ۴۳ مرتبہ قرآن میں آیا ہے۔

قرآن مجید نے ان کی زندگی کے مختلف حصوں کی باریک بینی کے ساتھ تفصیل بیان کی ہے ایسے حصے جو زیادہ تر تعلیم و تربیت اور پند و نصیحت حاصل کرنے کے پہلوؤں سے مربوط ہیں۔

مورخین و مفسرین نے لکھا ہے کہ نوح کا نام "عبدالغفار" یا "عبدالملک" یا "عبدالاعلیٰ" تھا، اور "نوح" کا لقب انھیں اس لیے دیا گیا ہے، کیونکہ وہ سالہا سال اپنے اوپر یا اپنی قوم پر نوحہ گری کرتے رہے۔ آپ کے والد کا نام "لمک" یا "لامک" تھا۔ اور آپ کی عمر کی مدت میں اختلاف ہے۔ بعض روایات میں ۱۴۹۰ اور بعض میں ۲۵۰۰ سال بیان کی گئی ہے، اور ان کی قوم کے بارے میں بھی طولانی عمریں تقریباً ۳۰۰ سال تک لکھی ہیں، جو بات مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے بہت طولانی عمر پائی ہے، اور قرآن کی صراحت کے مطابق آپ ۹۵۰ سال اپنی قوم کے درمیان رہے (اور تبلیغ میں مشغول رہے)۔

نوح کے تین بیٹے تھے "حام" "سام" "یافث" اور مورخین کا نظریہ یہ ہے کہ کرۂ زمین کی اس وقت کی تمام نسلِ انسانی کی بازگشت انھیں تینوں فرزندوں کی طرف ہے۔ ایک گروہ "حامی" نسل ہے، جو افریقہ کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ دوسرا گروہ "سامی" نسل ہے جو شرق اوسط اور مشرقِ قریب کے علاقوں میں رہتے ہیں اور "یافث" کی نسل کو چین کے ساکنین سمجھتے ہیں۔

اس بارے میں بھی، کہ نوح طوفان کے بعد کتنے سال زندہ رہے، اختلاف ہے، بعض نے ۵۰ سال لکھے ہیں اور بعض نے ۶۰ سال۔

یہود کے منابع (موجودہ تورات) میں بھی نوح کی زندگی کے بارے میں تفصیلی بحث آئی ہے، جو کئی لحاظ سے قرآن سے مختلف ہے۔ اور تورات کی تحریف کی نشانیوں میں سے ہے۔

یہ مباحث تورات کے سفر "تکوین" میں فصل ۶، ۷، ۸، ۹ اور ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں۔

نوحؑ کا ایک اور بیٹا بھی تھا جس کا نام "کنعان" تھا۔ جس نے باپ سے اختلاف کیا، یہاں تک کہ کشتیٔ نجات میں ان کے ساتھ بیٹھنے کے لیے بھی تیار نہ ہوا۔ اس نے بُرے لوگوں کے ساتھ صحبت رکھی اور خاندانِ نبوت کی قدر و قیمت کو ضائع کر دیا اور قرآن کی صراحت کے مطابق آخرکار وہ بھی باقی کفار کے مانند طوفان میں غرق ہو گیا۔

اس بارے میں کہ اس طویل مدت میں کتنے افراد نوحؑ پر ایمان لائے، اور ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہوئے، اس میں بھی اختلاف ہے بعض نے ۸۰ اور بعض نے ۸ افراد لکھے ہیں۔

نوحؑ کی داستان عربی اور فارسی ادبیات میں بہت زیادہ بیان ہوئی ہے، اور زیادہ تر طوفان اور آپ کی کشتیٔ نجات پر تکیہ ہوا ہے[1]

نوحؑ صبر، شکر اور استقامت کی ایک داستان تھے، اور محققین کا کہنا ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انسانوں کی ہدایت کے لیے وحی کی منطق کے علاوہ عقل و استدلال کی منطق سے بھی مدد لی (جیسا کہ اس سورہ کی آیات سے اچھی طرح ظاہر ہے) اور اسی بناء پر آپ اس جہان کے تمام خدا پرستوں پر ایک عظیم حق رکھتے تھے۔

ہم نوحؑ کے حالات کی تشریح کو امام باقرؑ کی ایک حدیث پر ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: نوحؑ غروبِ آفتاب اور صبح کے وقت یہ دعا اور مناجات پڑھا کرتے تھے۔

"امسیت اشهد انه ما امسی بی من نعمة فی دین او دنیا فانها من الله وحده لا شریك له، له الحمد بها علی والشكر كثیرا فانزل الله: "انه كان عبدا شكورا" فهذا كان شكره"

میں نے اس حالت میں شام کی ہے کہ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ دین و دنیا کی جو نعمت میں رکھتا ہوں، وہ اس خدائے یگانہ کی طرف سے ہے، جس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور میں اس کی نعمتوں پر اس کی حمد و ثنا کرتا ہوں اور اس کا بہت بہت شکر کرتا ہوں۔

اسی بناء پر خدا نے قرآن میں یہ نازل فرمایا ہے کہ وہ شکرگزار بندہ تھا اور نوحؑ کا شکر اسی طرح کا تھا[2]

۲۔ "رب اغفرلی ولوالدی ولمن دخل بیتی مؤمنا" "پروردگارا! مجھے، میرے ماں باپ کو اور جو شخص میرے گھر میں مومن وارد ہو بخش دے"۔ کے جملہ میں لفظ "بیت" کے معنی میں اختلاف ہے مجموعی طور پر اس کے چار معانی بیان کیے گئے ہیں بعض نے اسے شخصی اور ذاتی گھر کے معنی میں لیا ہے

---

[1] "اعلام القرآن"، "فرہنگ قصص قرآن"، "دائرۃ المعارف دھخدا" مادہ "نوح" و "بحار الانوار جلد ۱۱"

[2] بحار الانوار جلد ۱۱ ص ۲۹۱ حدیث ۲

بعض مسجد کے معنی میں لیتے ہیں۔
بعض کشتی نوح کے معنی میں لیتے ہیں اور
بعض ان کے دین وآئین وشریعت کے معنی میں جانتے ہیں۔
ایک حدیث میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:
"یہاں بیت سے مراد ولایت ہے، جو شخص ولایت میں داخل ہوا وہ انبیاء کے گھر میں داخل ہوا ہے:"
"من دخل فی الولایۃ دخل فی بیت الانبیاء علیہم السلام"

خداوندا! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم ولایت آئمہ اہل بیت کو قبول کرنے کے طریق سے بیت انبیاء میں داخل ہوں۔
پروردگارا! ہمیں ایسی استقامت عطا فرما کہ ہم نوحؑ جیسے بزرگ انبیاء کے مانند تیرے دین وآئین کی طرف دعوت کی راہ میں خستہ نہ ہوں، اور ہرگز تھک ہار کر نہ بیٹھ جائیں۔
بارالٰہا! جس وقت تیرے خشم وغضب کا طوفان آئے تو ہمیں اپنے لطف ورحمت کی نجات کی کشتی کے ذریعہ رہائی بخش دے۔

آمین یارب العالمین
اختتام سورۂ نوح
اوّل ماہ محرم الحرام ۷۔۸ھ

اختتام ترجمہ بوقت تقریباً پونے سات بجے صبح
۲۱ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۵ ستمبر ۱۹۸۷ء
۱۸۰ ای ماڈل ٹاؤن۔ لاہور
صفدر حسین نجفی

سورۂ جن

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اور

اس کی ۲۸ آیات ہیں

شروع

۲۰ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

سورۂ جن کے مضامین ومطالب

یہ سورہ جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، زیادہ تر ایک دکھائی نہ دینے والی مخلوق کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جسے "جن" کہتے ہیں۔ یہ گفتگو ان کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے، قرآن مجید کے مقابلہ میں خضوع کرنے، معاد پر ان کے ایمان و اعتقاد، ان کے درمیان مومن وکافر گروہ کے وجود اور اسی قسم کے دوسرے مسائل سے متعلق ہے۔ سورہ کا یہ حصہ ابتدائیں آیات میں سے انیس آیات میں پھیلا ہوا ہے۔ اور "جن" کے بارے میں بہت سے بے ہودہ عقائد کی اصلاح کرتا ہے، اور انھیں باطل قرار دیتا ہے۔

اس سورہ کے دوسرے حصہ میں توحید ومعاد کے مسئلہ کے بارے میں اشارہ آیا ہے۔

اور اس سورہ کے آخری حصہ میں علم غیب کے مسئلہ کے متعلق گفتگو ہے، کہ کوئی بھی شخص اس سے آگاہ نہیں ہے، سوائے اس فرد جس کا خدا نے ارادہ کر لیا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامی اسلام سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الجن اعطی بعدد کل جنی و شیطان صدق بمحمد وکذب به عتق رقبة"

"جو شخص سورۂ جن کو پڑھے تو اسے ہر جن اور شیطان کی تعداد کے برابر جس نے محمدؐ کی تصدیق یا تکذیب کی ہے، غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من اکثر قراءة قل اوحی لم یصبه فی الحیٰوة الدنیا شیئ من اعین الجن ولا نفثهم ولا سحرهم، ولا کیدهم، وکان مع محمد (ص) فیقول یارب لا ارید منه بدلا ولا ابغی عنه حولا"

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۵

"جو شخص سورۂ جن کو بکثرت پڑھے، تو وہ دنیا کی زندگی میں، ہرگز جنوں کی نظر بد، ان کے جادو، سحر اور مکر و فریب سے نقصان نہیں اٹھائے گا، اور وہ محمدؐ کے ہمراہ ہوگا اور کہے گا: "پروردگارا! میں اس کی بجائے کسی اور کو نہیں چاہتا اور نہ ہی اس سے کسی دوسرے کی طرف مائل ہوتا ہوں"۔[1]

البتہ یہ تلاوت، اس سورہ کے مضامین و مطالب پر آگاہ ہونے اور پھر اس پر عمل کرنے کا ایک مقدمہ ہے۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۳۹۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

۱- قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝

۲- يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝

۳- وَّاَنَّهُ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝

۴- وَّاَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا ۝

۵- وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۝

۶- وَّاَنَّهُ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝

رحمن ورحیم خدا کے نام سے

ترجمہ

۱- کہہ دیجیے کہ مجھے وحی ہوئی ہے کہ "جن" کی ایک جماعت نے کان دھر کے میری باتیں سنیں تو انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے۔

۲- جو سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے، لہذا ہم اس پر ایمان لے آئے، اور ہم ہرگز کسی کو اپنے پروردگار کا شریک

قرار نہیں دیتے۔

۳۔ اور بے شک ہمارے باعظمت پروردگار کا مقام بلند ہے، اور اس نے ہرگز اپنے لیے بیوی اور اولاد کا انتخاب نہیں کیا ہے۔

۴۔ اور بے شک ہمارے بے وقوف لوگ خدا کے بارے میں ناروا باتیں کیا کرتے تھے۔

۵۔ اور ہم نے تو یہ گمان کر لیا تھا کہ جن اور انسان ہرگز خدا پر جھوٹ نہیں باندھتے۔

۶۔ اور بے شک انسانوں میں سے کچھ لوگ، جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ لیا کرتے تھے، اور وہ ان کی گمراہی اور طغیان میں زیادتی کا سبب بنا کرتے تھے۔

شانِ نزول

سورۂ احقاف کی آیہ ۲۹ تا ۳۲ کی تفسیر میں کچھ شانِ نزول بیان ہو چکی ہیں، جو زیر بحث سورہ (سورۂ جن) کے مطالب سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں، اور وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں، کہ دونوں سورتوں کی آیات ایک ہی واقعہ سے مربوط ہیں۔ وہ شانِ نزول مختصر طور پر اس طرح ہے:

۱۔ پیغمبرؐ مکہ سے طائف کے بازار "عکاظ" کی طرف آئے تاکہ اس عظیم مرکز اجتماع میں لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دیں، لیکن کسی نے آپ کی دعوت کا کوئی مثبت جواب نہ دیا، واپسی پر آپ ایک ایسی جگہ پہنچے جسے "وادی جن" کہتے تھے، رات آپ وہیں رہے اور قرآن کی آیات کی تلاوت فرماتے رہے، جنوں کے ایک گروہ نے سنا تو وہ ایمان لے آئے اور تبلیغ کے لیے اپنی قوم کی طرف پلٹ گئے۔[1]

۲۔ "ابن عباس" کہتے ہیں "پیغمبر صبح کی نماز میں مشغول ہوئے اور اس میں قرآن کی تلاوت کر رہے تھے، جنوں کا ایک گروہ آسمانی خبروں کے ان سے منقطع ہو جانے کی علت کی تحقیق کر رہا تھا۔ انھوں نے محمدؐ سے قرآن کی تلاوت کی آواز سنی تو انھوں نے کہا کہ آسمانی اخبار کے ہم سے منقطع ہو جانے کی علت یہی ہے لہٰذا وہ اپنی قوم کی طرف پلٹ گئے اور انھیں اسلام کی طرف دعوت دی۔[2]

۳۔ "ابو طالبؑ" کی وفات کے بعد جب رسولِ خدا پر معاملہ سخت ہو گیا تو آپ نے "طائف" کی طرف جانے کا ارادہ کیا تاکہ کوئی مددگار پیدا کریں۔ "طائف" کے رؤسا نے شدت کے ساتھ آپ کی تکذیب کی اور انھوں نے پیغمبر کی پشت پر اس قدر پتھر مارے کہ آپ کے پائے مبارک سے خون جاری ہو گیا، تھکے ماندے زخمی حالت میں ایک باغ کے پاس آئے اور انجام کار اس باغ کے مالکوں کا غلام جس کا

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۱۹ (تلخیص کے ساتھ)

[2] صحیح بخاری، مسلم و مسند احمد مطابق نقل "فی ظلال" جلد ۸، ص ۲۷۹ (تلخیص کے ساتھ)

نام "عداس" تھا، آنحضرتؐ پر ایمان لے آیا۔ آپ وہاں سے مکہ کی طرف لوٹے، رات ہوتے ایک کھجور کے درخت کے قریب پہنچے اور نماز میں مشغول ہو گئے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے "نصیبین" یا "یمن" کے "جنوں" کا ایک گروہ گزر رہا تھا۔ انھوں نے صبح کی نماز میں آنحضرتؐ کی تلاوت قرآن کی آواز سنی تو وہ ایمان لے آئے۔[1]

بہت سے مفسرین نے اسی قسم کے شانِ نزول سورۂ جن کے آغاز میں بھی نقل کیے ہیں۔

لیکن یہاں ایک اور شانِ نزول بھی بیان کی گئی ہے۔ جو ان سب سے مختلف ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لوگوں نے "عبداللہ بن مسعودؓ" سے پوچھا: کیا تم اصحاب پیغمبرؐ میں سے، کوئی شخص "جن" والی رات کے واقعہ میں، پیغمبرؐ کی خدمت میں تھا۔ اس نے کہا، کہ ہم میں سے کوئی نہیں تھا۔ ہم نے ایک رات مکہ میں پیغمبرؐ کو نہ پایا۔ اور جس قدر ہم نے جستجو اور تلاش کی، آپ کا کوئی پتہ نہ چلا۔ ہم ڈرے کہ کہیں پیغمبرؐ کو دشمنوں نے قتل نہ کر دیا ہو، ہم پیغمبرؐ کو تلاش کرتے ہوئے مکہ کے دروں کی طرف دوڑ گئے۔ اچانک ہم نے دیکھا کہ آپ کوہ "حرا" کی طرف سے آ رہے ہیں، ہم نے عرض کیا، اے رسولِ خدا آپ کہاں تھے؟ ہم سخت پریشان تھے اور کل رات ہماری زندگی کی بدترین رات تھی۔ آپ نے فرمایا: جنوں کی طرف سے ایک دعوت کرنے والا میرے پاس آیا تھا اور میں ان کے لیے قرآن پڑھنے کے لیے گیا تھا۔[2]

تفسیر

ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے

اب جو کچھ بیان ہو چکا، اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے، آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرماتا ہے: "کہہ دیجیے کہ میری طرف وحی ہوئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے میری باتوں کو کان لگا کر سنا، تو انھوں نے کہا کہ ہم نے عجیب قرآن سنا ہے۔" (قل اوحی الیّ انہ استمع نفر من الجن فقالوا انا سمعنا قرانا عجبا)۔[3]

"اوحی الیّ" (میری طرف وحی کی گئی ہے) کی تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پیغمبرؐ نے بذاتِ خود اس واقعہ میں جنوں کو مشاہدہ نہیں کیا تھا، بلکہ آپ وحی کے ذریعے آگاہ ہوئے ہیں کہ انھوں نے قرآنِ مجید کو کان دھر کے سنا ہے۔

ضمنی طور پر یہ آیت، اچھی طرح سے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ گروہ "جن" صاحبانِ عقل و شعور، فہم و ادراک والے اور تکلیف و مسئولیت کے حامل ہیں، اور زبان سے آشنائی اور اعجاز آمیز کلام میں فرق کو سمجھتے ہیں، اور اسی طرح سے خود کو تبلیغِ حق کا ذمہ دار جانتے ہیں

---

[1] مجمع البیان، جلد ۹ ص ۹۲ وسیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۶۲، ۶۳ (تلخیص کے ساتھ)

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۸

[3] اہل لغت و تفسیر کے قول کے مطابق "نفر" ۳ سے ۹ افراد تک کو کہا جاتا ہے۔

اور قرآن کے خطاب کے مخاطب بھی ہیں۔

یہ اس نظر نہ آنے والے موجود کی خصوصیات کا ایک حصہ ہے، جو صرف اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے، ان کی کچھ اور خصوصیات بھی ہیں، جنھیں ہم انشاء اللہ اسی بحث کے آخر میں تفصیل سے بیان کریں گے۔

انھیں اس بات کا حق تھا کہ وہ قرآن کو ایک عجیب بات شمار کریں، کیونکہ اس کا لب و لہجہ اور طرز و آہنگ بھی عجیب ہے اور اس کا نفوذ کرنا اور قوت جاذبہ بھی۔ اس کے مضمون و مطالب اور اس کی تاثیر بھی عجیب ہے اور اس کا لانے والا بھی کہ جس نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور وہ امیین میں سے مبعوث ہوا تھا۔

یہ ایک ایسا کلام ہے جو ظاہر و باطن میں عجیب ہے اور ہر دوسری گفتگو سے مختلف ہے، اور اس طرح سے انھوں نے قرآن کے معجزہ ہونے کا اعتراف کر لیا ہے۔

انھوں نے اس جملہ کے بعد کچھ اور باتیں بھی اپنی قوم سے کہیں، جنھیں قرآن نے بعد والی آیات میں بارہ جملوں میں بیان کیا ہے، جن میں سے ہر ایک "ان" کے ساتھ شروع ہوتا ہے، جو تاکید کی نشانی ہے[1]

پہلے فرماتا ہے: انھوں نے کہا: "یہ قرآن سب کو راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے، لہٰذا ہم اس پر ایمان لائے ہیں، اور ہم ہرگز کسی کو اپنے پروردگار کا شریک قرار نہیں دیتے": (یهدی الی الرشد فاٰمنا به ولن نشرك بربنا احدا)۔

"رشد" کی تعبیر بہت ہی وسیع اور ایک جامع تعبیر ہے، جو ہر قسم کا امتیاز اپنے اندر لیے ہوئے ہے، ایک ایسا صاف ستھرا راستہ ہے جس میں کوئی پیچ و خم نہیں ہے، روشن اور واضح جو چلنے والوں کو سعادت و کمال کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔

ایمان کے اظہار اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے بعد، انھوں نے صفات خدا کے بارے میں اپنی گفتگو کو اس طرح جاری رکھا: "ہمارے پروردگار کا باعظمت مقام (مخلوق کے ساتھ مشابہت اور ہر قسم کے عیب و نقص سے) بلند ہے اور اس نے اپنے لیے بیوی اور اولاد کا ہرگز انتخاب نہیں کیا (و انه تعالٰی جد ربنا ما اتخذ صاحبة ولا ولدا)۔

"جد" کے لغت میں بہت سے معانی ہیں منجملہ ان کے "عظمت"، "شدت"، "جدیت"، "حصہ و نصیب"، "نیا ہونا" اور اس کے مانند لیکن اس کا اصلی ریشہ اور جڑ، جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں نقل کیا ہے، "قطع" کے معنی میں ہے اور چونکہ ہر با عظمت وجود دوسرے

---

[1] علماء نحو کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "ان" جب مقول قول میں ہو تو اسے زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے جیسا کہ پہلی آیات میں پہلے مرحلہ میں زیر کے ساتھ ہے، لیکن بعد والی آیات میں جن کا اس پر عطف ہے زبر کے ساتھ ہے۔ اس لیے بہت سے مفسرین اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ ان آیات میں مقدرات فرض کریں یا کچھ اور توجیہیں کریں، لیکن اس بات میں کیا مانع ہے کہ ہم یہ کہیں کہ یہ نحوی قاعدہ استثناء بھی رکھتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن موارد میں مقول قول پر عطف ہو تو جائز ہے کہ اسے زبر کے ساتھ پڑھا جائے اور اس کی دلیل اسی قسم کی آیات ہیں۔

موجودات سے قطع اور جدا ہو جاتا ہے، لہذا یہ لفظ عظمت کے معنی میں آیا ہے۔

اسی طرح اس کے باقی معانی کے بارے میں اسی تناسب کو نظر میں رکھا جا سکتا ہے اور اگر دادا یا نانا کو جد کہا جاتا ہے تو وہ بھی اس کی بزرگی، مقام اور سن کے واسطہ سے ہے۔

بہت سے مفسرین نے یہاں "جد" کے بہت سے محدود معانی ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اس کی "صفات" کے معنی میں، اور بعض نے "قدرت" کے معنی میں، بعض نے "ملک و حکومت" کے معنی میں، بعض نے "نعمت" کے معنی میں اور بعض نے "نام" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ یہ سب کے سب عظمت کے معنی میں جمع ہیں۔[1]

لیکن چونکہ یہ تعبیر "جد" کے مشہور معنی، جو وہی "دادا" اور "نانا" کا اظہار کرتی ہے۔ اس لیے بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ گروہ جن نے نادانی کی بناء پر اس قسم کی غیر مناسب تعبیر کو انتخاب کیا یعنی تم لوگ خدا کے بارے میں ہرگز اس قسم کی تعبیر نہ کرو۔[2]

یہ حدیث ممکن ہے ایسے مواقع کے لیے ہو، جہاں اس قسم کا اظہار ہوتا ہو، ورنہ قرآن ان آیات میں، جنوں کی باتوں کو موافق لب و لہجہ میں نقل کرتا ہے اور انہیں صحیح و درست سمجھتا ہے۔ علاوہ ازیں نہج البلاغہ کے بعض خطبوں میں بھی یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے، جیسا کہ خطبہ ۱۹۱ میں آیا ہے۔

الحمد لله الفاشی فی الخلق حمده والغالب جنده والمتعالی جده

"حمد و ستائش اس خدا کے لیے مخصوص ہے، جس کی حمد و ثنا نے ہر جگہ کو گھیر رکھا ہے اور اس کا لشکر ہر جگہ کامیاب ہے اور اس کی مجد و عظمت بلند ہے۔"

بعض روایات میں بھی یہ آیا ہے کہ "انس بن مالک" کہتے ہیں:

کان الرجل اذا قرء سورة البقرة جد فی اعیننا

جب کوئی شخص سورۂ بقرہ کو یاد کر لیتا تھا اور اس کی قرأت کیا کرتا تھا، تو وہ ہماری نظر میں بزرگ اور باعظمت دکھائی دیتا تھا۔

بہرحال مجد و بزرگی و عظمت کے معنی میں اس لفظ کا استعمال ایک ایسا مطلب ہے جو متون لغت کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہے اور موارد استعمال کے ساتھ بھی۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان باتوں کے کہنے والے "جن" یہاں خصوصیت کے ساتھ اس مطلب پر تکیہ کرتے ہیں کہ خدا کی بیوی اور اولاد نہیں ہے اور احتمال یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بے ہودگی کی طرف اشارہ ہو جو عربوں میں موجود تھی، جو یہ کہتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ "ایک جن" بیوی سے، جسے خدا نے انتخاب کیا ہے۔

یہی معنی ایک احتمال کے عنوان سے سورۂ صافات کی آیہ ۱۵۸ کی تفسیر میں بھی آیا ہے "وجعلوا بینه و بین الجنة نسبا"

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۶۹، "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۲۵ اور تفسیر علی بن ابراہیم میں اسی تعبیر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

[2] "تفسیر قرطبی" جلد ۱۰ ص ۶۸۰۱

"وہ خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری کے قائل تھے۔"

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: "اب ہم اعتراف کرتے ہیں کہ ہم میں سے کچھ بے وقوف لوگ خدا کے بارے میں ناروا اور حق سے دور بات کیا کرتے تھے" (وانہ کان یقول سفیھنا علی اللہ شططا)۔

یہاں ممکن ہے "سفیہ" کی تعبیر جنس اور جمع کے معنی میں ہو، یعنی ہمارے سفہاء اور بے وقوف لوگ خدا کے لیے بیوی اور اولاد کے قائل تھے، اور انھوں نے شبیہ و شریک بنالیا تھا اور راہ حق سے منحرف ہو کر فضول اور بے ہودہ باتیں کہا کرتے تھے۔

بہت سے مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں "سفیہ" کا مفہوم وہی ایک فرد ہے اور ابلیس کی طرف اشارہ ہے؛ جس نے خدا کے فرمان کی مخالفت کرنے کے بعد، اس کی ساحت مقدس کی طرف بہت سی ناروا نسبتیں دیں، یہاں تک کہ اس نے آدم کے سجدہ کے بارے میں، پروردگار کے حکم پر علی الاعلان اعتراض کیا، اور اسے حکمت سے دور سمجھا، اور اپنے آپ کو آدم سے افضل و برتر خیال کیا۔

چونکہ "ابلیس" "جن" تھا۔ لہٰذا مومنین جن اس سے نفرت کا اظہار کر رہے ہیں، اور اس کی بات کو فضول اور حق سے دور کہہ رہے ہیں۔ اگرچہ وہ ظاہراً عالم و عابد تھا۔ لیکن عالم بے عمل اور عابد خود خواہ و منحرف و مغرور، "سفیہ" کے واضح مصادیق میں سے ہے۔

"شطط" (بروزن وسط) حد اعتدال سے خارج ہو کر دور جا پڑنے کے معنی میں ہے۔ اس لیے وہ باتیں جو حق سے دور ہوں انھیں شطط کہا جاتا ہے اور اسی لیے ان بڑے دریاؤں کے کناروں کو جن کا فاصلہ پانی سے زیادہ دور ہو اور اس کی دیواریں بلند ہوں "شط" کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مزید کہا: "ہم یہ گمان کیا کرتے تھے کہ انسان اور جن ہرگز خدا پر جھوٹ نہیں باندھیں گے" (وانا ظننا ان لن تقول الانس والجن علی اللہ کذبا)۔

ان کی یہ بات ممکن ہے اس اندھی تقلید کی طرف اشارہ ہو جو یہ گروہ اس سے پہلے دوسروں کی کیا کرتا تھا اور اس بناء پر وہ خدا کا شریک بناتے تھے اور اس کے لیے بیوی اور اولاد کے قائل تھے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ان مسائل کو دوسروں سے بغیر کسی دلیل کے قبول کر لیا تھا تو وہ غلط فہمی کی بناء پر تھا۔ ہمیں یہ خیال ہی نہیں آیا کہ انسان اور جن اتنی جرأت کریں گے کہ اتنا بڑا جھوٹ خدا پر باندھیں گے۔ لیکن اب جبکہ ہم نے اس بات کی تحقیق کر لی ہے اور حق کو معلوم کر لیا ہے اور اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ لہٰذا ہم اب اس ناروا تقلید کو غلط سمجھتے ہیں، اور اس طرح اپنی غلطی اور مشرکین جن کے انحراف کا اعتراف کرتے ہیں۔

اس کے بعد انھوں نے کہا، جنوں اور انسانوں کے انحرافات میں سے ایک یہ تھا کہ "انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ کی پناہ لیا کرتے تھے اور وہ ان کی گمراہی، گناہ اور طغیان و سرکشی کی زیادتی کا سبب بنتے تھے" (وانہ کان رجال من الانس

یعوذون برجال من الجن فزادوھم رھقا)۔

"رھق" (بروزن شفق) اصل میں کسی چیز کو قہر و غلبہ کے ذریعے چھپانے کے معنی میں ہے اور چونکہ گمراہی، گناہ، طغیان اور خوف انسان کے قلب و روح پر مسلط ہو جاتے ہیں اور اس کو چھپا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کا ان معانی پر اطلاق ہوا ہے۔

بہت سے مفسرین نے اس جملہ کو ایک دوسری بیہودہ اور فضول بات کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں موجود تھی اور وہ یہ تھی کہ جب عربوں کے قافلے رات کے وقت کسی درہ میں داخل ہوتے تھے تو یہ کہا کرتے تھے۔

اعوذ بعزیز ھٰذا الوادی من شر سفہاء قومہ!

"میں اس سرزمین کے بزرگ و رئیس کی —— اس کی قوم کے .....؟ اور بے وقوفوں کے شر سے —— پناہ مانگتا ہوں"۔

اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس بات کے کہنے سے جنوں کا بزرگ اور رئیس، ان کی نادان اور بیوقوف جنوں کے شر سے حفاظت کرے گا[1] اور چونکہ خرافات اور بیہودہ باتوں سے انحطاط فکری، خوف اور گمراہی کا موجب ہے لہٰذا آیت کے آخر میں "فزادوھم رھقا" ہم جلایا ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جنوں میں بھی مرد اور عورتیں ہوتی ہیں، کیونکہ اس میں "رجال من الجن" کی تعبیر آئی ہے[2]

لیکن آیت کا مفہوم بہرحال ایک وسیع مفہوم ہے، جو انسانوں کی جنوں سے ہر قسم کی پناہ لینے کو شامل ہے اور اوپر والی فضول اور بیہودہ بات اس کا ایک مصداق ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ عربوں کے درمیان کاہن بہت تھے، جن کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ جنوں کے ایک گروہ کے ذریعہ بہت سی مشکلات کو حل کرتے ہیں اور آنے والے واقعات کی خبر دیتے ہیں۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۶۹ و "روح المعانی" جلد ۲۰ ص ۸۵

[2] اوپر والی آیت کی تفسیر میں ایک اور بیان بھی آیا ہے جسے مفسرین کے ایک گروہ نے ایک احتمال کے عنوان سے آیت کی تفسیر میں ذکر کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کی ایک جماعت کا جنوں کی طرف پناہ حاصل کرنا، جنوں کے طغیان کا سبب بنا اور انہوں نے خود کو اہم کاموں کا مبدا و منشاء خیال کر لیا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے (پہلی تفسیر کے مطابق "زادوا" میں ضمیر "جن" کی طرف لوٹتی ہے اور "ھم" کی ضمیر انسانوں کی طرف، دوسری تفسیر کے برعکس)۔

۷۔ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝

۸۔ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝

۹۔ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝

۱۰۔ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝

ترجمہ

۷۔ اور انھوں نے بھی یہی گمان کر لیا تھا، جیسا کہ تم گمان کرتے تھے، کہ خدا ہرگز کسی کو (نبوت پر) مبعوث نہیں کرے گا۔

۸۔ اور ہم نے آسمان میں جستجو کی، تو ہم نے سب کو قوی محافظوں اور شہاب کے تیروں سے پُر پایا۔

۹۔ اور ہم اس سے پہلے چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمانوں میں بیٹھ جایا کرتے تھے، لیکن اب اگر کوئی چوری چھپے سننا چاہتا ہے، تو وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پاتا۔

۱۰۔ اور اب (ان حالات میں) ہم نہیں جانتے کہ اہلِ زمین کے بارے میں ان کے پروردگار نے کسی شر اور برائی کا ارادہ کیا ہے یا ان کی ہدایت کا ارادہ کیا ہے۔

تفسیر

ہم پہلے چوری چھپے سن لیا کرتے تھے، لیکن .....

یہ آیات اسی طرح سے "جن مومنین" کے بیان کو جاری رکھے ہوئے ہیں، جو اپنی قوم کو تبلیغ کرتے وقت بیان کر رہے تھے۔ اور مختلف طریقوں سے انھیں اسلام اور قرآن کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ پہلے کہتے تھے: "انسانوں کا ایک گروہ، تمھاری طرح ہی یہ گمان کرتا تھا، کہ خدا کسی بھی انسان کو (موسٰیؑ و مسیحؑ کے بعد) نبوت کے ساتھ مبعوث نہیں کرے گا": (وانھم ظنوا کما ظننتم ان لن یبعث اللہ احدًا)۔

لہٰذا وہ قرآن کے انکار اور پیغمبر اسلامؐ کی نبوت کی تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن ہم نے جب غور سے اس کتاب آسمانی کی آیات کو سنا، تو ہم نے اس کی حقانیت کا واضح طور پر ادراک کر لیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی مشرک انسانوں کی طرح کافر ہو جاؤ اور انھیں جیسی سرنوشت میں گرفتار ہو جاؤ۔

یہ تعبیر مشرکین کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ یہ جان لیں کہ جب جنوں کی منطق یہ ہے اور ان کا فیصلہ یہ ہے تو پھر وہ بیدار ہو جائیں اور قرآن اور پیغمبر اکرمؐ کے دامن سے متمسک ہو جائیں۔

بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ "ان لن یبعث اللہ احدًا" کا جملہ معاد کے انکار کی طرف اشارہ ہے، نہ کہ پیغمبر کی بعثت کے انکار کی طرف۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت کلی طور پر خدا کا کلام ہے، نہ کہ مومنین "جن" کا اور یہ جملہ کی صورت میں ان کی باتوں کے درمیان آیا ہے اور اس میں مخاطب مشرکین عرب ہیں۔

اس تفسیر کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا کہ اے مشرکین عرب جن بھی تمھاری طرح ہی اس طرح کا گمان رکھتے تھے کہ خدا کسی بھی رسول کو مبعوث نہیں کرے گا۔ لیکن قرآن کو سننے کے بعد وہ اپنی غلطی کو سمجھ گئے۔ لہٰذا اب وہ وقت آگیا ہے کہ تم بھی بیدار ہو جاؤ۔

لیکن یہ تفسیر بہت بعید نظر آتی ہے، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ جن مومنین کی گفتگو ہی چل رہی ہے اور اس میں "کافرین جن" مخاطب ہیں۔

اس کے بعد مومنین جن، اپنی گفتگو کی صداقت کی ایک نشانی کی طرف ــــ جو عالم طبیعت میں تمام جنوں کے لیے قابل ادراک ہے ــــ اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم نے آسمانوں میں جستجو کی، تو ہم نے ان سب کو نگہبانوں اور قوی محافظوں[1] اور شہاب کے تیروں سے بھرپور پایا": (وانا لمسنا السماء فوجدناھا ملئت حرسًا شدیدًا و شھبًا)۔[2]

ہم اس سے پہلے چوری چھپے باتیں سننے کے لیے آسمانوں میں جا کر بیٹھ جایا کرتے تھے اور وہاں سے کچھ خبریں معلوم کر لیا کرتے تھے۔

---

[1] "لمسنا" "لمس" کے مادہ سے ہے، جس کا معنی مسّ ہے، لیکن یہاں طلب و جستجو سے کنایہ ہے (مفردات راغب و تفسیر کبیر فخر رازی اور تفسیر قرطبی)۔

[2] "حرس" (بروزن قفس) جمع ہے "حارس" کی، جو نگہبان کے معنی میں ہے اور بعض اس کو اسم جمع سمجھتے ہیں۔

اور اپنے دوستوں کو ان کی اطلاع دے دیا کرتے تھے، لیکن اب معاملہ ایسا ہو گیا ہے کہ اب اگر کوئی چوری چھپے کچھ سننا چاہتا ہے تو وہ اپنی گھات میں ایک شہاب کو پاتا ہے جو اس کو نشانہ بنا لیتا ہے۔ (وانا کنا نقعد منہا مقاعد للسمع فمن یستمع الاٰن یجد لہ شہابا رصدا)۔

تو کیا یہ نئی وضع و کیفیت اس حقیقت کی دلیل نہیں ہے کہ اس پیغمبر کے ظہور اور اس کی کتاب آسمانی کے نزول سے عالم میں ایک عظیم تغیر پیدا ہو گیا ہے؟ آخر پہلے تم میں چوری چھپے سننے کی طاقت کیوں تھی اور اب تم میں سے کوئی بھی اس کام پر قدرت کیوں نہیں رکھتا؟ کیا اس وضع جدید اور نئی کیفیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ شیطنت، کہانت اور مکر و فریب کا دور ختم ہو گیا ہے اور جہالت کی تاریک رات ڈھل گئی ہے اور وحی و نبوت کا آفتاب عالم تاب طلوع ہو گیا ہے۔

"شہاب" اصل میں اس شعلہ کے معنی میں ہے جو آگ میں سے بھڑک کر نکلتا ہے اور اس آتشیں شعلہ کو بھی جو ایک لمبے خط کی صورت میں آسمان سے ظاہر ہوتا ہے "شہاب" کہتے ہیں۔ موجودہ دور کے ماہرین کی تحقیقات کے مطابق وہ پتھروں کے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں، جو کرۂ زمین سے باہر کی فضا میں حرکت کر رہے ہوتے ہیں، جب وہ زمین کے قریب آتے ہیں تو اس کی قوت کشش کے زیر اثر آ جاتے ہیں، اور تیزی کے ساتھ زمین کی طرف گرتے ہیں، جب وہ فضا یعنی زمین کے گرداگرد پھیلی ہوئی تہ بہ تہ ہوا میں داخل ہوتے ہیں، تو اس کے ساتھ شدید ٹکراؤ کی وجہ سے جل کر آگ بن جاتے ہیں، اور جلانے والے شعلہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اور اکثر ان کی راکھ زمین پر آ گرتی ہے۔

قرآن مجید میں یہ مسئلہ بارہا بیان ہوا ہے کہ "شہاب" وہ تیر ہیں جو ان شیاطین کی طرف، جو چوری چھپے باتیں سننے کا ارادہ کرتے ہیں، پھینکے جاتے ہیں۔

اس بارے میں کہ چوری چھپے سننے سے مراد کیا ہے؟ اور جن اور شیاطین آسمان سے کس طرح بھگائے جاتے ہیں؟ ہم نے سورۂ حجر کی آیہ ۱۸ کے ذیل میں (جلد ۶ ص ۲۴۳ کے بعد)، اور سورۂ صافات کی آیہ ۱۰ کے ذیل میں (جلد ۱۰ ص ۱۵۱ کے بعد) تفصیلی مباحث پیش کیے ہیں۔

بہرحال لفظ "رصد" (بروزن حسد) کسی چیز کے انتظار میں آمادگی کے معنی میں ہے جسے فارسی (اور اردو) میں "گھات لگا کر بیٹھنے" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لفظ بعض اوقات اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ چیز یا وہ شخص جو گھات لگا کر بیٹھا ہوا ہو اور اوپر والی آیات میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے مزید کہا کہ ان اوضاع و حالات میں ہم نہیں جانتے، آیا یہ چوری چھپے سننے کی ممنوعیت اس بات کی دلیل ہے کہ زمین پر رہنے والے لوگوں کے لیے کسی شر اور برائی کا ارادہ ہوا ہے، یا خدا یہ چاہتا ہے کہ انہیں اس طریقہ سے ہدایت کرے"

(وانا لا ندری اشر ارید بمن فی الارض ام اراد بہم ربہم رشدا)۔

دوسرے لفظوں میں ہم نہیں جانتے کہ کیا یہ امر خدا کی طرف سے نزول عذاب بلا کا مقدمہ ہے یا ان کی ہدایت کی تمہید ہے۔

لیکن مومنین جن کو اجمالی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چوری چھپے سننے کی ممانعت جو پیغمبر اسلام کے ظہور کے قریب ہوئی ہے، انقلاب کی

ہدایت کا مظہر ہے اور کہانت کے اداروں اور اسی جیسی خرافات کے ختم ہونے کی تمہید ہے ۔ اور یہ چیز تاریکی کے دور کے ختم ہونے اور ایک نورانی اور روشن دور کے آغاز کے اعلان کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی ۔

لیکن چونکہ "جن" چوری چھپے سننے کے مسئلہ سے ایک خاص دلچسپی رکھتے تھے ۔ لہٰذا وہ بھی یہ باور نہیں کر سکتے تھے کہ یہ محرومیت ایک قسم کی خیر و برکت ہے ۔ مزید یہ بات واضح ہے کہ زمانہ جاہلیت کے کاہن اسی چوری چھپے سننے کے مسئلہ پر تکیہ کرتے ہوئے، لوگوں کے ایک بہت بڑے حصہ کو گمراہ کیا کرتے تھے ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ اس جملہ میں ہدایت کی نسبت تو خدا کی طرف دیتے ہیں ۔ لیکن شر کو فعل مجہول کی صورت میں خدا کی طرف نسبت دیئے بغیر ذکر کرتے ہیں ۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ آتا ہے وہ خیر و ہدایت ہوتی ہے ۔ لیکن شر و فساد، خود لوگوں کی طرف سے اور خدا کی نعمتوں اور مواہب آفرینش کے سوءِ استفادہ سے پیدا ہوتا ہے ۔

۱۱۔ وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَ مِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا ۙ

۱۲۔ وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَ لَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۙ

۱۳۔ وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰۤى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّ لَا رَهَقًا ۙ

۱۴۔ وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓىِٕكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا

۱۵۔ وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۙ

ترجمہ

۱۱۔ اور یہ کہ ہمارے درمیان صالح اور غیر صالح افراد ہیں اور ہم مختلف گروہ ہیں۔

۱۲۔ اور یہ کہ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ ہم زمین میں ہرگز خدا کے ارادہ پر غالب نہیں آسکتے، اور نہ ہی اس کے قبضہ قدرت سے فرار کر سکتے ہیں۔

۱۳۔ اور یہ کہ جب ہم نے قرآن کی ہدایت سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے، اور جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے پھر وہ نہ تو نقصان سے ڈرتا ہے اور نہ ہی ظلم سے۔

۱۴۔ اور یہ کہ ہم میں سے ایک گروہ تو مسلمان ہے اور ایک گروہ ظالم ہے اور جو شخص اسلام کو اختیار کرے اس نے سیدھی راہ کو انتخاب کر لیا ہے۔

۱۵۔ اور ظالم تو ہیں ہی دوزخ کا ایندھن۔

تفسیر

ہم نے حق کو سنا اور سرِ تسلیم خم کر لیا

یہ آیات اسی طرح جن مومنین کی باتوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں، یعنی وہ باتیں جو انھوں نے اپنی گمراہ قوم کو تبلیغ کرتے وقت کہی تھیں، پہلی آیت میں ان کی زبانی کہتا ہے: ہمارے درمیان صالح اور غیر صالح افراد ہیں اور ہم ہیں مختلف گروہ ہیں" (وانامنا الصالحون ومنا دون ذالك كنا طرائق قددًا)۔

احتمال یہ ہے کہ انھوں نے اس جملہ کو اس لیے کہا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "ابلیس" کا قبیلہ "جن" میں سے ہونا، ان میں سے ایک گروہ کے دل میں یہ توہم پیدا نہ کر دے، کہ جن کی طبیعت اور مزاج شرار و فساد، شیطنت پر ہے اور نورِ ہدایت ان کے دل میں ہرگز نہیں چمکتا۔

مومنین جن اس گفتگو سے یہ واضح کر رہے ہیں کہ اصل اختیار اور آزادی ارادہ ان پر بھی حکم فرما ہے، اور صالح اور غیر صالح دونوں قسم کے افراد ان میں موجود ہیں۔ اس بناء پر ہدایت کی استعداد ان میں بھی موجود ہے اور اصولی طور پر تبلیغ کی تاثیر کے عوامل میں سے ایک طرف مقابل کی شخصیت کو اجاگر کرکے اسے ہدایت و کمال کی استعداد کے موجود ہونے کی طرف توجہ دلانا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جن مومنین نے، چوری چھپے سننے کے مسئلہ سے، سوء استفادہ کے موضوع سے، برائت کے لیے کہی ہو۔ یعنی اگرچہ ہم میں سے بعض، وہ اخبار جو وہ چوری چھپے سنا کرتے تھے، انھیں شریر انسانوں کے پاس پہنچا کر گمراہی کا سبب بنے تھے۔ لیکن ہم میں سے تمام جن ایسے نہیں تھے۔

یہ آیت ضمنی طور پر جنوں کے بارے میں ہم انسانوں کی ذہنیتوں کی بھی اصلاح کرتی ہے۔ کیونکہ بہت سے لوگوں کے تصور میں لفظ "جن" شیطنت، فساد اور گمراہی کی ایک قسم کے ساتھ ہے۔ یہ آیت کہتی ہے کہ وہ بھی مختلف گروہ ہیں، صالح اور غیر صالح۔

لفظ "قدد" (بروزن پسر) "قد" (بروزن ضد) کی جمع ہے۔ جس کا معنی کٹا ہوا کے ہیں۔ اور مختلف گروہوں پر بھی، چونکہ وہ ایک دوسرے سے الگ الگ ٹکڑوں میں ہوتے ہیں۔ اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

جن مومنین اپنی باتوں کو جاری رکھتے ہوئے دوسروں کو خبردار کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "ہمیں یقین ہے کہ ہم زمین میں، خدا کے ارادہ پر ہرگز غالب نہیں آسکتے، اور نہ ہی اس کے پنجۂ قدرت سے فرار کر سکتے ہیں" (وانا ظننا ان لن نعجز الله فى الارض ولن نعجزه هربًا)۔

اس بناء پر، اگر تمھارا یہ خیال ہو کہ تم خدا کے عذاب سے بھاگ کر زمین کے کسی گوشہ میں یا آسمانوں کے کسی مقام میں نجات پا جاؤ گے، تو تم سخت غلط فہمی میں مبتلا ہو۔

اس طرح سے پہلا جملہ تو زمین میں خدا کے پنجۂ قدرت سے فرار کرنے کیلیے اور دوسرا جملہ مطلق فرار کرنے کی طرف اشارہ ہے، عام اس سے کہ وہ زمین میں ہو یا آسمان میں۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ پہلا تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم خدا پر غالب نہیں آ سکتے، اور دوسرا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کے پنجۂ عدالت سے فرار ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس بناء پر کہ نہ تو غلبہ کی کوئی راہ ہے اور نہ ہی بھاگنے کی، تو پھر اس کے فرمانِ عدالت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔

جن مومنین اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتے ہیں: "ہم نے جب قرآن کی ہدایت کو سنا تو ہم اس پر ایمان لے آئے" (و انا لما سمعنا الهدیٰ اٰمنا به)۔

"اگر ہم تمھیں قرآن کی ہدایت کی طرف بلاتے ہیں تو ہم نے خود پہلے اس پروگرام پر عمل کیا ہے۔ اس بناء پر ہم دوسروں کو کسی ایسی چیز کی دعوت نہیں دے رہے ہیں، جسے ہم نے خود چھوڑ رکھا ہو۔

اس کے بعد ایمان کے نتیجہ کو ایک مختصر سے جملہ میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: "جو شخص اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے تو اسے نہ تو نقصان کا کوئی ڈر ہے اور نہ ہی ظلم کا" (فمن یؤمن بربه فلا یخاف بخسا و لا رهقا)۔

"بخس" (بروزن شخص) ظلم وستم کے ذریعہ نقصان کے معنی میں ہے اور "رهق" (بروزن شفق)، جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں: "کسی چیز کے زور کے ساتھ چھپانے" کے معنی میں ہے۔

بعض نے ان دو تعبیروں کے درمیان فرق کو اس طرح بیان کیا ہے کہ "بخس" تو اس بات کی طرف اشارہ ہے، کہ ان کی "حسنات" اور نیکیوں میں سے کسی چیز میں کمی نہیں کی جائے گی اور "رهق" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے "سیئات" اور برائیوں میں اضافہ نہیں کیا جائے گا۔

بعض نے "بخس" کو "حسنات" کی کمی اور "رهق" کو "تکالیفِ شاقہ" کے معنی میں لیا ہے۔

بہرحال مراد یہ ہے کہ مومنین جس چھوٹے اور بڑے کام کو انجام دیں گے، وہ اس کا اجر و ثواب، بے کم و کاست حاصل کریں گے۔

یہ درست ہے کہ پروردگار کی عدالت مومنین پر منحصر نہیں ہے۔ لیکن چونکہ غیر مومن کوئی عمل صالح رکھتے ہی نہیں، اس لیے ان کے اجر کی بات درمیان میں نہیں آئی۔

بعد والی آیت میں مومنوں اور کافروں کی سرنوشت کے بارے میں زیادہ وضاحت کے لیے کہتا ہے: "ہم قرآن کی ہدایت کے ذریعہ یہ جانتے ہیں کہ ہم میں سے ایک گروہ مسلمان ہے اور ایک گروہ ظالم و بیدادگر ہے۔ (و انا منا المسلمون و منا القاسطون)[1]

لیکن جو اسلام کو اختیار کر لیں تو انھوں نے راہِ راست کو انتخاب کیا ہے اور خدا کی ہدایت اور ثواب کی طرف قدم اٹھایا ہے"

---

[1] "قاسط" "قسط" کے مادہ سے عادلانہ تقسیم کے معنی میں ہے۔ یہ مادہ جب بابِ "افعال" کی صورت میں "اقساط" آتے تو اجرائے عدالت کے معنی میں ہے اور جب ثلاثی مجرد کی صورت میں استعمال ہو۔ (مثلاً اوپر والی آیت) تو پھر ظلم اور راہِ حق سے انحراف کے معنی میں ہوتا ہے۔

(فمن اسلم فاولئك تحرّوا رشدًا)[1]

" باقی رہے ظالم تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں " (واما القاسطون فکانوا لجھنم حطبًا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں "مسلم" "ظالم" کے مقابلہ میں آیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کو جو چیز ظلم سے باز رکھتی ہے وہ ایمان ہی ہے۔ ورنہ ایک بے ایمان فرد تو بہر حال ظلم و ستم میں آلودہ ہوگا ہی، اور ضمنی طور پر بتاتا ہے کہ واقعی مومن وہ ہے جو ظلم و ستم سے ہرگز آلودہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

المؤمن من أمنه الناس علی انفسهم واموالهم

"مومن وہ ہے کہ لوگ جس کی طرف سے اپنی جان و مال کے سلسلہ میں امان میں رہیں"[2]

ایک اور حدیث میں آیا ہے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده

"مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان آسودہ رہیں"[3]

"تحرّوا رشدًا" کی تعبیر بتاتی ہے کہ مومنین، توجہ، قصد و ارادہ اور تحقیق کے ساتھ ہدایت حاصل کرتے ہیں، آنکھیں بند کر کے اندھی تقلید کے طور پر نہیں، اور ان کا بالاترین اجر حقیقت کو پا لینا ہی ہے، جس کے زیر سایہ وہ خدا کی تمام نعمتوں کو حاصل کرتے ہیں جبکہ ستم گروں کی بدترین بدبختی یہ ہے کہ وہ دوزخ کا ایندھن ہیں یعنی آگ ان کے وجود کے اندر سے شعلہ ور ہوگی۔

---

[1] "تحرّوا" "تحری" کے مادہ سے کسی چیز کا قصد کرنے کے معنی میں ہے۔

[2] تفسیر "روح البیان" جلد ۱۰ ص ۱۹۵

[3] "اصول کافی" جلد ۲۔ باب المؤمن وعلاماته وصفاته

۱۶۔ وَّ اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا ۙ

۱۷۔ لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَ مَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا ۙ

۱۸۔ وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۙ

۱۹۔ وَّ اَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ؕ

ترجمہ

۱۶۔ اور اگر وہ (جن وانس) ایمان کے طریقہ پر استقامت اختیار کریں، تو ہم انھیں فراواں پانی سے سیراب کریں۔

۱۷۔ مقصد یہ ہے کہ ہم انھیں اس فراواں نعمت کے ذریعہ آزمائیں اور جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے روگردانی کرے گا، تو وہ اسے شدید اور روز افزوں عذاب میں گرفتار کرے گا۔

۱۸۔ اور یہ کہ مساجد خدا ہی کے لیے ہیں، ان مساجد میں خدا کے علاوہ کسی کو نہ پکارو۔

۱۹۔ اور یہ کہ جب خدا کا بندہ (محمدؐ عبادت کے لیے کھڑا ہوتا اور اسے پکارتا، تو کچھ لوگ بڑی شدت کے ساتھ اس کے گرد جمع ہو جاتے۔

تفسیر

ہم تمھیں ان فراواں نعمتوں کے ذریعے آزمائیں گے

یہ آیات بظاہر جن مومنین کی اپنی قوم سے گفتگو کو جاری رکھے ہوئے ہیں (اگرچہ کچھ مفسرین نے اسے خدا کا کلام سمجھا ہے، جو جملہ معترضہ کے طور پر جنوں کی گفتگو کے درمیان آیا ہے)۔ لیکن چونکہ اس کا جملہ معترضہ ہونا خلاف ظاہر ہے اور آیات کی تعبیر گزشتہ آیات کے لب ولہجہ سے زیادہ

مشابہ ہے، جو جن مومنین کی گفتگو تھی، لہٰذا اس کا جنوں کا کلام نہ ہونا بعید ہے[1]

بہرحال گزشتہ آیات میں، قیامت میں مومنین کے لیے اجر و ثواب کے بارے میں گفتگو تھی، اور ان آیات میں ان کے دنیاوی اجر و ثواب کی گفتگو ہے، فرماتا ہے: "اگر وہ (جن و انس) ایمان کے طریقہ پر استقامت کریں، تو ہم انھیں فراواں پانی سے سیراب کریں گے۔

(وان لواستقاموا علی الطریقة لاسقیناهم ماءً غدقًا)۔

ہم ان پر اپنی رحمتوں کی بارش نازل کریں گے، اور حیات بخش پانی کے منابع اور چشمے ان کے اختیار میں دے دیں گے اور جہاں پانی کی فراوانی ہوتی ہے، وہاں پر ہر چیز کی فراوانی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طرح سے ہم انھیں انواع و اقسام کی نعمتوں سے نوازیں گے۔

"غدق" (بروزن شفق) فراواں پانی کے معنی میں ہے۔

قرآن مجید نے اس مطلب پر کئی بار تکیہ کیا ہے، کہ "ایمان و تقویٰ" نہ صرف معنوی برکات کا سرچشمہ ہیں، بلکہ مادی ارزاق کی زیادتی، نعمتوں کی کثرت، آبادی و عمران اور مادی برکت کی زیادتی کا موجب بھی ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک تفصیلی بحث، جلد ۱۴ میں سورۂ نوح کی آیہ ۱۲ کے ذیل میں "ایمان و تقویٰ کا عمران و آبادی سے رابطہ" کے عنوان کے تحت کر چکے ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس بیان کے مطابق، وہ چیز جو نعمت کی زیادتی کا سبب بنتی ہے، ایمان پر استقامت ہے، نہ کہ اصل ایمان کیونکہ وقتی اور جلدی گزر جانے والے ایمان سے اس قسم کی برکات ظاہر نہیں ہوتیں۔ لہٰذا اہم چیز ایمان، تقویٰ پر استقامت ہے، جس میں بہت سوں کے پاؤں لنگ کرنے لگتے ہیں اور لرزاں ہو جاتے ہیں۔

بعد والی آیت میں اسی سلسلہ میں ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "مقصد یہ ہے کہ ہم انھیں وفورِ نعمت کے ذریعہ آزمائیں" (لنفتنهم فيه)۔

آیا نعمت کی زیادتی ان کے غرور و غفلت کا سبب بنتی ہے یا بیداری، شکر گزاری اور خدا کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کا سبب ہوتی ہے۔

اور یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدائی امتحان کے اہم اسباب میں سے ایک وفورِ نعمت ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ نعمت کے ذریعہ جو آزمائش ہوتی ہے، وہ عذاب کے ذریعہ ہونے والی آزمائش سے زیادہ سخت اور زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ کیونکہ نعمت کی زیادتی کا مزاج سستی، کاہلی، غفلت اور لذائذ و شہوات میں غرق ہوتا ہے، اور یہ ٹھیک ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہے، اور

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہا وہ چیز جو اس بات کا سبب بنی ہے کہ مفسرین کا یہ گروہ اسے خدا کا کلام اور جملہ معترضہ سمجھیں "متکلم مع الغیر" کی ضمیریں ہیں، جو ان آیات میں استعمال ہوئی ہیں، ایک جگہ کہتا ہے کہ ہم انھیں فراواں پانی سے سیراب کریں گے"، دوسری جگہ فرماتا ہے کہ، ہدف و مقصد یہ ہے کہ ہم انھیں آزمائیں۔ لیکن اگر ہم ان تعبیروں کو نقل بالمعنی جان لیں تو پھر کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی، یہ ٹھیک اس بات کے مشابہ ہے کہ کوئی اپنے دوست سے نقل کرے اور کہے کہ، فلاں آدمی کا عقیدہ یہ ہے کہ میں اچھا آدمی ہوں۔ البتہ اس نے لفظ "میں" استعمال نہیں کیا۔ بلکہ اس نے "وہ" کا لفظ استعمال کیا ہے، لیکن کہنے والا اس قسم کی تعبیر استعمال کرتا ہے۔

میدان کو شیطان کی فعالیت کے لیے آمادہ کر دیتی ہے ۔ صرف وہی لوگ رفاہ نعمت کی زیادتی کے غیر مطلوب عوارض سے امان میں رہ سکتے ہیں ، جو ہمیشہ خدا کی یاد میں رہیں اور اس کے ذکر کو فراموش نہ کریں اور دائمی یاد کے ذریعہ خانۂ دل کو شیاطین کے نفوذ سے محفوظ رکھیں ؎۱

لہٰذا اس کے بعد مزید کہتا ہے : "جو شخص اپنے پروردگار کے ذکر سے روگردانی کرے گا ، تو وہ اسے شدید اور روز افزوں عذاب میں گرفتار کرے گا"

(ومن یعرض عن ذکر ربہ یسلکہ عذابًا صعدًا)۔

" صعد " (بر وزن سفر) صعود کرنے اور اوپر جانے کے معنی میں ہے اور بعض اوقات "گھاٹی" کے معنی میں آتا ہے اور چونکہ گھاٹیوں سے اوپر جانے میں مشقت اٹھانی پڑتی ہے ۔ اس لیے یہ لفظ "مشقت اٹھانے والے کاموں" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ لہٰذا بہت سے مفسرین نے اوپر والی آیت کی اسی طرح تفسیر کی ہے کہ اس سے مراد "مشقت والا عذاب" ہے ۔ اس کے مشابہ جو سورۂ مدثر کی آیہ ۱۷ میں آیا ہے ، جس میں بعض مشرکین کے بارے میں فرماتا ہے : "سارھقہ صعودًا" : " میں اسے مشقت والے عذاب میں ڈھانپ لوں گا"۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ اوپر والی تعبیر ، اس عذاب کے مشقت بار ہونے کے بیان کے ضمن میں ، اس کے روز افزوں ہونے کی طرف بھی اشارہ ہو ۔

اس طرح اوپر والی آیات ایک طرف تو ایمان و تقویٰ کا ، زیادتی نعمت سے تعلق بیان کرتی ہے ۔ اور دوسری طرف نعمت کی زیادتی کا ، خدا کی آزمائشات کے ساتھ تعلق بیان کرتی ہیں اور تیسری طرف خدا کی یاد سے روگردانی کا سخت ترین اور روز افزوں عذاب سے تعلق ظاہر کرتی ہیں ، اور یہ ایسے حقائق ہیں ، جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے ۔

جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۲۴ میں آیا ہے : ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکًا : "جو شخص میری یاد سے روگردانی کرے گا تو اس کی زندگی تنگ اور سخت ہو جائے گی ۔

اور سورۂ نمل کی آیہ ۴۰ میں حضرت سلیمان کی زبانی بیان ہوا ہے : ھٰذا من فضل ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر ؛ " یہ میرے پروردگار کا فضل ہے ۔ وہ مجھے آزمانا چاہتا ہے کہ میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں "۔

اور سورۂ انفال کی آیہ ۲۸ میں آیا ہے ، واعلموا انما اموالکم واولادکم فتنۃ " جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے آزمائش ہیں ۔

بعد والی آیت میں جن مومنین کی زبانی ، دوسروں کو توحید کی طرف دعوت دینے کے موقع پر اس طرح کہتا ہے : " مساجد خدا کے لیے ہیں ، ان مساجد میں خدا کے ساتھ کسی کو نہ پکارو " (وان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدًا) ۔

اس بارے میں کہ یہاں " مساجد " سے کیا مراد ہے ، گوناگوں تفاسیر بیان کی گئی ہیں ۔

؎۱ بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ اوپر والی آیت میں "طریقۃ" سے مراد ، ہی کفر کی راہ ہی ہے ، اور اس راہ میں استقامت کے بعد نعمت میں جو زیادتی ہوتی ہے وہ حقیقت میں عذاب کا ایک مقدمہ اور نعمت میں استدراج کا مصداق ہوتا ہے ، لیکن یہ تفسیر زیر بحث آیت اور اس سے قبل و بعد کی آیات کے لب و لہجہ سے بالکل مناسبت نہیں رکھتی ۔

پہلی یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مکان اور جگہیں ہیں کہ جن میں خدا کے لیے سجدہ ہوتا ہے، جس کا مصداق اکمل، مسجد الحرام ہے اور اس کا دوسرا مصداق باقی مساجد ہیں اور زیادہ وسیع مصداق وہ تمام جگہیں ہیں جہاں انسان نماز پڑھتا ہے اور خدا کے لیے سجدہ کرتا ہے، اور پیغمبر کی معروف حدیث کے مطابق، جس میں آپ نے فرمایا:

جعلت لی الارض مسجدًا و طهورًا

"تمام روئے زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور (تیمم کرنے کے لیے) طہارت کا ذریعہ قرار دی گئی ہے۔"[1]

اس میں ہر جگہ شامل ہے اور اس طرح سے یہ مشرکین عرب، اور ان جیسے لوگوں کے اعمال کا، جنھوں نے خانہ کعبہ کو بت کدہ بنا رکھا تھا، ایک جواب یہ ہے، اور منحرف عیسائیوں کے اعمال کا بھی، جنھوں نے "تثلیث" کو اپنا لیا تھا اور اپنے گرجوں میں تین خداؤں کی پرستش کرتے تھے قرآن کہتا ہے، تمام عبادت گاہیں خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، اور ان عبادت گاہوں میں خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا اور اس کے غیر کی پرستش ممنوع ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ مساجد سے مراد، سجدہ کے سات اعضاء ہیں۔ ان اعضاء کو صرف خدا کے لیے زمین پر رکھنا چاہیے اور اس کے غیر کی لیے جائز نہیں ہے۔ جیسا کہ مشہور حدیث میں نویں امام محمد بن علی الجوادؑ سے نقل ہوا ہے کہ "معتصم عباسی" نے ایک مجلس میں جس میں اہل سنت کے علماء جمع تھے، سوال کیا کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہیے؟ بعض نے کہا کہ کلائی سے، اور اس نے تیمم والی آیت سے استدلال کیا، بعض دوسروں نے کہا کہ کہنی سے اور انھوں نے وضو والی آیت سے استدلال کیا، معتصم نے آپ سے اس سلسلہ میں وضاحت کی درخواست کی تو پہلے تو حضرت نے اس سے خواہش کی کہ وہ اپنے سوال سے صرف نظر کرے، جب اس نے اصرار کیا تو آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ان حضرات نے کہا ہے وہ سب غلط ہے صرف چار انگلیاں جڑ سے کاٹی جانی چاہییں۔ ہاتھ کی ہتھیلی اور انگوٹھا چھوڑ دینا چاہیے۔ جب معتصم نے اس کی دلیل طلب کی تو امام نے پیغمبرؐ کے اس ارشاد سے استدلال کیا کہ سجدہ سات اعضاء پر ہونا چاہیے۔ پیشانی، دو ہاتھ، دونوں گھٹنوں کے سرے اور پاؤں کے انگوٹھوں کے سرے اور اس کے بعد مزید فرمایا کہ اگر کلائی یا کہنی سے کاٹا جائے گا تو ہاتھ اس کے لیے باقی نہیں رہے گا کہ جس پر وہ سجدہ کرے۔ جبکہ خدا نے یہ فرمایا ہے وان المساجد للہ یعنی یہ سات اعضاء خدا کے لیے ہیں اور جو چیز خدا کے ساتھ مخصوص ہو اسے قطع نہیں کرنا چاہیے۔ اس بات پر معتصم کو بہت تعجب ہوا اور اس نے حکم دیا کہ آنحضرتؐ کے حکم کے مطابق چور کا ہاتھ چاروں انگلیوں کی جڑ سے کاٹا جائے[2]

اس مضمون کی اور دوسری احادیث بھی نقل ہوئی ہیں[3]

لیکن جو احادیث اس سلسلہ میں نقل ہوئی ہیں وہ عام طور پر سند کے بغیر ہیں۔ یا ان کی سند ضعیف ہے اور اس سے قطع نظر ان میں ایسا نقص پایا جاتا ہے جن کا جواب آسان نہیں ہے۔ مثلاً ہمارے فقہاء کے درمیان یہ بات مسلّم ہے کہ اگر "چور" دوبارہ چوری کرے (جبکہ اس پر حد جاری ہو چکی ہو) تو اس کے پاؤں کے اگلے حصہ قطع کریں گے اور پاؤں کی ایڑی کو سالم رہنے دیں گے۔ حالانکہ پاؤں کا انگوٹھا بھی سجدہ کے سات

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۲ ص ۹۷۰ حدیث ۳

۲۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۴۹۰ (ابواب حد السرقہ باب ۴ حدیث ۵)

۳۔ نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۹، ۴۳۰

مقامات میں سے ایک ہے اور اسی طرح "محارب" (ڈرانے دھمکانے والے) کے بارے میں جس کی سزاؤں میں سے ایک اس کے ہاتھ پاؤں کے ایک حصّہ کو قطع کرنا ہے۔

تیسرا یہ کہ "مساجد" سے مراد وہی سجود ہے یعنی سجدہ ہمیشہ خدا کے لیے ہونا چاہیے اور اس کے غیر کو سجدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ احتمال بھی آیت کے ظاہر کے برخلاف ہے، اور اس پر کوئی بھی شاہد موجود نہیں ہے۔

جو کچھ بیان ہو چکا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ آیت کے ظاہر کے موافق ہے وہ پہلی تفسیر ہی ہے اور توحید اور عبادت کے خدا کے ساتھ مخصوص ہونے کے بارے میں، ماقبل و مابعد کی آیات سے مکمل مناسبت رکھتی ہے اور دوسری تفسیر آیت کے مفہوم میں وسعت کی قسم سے ہے لیکن تیسری تفسیر پر کوئی شاہد نہیں ہے۔

اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے، قرآن مجید اور پیغمبرؐ کی عبادت کی، حد سے زیادہ تاثیر کو بیان کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "جس وقت خدا کا بندہ ــــ محمدؐ ــــ عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور خدا کو پکارتا ہے تو جنوں کا ایک گروہ شدت سے اس کے اطراف میں جمع ہو جاتا ہے" (وانه لما قام عبد الله يدعوه كادوا يكونون عليه لبدًا)۔[1]

"لبد" (بروزن پدر) اس چیز کے معنی میں ہے جس کے اجزاء ایک دوسرے کے اوپر تہہ بہ تہہ رکھے گئے ہوں، اور یہ تعبیر اس پہلی ملاقات میں، قرآن سننے کے لیے، جن مومنین کے عجیب و غریب ہجوم کو بیان کرتی ہے، اور اسی طرح پیغمبرؐ کی نماز کے حد سے زیادہ قوت جذب کو بیان کرتی ہے۔

اس آیت کے لیے دو اور تفاسیر بھی بیان ہوئی ہیں پہلی یہ کہ مومنین جن پیغمبر کے اصحاب کی حالت کی تشریح کرتے ہیں کہ وہ اتنی کم تعداد ہونے کے باوجود جو مکہ میں ان کی تھی۔ پیغمبرؐ کے ارشادات کو سننے کے لیے کس طرح سر اور کندھے سے بھی اوپر چلے جاتے تھے، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ گروہ جن انھیں نمونہ بنا کر ایمان کی طرف آئیں۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ یہ مشرکین عرب کی حالت کا بیان ہے کہ جس وقت پیغمبر نماز اور قرآن میں مشغول ہوتے تھے تو وہ آپ کے اطراف کو سختی سے گھیر لیتے تھے اور استہزاء کرتے، مذاق اڑاتے اور آپ کو تکلیف و آزار پہنچاتے۔

لیکن آخری تفسیر جن مبلّغین کے ہدف و مقصد کے ساتھ کچھ مناسبت نہیں رکھتی، کیونکہ وہ تو یہ چاہتے تھے کہ دوسروں کو ایمان کا شوق دلائیں لہٰذا مناسب گزشتہ دو معانی میں سے کوئی ایک ہی ہے۔

ایک نکتہ

آیہ "ان المساجد لله" کی تفسیر میں تحریف

پیغمبر اور اولیاء دین سے "توسل" کا مسئلہ یعنی ان حضرات کو بارگاہ خدا میں وسیلہ اور شفیع قرار دینا ایک ایسا مفہوم ہے جو درحقیقت توحید سے

[1] اس تفسیر کے مطابق اور اس بناء پر کہ یہ جملہ جن مومنین کی گفتگو میں سے ہو، "متکلم" کی بجائے "غائب" کی ضمیر کا آنا باب "التفات" سے ہے۔ یا یہ اس لحاظ سے ہے کہ جن میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کی حالت کو بیان کر رہا تھا۔ (غور کیجیے)

منافات رکھتا ہے اور نہ ہی قرآن مجید کی آیات سے، بلکہ یہ توحید پر ایک تاکید ہے اور یہ کہ ہر چیز خدا کی طرف سے ہے۔ قرآن مجید کی آیات میں بھی مسئلہ شفاعت اور اسی طرح مومنین کے لیے پیغمبر کی استغفار اور طلب بخشش کے مسئلہ کا بار بار اشارہ ہوا ہے[۱]

اس کے باوجود بعض ایسے لوگوں کا ——— جو اسلام اور قرآن کی تعلیمات سے دور ہیں ——— اصرار یہ ہے کہ ہر قسم کے توسل اور شفاعت کا انکار کریں اور اپنے مقصود کو ثابت کرنے کے لیے کچھ دستاویزات لائے ہیں، منجملہ ان کے اوپر والی آیت (و ان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدًا) ہے وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے مطابق قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ خدا کے نام کے ساتھ کسی شخص کا نام نہ لو اور اس کے علاوہ کسی کو نہ پکارو، اور کسی سے شفاعت طلب نہ کرو۔

لیکن انصاف یہ ہے کہ اس آیت کا اس مفہوم کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے، بلکہ اس کا ہدف اور مقصد شرک کی نفی ہے، یعنی کسی چیز کو خدا کے ساتھ عبادت کرنے میں یا حاجت طلب کرنے میں شریک قرار دینا۔

دوسرے لفظوں میں اگر کوئی واقعی طور پر خدا کے کام غیر خدا سے چاہے اور اس کو صاحب اختیار اور ان کے انجام دینے میں مستقل شمار کرے تو وہ مشرک ہے۔ جیسا کہ لفظ "مع" (فلا تدعوا مع اللہ) کے جملہ میں اس معنی کی گواہی دیتا ہے کہ کسی کو خدا کا شریک اور مستقل تاثیر کا مبدء نہیں جاننا چاہیے۔

لیکن اگر کوئی خدا کے انبیاء سے شفاعت چاہے یا پروردگار کی بارگاہ میں وساطت کا تقاضا کرے، تو یہ نہ صرف اس کی نفی نہیں کرتا، بلکہ قرآن بعض اوقات خود پیغمبر کو اس بات کی دعوت دیتا ہے، اور کبھی دوسروں کو حکم دیتا ہے کہ وہ پیغمبر سے شفاعت طلب کریں۔

سورۂ توبہ کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا وصل علیھم ان صلاتك سکن لھم "ان کے مال سے زکوٰۃ لے تاکہ تم اس کے ذریعہ انھیں پاک کرو اور (زکات وصول کرتے وقت) ان کیلیے دعا کرو، کیونکہ تیری دعا ان کے سکون و آرام کا باعث ہے۔

اور سورۂ یوسف کی آیہ ۹۷ میں ان کے بھائیوں کی زبانی باپ کو خطاب کرتے ہوئے آیا ہے: یا ابانا استغفر لنا ذنوبنا انا کنا خاطئین "اے اباجان! ہمارے لیے استغفار کیجیے کیونکہ ہم خطا کار تھے۔

یعقوب نے بھی، اس تقاضے کا نہ صرف انکار نہیں کیا بلکہ ان کی درخواست کی موافقت میں یہ وعدہ دیا اور کہا: سوف استغفر لکم ربی " میں بہت جلد تمہارے لیے بارگاہ خدا سے بخشش کا تقاضا کروں گا"۔

اس بناء پر توسل اور شفاعت طلب کرنے کا مسئلہ اس مفہوم کے ساتھ، جو بیان کیا گیا ہے، قرآن کے صریح احکام میں سے ہے۔

---

[۱] ہم نے "قرآن و حدیث کی نظر میں شفاعت" کے مسئلہ کے بارے میں، پہلی جلد سورۂ بقرہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں اور "توسل" کی حقیقت کے بارے میں سورۂ مائدہ کی آیہ ۳۵ جلد ۴ میں، تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

۲۰۔ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ۝

۲۱۔ قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝

۲۲۔ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝ لا

۲۳۔ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ ط

۲۴۔ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ۝

ترجمہ

۲۰۔ کہہ دیجیے: میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور کسی کو بھی اس کا شریک قرار نہیں دیتا۔

۲۱۔ کہہ دیجیے! میں تمھارے لیے کسی نقصان یا ہدایت کا مالک نہیں ہوں۔

۲۲۔ کہہ دیجیے: (اگر میں بھی اس کے حکم کے خلاف کروں گا) تو کوئی بھی مجھے اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے گا اور اس کے علاوہ مجھے اور کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی۔

۲۳۔ میری ذمہ داری تو صرف خدا کی طرف سے ابلاغ رسالت اور اس کے پیغاموں کو پہنچانا ہے، اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ وہ اسی میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔

۲۴۔ (کفار کی یہ کارشکنی اسی طرح جاری رہے گی) جب تک کہ وہ اسے دیکھ نہ لیں، جس کا انھیں وعدہ دیا گیا ہے اس وقت انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس کے مددگار زیادہ ضعیف ہیں اور کس کی جمعیت بہت ہی کم ہے۔

تفسیر

کہہ دیجیے: میں کسی کے سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں

ان آیات میں توحید کی بنیادوں کو مستحکم کرنے اور ہر قسم کے شرک کی نفی کے لیے ـــــ جس کی طرف گزشتہ آیات میں بھی اشارہ ہوا تھا ـــــ پہلے پیغمبرؐ کو حکم دیا جاتا ہے: "کہہ دیجیے میں تو صرف اپنے پروردگار کو پکارتا ہوں اور صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں، اور کسی کو بھی اس کا شریک قرار نہیں دیتا" (قل انما ادعوا ربی ولا اشرك به احدًا)۔

اس کے بعد حکم ہے: "کہہ دیجیے میں تمہارے لیے سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں اور ہدایت دوسرے کے ہاتھ میں ہے"۔ (قل انی لا املك لكم ضرًّا ولا رشدًا)۔

پھر مزید کہتا ہے: "کہہ دیجیے: اگر میں بھی خدا کے حکم کے خلاف کام کروں گا تو کوئی بھی مجھے اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دے گا، اور میں اس کے علاوہ کوئی اور ملجاء اور پناہ گاہ نہیں پاؤں گا"۔ (قل انی لن یجیرنی من الله احد ولن اجد من دونه ملتحدًا)[1]

اس طرح سے نہ تو کوئی مجھے پناہ دے سکتا ہے، اور نہ ہی کوئی چیز میری پناہ گاہ بن سکتی ہے۔ یہ باتیں ایک طرف تو خدا کی بارگاہ میں مکمل عبودیت کا اعتراف ہے، اور دوسری طرف سے پیغمبرؐ کے بارے میں ہر قسم کے غلو کی نفی کرتی ہیں اور تیسری طرف سے یہ بتاتی ہیں کہ نہ صرف بتوں سے ہی کوئی کام نہیں چلتا بلکہ خود پیغمبرؐ بھی اس عظمت کے باوجود عذابِ خدا کے مقابلہ میں ملجاء اور مستقل پناہ نہیں ہو سکتے۔ اور چوتھی طرف سے ان بہانہ جوئیوں اور بے محل توقعات کو ـــــ جو ہٹ دھرم لوگ پیغمبرؐ سے رکھتے تھے، اور ان سے خدائی کاموں کے تقاضے کرتے تھے ـــــ ختم کرتی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ توسل اور شفاعت بھی اذنِ خدا سے ہی ہے۔

"ملتحدًا" ملجاء پناہ گاہ کے معنی میں ہے اور اصل میں "لحد" (بروزنِ مُہد) کے مادہ سے اس گڑھے کے معنی میں ہے جو ایک کنارے پر بنایا گیا ہو، جیسا کہ مُردوں کے لیے قبر کی گہرائی میں کھودا جاتا ہے، جو قبر کی گہرائی میں ایک طرف کو زیادہ مقدار میں کھودتے ہیں اور مُردے کے جسم کو اس میں رکھتے ہیں تاکہ اس پر مٹی نہ گرے اور جانوروں کے آسیب سے بھی زیادہ محفوظ رہے، اس کے بعد ہر دوسری ملجاء جگہ اور پناہ گاہ پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔

جیسا کہ گزشتہ آیات میں بھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ان تعبیرات کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبرؐ خدا کے مقابلہ میں اور مستقل طور پر کوئی نقش و اثر

---

[1] بعض نے اس آیت کے لیے ایک شانِ نزول بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ کفارِ قریش نے پیغمبرؐ سے کہا کہ تم اپنے دین سے پھر جاؤ تاکہ ہم تمہیں پناہ دیں تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انہیں جواب دیا (تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۰ ص ۲۹۳)

نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود وہ خدا سے لوگوں کے لیے مشکلات کے حل کا تقاضا کر سکتے ہیں۔ یا شائستہ اور لائق افراد کے لیے ہدایت کی درخواست کر سکتے ہیں اور یہ عین توحید ہے نہ کہ شرک۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں "ضر" (نقصان) کے مقابلہ میں "رشد" (ہدایت) کو قرار دیا گیا ہے، جو اس طرف اشارہ ہے کہ حقیقی سود اور نفع ہدایت میں ہے۔ جیسا کہ جنات کی باتوں میں بھی گزشتہ آیات میں "شر" اور "رشد" کے مقابلہ میں قرار پایا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "میرا وظیفہ تو صرف خدا کی طرف سے ابلاغ اور اس کے پیغامات کو پہنچانا ہے" (الا بلاغا من الله و رسالاته)[1]

یہ تعبیر اسی چیز کے مشابہ ہے جس کی طرف آیاتِ قرآنی میں بار بار اشارہ ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیہ ۹۲ میں آیا ہے: (انما علی رسولنا البلاغ المبین) "پیغمبر کے ذمہ تو صرف واضح طور پر ابلاغ کرنا (اور پہنچا دینا ہے)۔

اور سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۸ میں آیا ہے:

قل لا املك لنفسي نفعًا ولا ضرًّا الا ما شاء الله ولو كنت اعلم الغيب لاستكثرت من الخير وما مسني السوء ان انا الا نذير و بشير لقوم يؤمنون

"کہہ دیجیے کہ میں تو اپنے لیے بھی سود و زیاں کا مالک نہیں ہوں۔ اور اگر میں غیب کی خبر رکھتا ہوتا تو اپنے لیے بہت سا نفع جمع کر لیتا اور کوئی بھی خرابی مجھے نہ پہنچتی۔ میں تو صرف اس گروہ کے لیے جو ایمان لے آتے ہیں، ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں"۔

اس جملہ کے لیے بہت سے مفسرین نے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے اور وہ یہ ہے کہ: میں اپنی نجات کے لیے دعوتِ حق کے ابلاغ اور اس کی رسالت کے ادا کرنے کے سوا کسی قسم کی کوئی پناہ گاہ نہیں رکھتا[2]

یہ بات کہ "بلاغ" اور "رسالات" میں کیا فرق ہے۔ بعض نے تو یہ کہا ہے کہ "بلاغ" تو اصولِ دین کے ابلاغ کی طرف اشارہ ہے اور "رسالات" فروعِ دین کے بیان کی طرف۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ "بلاغ" احکامِ الٰہی کے معنی میں ہے اور "رسالات" ان کے اجراء کے معنی میں۔

لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کی تاکید ہوں۔ اور قرآن کی بہت سی آیات اس طرح ہیں، جو ان دونوں کو ایک ہی معنی کی صورت میں بیان کرتی ہیں، مثلاً سورۂ اعراف کی آیہ ۶۲، جو یہ کہتی ہے "ابلغكم رسالات ربي"

---

[1] چونکہ "بلاغ" حرف "عن" کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ اس لیے بعض نے "من" کو "عن" کے معنی میں لیا ہے اور بعض نے "کائنا" کا لفظ مقدر سمجھا ہے (الا بلاغا کائنا من الله)

[2] اس تفسیر کے مطابق یہ جملہ گزشتہ جملے ولن اجد من دونه ملتحدًا سے استثناء ہے اور پہلی تفسیر کے مطابق یہ گزشتہ آیات سے استثناء ہے۔

"میں اپنے پروردگار کی رسالتیں تمہیں پہنچاتا ہوں" (اور دوسری متعدد آیات)

بہرحال آیت کے آخر میں خبردار کرتا ہے کہ "جو شخص خدا اور اس کے رسول کی معصیت اور نافرمانی کرے گا، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا" (ومن یعص اللہ ورسولہ فان لہ نار جھنم خالدین فیھا ابداً)۔

یہ بات واضح ہے کہ اس سے مراد ہر گنہگار نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد مشرکین اور کافرین ہیں، کیونکہ ہر گنہگار ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہنے کا مستحق نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، کفار و مشرکین کی یہ وضع و کیفیت، کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کا استہزاء کرتے اور انھیں ضعیف اور کمزور شمار کرتے ہیں اس وقت تک یونہی جاری رہے گی، جب تک کہ وہ اس چیز کو نہ دیکھ لیں جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس وقت وہ جانیں گے کہ کس کے مددگار زیادہ ہیں، اور کس کی جمعیت کم ہے" (حتّٰی اذا رأوا ما یوعدون فسیعلمون من اضعف ناصرًا واقل عددًا)۔[1]

اس بارے میں کہ "ما یوعدون" کے جملے سے دنیا کا عذاب مراد ہے یا آخرت کا یا دونوں؟ بہت سی تفسیریں بیان کی گئی ہیں، لیکن مناسب یہ ہے کہ اس کا معنی عام اور وسیع ہو، خاص طور پر جبکہ تعداد کی زیادتی اور کمی، اور ناصر و مددگار کا ضعف و قدرت زیادہ تر دنیا کے ساتھ مربوط ہے۔ لہٰذا بہت سے مفسرین نے اس کی جنگِ بدر کے مسئلہ کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ جس میں مسلمانوں کی قدرت و قوت آشکار ہوئی تھی اور بہت سی روایات میں مہدی (ارواحنا فداہ) کے ظہور کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے۔ اس بناء پر اگر ہم آیت کی اس کے وسیع معنی کے ساتھ تفسیر کریں تو یہ سب باتیں شامل ہوں گی۔

علاوہ ازیں سورۂ مریم کی آیہ ۵، میں بھی آیا ہے: حتّٰی اذا رأوا ما یوعدون اما العذاب واما الساعة فسیعلمون من ھو شر مکانًا واضعف جندًا - یہ کیفیت اسی طرح برقرار رہے گی جب تک کہ وہ خدا کے وعدے کو اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیں گے یا اس دنیا کا عذاب یا آخرت کا عذاب، اس دن وہ جان لیں گے کہ کس شخص کی حیثیت بدتر اور کس کا لشکر زیادہ کمزور و ناتوان ہے"۔

بہرحال آیت کا لب و لہجہ بتاتا ہے کہ دشمنانِ اسلام اپنے افراد کی قدرت اور کثرت پر ناز کیا کرتے تھے اور انھیں ضعیف و ناتواں شمار کرتے تھے، قرآن اس ذریعہ سے مومنین کو تسلی دیتے ہوئے اور ان کی دلداری کرتے ہوئے انھیں خوشخبری دیتا ہے کہ آخرکار ان کی کامیابی اور دشمنوں کی شکست و ناتوانی کا دن آ پہنچے گا۔

---

[1] "حتّٰی" عام طور پر کسی چیز کی غایت اور نہایت کے لیے آتا ہے اور یہاں اس کے لیے دو وجہ بیان کیے گئے ہیں پہلا یہ کہ یہ ایک محذوف جملہ کی غایت ہے، اور تقدیر میں اس طرح ہے" ولا یزالون یستھزءون و یستضعفون المؤمنین حتّٰی اذا رأوا ما یوعدون" دوسری یہ کہ "یکونون علیہ لبدًا" کی غایت ہو، جو پہلے کی چند آیات میں آیا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

چند نکات

۱۔ خدائی رہبروں کی صداقت

خدائی رہبروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ "شیطانی رہبروں" کے برخلاف ہرگز لمبے چوڑے دعوے نہیں کرتے اور اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتے اور متکبر و مغرور نہیں ہوتے۔

جبکہ فرعون انا ربکم الاعلٰی "میں تمہارا اعلیٰ اور بلند تر خدا ہوں" وھٰذہ الانہار تجری من تحتی، "اور دریائے نیل کی بڑی بڑی شاخیں سب میری نظروں کے سامنے جاری ہیں" کی احمقانہ فریاد بلند کرتا تھا، اور رہبران الٰہی، تواضع اور فروتنی سے، اپنے آپ کو خدا کے بندوں میں سے ایک چھوٹا سا بندہ بتلاتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ وہ اس کے ارادہ کے مقابلے میں اپنی طرف سے کوئی قدرت نہیں رکھتے۔

سورۂ کہف کی آیہ ۱۱۰ میں آیا ہے: قل انما انا بشر مثلکم یوحٰی الیّ، کہہ دیجیے میں تو تم جیسا ہی ایک بشر ہوں، سوائے اس کے کہ میری طرف وحی ہوتی ہے۔

اور دوسری جگہ آیا ہے: وما ادری ما یفعل بی ولا بکم ان اتبع الا ما یوحٰی الیّ وما انا الا نذیر مبین، "میں نہیں جانتا کہ خدا میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ میں تو صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی مجھ پر وحی ہوتی ہے اور میں ایک واضح ڈرانے والے کے سوا اور کچھ نہیں ہوں۔" (احقاف ــــ ۹)

ایک اور دوسری آیت میں یہ آیا ہے: قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک: "کہہ دیجیے میں یہ نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں میں تو غیب کا علم بھی نہیں رکھتا (سوائے اس کے جس کی خدا مجھے تعلیم دیتا ہے) اور نہ ہی میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔" (انعام ــــ ۵۰)

اگر وہ مادی قدرت کی انتہائی بلندی پر بھی پہنچ جاتے تو بھی ہرگز آپے سے باہر نہ ہوتے اور سلیمان کی طرح کہتے: ھٰذا من فضل ربی۔ "یہ قدرت و شوکت میرے پروردگار کا فضل ہے" (نمل ــــ ۴۰)

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد آیات میں سخت قسم کی تعبیریں نظر آتی ہیں، جن میں پیغمبر کی ذات کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں عتاب کرتا ہے، اور اس بات کی تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنی تمام ذمہ داریوں کا خیال رکھیں۔

یہ آیت اور گزشتہ آیات کا مجموعہ جن کی تعداد قرآن میں کم نہیں ہے، اس پیغمبر کی حقانیت پر ایک زندہ سند ہے۔ ورنہ اس میں کونسی رکاوٹ تھی کہ وہ ان لوگوں کے سامنے جو آپ کے لیے ہر قسم کے مقام اور منزلت کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے، اپنے لیے بڑے سے بڑے مقام کا دعویٰ کرتے، جو کہ بشری دسترس سے بھی بالاتر ہوتا اور ہر قسم کے چون و چرا سے دور بھی۔ جیسا کہ تاریخ نے شیطانی رہبروں کے بارے میں اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں۔

ہاں! زیر بحث آیات اور ان ہی جیسی آیات کی تعبیریں رسول اللہ کی دعوت کی حقانیت کے زندہ شواہد ہیں۔

۲. جمعیت کے افراد کا زیادہ ہونا اہم نہیں، جمعیت کا ایمان اہم ہے۔

قرآنی آیات میں یہ مطلب بہت زیادہ نظر آتا ہے کہ ہر زمانے کے طاغوت اپنی جمعیت اور افرادی قوت کی دوسروں پہ زیادتی پر فخر کرتے تھے اور انبیاء کے مقابلے میں اتراتے تھے۔

فرعون موسیٰؑ کے طرف داروں کی تحقیر کے لیے کہتا تھا: "ان ھؤلاء لشرذمة قلیلون"، "یہ بہت ہی تھوڑے سے آدمی ہیں"۔ (شعراء ـــــ ۵۴)

اور مشرکینِ عرب یہ کہا کرتے تھے "نحن اکثر اموالاً واولاداً وما نحن بمعذبین": "ہم بہت مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہمیں ہرگز عذاب نہیں ہوگا" (سبا ـــــ ۳۵)

اور کبھی ایک بے ایمان آدمی ایک مومن آدمی کے مقابلہ میں اپنی ثروت اور افرادی قوت پر فخر کرتے ہوئے کہتا: انا اکثر منك مالاً و اعز نفراً، "میرے پاس تجھ سے زیادہ دولت و ثروت اور زیادہ قوی افراد ہیں" (کہف ـــــ ۳۴) لیکن اس کے مقابلہ میں، افراد مومن، انبیاء اور خدائی رہبروں کی پیروی میں، جمعیت کی زیادتی اور افرادی قوت پر تکیہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی منطق یہ تھی: کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة باذن الله: "کتنے ہی چھوٹے گروہ ایسے ہوئے ہیں جو خدا کے حکم سے بڑے بڑے گروہوں پر کامیاب ہوئے ہیں" (بقرہ ـــــ ۲۴۹)

امیرالمومنین علیؑ فرماتے ہیں:

ایھا الناس لا تستوحشوا فی طریق الھدی لقلة اھله

اے لوگو! ہدایت کی راہ میں افراد کی کمی سے ہرگز دحشت نہ کرو[1]

تاریخ انبیاء خصوصاً پیغمبر اسلامؐ کی تاریخ زندگی، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ بے ایمان اور بکثرت جمعیتیں، ہر قسم کی قدرت رکھنے کے باوجود، مومنین کے تھوڑے سے یار و انصار کے مقابلہ میں کس طرح سے شکست اور درماندگی کا شکار ہوئے۔ قرآن مجید میں "بنی اسرائیل" و "فرعون" اور "طالوت" و "جالوت" کی داستان میں اور "جنگ بدر" و "احزاب" سے مربوط آیات میں بھی یہ معنی اچھی طرح منعکس ہوئے ہیں۔

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۲۰۱

۲۵۔ قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ اَمَدًا ○

۲۶۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ○

۲۷۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ○

۲۸۔ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ○

ترجمہ

۲۵۔ کہہ دیجیے کہ میں نہیں جانتا، جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے، یا میرا پروردگار اس کے لیے کوئی وقت قرار دے گا۔

۲۶۔ عالم الغیب وہی ہے اور وہ کسی شخص کو بھی اپنے غیب کے اسرار پر آگاہ نہیں کرتا۔

۲۷۔ مگر ان رسولوں کو، جنھیں اس نے منتخب کر لیا ہے، اور وہ ان کے لیے، ان کے آگے بھی اور پیچھے بھی نگران مقرر کر دیتا ہے۔

۲۸۔ تاکہ وہ جان لے کہ اس کے پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغامات کو پہنچا دیا ہے اور جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر احاطہ رکھتا ہے اور اس نے ہر چیز کا حساب کر رکھا ہے۔

تفسیر

عالم الغیب خدا ہے

چونکہ گزشتہ آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ اس گروہ کا استہزاء اور سرکشی اسی طرح سے جاری رہے گی جب تک کہ

عذاب کا خدائی وعدہ نہیں آپہنچا اور اس سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا ؟ جیسا کہ مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں بیان کیا ہے، کہ بعض مشرکین نے "نضر بن حارث" کے مانند، گزشتہ آیات کے نزول کے بعد اسی سوال کو پیش کیا تھا، قرآن مجید اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

"کہہ دیجیے! میں نہیں جانتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے (دنیا کا عذاب اور قیام قیامت) قریب ہے یا میرا پروردگار اس کے لیے کوئی زمانہ قرار دے گا" (قل ان ادری اقریب ماتوعدون ام یجعل لہ ربی امدا)۔

یہ علم خدا کی پاک ذات کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس نے یہ چاہا ہے کہ یہ اس کے بندوں سے پوشیدہ رہے، تاکہ مخلوق کے امتحان اور آزمائش کا موضوع مکمل ہو، کیونکہ اگر وہ یہ جان لیں کہ وہ دور ہے یا نزدیک ہے تو دونوں صورتوں میں امتحان کا اثر کم ہو جائے گا۔

"امد" (بروزن صمد) زمانہ کے معنی میں ہے، اس فرق کے ساتھ کہ "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق کہ "زمان" تو ابتدا اور انتہا دونوں کو شامل ہوتا ہے، لیکن "امد" صرف کسی چیز کی انتہاء کے زمانہ کو کہتے ہیں۔

اہلِ لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ "امد" اور "ابد" معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کے نزدیک ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ "ابد" تو غیر محدود مدت کو بھی شامل ہوتا ہے جبکہ "امد" صرف محدود مدت چاہے وہ کتنی بھی طولانی ہو۔

بہرحال، قرآن مجید کی آیات میں بارہا یہ مطلب ہمارے سامنے آتا ہے کہ جب بھی قیامت کے زمانہ کے بارے میں سوال ہوتا ہے تو پیغمبر اکرمؐ اس سے بے اطلاع ہونے کا اظہار فرمایا کرتے تھے اور یہ کہا کرتے تھے کہ "اس کا علم خدا کے ساتھ مخصوص ہے"۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن "جبرئیل" ایک مردِ عرب کی صورت میں پیغمبرؐ کے سامنے ظاہر ہوئے، اور ان سوالات میں سے جو انھوں نے آنحضرتؐ سے کیے، ایک یہ تھا کہ:

اخبرنی عن الساعۃ

"بتلائیے قیامت کب برپا ہوگی"؟

پیغمبرؐ نے فرمایا:

ما المسئول عنھا باعلم من السائل

"جس سے سوال کر رہے ہو وہ (اس مسئلہ میں) سوال کرنے والے سے زیادہ آگاہ نہیں ہے"۔

اس مردِ عرب نے دوبارہ بلند آواز میں کہا:

یا محمدؐ متی الساعۃ؟

"اے محمدؐ! قیامت کب آئے گی"؟

پیغمبرؐ نے فرمایا:

ویحک انھا کائنۃ فما اعددت لھا؟

"وائے ہو تجھ پر قیامت تو آکر رہے گی، یہ تو بتا کہ تو نے اس کے لیے کون سی چیز تیار کر رکھی ہے"۔

اعرابی نے کہا:

"میں نے نماز و روزہ تو کوئی زیادہ فراہم نہیں کیا لیکن خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں"۔

پیغمبرؐ نے فرمایا:

فانت مع من احببت

"پس تو اس کے ساتھ رہے گا جسے تو دوست رکھتا ہے"۔

اصحاب پیغمبرؐ میں سے ایک صحابی "انس" کہتے ہیں،

فما فرح المسلمون بشیء فرحهم بهذا الحديث

"مسلمان کسی حدیث پر اتنا خوش نہیں ہوئے، جتنا کہ اس حدیث پر خوش ہوئے"[1]

اس کے بعد بحث کو جاری رکھتے ہوئے، علم غیب کے بارے میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "عالم الغیب خدا ہے وہ کسی کو بھی اپنے غیب کے اسرار سے آگاہ نہیں کرتا" (عالم الغيب فلا يظهر على غيبه احداً)[2]

اس کے بعد اس کلی مسئلہ سے استثناء کے عنوان سے مزید کہتا ہے: "مگر وہ رسول کہ جسے اس نے برگزیدہ کیا ہے اور اس سے وہ راضی ہے"۔ (الا من ارتضى من رسول)۔

وہ اسے جتنا چاہتا ہے علم غیب کی تعلیم دیتا ہے اور وحی کے ذریعہ اس تک پہنچاتا ہے۔

"پھر اس کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے نگہبان بھیجتا ہے"۔ (فانه يسلك من بين يديه ومن خلفه رصداً)۔

"رصد" اصل میں "مصدری" معنی رکھتا ہے اور کسی چیز کی نگرانی اور نگہبانی کے لیے آمادگی کے معنی میں ہے اور "اسم فاعل" اور "مفعول" پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ مفرد و جمع دونوں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی ایک نگرانی کرنے والا اور نگہبان فرد، یا نگرانی کرنے والے نگہبانوں کی ایک جماعت، دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اور یہاں اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں خدا نزول وحی کے بعد حکم دیتا ہے کہ وہ اس کے پیغمبر کا ہر طرف سے احاطہ کیے رہیں۔ اور شیاطین، جن و انس اور ان کے وسوسوں سے، اور ان چیزوں سے، جو وحی کی اصالت کو خدشہ دار کرتی ہیں، محافظت اور پاسداری کریں۔ تاکہ اللہ کا پیغام کی و زیادتی اور کسی معمولی سے معمولی خدشہ کے بغیر بندوں تک پہنچ جائے۔

اور یہ بات خود پیغمبر کے معصوم ہونے کی ایک دلیل ہے کہ وہ غیبی قوتوں اور خدائی امدادوں اور اس کے فرشتوں کی نگرانی کے ذریعہ لغزشوں اور خطاؤں سے

---

[1] تفسیر "مراغی" جلد ۲۹ ص ۱۰۵

[2] "عالم الغیب" ایک مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر "هو العالم الغيب" ہے اور بعض نے اسے "ربّی" کی صفت یا بدل قرار دیا ہے، جو گزشتہ آیت میں ہے۔

مامون و محفوظ ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں جو اس سورہ کی آخری آیت ہے، ان نگرانی کرنے والے نگہبانوں کے وجود کی دلیل کو اس طرح بیان کرتا ہے
"مقصد یہ ہے کہ خدا جان لے کہ اس کے پیغمبروں نے اپنے پروردگار کے پیغامات بے کم و کاست پہنچا دیئے ہیں۔ اور جو کچھ ان کے پاس ہے، خدا اس پر احاطہ رکھتا ہے، اور اس نے ہر ایک چیز کا باریکی کے ساتھ شمار کیا ہے" (لیعلم ان قد ابلغوا رسالات ربھم واحاط بما لدیھم واحصی کل شیء عددا)۔[1]

یہاں "علم" سے مراد علم فعلی ہے اور دوسرے لفظوں میں آیت کا معنی یہ نہیں ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کے بارے میں کسی چیز کو نہیں جانتا تھا اور بعد میں اس نے جانا ہے۔ کیونکہ خدا کا علم ازلی و ابدی اور بے پایاں ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ علم الٰہی خارج میں تحقق پائے اور عینی صورت اختیار کرے۔ یعنی پیغمبر اس کی رسالت کی عملی طور پر تبلیغ کریں اور اتمام حجت کریں۔

چند نکات

علم غیب کے بارے میں ایک وسیع تحقیق

قرآن کی مختلف آیات میں غور کرنے سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ علم غیب کے سلسلہ میں دو قسم کی آیات موجود ہیں، پہلی قسم کی آیات تو وہ ہیں جو علم غیب کو خدا کے ساتھ مخصوص بتاتی ہیں، اور اس کے غیر سے اس کی نفی کرتی ہیں۔ مثلاً سورہ انعام کی آیہ ۵۹، وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو: غیب کی چابیاں خدا ہی کے پاس ہیں، اس کے سوا کوئی شخص انھیں نہیں جانتا اور سورۂ نمل کی آیہ ۶۵ قل لا یعلم من فی السماوات والارض الغیب الا اللہ، کہہ دیجیے کہ آسمانوں اور زمین میں سے کوئی شخص بھی غیب کو نہیں جانتا، سوائے خدا کے۔

اور پیغمبرؐ کے بارے میں سورۂ انعام کی آیہ ۵۰ میں جو کچھ آیا ہے۔ مثلاً قل لا اقول لکم عندی خزائن اللہ ولا اعلم الغیب، کہہ دیجیے میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ خدا کے خزانے میرے پاس ہیں، اور میں غیب کو نہیں جانتا۔

اور سورۂ اعراف کی آیہ ۱۸۸ میں آیا ہے: ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر: "اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو میں بہت سی خیر فراہم کر لیتا" اور آخر میں سورۂ یونس کی آیہ ۲۰ میں یہ آیا ہے، فقل انما الغیب للہ

---

[1] بہت سے مفسرین نے "لیعلم" کی ضمیر کو پیغمبر اسلام کی طرف لوٹایا ہے اور انھوں نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا اسرار وحی و رسالت کے لیے محافظ اور نگہبان قرار دیتا ہے، تاکہ پیغمبرؐ جان لے کہ انھوں نے وقت کے ساتھ، وحی الٰہی کو اس کے پاس پہنچا دیا ہے اور کسی قسم کا شک نہ کرے وحی الٰہی کی اصالت میں نہ کرے لیکن یہ تفسیر۔ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ رسالت تو پیغمبر کا کام ہے، نہ کہ فرشتوں کا، اور "رسول" کی تعبیر گزشتہ آیت میں اور "رسالات" کی تعبیر چند گزشتہ آیات میں، خود پیغمبرؐ کی ذات کے بارے میں آئی ہے۔ بعید نظر آتی ہے، اور حق وہی پہلی تفسیر ہے۔

"کہہ دیجیے کہ غیب تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے"۔

اور اسی قسم کی دوسری آیات ۔

دوسرا حصہ ان آیات کا ہے جو وضاحت کے ساتھ بتاتی ہیں کہ اولیاء خدا "اجمالی طور پر" علم غیب سے آگاہی رکھتے تھے، جیسا کہ آل عمران کی آیہ ۱۷۹ میں آیا ہے: وما کان الله لیطلعکم علی الغیب ولکن الله یجتبی من رسله من یشاء "خدا تم لوگوں کو اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرے گا لیکن خدا اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے (غیب کے لیے) منتخب کر لیتا ہے (اور اسرار غیب کا ایک حصہ انھیں عطا کر دیتا ہے)۔

اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے معجزات میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا: وانبئکم بما تأکلون وما تدخرون فی بیوتکم: "میں تمھیں اس کی جو تم کھاتے ہو یا اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو، خبر دیتا ہوں"۔ (آل عمران ـــــ ۴۹)

زیر بحث آیت بھی، اس استثناء کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو اس میں آیا ہے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خدا علم غیب کا ایک حصہ اپنے برگزیدہ رسولوں کو عطا فرماتا ہے (کیونکہ نفی سے استثناء ہمیشہ اثبات ہوتا ہے)۔

دوسری طرف قرآن کی وہ آیات جو غیب کی خبروں پر مشتمل ہیں، وہ بھی کم نہیں ہیں۔ مثلاً سورۂ روم کی دوسری آیت سے لے کر چوتھی تک غلبت الروم فی ادنی الارض وهم من بعد غلبهم سیغلبون فی بضع سنین: "رومی مغلوب ہو گئے ہیں، اور یہ شکست نزدیک کی سرزمین میں واقع ہوئی ہے، لیکن وہ اس مغلوبیت کے بعد عنقریب غالب ہوں گے، چند ہی سالوں کے اندر اندر"۔ اور سورۂ قصص کی آیت ۸۵ جو کہتی ہے: ان الذی فرض علیك القرآن لرادك الی معاد، "وہ ہستی جس نے قرآن کو تجھ پر فرض کیا ہے، وہ تجھے تیری جگہ (مکہ) کی طرف دوبارہ پلٹائے گا"۔

اور سورۂ فتح کی آیہ ۲۷ جو کہتی ہے، لتدخلن المسجد الحرام ان شاء الله اٰمنین، "انشاء اللہ تم مسجد الحرام میں انتہائی امن وامان کے ساتھ، داخل ہو گے"۔

اور اسی قسم کی دوسری آیات ۔

اصولی طور پر آسمانی وحی جو پیغمبروں پر نازل ہوتی ہے، ایک قسم کا غیب ہی ہے جو انھیں عطا کیا جاتا ہے۔ یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ وہ غیب سے آگاہی نہیں رکھتے جبکہ ان کے اوپر وحی نازل ہوتی ہے ۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ہمارے پاس بہت سی ایسی روایات موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومین اجمالی طور پر غیب کا علم رکھتے تھے اور بعض اوقات اس کی خبر دیا کرتے تھے ۔ مثلاً فتح مکہ کی داستان اور "حاطب بن ابی بلتعہ" کے واقعہ میں جس میں مکہ کے لوگوں کو خط لکھا تھا اور وہ خط مشرکین مکہ کے پاس پہنچانے کے لیے "سارہ" نامی عورت کے حوالے کیا گیا تھا، تاکہ وہ انھیں لشکر اسلام کے قریب الوقوع حملے سے آگاہ کر دے ۔ اور وہ عورت اس خط کو اپنے گیسوؤں کے درمیان چھپا کر مکہ کی طرف چل پڑی تھی۔ پیغمبرؐ نے علیؑ اور کچھ دوسرے مسلمانوں کو اس کے پیچھے بھیجا، اور فرمایا: تمھیں ایک منزل گاہ پر جس کا نام روضۂ "خاخ" ہے ایک عورت ملے گی جس کے پاس "حاطب" کا خط ہے، جو مشرکین مکہ کے نام ہے، تم اس سے وہ خط لے لو، جب وہ سب کے سب وہاں پہنچے تو انھیں وہ

عورت مل گئی۔ شروع میں اس نے سختی کے ساتھ انکار کیا۔ لیکن آخرکار اس نے اعتراف کر لیا اور انھوں نے وہ خط اس سے لے لیا[1]

اس کے علاوہ جنگِ "موتہ" کا واقعہ اور جعفر اور لشکرِ اسلام کے بعض دوسرے کمانڈروں کی شہادت کی خبر دینا۔ جبکہ پیغمبرؐ نے مدینہ میں مسلمانوں کو، اسی لمحہ میں، جبکہ یہ واقعہ رونما ہوا تھا، خبر دی تھی[2] اور اس قسم کے اخبارِ غیب کی مثالیں پیغمبرؐ کی زندگی میں کم نہیں ہیں۔

نہج البلاغہ میں بھی آئندہ کے واقعات کی بہت سی پیشین گوئیاں نظر آتی ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ علیؑ ان اسرارِ غیب کو جانتے تھے۔ مثلاً وہ باتیں جو خطبہ ۱۳ میں اہلِ بصرہ کی مذمت میں بیان ہوئی ہیں۔ جس میں آپ فرماتے ہیں:

كانى بمسجدكم كجؤجؤ سفينة قد بعث الله عليها العذاب من فوقها ومن تحتها وغرق من فى ضمنها

"گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ آسمان و زمین سے خدا کا عذاب تم پر نازل ہو رہا ہے اور تم سب کے سب اس میں غرق ہو گئے ہو، صرف تمھاری مسجد کی چوٹی کشتی کے سینہ کی طرح پانی کے اوپر نمایاں ہے"

اور دوسری روایات میں بھی جو علمائے اہلِ سنت اور شیعہ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، آئندہ کے واقعات کے بارے میں آنحضرتؐ سے بہت سی پیشین گوئیاں آئی ہیں، جیسا کہ "حجر بن قیس" کے بارے میں ہے کہ آپ نے فرمایا: تجھے میرے بعد لعنت کرنے پر مجبور کریں گے[3]

اور جو کچھ آپ نے "مروان" کے بارے میں فرمایا کہ وہ بڑھاپے کے بعد ضلالت و گمراہی کا پرچم کندھے پر اٹھائے گا[4]

اور جو کچھ "کمیل بن زیاد" نے حجاج سے کہا تھا کہ امیر المومنین علیؑ نے مجھے خبر دی ہے کہ تو میرا قاتل ہے[5]

اور جو کچھ آپ نے خوارج نہروان کے بارے میں فرمایا تھا، کہ ان سے جنگ میں ہمارے گروہ کے دس آدمی بھی نہیں مارے جائیں گے، اور ان میں سے دس آدمی بھی نجات نہیں پائیں گے اور حقیقتاً اسی طرح واقع ہوا[6]

اور جو کچھ امام حسینؑ کی قبر کی جگہ کے بارے میں سرزمین کربلا کے قریب سے عبور کے وقت "اصبغ بن نباتہ" سے فرمایا[7]

کتاب فضائل الخمسہ میں، اہلِ سنت کی کتابوں سے، علیؑ کے علم کی حد سے زیادہ وسعت کے بارے میں، بہت زیادہ روایات نقل ہوئی ہیں، ان سب کا بیان باعثِ طول ہو گا[8]

---

[1] اس واقعہ کی تفصیل حوالے کے ساتھ اسی جلد میں سورۂ ممتحنہ کی تفسیر میں ہے۔

[2] "کامل ابن اثیر" جلد ۲ ص ۲۳۷ (واقعہ غزوۂ موتہ)

[3] مستدرک صحیحین جلد ۲ ص ۳۵۸

[4] طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۳۰

[5] الاصابہ ابن حجر، جلد ۵ قسم ۲ ص ۲۲۵

[6] ہیثمی نے "مجمع" جلد ۶ ص ۲۴۱ پر

[7] "الریاض النضرہ" جلد ۲ ص ۲۲۲

[8] "فضائل الخمسہ" جلد ۲ ص ۲۲۳، ۲۵۲

اہل بیت کی روایات میں بھی متعدد حدیثوں میں آئمہ معصومین کے لیے علم غیب کا اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے کتاب کافی جلد اول کے متعدد ابواب میں اس بارے میں تصریح یا اشارے نظر آتے ہیں۔

مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی جلد ۲۶ میں، اس سلسلہ میں بہت سی احادیث جو ۲۲ حدیثوں تک پہنچتی ہیں نقل کی ہیں۔

مجموعی طور پر پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ معصومین کے لیے اسرار غیب سے آگاہی کے سلسلہ میں روایات حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔

اب بحث صرف یہ ہے کہ ان روایات و آیات کے درمیان، جن میں سے بعض غیر خدا سے علم غیب کی نفی کرتی ہیں اور بعض اثبات کرتی ہیں کس طرح جمع کی جائے ؟

یہاں بحث کے لیے مختلف طریقے موجود ہیں۔

جمع کے طریقوں میں سے مشہور ترین طریقہ یہ ہے کہ علم غیب کے خدا کے ساتھ اختصاص سے مراد علم ذاتی و استقلالی ہے۔ اس بناء پر اس کا غیر مستقل طور پر ہرگز علم غیب سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا، اور ان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور اس کے الطاف و عنایت سے علیٰ اور تبھی جنبہ رکھتا ہے۔

اس جمع کا شاہد یہی زیر بحث آیت ہے، جو کہتی ہے: خدا کسی کو بھی اپنے اسرار غیب سے آگاہ نہیں کرتا، مگر وہ رسول جس سے وہ راضی ہے۔

"نہج البلاغہ" میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ جب علیؑ آیندہ کے واقعات کی خبر دے رہے تھے (اور اسلامی ممالک پر مغلوں کے حملہ کی پیشین گوئی کر رہے تھے) اور آپ کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا: اے امیر المومنین کیا آپ علم غیب جانتے ہیں؟ حضرت ہنسے اور فرمایا:

لیس ھو بعلم غیب، و انما ھو تعلم من ذی علم

"یہ علم غیب نہیں ہے، یہ ایک ایسا علم ہے جو صاحب علم (پیغمبرؐ) سے میں نے حاصل کیا ہے"[1]

اس جمع کو بہت سے علماء محققین نے قبول کیا ہے۔

۲۔ اسرار غیب دو قسم کے ہیں، ایک قسم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے، اور اس کے علاوہ اسے کوئی نہیں جانتا۔ مثلاً قیام قیامت اور اسی قسم کے دوسرے امور، اور ایک قسم وہ ہے کہ جس کی وہ انبیاء و اولیاء کو تعلیم دیتا ہے، جیسا کہ نہج البلاغہ میں اسی خطبہ کے ذیل میں جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے۔ آیا ہے کہ:

وانما علم الغیب علم الساعة و ما عدده الله سبحانه بقوله: ان الله عنده علم الساعة، و ینزل الغیث و یعلم ما فی الارحام، و ما تدری نفس ماذا تکسب غدا و ماتدری نفس بای ارض تموت

"علم غیب تو صرف قیامت کا علم ہے اور وہ ہے جسے خدا نے اس آیت میں شمار کیا ہے، جیسا کہ فرماتا

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۸

ہے: قیامت کے وقت سے آگاہی خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور وہی بارش کو نازل کرتا ہے، اور جو کچھ ماؤں کے رحم میں ہے، اسے جانتا ہے اور کوئی بھی شخص یہ نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا۔ اور کس سرزمین میں مرے گا۔"

اس کے بعد امام نے اس معنی کی تشریح میں مزید فرمایا:

"خداوند اس سے جو رحموں میں برقرار ہے، آگاہ ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی، بدصورت ہے یا خوبصورت، سخی ہے یا بخیل، سعادت مند ہے یا شقی و بدبخت، اہلِ دوزخ ہے یا اہلِ جنت؟ .... یہ سب علوم غیب ہیں، جنھیں خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور ان کے علاوہ وہ علوم ہیں جن کی خدا نے اپنے پیغمبر کو تعلیم دی ہے اور انھوں نے ان کی مجھے تعلیم دی ہے[1]

۲۔ ان دونوں قسم کی آیات و روایات کے درمیان جمع کرنے کا ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ اسرارِ غیب دو جگہ ثبت ہیں "لوحِ محفوظ" (علمِ خدا کے مخصوص خزانہ) ہیں، جس میں کسی قسم کی تبدیلی اور تغیر رونما نہیں ہوتا، اور اس سے کوئی بھی شخص آگاہ نہیں ہے اور (لوحِ محو و اثبات) جو مقتضیات کا علم ہے نہ کہ علتِ تامہ کا۔ اور اسی بناء پر وہ تغیر اور تبدیلی کے قابل ہے اور جسے دوسرے نہیں جانتے وہ اسی حصے مربوط ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

ان الله علمًا لم یعلمه الّا هو، وعلمًا اعلمه ملائکته و رسله فما اعلمه ملائکته وانبیاءه و رسله فنحن نعلمه

"خدا کا ایک علم تو ایسا ہے جسے اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔ اور ایک علم ایسا ہے: جس سے اس نے فرشتوں اور انبیاء کو آگاہ کیا ہے، جو کچھ اس نے فرشتوں، انبیاء اور رسولوں کو دیا ہے، اسے ہم بھی جانتے ہیں"[2]

امام علی بن الحسینؑ سے بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

لولا اٰیة فی کتاب الله لحدثتکم بما کان وما یکون الی یوم القیامة! فقلت له ایة اٰیة؟ فقال قول الله: یمحوا الله ما یشاء و یثبت و عنده ام الکتاب

"اگر قرآن مجید میں ایک آیت نہ ہوتی تو میں تمھیں اس سے بھی جو کہ پہلے گزر چکا ہے، اور ان واقعات کی بھی جو قیامت تک ہونے والے ہیں خبر دے دیتا، راوی کہتا ہے، میں نے کہا: وہ کون سی آیت ہے؟

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۲۸

[2] بحار الانوار جلد ۲۶ ص ۱۶۰، (حدیث ۵) اس سلسلہ میں دوسری متعدد روایات بھی اسی ماخذ میں نقل ہوئی ہیں۔

فرمایا: خدا فرماتا ہے: یمحوا اللہ ما یشاء (خدا جس چیز کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے، اور جس چیز کو چاہتا ہے ثابت رکھتا ہے)، ام الکتاب (اور لوح محفوظ) اسی کے پاس ہے"۔[1]

اس جمع کے مطابق علوم کی تقسیم ان کے حتمی ویقینی ہونے یا نہ ہونے کی بنیاد پر ہے، اور گزشتہ جمع میں معلومات کی مقدار کی بنیاد پر ہے۔ (غور کیجیے)

۴۔ ایک دوسرا راستہ یہ ہے کہ خدا تو تمام اسرار غیب سے بالفعل آگاہ ہے، لیکن انبیاء و اولیاء ممکن ہے بہت سے اسرار غیب کو بالفعل نہ جانتے ہوں، لیکن جب وہ ارادہ کرتے ہیں تو خدا انھیں ان کی تعلیم دے دیتا ہے، اور یقیناً یہ ارادہ بھی خدا کے اذن و رضا سے ہی انجام پاتا ہے۔

اس بناء پر ان آیات و روایات میں جمع، جو یہ بتاتی ہیں کہ وہ نہیں جانتے، تو وہ بالفعل نہ جاننے کی طرف اشارہ ہے، اور جو یہ کہتی ہیں کہ وہ جانتے ہیں وہ ان کے جاننے کے امکان کی طرف اشارہ ہے

اس کی مثال ٹھیک اس طرح ہے کہ کوئی شخص ایک خط کسی آدمی کو دے کہ وہ اسے دوسرے تک پہنچا دے، تو یہاں یہ کہا جاسکتا ہے اسے خط کے مضمون کا کوئی علم نہیں ہے، حالانکہ وہ خط کو کھول کر پڑھ سکتا ہے، کبھی تو صاحب خط نے اسے مطالعہ کی اجازت دی ہوئی ہوتی ہے، اس صورت میں اسے ایک لحاظ سے خط کے مضمون کا عالم سمجھا جاسکتا ہے اور کبھی اسے اجازت دی ہوئی نہیں ہوتی۔

اس جمع کی شاہد وہ روایات ہیں جو کتاب کافی کے ایک باب میں ان الائمۃ اذا شاؤا ان یعلموا علموا: "ائمہ جب کسی چیز کو جاننا چاہتے ہیں تو انھیں اس کا علم دے دیا جاتا ہے" کے عنوان کے تحت وارد ہوئی ہیں:

منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

اذا اراد الامام ان یعلم شیئا اعلمہ اللہ بذالک

"جب امام کسی چیز کو جاننا چاہتا ہے تو خدا اسے اس کی تعلیم دے دیتا ہے"۔[2]

جمع کی یہ وجہ، پیغمبرؐ اور امام کے علم کے سلسلہ میں بہت سی مشکلات کو حل کر دیتی ہے۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ وہ اس پانی اور کھانے کو جس میں زہر ملا ہوا ہوتا ہے کس طرح کھا لیتے ہیں، حالانکہ یہ بات جائز نہیں ہے کہ انسان کوئی ایسا کام کرے جو اس کے لیے خطرے کا موجب ہو، ایسے مواقع کے لیے کہنا پڑے گا کہ پیغمبر یا امام کو اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ وہ اس کا ارادہ کریں کہ اسرار غیب ان پر آشکار ہوں

اسی طرح بعض اوقات مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر یا امام کسی مطلب پر آگاہ نہ ہوں، یا کوئی امتحان اور آزمائش ایسی صورت پذیر ہو جو ان کے تکامل و ارتقاء کا موجب بنے، جیسا کہ "لیلۃ المبیت" کی داستان میں آیا ہے کہ علیؑ پیغمبرؐ کے بستر پر سوتے، حالانکہ خود جناب سے نقل ہوا ہے کہ آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ صبح کے وقت جب مشرکینِ قریش اس بستر پر حملہ کریں گے تو شہید ہو جائیں گے یا جان سلامت رہے گی۔ یہاں مصلحت یہ ہے کہ امام اس کام کے انجام سے آگاہ نہ ہو، تاکہ خدائی آزمائش اور امتحان پورا ہو جائے اور اگر امام جانتے کہ وہ پیغمبر کے

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۱۲ (حدیث ۱۶۰)

[2] کتاب کافی باب ان الائمۃ اذا شاؤا ان یعلموا علموا (حدیث ۲) اسی مضمون کی دوسری روایات بھی اسی باب میں نقل ہوئی ہیں۔

بستر پر سوئیں گے اور صبح کو صحیح و سالم اٹھیں گے، تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں تھی اور آیاتِ قرآنی اور دیگر روایات میں اس ایثار و قربانی کی اہمیت کے سلسلہ میں جو کچھ وارد ہوا ہے کچھ زیادہ قابلِ توجہ نظر نہیں آتا۔

ہاں علمِ ارادی کا مسئلہ اس قسم کے تمام اشکالات و اعتراضات کا جواب ہے۔

۵۔ علمِ غیب کے سلسلہ میں مختلف روایات کے لیے جمع کی ایک اور صورت بھی موجود ہے (اگرچہ یہ راہ ان روایات کے ایک حصّہ پر ہی صادق آتی ہے) اور وہ یہ ہے کہ ان روایات میں مخاطب مختلف تھے۔ وہ لوگ جو آئمہ کے بارے میں علمِ غیب کے مسئلہ کی قبولیت کی استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں، انھیں توحق مطلب بیان کردیا جاتا تھا لیکن مخالف یا ضعیف و کم استعداد افراد کے لیے سننے والے کی سمجھ کے مطابق بات کی جاتی ہے۔

مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ ابو بصیر اور امام صادقؑ کے بزرگ اصحاب میں سے کچھ اور افراد ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ امام غصہ میں بھرے ہوئے مجلس میں وارد ہوئے، جب آپ بیٹھ گئے تو حاضرین مجلس سے فرمایا:

یا عجبا لاقوام یزعمون انا نعلم الغیب، ما یعلم الغیب الا اللّٰہ عزوجل، لقد هممت بضرب جاریتی فلانة، فهربت منی فما علمت فی ای بیوت الدار هی

"تعجب ہے کہ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم علمِ غیب جانتے ہیں (حالانکہ) خدا کے سوا کوئی بھی علمِ غیب نہیں جانتا۔ میں اپنی ایک کنیز کو تادیب کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے آگے سے بھاگ گئی اور مجھے یہ علم نہ ہوا کہ وہ گھر کے کس کمرے میں ہے"[۱]

حدیث کا راوی کہتا ہے کہ جس وقت امام اس مجلس سے اٹھے، تو میں اور کچھ دوسرے اصحاب آپ کی منزل میں داخل ہوئے اور ہم نے کہا، ہم آپ پر قربان ہوں، آپ نے اپنی کنیز کے بارے میں اس طرح فرمایا ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ کے پاس بہت سے علوم ہیں، اور ہم علمِ غیب کا تو کوئی نام نہیں لیتے؟

امام نے اس کے بعد اس سلسلہ میں تشریح کی جس کا مفہوم اسرارِ غیب پر آپ کی آگاہی تھا۔

واضح رہے کہ اس مجلس میں کچھ ایسے افراد تھے، جو ان معانی کے ادراک اور مقامِ امام کی معرفت کے لیے ضروری استعداد نہیں رکھتے تھے۔

اس بات پر توجہ رکھنا چاہیے کہ ان پانچوں طریقوں میں آپس میں کوئی منافات نہیں ہے اور سب ہی صادق ہو سکتے ہیں۔

(غور کیجیے)

۲۔ ائمہ کے علمِ غیب کو ثابت کرنے کی ایک اور راہ

یہاں اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ پیغمبرؐ اور آئمہ معصومین اجمالی طور پر اسرارِ غیب سے آگاہ تھے دو اور راستے بھی موجود ہیں:

---

[۱] اصول کافی جلد ۱ باب نادر فیه ذکر الغیب حدیث ۳

پیغمبر یا امام کی ماموریت کسی خاص مکان و زمان میں محدود نہیں تھی، بلکہ پیغمبر کی رسالت اور آئمہ کی امامت جہانی اور جاودانی ہے، تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس قسم کی وسیع ماموریت اور ذمہ داری رکھتا ہو، اور وہ اپنے محدود زمانہ اور ماحول کے سوا کسی قسم کی آگاہی نہ رکھتا ہو؟ کیا وہ شخص، جو مثلاً کسی ملک کے ایک بہت بڑے حصہ کی امارت اور گورنری پر مامور ہو، اس علاقہ سے بے خبر ہو سکتا ہے اور پھر یوں وہ اپنی ماموریت کو اچھی طرح انجام دے سکتا ہے؟

دوسرے الفاظ میں: پیغمبرؐ اور امام کو اپنی مدتِ حیات میں، احکام الٰہی کو اس طرح بیان و اجراء کرنا چاہیے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر مکان کے تمام انسانوں کی ضروریات کے لیے جواب دہ ہوں اور یہ ممکن نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اسرار غیب کے ایک حصّہ کو جانتے ہوں۔

دوسرا یہ کہ: قرآن مجید میں تین آیات ایسی ہیں کہ اگر ہم انھیں ایک دوسری کے ساتھ رکھ دیں تو اس سے پیغمبرؐ اور آئمہؑ کے علم کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے۔ پہلی یہ کہ قرآن اس شخص کے بارے میں جو "ملکہ سبا" کا تخت آنکھ جھپکنے میں سلیمان کے پاس لے آیا (یعنی آصف بن برخیا) کہتا ہے:

قال الذی عندہ علم من الکتاب انا اٰتیک بہ قبل ان یرتد الیک طرفک فلما راٰہ مستقرا عندہ قال ھٰذا من فضل ربی

"اس شخص نے، جو کتاب میں سے کچھ علم رکھتا تھا، کہا: میں اس کو آنکھ جھپکنے سے پہلے تیرے پاس لے آؤں گا۔ جب سلیمان نے اسے اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہا: یہ میرے پروردگار کے فضل سے ہے" (نمل ـــــ ۴۰)

دوسری آیت میں یہ آیا ہے:

قل کفیٰ باللہ شھیدا بینی و بینکم و من عندہ علم الکتاب

"کہہ دیجیے میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے خدا اور وہ شخص جس کے پاس علم کتاب ہے کافی ہے" (رعد ـــــ ۴۳)

دوسری طرف بہت سی احادیث میں، جو اہل سنت اور شیعہ کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، اس طرح آیا ہے کہ ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا سے "الذی عندہ علم من الکتاب" کے معنی پوچھے، تو آپ نے فرمایا: وہ میرے بھائی سلیمان بن داؤد کا وصی تھا تو میں نے کہا "و من عندہ علم الکتاب" کون ہے، تو آپ نے فرمایا:

ذاک اخی علی بن ابی طالب

"وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں"[1]

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "علم من الکتاب" جو "آصف" کے بارے میں آیا ہے، علم جزئی کو بیان کرتا ہے، اور "علم الکتاب" جو علی کے بارے میں آیا ہے، وہ علم کلی کو بیان کرتا ہے، اس سے "آصف" اور علیؑ کے مقام علمی کے درمیان فرق واضح ہو جاتا ہے۔

---

[1] "احقاق الحق" جلد ۳ ص ۲۸۰-۲۸۱، اور "نور الثقلین" جلد ۲ ص ۵۲۳ کی طرف رجوع کریں۔

تیسری طرف سورۂ نحل کی آیہ ۸۹ میں آیا ہے: و نزلنا علیك الكتاب تبیانًا لكل شیء ۱۶ "ہم نے قرآن کو تجھ پر نازل کیا ہے، جو ہر چیز کو بیان کرتا ہے"۔

واضح رہے کہ جو شخص اس قسم کی کتاب کے اسرار کا عالم ہو اسے غیب کے اسرار کو جاننا چاہیے اور یہ اس چیز پر ایک واضح اور آشکار دلیل ہے کہ اولیاء خدا میں سے کوئی انسان حکم خدا سے اسرار غیب پر آگاہ ہو سکتا ہے۔

علم غیب کے سلسلہ میں ہم نے سورۂ انعام کی آیہ ۵۰، ۵۹ جلد ۳ اور آیہ ۱۸۸ سورۂ اعراف جلد ۴ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

۴۔ "جن" کی خلقت کے بارے میں تحقیق

"جن" جیسا کہ اس لفظ کے لغوی مفہوم سے معلوم ہوتا ہے ایک ایسا نظر نہ آنے والا موجود ہے جس کے بہت سے مشخصات قرآن میں ذکر ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

۱۔ ایک ایسا وجود ہے جو آگ کے شعلے سے پیدا ہوا ہے، انسان کے برخلاف جو مٹی سے پیدا ہوا ہے (وخلق الجان من مارج من نار) (الرحمٰن ـــــ ۱۵)

۲۔ وہ علم و ادراک اور حق و باطل کی پہچان، اور منطق و استدلال کا حامل ہے (سورۂ جن کی مختلف آیات)

۳۔ وہ تکلیف و مسئولیت (فرائض و وظائف) رکھتا ہے۔ (سورۂ جن اور سورۂ رحمٰن کی آیات)

۴۔ ان میں سے ایک گروہ مومن و صالح اور ایک گروہ کافر ہے۔ (و انا منا الصالحون و منا دون ذالك) (جن ـــــ ۱۱)

۵۔ وہ حشر و نشر اور معاد و قیامت رکھتے ہیں (واما القاسطون فكانوا لجهنم حطبًا) (جن ـــــ ۱۵)

۶۔ وہ آسمانوں میں نفوذ کرنے، اور وہاں سے خبریں لینے اور چوری چھپے سننے کی قدرت رکھتے تھے، لیکن پھر انہیں روک دیا گیا۔ (و انا كنا نقعد منها مقاعد للسمع فمن يستمع الاٰن يجد له شهابًا رصدًا) (جن ـــــ ۹)

۷۔ وہ بعض انسانوں کے ساتھ رابطہ پیدا کر لیا کرتے تھے، اور اس محدود آگاہی کے ذریعہ جو وہ بعض پوشیدہ اسرار کے بارے میں رکھتے تھے، انسانوں کو گمراہ کرتے تھے۔ (و انه كان رجال من الانس يعوذون برجال من الجن فزادوهم رهقًا) (جن ـــــ ۶)

۸۔ ان میں کچھ ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں، جو بہت زیادہ طاقت رکھتے ہیں، جیسا کہ انسانوں میں بھی ایسے افراد ہیں (قال عفريت من الجن انا اٰتيك به قبل ان تقوم من مقامك) ایک سرکش جن نے سلیمان سے کہا: "میں ملکہ سبا کا تخت، اس سے پہلے کہ تو اپنی جگہ سے اٹھے (دربار برخواست کرے) اس کی سرزمین سے یہاں لے آؤں گا" (نمل ـــــ ۳۹)

۹۔ وہ انسانوں کے بعض ضروری کاموں کے انجام دینے کی قدرت رکھتے ہیں (ومن الجن من یعمل بین یدیہ
باذن ربہ۔۔۔۔ یعملون لہ مایشاء من محاریب و تماثیل و جفان کالجواب) "جنات کا ایک
گروہ خدا کے حکم سے سلیمان کے سامنے کام کیا کرتا تھا اور اس کے لیے ..... عبادت خانے، تصویریں اور بڑے بڑے برتن تیار کیا کرتے
تھا" (سبا ـــ ۱۲، ۱۳)

۱۰۔ ان کی خلقت روئے زمین پر انسانوں کی خلقت سے پہلے تھی (والجان خلقناہ من قبل)
(حجر ـــ ۲۷) اور کچھ دوسری خصوصیات۔
اس کے علاوہ قرآنی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ عام لوگوں میں مشہور ہے اور وہ انھیں "ہم سے بہتر" سمجھتے ہیں،
اس کے برخلاف انسان ایک ایسی نوع ہے جو ان سے بہتر اور برتر ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام خدائی پیغمبر انسانوں میں سے انتخاب
ہوئے، اور وہ پیغمبر اسلام پر جو نوع بشر میں سے تھے، ایمان لائے اور آپ کی تبعیت اور پیروی کی، اور اصولی طور پر شیطان پر آدم کے
سامنے سجدہ کا واجب ہونا جو قرآن کی تصریح کے مطابق اس وقت گروہ جن (کے بزرگوں) میں سے تھا۔ (کہف ـــ ۵۰) نوع انسان
کی جن پر فضیلت پر دلیل ہے۔
یہاں تک تو ان مطالب سے گفتگو تھی، جو قرآن مجید سے، اس نظر نہ آنے والے موجود کے بارے میں معلوم ہوتے ہیں، جو ہر قسم کی
بیہودگی اور غیر علمی مسائل سے خالی ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ عامۃ الناس نے بہت سی خرافات اس موجود کے بارے میں گھڑی ہوئی ہیں۔
جو عقل و منطق کے ساتھ سازگار نہیں ہیں اور اسی بناء پر ایک خرافاتی اور غیر منطقی چہرہ اس موجود کو دیا گیا ہے کہ جونہی لفظ "جن" بولا جاتا ہے تو چند
ایک خرافات بھی اس کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ انھیں عجیب و غریب اور دہشت ناک شکلوں اور دم دار و مونڈی
وپر آزار، کینہ پرور و بدرفتار سمجھتے ہیں جو گرم پانی کے ایک برتن کو کسی خالی جگہ میں انڈیلنے سے گھروں کو آگ لگا سکتے ہیں۔ اور اسی قسم
کے دوسرے موہومات۔
حالانکہ اگر وجود جن کو ان خرافات سے الگ کیا جائے تو اصل مطلب مکمل طور پر قابلِ قبول ہے، کیونکہ زندہ موجودات کے صرف
ان ہی چیزوں میں منحصر ہونے پر، جنھیں ہم دیکھتے ہیں، کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ بلکہ علماء اور علوم طبیعی کے ماہرین کہتے ہیں کہ وہ
موجودات، جنھیں انسان اپنے حواس کے ساتھ درک کر سکتا ہے، ان موجودات کے مقابلہ میں، جو حواس کے ساتھ قابلِ ادراک نہیں ہیں
کچھ بھی نہیں ہیں۔
ان آخری ایام تک جب تک کہ خوردبین سے زندہ موجودات کا انکشاف نہیں ہوا تھا، کوئی شخص یہ یقین نہیں کرتا تھا کہ پانی کے
ایک قطرہ میں، یا خون کے ایک قطرہ میں ہزارہا زندہ جاندار موجود ہیں، جن کو دیکھنے کی انسان میں قدرت نہیں ہے۔
نیز ماہرین کہتے ہیں: ہماری آنکھ نہ صرف محدود رنگوں کو ہی دیکھتی ہے، اور ہمارا کان محدود صوتی امواج کو ہی سنتا ہے، وہ رنگ اور آوازیں
جو ہماری آنکھ اور کان سے قابلِ ادراک نہیں ہیں، ان سے بہت ہی زیادہ ہیں جو قابلِ ادراک ہیں۔
جب عالم کی وضع و کیفیت اس طرح کی ہو، تو پھر کون سی تعجب کی بات ہے، کہ انواع و اقسام کے زندہ موجودات اس
عالم میں موجود ہوں، جنھیں ہم اپنے حواس کے ساتھ درک نہ کر سکتے ہوں، اور جب پیغمبر اسلام جیسا مخبر صادق ان کے متعلق خبر دے، تو ہم

اسے قبول کیوں نہ کریں؟

بہر حال ایک طرف تو قرآن نے، جو کلام ناطق صادق ہے، جنات کے وجود کی ان خصوصیات کے ساتھ، جو اوپر ذکر ہوئی ہیں، خبر دی ہے، اور دوسری طرف کوئی عقلی دلیل اس کی نفی پر موجود نہیں ہے، لہٰذا اس کو قبول کر لینا چاہیئے اور غلط و ناروا توجیہات سے بچنا چاہیئے، اور اسی طرح سے عوام کے خرافات سے اس سلسلہ میں اجتناب کرنا چاہیئے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "جن" کبھی ایک زیادہ وسیع مفہوم پر بولا جاتا ہے، جو نظر نہ آنے والے کئی موجودات کے انواع کو شامل ہے، عام اس سے کہ وہ عقل و ادراک کے حامل ہوں یا عقل و ادراک نہ رکھتے ہوں۔ یہاں تک کہ حیوانات کا وہ گروہ بھی، جو آنکھ سے نظر آتا ہے اور عام طور پر گھونسلوں میں چھپا رہتا ہے، اس وسیع معنی میں داخل ہے۔

اس بات کی شاہد وہ روایت ہے جو پیغمبرؐ سے نقل ہوئی ہے، آپ نے فرمایا:

خلق الله الجن خمسة اصناف، صنف كالريح في الهواء، وصنف حيات وصنف عقارب، وصنف حشرات الارض، وصنف كبني آدم عليهم الحساب والعقاب

"خدا نے جنوں کو پانچ اقسام میں پیدا کیا ہے: ایک صنف تو ہوا کی طرح فضا میں ہے (جو نظر نہیں آتی)، ایک صنف سانپوں کی صورت میں ہے، ایک صنف بچھوؤں کی صورت میں ہے، ایک صنف حشرات زمین ہیں اور ایک صنف ان میں سے انسان کی مانند ہے، جس پر حساب و عتاب ہے۔"[1]

اس روایت اور اس کے وسیع مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت سی مشکلات، جو روایات و حکایات میں، جنات کے بارے میں بیان کی جاتی ہیں، حل ہو جائیں گی۔

مثلاً بعض روایات میں امیر المومنین علیؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

لا تشرب الماء من ثلمة الاناء ولا من عروته فان الشيطان يقعد على العروة والثلمة

برتن کے ٹوٹے ہوئے حصہ اور اس کے دستے والی طرف سے پانی نہ پیو، کیونکہ شیطان اس کے دستہ اور ٹوٹے ہوئے حصہ پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔[2]

اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "شیطان"، "جنوں" میں سے ہے، اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ برتن کی ٹوٹی ہوئی جگہ، اور اسی طرح اس کا دستہ انواع و اقسام کے جراثیم کے اجتماع کی جگہ ہوتا ہے، یہ بعید نظر نہیں آتا کہ "جن و شیطان" "عام مفہوم" کے لحاظ سے اس قسم کے موجودات کو بھی شامل ہوں، اگرچہ اس کا ایک خاص معنی بھی ہے، جو ایک ایسا موجود ہے جو فہم و شعور اور مسئولیت و

---

[1] "سفینۃ البحار" جلد اول ص ۱۰۶ (مادہ جن)

[2] "کتاب کافی" جلد ۶ ص ۳۸۵ کتاب الاشربہ باب الاوانی حدیث ۵

ب (فرائض و وظائف) رکھتا ہے، اور اس سلسلہ میں روایات بہت زیادہ ہیں۔[1]

پروردگارا! اس دن جس میں جن وانس تیری دادگاہ عدل میں حاضر ہوں گے، اور سب بدکار اپنے کیے پر پشیمان ہوں گے، تو ہمیں اپنے لطف میں قرار دے۔

خداوندا! تیرے ملک کا دامن وسیع اور کشادہ ہے اور ہماری معلومات اور ہماری معرفت محدود ہے، ہمیں لغزشوں، خطاؤں اور غیر حق بات کرنے سے مصئون و محفوظ رکھ۔

بارِ الٰہا! تیرے پیغمبر کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی دعوت کو انسانوں کے علاوہ جن وپری نے بھی قبول کیا ہے، ہمیں اس کی دعوت کو سچا ماننے والوں میں سے قرار دے۔

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ جن

بروز جمعہ ۲۱ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

۱۳۶۵/۷/۴

اختتام ترجمہ

بروز جمعہ یکم صفر ۱۴۰۸ھ

مطابق ۲۵ ستمبر ۱۹۸۷ء

بوقت تقریباً ساڑھے پانچ بجے صبح

۱۸۱ ای ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

---

[1] کتاب "اولین دانشگاہ و آخرین پیغمبر" کی پہلی جلد میں اس سلسلہ میں تقریباً تیس روایات جمع کی گئی ہیں۔

سورۂ مزمل

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی بیس آیات ہیں

تاریخ شروع

۲۲ محرم الحرام ۱۴۰۷ھ

۱۳۶۵/۷/۵

سورۂ مزمل کے مضامین و مطالب

سورہ کی آیات کا لب و لہجہ یہ بتاتا ہے کہ یہ "مکی" سورتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اس طرح اس کے "مدینہ" میں نزول کا احتمال، جیسا کہ بعض نے کہا ہے، بعید نظر آتا ہے۔ لیکن آغاز و انجام کی آیات کے لب و لہجہ کا فرق یہ بتاتا ہے کہ ان آیات کے درمیان قابلِ ملاحظہ زمانہ کا فاصلہ تھا۔ جیسے بعض مفسرین نے "آٹھ ماہ" بعض نے "ایک سال" اور بعض نے "دس سال" تک لکھا ہے[1]

اس سورہ کی بہت سی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ یہ اس وقت نازل ہوا جب پیغمبر اپنی اعلانیہ دعوت کا آغاز کر چکے تھے اور مخالفین آپ کے مقابلہ میں مخالفت اور تکذیب کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا پیغمبر کو یہ حکم ملتا ہے کہ اس مرحلہ میں نرمی اور مدارات سے کام لیں۔

اس لیے یہ احتمال کہ تمام سورۂ پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں نازل ہوا ہے، بہت بعید نظر آتا ہے۔ ممکن ہے اس کی ابتدائی آیات اس طرح کی ہوں، لیکن مسلّم طور پر اس کی تمام آیات اس طرح کی نہیں ہیں، کیونکہ اس کی تعبیریں "اسلام کے پھیلنے اور کم از کم مکہ کی حد تک مخالفین کی مخالفت اور مبارزہ کے لیے قیام کی نشاندہی کرتی ہے اور ہم یہ جانتے ہیں کہ آغازِ دعوت کے تین سالوں میں، اسی قسم کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

وہ شانِ نزول، جو اس سورہ یا اس کی آیات کے ایک حصہ کے لیے، روایات میں بیان کی گئی ہے وہ بھی مختلف ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ جب پیغمبر پر سب سے پہلی وحی ہوئی اور پیغامِ الٰہی پہنچا، آپ وحشت زدہ ہو کر خدیجہ کے پاس آئے (چونکہ جسمانی ناراحتی محسوس کر رہے تھے لہٰذا کچھ آرام کرنا چاہا) اور فرمایا: "مجھے کوئی کپڑا اوڑھا دو" اس موقع پر جبرئیل نازل ہوئے اور "یا ایھا المزمّل" کا پیغام پیغمبر کے لیے لائے[2]

جبکہ دوسری آیات میں یہ آیا ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ پیغمبر اپنی دعوت کو آشکار اور ظاہر کر چکے تھے، اور "قریش" "دارالندوہ" میں جمع ہوئے تاکہ وہ پیغمبر کے معاملہ میں غور و فکر کریں اور ان سے مقابلہ کرنے کے لیے کسی نام اور شعار (نعرہ) کا انتخاب کریں، بعض نے کہا کہ وہ "کاہن" ہے۔ لیکن ایک گروہ نے اس پیش نہاد کی مخالفت کی، بعض دوسروں نے کہا وہ "مجنون" ہے۔ لیکن پھر ایک گروہ نے مخالفت کی بعض نے "ساحر" کے عنوان کو ترجیح دی، تو اسے بھی انھوں نے قبول نہ کیا۔

آخرکار انھوں نے کہا، جو کچھ بھی ہے "وہ دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتا ہے (اس بناء پر ساحر ہے) اس کے بعد مشرکین اس جلسے

---

[1] تفسیر "درالمنثور" جلد ۶ ص ۲۷۶ و "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۷۷

[2] "روح المعانی" جلد ۲۸ ص ۱۰۱ اور نورالثقلین جلد ۵ ص ۴۴۶

منتشر ہو گئے۔

یہ بات پیغمبر تک پہنچی تو آپؐ نے اپنے آپ کو ایک چادر میں لپیٹ لیا (اور آرام کرنے لگے) اس وقت جبرئیل آئے "یاایھا المزمل" اور "یاایھا المدثر" کو آپ کے پاس آکر پڑھا۔ [1]

نتیجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، یہ سورہ ظاہراً مکہ میں نازل ہوئی ہے، اور یقینی طور پر اس کا ایک حصہ اسلام کے اعلانیہ اظہار، اور نسبتاً مکہ میں نفوذ کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ احتمال بھی ہے کہ سورہ کی کچھ ابتدائی آیات اوائل بعثت میں نازل ہوئی ہوں۔

بہرحال اس سورہ کے مضامین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ :- سورہ کی ابتدائی آیات ہیں، جو پیغمبرؐ کو عبادت اور تلاوت کے لیے رات کو قیام کی دعوت دیتی ہیں، اور ایک سنگین اور سخت پروگرام کو قبول کرنے کے لیے آمادگی پر آمادہ کرتی ہیں۔

دوسرا حصہ :- انھیں صبر و شکیبائی اور اس خاص علاقہ میں مخالفین کے ساتھ مقاومت و مقابلہ اور مدارات و نرمی کی دعوت دیتا ہے۔

تیسرے حصہ میں :- معاد و قیامت کے بارے میں مباحث ہیں، اور موسیٰ بن عمران کو فرعون کی طرف بھیجنے اور اس کی سرکشی اور پھر اس کے دردناک عذاب کو بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے حصہ میں :- ان سخت احکام کو، جو سورہ کی ابتداء میں، رات کے وقت قیام کے سلسلہ میں آئے تھے مسلمانوں کی مشکلات کی بناء پر ان میں تخفیف کرتا ہے۔

اور پانچویں حصہ میں :- یعنی اس سورہ کے آخری حصہ میں دوبارہ تلاوت قرآن، نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے اور استغفار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے آیا ہے:

من قرأ سورة المزمل رفع عنه العسر فی الدنیا والآخرة

"جو شخص سورۂ مزمل کو پڑھے گا تو دنیا و آخرت کی سختیاں اس سے اٹھ جائیں گی۔" [2]

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۲ ص ۲۷۶

[2] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۷۵

اور ایک دوسری حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

من قرأ سورة المزمل في العشاء الآخرة او في آخر الليل كان له الليل والنهار شاهدين مع السورة واحياه الله حياة طيبة واماته ميتة طيبة

"جو شخص سورۂ مزمل کو دوسری نماز عشاء (نماز عشاء ہی مراد ہے، کیونکہ بعض اوقات مغرب کو پہلی عشاء کہا جاتا ہے) یا آخر شب میں پڑھے، تو رات اور دن اور اسی طرح یہ سورہ قیامت کے دن اس کے گواہ ہوں گے اور خدا اسے پاکیزہ زندگی اور پاکیزہ موت دے گا"[1]

یقیناً یہ عظیم فضائل اس صورت میں ہیں جبکہ سورت کے مضامین، رات کے قیام، قرآن کی تلاوت، صبر و استقامت، ایثار و قربانی اور انفاق پر عمل کیا جائے گا نہ کہ وہ تلاوت جو عمل سے خالی ہو۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۷۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ یٰۤاَیُّہَا الۡمُزَّمِّلُ ○

۲۔ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ○

۳۔ نِّصۡفَہٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡہُ قَلِیۡلًا ○

۴۔ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡہِ وَ رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ○

۵۔ اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ○

ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے

۱۔ اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے۔

۲۔ رات کو، تھوڑے سے حصّہ کے سوا، قیام کیا کر۔

۳۔ آدھی رات یا اس میں سے تھوڑا کم کر دے۔

۴۔ یا آدھی رات پر کچھ اضافہ کر دے، اور قرآن کو دقّت وتامّل کے ساتھ پڑھا کر۔

۵۔ کیونکہ ہم عنقریب ایک سنگین وثقیل بات کا تجھ پر القاء کریں گے۔

تفسیر

اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے کھڑا ہو جا

جیسا کہ اس سورۃ کے آغاز کے لب ولہجہ سے پتہ چلتا ہے، یہ پیغمبرؐ کو استقامت کے لیے اور ایک عظیم وسنگین ذمہ داری کو قبول کرنے

کے لیے آمادگی کی ایک آسمانی دعوت ہے کہ جسے پہلے سے خود کو تیار کیے بغیر انجام دینا ممکن نہیں ہے، فرماتا ہے: "اے اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے" (یا ایھا المزمل)[1]

"رات کو تھوڑے سے حصہ کے سوا قیام کیا کر" (قم الیل الا قلیلاً)۔

"آدھی رات یا اس میں سے تھوڑا سا کم کر دے" (نصفہ او انقص منہ قلیلاً)۔

"یا آدھی رات پر کچھ اضافہ کر دے" (او زد علیہ)۔

"اور قرآن کو انتہائی غور و خوض سے اور انتہائی وضاحت و صفاوت کے ساتھ تلاوت کیا کر" (ورتل القرآن ترتیلاً)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب پیغمبرؐ ہیں لیکن "یا ایھا الرسول" اور "یا ایھا النبی" کے عنوان سے نہیں بلکہ "یا ایھا المزمل" کے عنوان سے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اپنے اوپر کپڑا لپیٹ کر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ رہنے کا دور نہیں ہے، بلکہ یہ کھڑے ہونے اور خود کو تیار کرنے اور عظیم رسالت کو انجام دینے کے لیے آمادگی کا دور ہے۔

اور اس کام کے لیے رات کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ:

اولاً دشمنوں کی آنکھ اور کان نیند کی حالت میں ہیں، اور

ثانیاً زندگی کے کاروبار بند ہیں، اور اس بناء پر انسان غور و فکر اور تربیتِ نفس کے لیے زیادہ سے زیادہ آمادگی رکھتا ہے۔

اسی طرح اس پروگرام کے لیے متنِ اصلی کے عنوان سے "قرآن" کا انتخاب اس بناء پر ہے کہ یہ اس سلسلہ کے تمام ضروری اسباق کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور یہ ایمان کی تقویت، استقامت، تقویٰ اور پرورشِ نفوس کا بہترین وسیلہ ہے۔

"ترتیل" کی تعبیر جو اصل میں منظوم "تنظیم" و "ترتیب" کے معنی میں ہے اور یہاں آیاتِ قرآنی کو تأنی (ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا) ضروری نظم، حروف کی صحیح ادائیگی، الفاظ کو وضاحت کے ساتھ پڑھنا، آیات کے مفاہیم میں دقت و تأمل اور ان کے نتائج میں غور و فکر کرنا ہے۔

واضح رہے کہ قرآن کی اس طرح سے تلاوت انسان کو معنوی نشو و نما، اخلاقی شہامت اور تقویٰ و پرہیزگاری سرعت کے ساتھ بخش سکتی ہے اور اگر بعض مفسرین نے اس کی نماز پڑھنے کے معنی میں تفسیر کی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کا ایک اہم حصہ "تلاوتِ قرآن" کہا ہے۔

"قم اللیل" کے جملہ میں "قیام" کی تعبیر، سونے کے مقابلہ میں کھڑا ہونے کے معنی میں ہے، نہ کہ صرف پاؤں پر

---

[1] "مزمل" اصل میں "متزمل" تھا۔ "تزمل" کے مادہ سے جس کا معنی اپنے اوپر کپڑا لپیٹنا ہے اور "زمیل" جو ہم ردیف کے معنی میں ہے (وہ شخص جو کسی کے پیچھے سواری پر ہو) اور اس کے بعد رفیق اور ساتھی کے معنی میں آیا ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ وہ ارتباط اور قریبی تعلق رکھتا ہے۔

کھڑا ہونے کے معنی میں ہے۔

لیکن ان آیات میں "شب زندہ داری" کی مقدار کے بارے میں جو مختلف تعبیریں آئی ہیں، وہ حقیقت میں "اختیار" کو بیان کرنے کے لیے ہیں، اور وہ پیغمبر کو یہ اختیار دیتی ہیں کہ آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ بیدار رہیں اور قرآن کی تلاوت کریں، پہلے مرحلہ میں "ساری رات" سوائے تھوڑی سی مقدار کے ذکر کرتا ہے، اور اس کے بعد اس میں تخفیف کرکے آدھی رات تک پہنچاتا ہے اور اس کے بعد آدھے سے بھی کم۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے "دو تہائی" "آدھی" اور "ایک تہائی" رات کے درمیان تخییر مراد ہے۔ اس آیت کے قرینہ سے جو اسی سورہ کے آخر میں آئے گی جس میں فرماتا ہے: (ان ربك يعلم انك تقوم ادنٰى من ثلثى الّيل و نصفه وثلثه)

ضمنی طور پر سورہ کے آخر کی اسی آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اس رات کے قیام میں اکیلے نہیں تھے، بلکہ مومنین کا ایک گروہ بھی اس خود سازی و تربیتی اور آمادگی کے پروگرام میں پیغمبر کے ساتھ تھا اور انھوں نے اس راہ میں آپ کو ایک اسوہ اور نمونہ کے طور پر قبول کیا ہوا تھا۔

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ "قم الليل الّا قليلاً" کے جملہ سے مراد یہ ہے کہ بعض راتوں کے سوا تمام راتوں میں قیام کیا کر، اور اس طرح سے استثناء رات کے حصول میں نہیں ہے، بلکہ راتوں کے افراد میں ہے۔ لیکن یہ تفسیر " " کے مفرد ہونے اور "نصف" (آدھی) اور اس سے کمتر کی تعبیر کے ساتھ درست نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد اس سخت اور اہم حکم کے "ہدف نہائی" اور "مقصد اصلی" کو اس طرح بیان کرتا ہے: ہم عنقریب ایک سخت بات تجھ کو القاء کریں گے" (انّا سنلقى عليك قولاً ثقيلاً)۔

اگرچہ مفسرین "قول ثقيل" کے بارے میں الگ الگ بیان رکھتے ہیں، جو مسئلہ کے ایک ہی پہلو کو پیش کرتے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قول کا سنگین ہونا، جس سے بلاشک و شبہ قرآن مجید مراد ہے، مختلف پہلوؤں سے ہے۔

آیات کے مفہوم اور مطالب کے لحاظ سے سنگین۔

دلوں پر تحمل کے لحاظ سے سنگین، یہاں تک کہ خود قرآن کہتا ہے: لو انزلنا هٰذا القراٰن على جبل لراٰيته خاشعًا متصدعًا من خشية الله: "اگر ہم اس قرآن کو پہاڑوں پر نازل کرتے، تو تم اسے خاشع اور شگافتہ دیکھتا (حشر ۔۔۔ ۲۱)

وعدوں اور وعیدوں، ذمہ داریوں اور مسئولیتوں کے بیان کے لحاظ سے سنگین۔

تبلیغ اور دعوت کی راہ کی مشکلات کے لحاظ سے سنگین۔

ترازوئے عمل اور عرصۂ قیامت میں سنگین

اور آخر میں پروگرام پیش کرنے اور اس کے مکمل اجراء کے لحاظ سے سنگین۔

ہاں! اگرچہ قرآن کا پڑھنا سہل و آسان اور زیادہ دلنشیں ہے لیکن اس کے مفاد اور معانی کو عمل میں لانا اسی نسبت سے سنگین اور مشکل ہے

خصوصاً پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں، اور آپ کے مکہ میں قیام کرنے کے وقت، جب ماحول کو جہالت، بت پرستی اور خرافات کے تیرہ و تاریک بادلوں نے گھیر رکھا تھا، لیکن پیغمبر اکرمؐ اور ان کے تھوڑے سے ساتھی، قرآن مجید کی تربیت سے مدد لیتے ہوئے، اور نماز شب سے اعانت طلب کرتے ہوئے اور پروردگار کی پاک ذات کے تقرب سے استفادہ کرتے ہوئے ان تمام مشکلات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے اور اس "قول ثقیل" کے بار کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر اسے منزل مقصود تک پہنچا دیا۔

چند نکات

ا۔ تلاوتِ قرآن اور دعا و عبادت کے لیے رات کو اٹھنا

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اگرچہ ان آیات میں مخاطب پیغمبر کی ذاتِ اقدس ہے۔ لیکن سورہ کا متن اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مومنین بھی اس پروگرام میں پیغمبر کی ذات کے ساتھ ہیں۔

اب بحث صرف یہ ہے کہ کیا یہ قیام اور شب زندہ داری، پیغمبر کی دعوت کے آغاز میں سب پر واجب تھی یا نہیں؟

بعض مفسرین کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ امر واجب تھا۔ بعد میں سورہ کی آخری آیت نے آکر اس حکم کو منسوخ کر دیا اور اس میں تقریباً ایک سال کا فاصلہ تھا۔

یہاں تک کہ بعض کا عقیدہ تو یہ ہے کہ یہ حکم پنجگانہ نمازوں کی تشریع سے پہلے تھا اور جب پنجگانہ نمازیں مشروع قرار دے دی گئیں تو اس کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

لیکن ——— جیسا کہ مرحوم "طبرسی" نے بھی "مجمع البیان" میں نقل کیا ہے ——— اس سورہ کی آیات کے ظاہر میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آتی جو "نسخ" کے اوپر دلیل ہو اور بہتر یہی ہے کہ یہ کہا جائے کہ یہ قیام و عبادت مستحب اور سنت مؤکدہ ہے اور اس میں ہرگز وجوب کا پہلو تھا ہی نہیں، سوائے پیغمبر اکرمؐ کی ذات کے لیے، کیونکہ قرآن کی بعض دوسری آیات کے مطابق نماز شب آپ پر واجب تھی اور اس میں کوئی مانع اور حرج نہیں ہے کہ یہ ستو پیغمبرؐ کے لیے واجب اور مسلمانوں پر مستحب ہو، اور اس سے قطع نظر اوپر والی آیات میں جو کچھ آیا ہے وہ "نماز شب" میں منحصر نہیں ہے۔ کیونکہ نماز شب تو آدھی رات یا دو تہائی رات یا ایک تہائی رات تک کو بھی شامل نہیں رکھتی۔ جو کچھ آیت میں بیان ہوا ہے وہ تو ترتیلِ قرآن کے لیے اٹھنا ہے۔

اس بناء پر یہ کام ابتداء میں مستحب مؤکد کی صورت میں تھا اور اس کے بعد اس میں تخفیف کر دی گئی اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ہر کام کے آغاز میں خصوصاً ایک عظیم انقلاب کی ابتداء میں، ہمیشہ زیادہ قوت و توانائی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ پیغمبر اور مسلمانوں کو، اس قسم کا فوق العادہ حکم دیا گیا ہو کہ وہ رات کا زیادہ حصہ بیدار رہیں اور اس جدید پروگرام اور اس کی انقلابی تعلیمات سے آشنا ہوں، اور اس سے آگاہی کے علاوہ خود کو اس پر عمل کرنے کے لیے روحانی طور پر تیار کریں۔

۱۔ ترتیل کا معنی

اوپر والی آیات میں جس چیز پر تکیہ کیا گیا ہے وہ قرآن کی قرات کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ " ترتیل " کا مسئلہ ہے۔

" ترتیل " کی تفسیر میں معصومین سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں، جن میں سے ہر ایک اس کے وسیع المفہوم جہات میں سے کسی ایک جہت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ایک حدیث میں امیرالمومنین علی سے آیا ہے:

بینه بیانا ولا تهذه هذ الشعر ولا تنثره نثر الرمل، ولکن اقرع به القلوب القاسیة ولا یکونن هم احدکم اخر السورة

" ترتیل یعنی اس کو واضح طور پر بیان کر، نہ تو اشعار کی طرح جلدی اور پے بعد دیگرے پڑھ، اور نہ ہی ریت کے ذروں کی طرح اس کو بکھیر دے۔ لیکن اس طرح پڑھو کہ اس سے سخت اور سنگین دلوں کو نرم کر دے، اور انہیں بیدار کر دے، ہرگز تمہارا مقصد یہ نہ ہو کہ تم لازمی اور حتمی طور پر آخر سورہ تک پہنچو اور اسے ختم کر کے ہو (بلکہ اہم بات یہ ہے کہ تم آیات کے مطالب اور معانی کو سمجھو)"[۱]

ایک اور حدیث میں امام صادق سے " ترتیل " کی تفسیر میں یہ آیا ہے:

اذا مررت بایة فیها ذکر الجنة فاسأل الله الجنة، واذا مررت بایة فیها ذکر النار فتعوذ بالله من النار

" جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جنت کا ذکر ہو تو رک کر خدا سے جنت کا سوال کرو (اور اپنی اس کے لیے اصلاح کرو) اور جب تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنم کا ذکر ہو، تو خدا سے اس سے پناہ مانگو (اور خود کو اس سے دور رکھو)"[۲]

ایک اور روایت میں اسی امام سے آیا ہے کہ آپ نے " ترتیل " کی تفسیر میں فرمایا:

هو ان تتمکث فیه وتحسن به صوتك

" ترتیل " یہ ہے کہ تو آیات کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھے اور انہیں اچھی آواز میں پڑھے "[۳]

ایک اور حدیث میں انہیں حضرت سے اس طرح نقل ہوا ہے:

ان القرآن لا یقرأ هذرمة، ولکن یرتل ترتیلا اذا مررت بایة فیها

---

[۱] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۳۷۸، یہ حدیث اصول کافی جلد ۲۔ باب " ترتیل القرآن بالصوت الحسن " اور دوسری کتابوں میں بھی مختصر فرق کے ساتھ آئی ہے۔

[۲] وہی مدرک

[۳] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۳۷۸

ذکر النار وقفت عندها وتعوذت باللہ من النار

"قرآن کو جلدی جلدی، سرعت اور تیزی کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ جس وقت تم کسی ایسی آیت سے گزرو جس میں جہنم کا ذکر ہو، تو وہاں رک جاؤ، اور خدا سے جہنم کی آگ سے پناہ مانگو۔"[1]

اور آخری بات یہ ہے کہ پیغمبر کے حالات میں نقل ہوا ہے کہ آنحضرتؐ آیات کو ایک دوسرے سے الگ الگ کر کے پڑھتے تھے اور اپنی آواز کو کھینچ کھینچ کر پڑھتے تھے۔[2]

یہ روایات، اور دوسری روایات جو اسی مفہوم کی اصولِ کافی، نور الثقلین، در منثور اور حدیث و تفسیر کی تمام کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، وہ سب کی سب اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ آیاتِ قرآنی کو اس طرح نہیں پڑھنا چاہیے، جو مطالب و مضامین اور پیام سے خالی ہو، بلکہ ان تمام امور کی طرف توجہ رکھنی چاہیے، جو پڑھنے اور سننے والوں میں اس کی تاثیر کو گہرا کر دے، اور اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ اللہ کا پیام ہے اور اس کا مقصد اس کے مطالب و مضامین کو تحقق بخشنا (اور عملی جامہ پہنانا ہے)۔

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں بہت سے مسلمان اس واقعیت سے بہت دور ہو گئے ہیں، اور انھوں نے قرآن کے صرف الفاظ پر اکتفا کر لیا ہے، اور ان کا مقصد صرف سورت اور قرآن کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ بغیر اس کے کہ وہ یہ جانیں کہ یہ آیات کس مقصد کے لیے نازل ہوئی ہیں؟ اور کس پیام کی تبلیغ کر رہی ہیں؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ قرآن کے الفاظ بھی محترم ہیں، اور ان کو پڑھنا بھی فضیلت رکھتا ہے؛ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ الفاظ اور تلاوت ان کے مطالب و مضامین کو بیان کرنے کا مقدمہ اور تمہید ہے۔

۲۔ نمازِ شب کی فضیلت

یہ آیات دوبارہ شب زندہ داری، نمازِ شب، اور اس وقت ـــــ جبکہ غافل لوگ خوابِ غفلت میں پڑے سوئے ہوئے ہوتے ہیں ـــــ قرآن کی تلاوت کی اہمیت کو گوشزد کرتی ہیں، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے کہ رات کو عبادت کرنا، خصوصاً سحر کے وقت، اور طلوعِ فجر کے نزدیک، روح کی صفائی، تہذیبِ نفوس اور انسان کی معنوی تربیت، پاکیزگیِ قلب، دل کی بیداری، ایمان و ارادہ کی تقویت اور انسان کے دل و جان میں تقویٰ کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں سب سے زیادہ اثر رکھتا ہے، یہاں تک کہ ایک ہی مرتبہ کی آزمائش سے، انسان اس کے آثار، واضح طور پر اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

اسی بناء پر آیاتِ قرآنی کے علاوہ روایاتِ اسلامی میں بھی اس مطلب پر بہت زیادہ تاکید ہوئی ہے۔

منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

ان من روح اللہ تعالیٰ ثلاثۃ، التہجد باللیل وافطار الصائم

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۴۲

[2] "مجمع البیان" زیر بحث آیت کے ذیل میں

و لقاء الاخوان

"تین چیزیں خدا کی مخصوص عنایات میں سے ہیں، شبانہ عبادت (نمازِ تہجد) روزہ داروں کو افطار کرانا اور مسلمان اور مومن بھائیوں کی زیارت و ملاقات کرنا" [1]

ایک اور حدیث میں انہیں جناب سے آیا ہے کہ آپ نے آیہ "ان الحسنات یذھبن السیئات" (نیک کام برے کاموں کے اثر کو زائل کر دیتے ہیں) کی تفسیر میں فرمایا:

صلاة اللیل تذھب بذنوب النھار

"نمازِ تہجد دن کے گناہوں کو ختم کر دیتی ہے" [2]

سورہ اسراء کی آیہ ۷۹ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلہ میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اور ہم نے وہاں پر نمازِ تہجد کی اہمیت کے بارے میں بہت سی روایات نقل کی ہیں [3]

---

[1] [2] "بحار الانوار" جلد ۸۷ ص ۱۴۲

[3] "تفسیر نمونہ" جلد ۱۲ ص ۲۲۷

۶۔ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ؕ

۷۔ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ؕ

۸۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ؕ

۹۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا ۝

۱۰۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ۝

ترجمہ

۶۔ یقیناً شبانہ (عبادت) کا پروگرام زیادہ مضبوط اور زیادہ استقامت والا ہے۔

۷۔ اور دن میں تو تمھارے لیے مسلسل اور طولانی کوششیں جاری رہیں گی۔

۸۔ اپنے رب کے نام کا ذکر کیے جاؤ اور صرف اسی کے ساتھ دل کو لگائے رکھو۔

۹۔ وہی مشرق و مغرب کا پروردگار ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ پس تم اسی کو اپنا نگہبان اور کارساز مانو

۱۰۔ اور جو کچھ وہ (دشمن) کہتے ہیں اس پر صبر کرو اور شائستہ طور پر ان سے دوری اختیار کرو۔

تفسیر

رات کے وقت کی عبادت کا اثر

یہ آیات اسی طرح رات کی عبادت اور رات کی تاریکی میں قرآن کی تلاوت کے ذریعے، معنوی تعلیمات کے سلسلہ میں بحث کو جاری رکھے ہوئے ہیں، اور حقیقت میں جو کچھ گزشتہ آیات میں بیان ہوا ہے: یہ اس کی دلیل کے طور پر آئی ہیں: "یہ عبادت اور رات کی تلاوت کا حکم اس بناء پر ہے کیونکہ (عبادت اور تعلیم کا) یہ پروگرام زیادہ مضبوط اور زیادہ استقامت والا ہے (انّ ناشئة اللیل هی اشد وطئا واقوم قیلا)"۔[1]

---

[1] "ناشئة" اسم فاعل ہے لیکن یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ مصدر ہو "عافیة" کی طرح۔

"ناشئة" ۔ "نشئ" (بروزن نشر) کے مادہ سے "حادثہ" کے معنی میں ہے، اور یہ بات کہ یہاں اس سے کیا مراد ہے اس کے تین تفاسیر بیان ہوئی ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ اس سے مراد رات کی گھڑیاں ہیں، جو یکے بعد دیگرے حادث ہوتی ہیں۔ یا خصوصیت کے ساتھ آخر شب اور سحر کی گھڑیاں ہیں۔

دوسری یہ ہے کہ اس سے مراد نماز و عبادت اور تلاوت کے لیے قیام کا پروگرام ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے نقل ہوا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

هي القيام في آخر الليل الى صلاة الليل

اس سے مراد آخر شب میں نماز تہجد کے لیے قیام کرنا ہے [1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے اس آیہ کی تفسیر میں آیا ہے:

قيامه عن فراشه لا يريد الا الله

اس سے مراد بستر سے کھڑا ہونا ہے جس کا مقصد خدا کے سوا اور کچھ نہ ہو [2]

تیسری یہ ہے کہ اس سے مراد "معنوی و روحانی حالات" اور "ملکوتی نشاط و جذبہ" ہے، جو انسان کے دل و جان میں رات کی ان مخصوص گھڑیوں میں پیدا ہوتا ہے جس کے اثرات روح انسانی میں زیادہ گہرے ہوتے ہیں اور ان کا دوام زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔

البتہ یہ تفسیر اور اس سے پہلے والی تفسیر ایک دوسرے کی لازم و ملزوم ہیں اور یہ مناسب ہے کہ یہ دونوں ہی آیت میں جمع ہوں۔

"وطئًا" ۔ اصل میں قدم رکھنے اور اسی طرح موافقت کرنے کے معنی میں ہے۔

"اشد وطئًا" کی تعبیر یا تو مشقت و زحمت کے معنی میں ہے جو شبانہ قیام اور عبادت میں ہوتی ہے یا پھر ثابت و راسخ تاثیرات کے معنی میں ہے جو ان عبادات کے سایہ میں انسان کی روح اور جان میں پیدا ہوتی ہے (البتہ دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے)

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ اس زیادہ موافقت کے معنی میں ہے جو ان لمحات میں انسان کے دل، آنکھ اور کان کے درمیان ہوتی ہے اور ان سب کے اجتماع سے عبادت کی راہ پیدا ہوتی ہے۔

"اقوم" "قیام" کے مادہ سے محکم و مضبوط اور زیادہ صاف کے معنی میں ہے اور "قیل" "بات کرنے" کے معنی میں ہے یہاں ذکر خدا اور تلاوت قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

مجموعی طور پر یہ آیت ان آیات میں سے ہے جو "شبانہ عبادت" اور سحر گاہی دعاؤں، اور ایسے لمحات میں جبکہ ہر وقت کی نسبت، دلی فراغت کے اسباب زیادہ فراہم ہوتے ہیں ——— محبوب کے ساتھ راز و نیاز کی رسا ترین باتوں کو اپنی معنی خیز تعبیروں کے ساتھ بیان کرتی ہے اور اسی طرح سے انسان کی تہذیب نفس، اور روح و جان کی پرورش میں اس کی تاثیر کو بیان کرتی ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۷۸۔

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۴۰ حدیث ۱۹

انسان کی روح، ان لمحات میں دعا و مناجات اور ذکر و فکر کے لیے ایک خاص قسم کی آمادگی رکھتی ہے۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے، یہ اس بناء پر ہے کہ دن میں تو تمہیں مسلسل اور بہت زیادہ سعی و کوشش اور جدوجہد کرنی پڑے گی (ان لك فی النهار سبحا طویلا)۔

تم ہمیشہ مخلوق کی ہدایت اور پروردگار کی رسالت کی تبلیغ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے مشکلات کو حل کرنے میں لگے رہتے ہو، اور عبادت اور مناجات کے لیے کافی وقت نہیں ملتا، لہٰذا اس کی بجائے رات کو عبادت کیا کرو۔

ایک اور احتمال بھی جو آیت کی تفسیر میں موجود ہے اور کئی جہات سے زیادہ بہتر اور قبل و بعد کی آیات کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے، یہ ہے کہ چونکہ تم دن بھر میں سنگین وظائف، بھاری ذمہ داریوں اور بہت زیادہ جدوجہد کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھاتے ہو، لہٰذا تمہیں رات کی عبادت کے ساتھ خود کو تقویت دینی چاہیے اور ان عظیم فعالیتوں کے لیے اس قیام شب کے ذریعہ مزید تیار ہونا چاہیے۔

"سبح" (بروزن "مدح") اصل میں حرکت اور آمد و رفت کے معنی میں ہے اور بعض اوقات تیرنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ مسلسل حرکت میں رہتا ہے

گویا وہ انسانی معاشرے کو ایک بے کراں سمندر سے تشبیہ دیتا ہے، جس میں ایک گروہ کثیر غرق ہونے کی حالت میں ہے، اس کی امواج خوفناک ہر طرف حرکت میں ہیں، سرگرداں کشتیاں اس میں پناہ گاہ تلاش کرتی پھرتی ہیں اور پیغمبر اسلام اس سمندر میں غرق ہونے والوں کے لیے، اکیلے نجات دہندہ ہیں اور آپ کا قرآن اس سمندر میں اکیلی نجات کی کشتی ہے۔

اس عظیم تیراک کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی شبانہ عبادات کے ذریعہ اس روزانہ کی عظیم ماموریت اور رسالت کے لیے آمادہ کرے۔

رات کی عبادت کے قیام کے حکم، اور اس کے عمیق اور گہرے آثار کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد پانچ احکام کا، جو ان کی تکمیل کرتے ہیں، ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کے نام کو یاد کرو اور اس کا ذکر کرو" (واذکر اسم ربك)۔

مسلم طور پر اس سے مراد صرف خدا کے نام کا ذکر کرنا نہیں ہے بلکہ معنی کی طرف توجہ ہے کیونکہ لفظی ذکر قلبی یاد کا ایک مقدمہ اور تمہید ہے اور قلبی ذکر روح و جان کو صفا بخشتا ہے اور دل میں معرفت و تقویٰ کے نہال کی آبیاری کرتا ہے۔

"رب" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس وقت تم اس کے مقدس نام کا ورد کرو تو اس کی بے پایاں نعمتوں اور اپنے لیے اس کی مسلسل تربیت کی طرف توجہ رکھو۔

ایک مفسر نے پروردگار کے ذکر کے کچھ مراحل بیان کیے ہیں۔

پہلا مرحلہ اس کے نام کے ذکر کا ہے، جس کی طرف زیر بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

اس کے بعد والے مرحلہ میں اس کی پاک ذات کی دل میں یاد آوری کی نوبت آتی ہے، جو سورۂ اعراف کی آیہ ۲۰۵ میں بیان ہوئی ہے" واذکر ربك فی نفسك تضرعا و خیفة " "اپنے پروردگار کو اپنے دل میں تضرع اور خوف کے

ساتھ یاد کرو"۔

آخرکار تیسرا مرحلہ آن پہنچتا ہے، اس مرحلہ میں خدا کی ربوبیت کے مرحلے سے اوپر چلا جاتا ہے اور خدا کے صفاتِ جمال وجلال کے مجموعہ کے مقام تک ــــــ جو اللہ میں جمع ہے ــــــ پہنچ جاتا ہے، جیسا کہ سورہ احزاب کی آیہ ۴۱ میں فرماتا ہے:

یا ایھا الذین اٰمنوا اذکروا اللہ ذکرًا کثیرًا

"اے ایمان لانے والو! خدا کو کثرت سے یاد کیا کرو"

اور اسی طرح سے یونہی یہ ذکر جاری و ساری رہے گا اور مرحلہ بہ مرحلہ تکامل وارتقاء پیدا کرتا رہے گا اور ذکر کرنے والوں کو اوجِ کمال تک پہنچا دے گا۔[1]

دوسرے حکم میں فرماتا ہے: خدا ہی کے ساتھ اپنے دل کو لگاؤ اور اس کے غیر سے امید کو قطع کر لو اور خلوص کے ساتھ عبادت کے لیے کمر بستہ ہو جاؤ: (و تبتل الیہ تبتیلاً)۔[2]

"تبتل" "بتل" (بروزن ختم) کے مادہ سے اصل میں انقطاع کے معنی میں ہے اور اسی لیے مریم کو "بتول" کہا گیا ہے کیونکہ انھوں نے اپنے لیے کوئی شوہر انتخاب نہیں کیا اور اگر بانوئے اسلام فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) کو بھی بتول کہا جاتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام عورتوں سے اعمال ورفتار اور معرفت کے لحاظ سے جدا اور برتر تھیں اور انقطاع الی اللہ کی حالت تک پہنچی ہوئی تھیں۔

بہرحال "تبتل" یہ ہے کہ انسان اپنے پورے دل کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو اور اللہ کے سوا ہر کسی سے منقطع ہو جائے، اور اپنے اعمال صرف اسی کے لیے بجا لائے اور اخلاص میں غرق ہو۔

اور اگر ایک روایت میں پیغمبرِ گرامی اسلام سے یہ نقل ہوا ہے کہ:

لا رھبانیۃ، ولا تبتل فی الاسلام

"اسلام میں نہ تو رہبانیت ہے اور نہ ہی تبتل"۔[3]

تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح سے ترکِ دنیا کرنا جو عیسائی راہبوں میں رائج ہے، وہ اسلام میں موجود نہیں ہے وہ ترکِ دنیا کے لیے شادی بیاہ کو بھی ترک کرتے ہیں اور ہر قسم کی اجتماعی فعالیت کو بھی، لیکن ایک واقعی اور حقیقی مسلمان، قلبِ اجتماع میں زندگی بسر کرنے کے باوجود تمام تر خدا ہی کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

---

[1] "تفسیر فخر رازی" جلد ۳۰ ص ۱۷۷ (اقتباس)

[2] قاعدہ کے مطابق یہاں "مفعول مطلق" "تبتل" ہونا چاہیے جو باب "تفعل" کا مصدر ہے، لیکن اس کی جگہ یہاں پر باب تفعیل کا مصدر آیا ہے۔ یہ امر اس بات کے علاوہ کہ یہ آیات کے آخر میں ہم آہنگی کو برقرار رکھتا ہے، ممکن ہے ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ بھی ہو اور وہ یہ ہے کہ "انقطاع الی اللہ" نہ سارا کا سارا اکتسابی ہے اور نہ ہی تمام کا تمام موہبتی۔ کیونکہ اس میں ایک طرف تو پرہیزگار بندہ کی سعی و کوشش شرط ہے اور دوسری طرف سے پروردگار کا لطف۔

[3] "مفردات" و "مجمع البحرین" مادہ "تبتل"

بعض روایات میں، آئمہ معصومین سے نقل ہوا ہے کہ " تبتل " کا معنی حالت نماز میں ہاتھ کو بلند کرنا ہے[1] لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ حقیقت میں اخلاص اور انقطاع الی اللہ کے ایک مظہر کا بیان ہے۔

بہر حال پروردگار کی وہ یاد اور یہ اخلاص، خلق خدا کی ہدایت کے سنگین و سخت پروگرام میں مردان خدا کا عظیم سرمایہ ہے۔

اس کے بعد تیسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: " وہی مشرق و مغرب کا پروردگار، جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے، اسی کو اپنا محافظ اور کارساز قرار دو" (رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلا)۔

یہاں " ذکر اللہ " اور " اخلاص " کے مرحلہ کے بعد، توکل اور تمام کاموں کو خدا کے سپرد کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ یعنی جہان ہستی کا سارا مجموعہ، اسی کی حکومت و ربوبیت کے زیر تسلط ہے اور پرستش کے لائق وہی یکہ و تنہا معبود ہے، یہ تعبیر حقیقت میں، توکل بر خدا کے موضوع پر ایک دلیل کے طور پر آئی ہے، انسان اس پر توکل کیسے نہ کرے اور اپنے معاملات کو اس کے سپرد کیوں نہ کرے حالانکہ اس وسیع عالم ہستی میں اس کے علاوہ کوئی اور حاکم، فرمانروا، منعم، مربی اور معبود نہیں ہے۔

آخر چوتھے اور پانچویں حکم میں فرماتا ہے: " دشمن جو کچھ کہتے ہیں اس پر صبر و شکیبائی اختیار کرو، اور ان سے شائستہ اور عمدہ طریقہ سے دوری اختیار کرو" (واصبر علٰی ما یقولون واھجرھم ھجرا جمیلا)۔

اور اس طرح سے یہاں " صبر " اور " ہجران " کا مقام آپہنچتا ہے، کیونکہ حق کی طرف دعوت کی راہ میں، دشمنوں کی بدگوئی اور ان کا اذیت و آزار پہنچانا بہت زیادہ، اور اگر باغبان کوئی پھول توڑنا چاہتا ہے تو اسے کانٹے کی زبان کے مقابلہ میں صبر کرنا پڑے گا۔

اس کے علاوہ بعض اوقات یہاں بے اعتنائی اور دوری ضروری ہو جاتی ہے، تاکہ ایک تو ان کے شر سے محفوظ رہے، اور دوسرے اس طرح سے انھیں ایک سبق بھی دے، لیکن یہ ہجران و دوری، تربیتی پروگراموں اور خدا کی طرف تبلیغ و دعوت کے قطع کرنے کے معنی میں نہیں ہونی چاہیے۔

اس طرح سے اوپر والی آیات، پیغمبر اسلام اور ان تمام لوگوں کے لیے جو آپ کی پیروی کرتے ہیں ایک جامع اور کامل نسخہ دیتی ہیں کہ وہ رات کی عبادات اور بوقت سحر پروردگار سے دعا و مناجات سے مدد حاصل کریں اور پھر اس پودے کی یاد خدا، اخلاص، توکل، صبر اور ہجران جمیل کے پانی سے آبیاری کریں۔ کیسا جامع اور عمدہ نسخہ ہے؟

" رب المشرق والمغرب " (مشرق و مغرب کے پروردگار) کی تعبیر تمام عالم ہستی پر اس کی حاکمیت و ربوبیت کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ ہم روزمرہ کی تعبیروں میں کہتے ہیں: فلاں شخص نے زمین کے مشرق و مغرب پر اپنا تسلط جما لیا ہے، یعنی تمام روئے زمین کو، نہ کہ صرف مشرق و مغرب کے نقطہ کو۔

" ھجر جمیل " (شائستہ دوری و جدائی)، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ دلسوزی اور حق کی طرف دعوت و تبلیغ سے توام ہجران و دوری کے معنی میں ہے، جو خاص خاص حالتوں میں ایک تربیتی روش شمار ہوتی ہے اور دوسرے حالتوں میں " جہاد " کے مسئلہ کے

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۲۰ حدیث ۲۴

ساتھ بالکل منافات نہیں رکھتی، کیونکہ ہر ایک کی ایک جگہ ہے اور ہر نقطہ کا ایک مقام ہے، دوسرے لفظوں میں یہ دوری بے اعتنائی نہیں ہے، بلکہ خود ایک قسم کی اعتناء اور پرواہ کرتا ہے، بہرحال یہ جو بعض نے اوپر والی آیت کو آیات جہاد سے منسوخ سمجھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔

مرحوم "طبرسی" "مجمع البیان" میں اس آیہ کے ذیل میں کہتے ہیں:

وفی هٰذا دلالة علی وجوب الصبر علی الاذی لمن یدعو الی الدین و المعاشرة باحسن الاخلاق واستعمال الرفق لیکونوا اقرب الی الاجابة

"یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مبلغین اور قرآن کی طرف دعوت دینے والے تکالیف اور اذیتوں میں صبر اختیار کریں، اور حسن خلق و مدارات کے ساتھ لوگوں میں معاشرت کریں۔ تاکہ ان کی باتیں جلدی قبول ہوں"[1]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۷۹

۱۱۔ وَذَرْنِي وَالْمُكَذِّبِينَ أُولِي النَّعْمَةِ وَمَهِّلْهُمْ قَلِيلًا ۝

۱۲۔ إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا ۝

۱۳۔ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا ۝

۱۴۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۝

۱۵۔ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝

۱۶۔ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۝

۱۷۔ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝

۱۸۔ السَّمَاءُ مُنفَطِرٌ بِهِ ۚ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۝

۱۹۔ إِنَّ هَٰذِهِ تَذْكِرَةٌ ۖ فَمَن شَاءَ اتَّخَذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝

ترجمہ

۱۱۔ مجھے ان جھٹلانے والے صاحبانِ نعمت (سے بدلہ لینے کے لیے) چھوڑ دو اور انھیں تھوڑی سی مہلت دے دو۔

۱۲۔ کیونکہ ہمارے پاس غل وزنجیر اور (جہنم کی آگ) ہے۔

۱۳۔ اور گلوگیر غذا اور دردناک عذاب ہے۔

۱۴۔ اس دن زمین اور پہاڑ شدت سے لرزرہے ہوں گے اور پہاڑ (اس طرح ریزہ ریزہ ہوں گے کہ) ریت کے تودوں کی شکل میں نرم ہو جائیں گے

۱۵۔ ہم نے تمھاری طرف ایسا ہی ایک پیغمبر گواہ بنا کر بھیجا ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا۔

۱۶۔ فرعون اس رسول کی مخالفت اور نافرمانی کے لیے کھڑا ہو گیا تو ہم نے اسے سخت سزا دی۔

۱۷۔ تو اگر تم بھی کافر ہو گئے، تو تم (خدا کے شدید عذاب سے) اس دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، کس طرح خود کو بچاؤ گے۔

۱۸۔ اس دن آسمان پھٹ پڑے گا اور اس کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا

۱۹۔ یہ تو ایک تنبیہ اور نصیحت ہے پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرلے۔

تفسیر

ان مستکبرین کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے

گزشتہ آیات میں سے آخری آیت میں دشمنانِ اسلام کی کارشکنیوں، نامرادیوں اور اذیت و آزار کی طرف اشارہ تھا۔ زیر بحث آیات میں انھیں خدا کی طرف سے، دنیا و آخرت کے عذابوں کی شدید تہدیدیں اور دھمکیاں دی گئی ہیں اور انھیں اپنے شوم و منحوس پروگراموں پر تجدید نظر کی دعوت دی ہے اور صدر اول کے مسلمانوں کی ان دشمنوں کے سخت ہجوم کے مقابلہ میں دلداری کر کے انھیں پامردی بخشی ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "مجھے ان تکذیب کرنے والے، ثروت مند اور صاحبانِ نعمت افراد کے ساتھ (بدلہ لینے کے لیے) چھوڑ دے اور انھیں تھوڑی سی مہلت دے دے"۔ (وذرنی والمکذبین اولی النعمة ومهلهم قلیلاً)۔

یعنی ان کا تمہارے مقابل تو نہیں ہے، میں ہوں! ان کی سزا و عذاب کا معاملہ خود مجھ پر چھوڑ دے، اور تھوڑی سی انھیں مہلت دے دے، تاکہ اتمامِ حجت بھی ہو جائے اور وہ اپنی ماہیت کو ظاہر و آشکار بھی کر دیں، اور اپنی پشت کو بارِ گناہ سے سنگین اور بوجھل کرلیں، تو اس وقت میرا عذاب ان کا گلا دبائے گا۔

اور ہم جانتے ہیں کہ تھوڑی مدت ہی گزری تھی کہ مسلمان طاقت ور ہو گئے اور انھوں نے جنگ "بدر" و "حنین" و "احزاب" وغیرہ میں اپنی سخت اور توڑنے والی ضربیں دشمن کے پیکر پر لگائیں، نیز زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ یہ سرکشی کرنے والے دنیا سے چلتے بنے اور برزخ میں عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئے اور قیامت کا عذاب بھی ان سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

ضمنی طور پر "اولی النعمة" (صاحبانِ نعمت) کی تعبیر مال و دولت اور مادی امکانات و وسائل کی زیادتی سے پیدا ہونے والے غرور و غفلت کی طرف اشارہ ہے، جو ایسے لوگوں کو اکثر دامن گیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی طول تاریخ میں —— جیسا کہ قرآن شاہد ہے

ہے ـــــــ یہ گروہ ہمیشہ مخالفین کی صفِ اول میں رہا ہے ۔

حقیقت میں یہ آیت سورۂ سبا کی آیت ۳۴ کے مشابہ ہے، جو کہتی ہے: وما ارسلنا فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا انا بما ارسلتم بہ کافرون ، "ہم نے کسی شہر و دیار میں کوئی انذار کرنے والا نہیں بھیجا، مگر یہ کہ ان کے سرکشین (جو ناز و نعمت میں مست تھے) نے کہا: تم جس چیز کے ساتھ بھیجے گئے ہو ہم اس کے کافر ہیں ۔ اشارہ کرتے ہیں:۔

حالانکہ اس قسم کے افراد کو دوسروں سے پہلے منادیان حق کی دعوت پر لبیک کہنا چاہیے، تاکہ اس طریقہ سے ان سب خدائی نعمتوں کا شکر بجا لائیں ۔

اس کے بعد اسی تہدید کو جاری رکھتے ہوئے اور زیادہ صریح صورت میں کہتا ہے: "ہمارے پاس غل و زنجیر اور جہنم کی آگ ہے" (ان لدینا انکالا و جحیما)۔

"انکال" "نکل" (بروزنِ فکر) کی جمع ہے اور بوجھل زنجیروں کے معنی میں ہے اور اصل میں "نکول" کے مادہ سے، ضعف و ناتوانی کے معنی میں لیا گیا ہے اور چونکہ وہ زنجیر جو ہاتھ پاؤں اور گردن میں ڈالتے ہیں، انسان کو حرکت کرنے سے روک دیتی ہے، اور ناتواں بنا دیتی ہے، اسی لیے یہ لفظ "زنجیر" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ہاں! بے قید و شرط آزادی اور اس ناز و نعمت کے مقابلہ میں جو وہ اس دنیا میں رکھتے تھے، وہاں ان کا حصہ قید اور آگ ہی ہوگی ۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: " اور گلوگیر ہونے والی غذا اور دردناک عذاب": (وطعاما ذا غصۃ وعذابا الیما)۔

وہ غذا، ان کی دنیا کی چرب و شیریں غذاؤں سے ـــــــ جو آسانی کے ساتھ گلے سے نیچے اتر جاتی تھیں اور مزے دار ہوتی تھیں ـــــــ برعکس ہوگی اور اس جہان کے خود غرض، مغروروں اور ستمگروں کی بے حساب آسائش کے مقابلہ میں دردناک زندگی ہوگی ۔

اگرچہ سخت اور گلوگیر غذا خود ایک دردناک عذاب ہے لیکن اس کے بعد عذابِ الیم کو الگ ذکر کرتا ہے اور یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ آخرت کے عذاب الیم کے ابعاد و جہات اور مختلف پہلو، شدت و عظمت کے لحاظ سے خدا کے علاوہ کسی اور شخص کو معلوم نہیں ہیں اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک دن ایک مسلمان اس آیت کی تلاوت کر رہا تھا، اور پیغمبر کان دھر کر سن رہے تھے کہ اچانک اس شخص نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا [1]

ایک اور حدیث میں یہ آیا ہے کہ خود پیغمبر اس آیت کی تلاوت کر رہے تھے اور آپ کی ایسی حالت ہوئی [2]

یہ غذا گلوگیر کیوں نہ ہوگی؟ جبکہ سورۂ غاشیہ کی آیہ ۶ میں یہ آیا ہے: لیس لھم طعام الا من ضریع ،

---

[1] "مجمع البیان"، جلد ۱۰ ص ۳۸۰

[2] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۰۷

" ان کی غذا جانکاہ از کانٹوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوگی "

اور سورۂ دخان کی آیہ ۴۳، ۴۴ میں یہ آیا ہے: ان شجرت الزقوم طعام الاثیم، " زقوم کا درخت (وہی تلخ، بدبودار بدذائقہ، کڑوا اور مار ڈالنے والا پودا) گنہگاروں کی غذا ہے۔

اس کے بعد اس دن کی تشریح کرتے ہوئے جس میں یہ عذاب ظاہر ہوں گے، فرماتا ہے: " یہ اس دن ہوگا جس دن زمین اور سب پہاڑ شدت کے ساتھ لرزنے لگیں گے اور پہاڑ اس طرح سے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے ریت کے تودوں کی طرح نرم ہو جائیں گے " (یوم ترجف الارض والجبال وکانت الجبال کثیبا مهیلا)۔

" کثیب " تہ بہ تہ پڑی ہوئی ریت (ٹیلہ) کے معنی میں ہے اور " مهیل " هیل (بروزن کیل) کے مادہ سے، ریت اور آٹے جیسی کسی نرم چیز کو دوسری چیز پر ڈالنا، یہاں وہ نرم ریت مراد ہے جسے کبھی قرار نہیں ہوتا۔

اس معنی کی بناء پر قیامت میں اس طرح سے بکھر جائیں گے کہ ایسی نرم ریت کی صورت اختیار کرلیں گے کہ اگر اس پر پاؤں رکھیں گے تو وہ اس میں دھنس جائیں گے۔

قیامت کے دن کے لیے قرآن نے پہاڑوں کی قسمت کے بارے میں مختلف تعبیریں بیان کی ہیں جو سب کی سب ان کی نابودی اور ان کے نرم خاک میں تبدیل ہو جانے کی حکایت کرتی ہیں (پہاڑوں کی نابودی کے مختلف مراحل کی مزید تشریح اور اس سلسلے میں قرآن کی مختلف تعبیریں سورہ طٰہٰ کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں آئی ہیں)۔

اس کے بعد پیغمبرؐ کی بعثت اور منہ زور عربوں کی مخالفت کا موسیٰ بن عمران کے فرعون کے مقابلہ میں قیام سے موازنہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " ہم نے تمہاری طرف ایسا ہی پیغمبر بھیجا ہے، جو تم پر گواہ ہے، جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا تھا " (انا ارسلنا الیکم رسولا شاهدا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا)۔

اس کا ہدف و مقصد تمہاری ہدایت اور تمہارے اعمال پر نظر رکھنا ہے، جیسا کہ موسیٰ بن عمران کا ہدف فرعون اور فرعونیوں کی ہدایت اور ان کے اعمال پر نظر رکھنا تھا۔

" لیکن فرعون اس رسول کی مخالفت کے لیے کھڑا ہو گیا تو ہم نے بھی اسے شدید عذاب اور سزا میں گرفتار کر دیا " (فعصی فرعون الرسول فاخذناه اخذا وبیلا)۔

نہ تو اس کا عظیم لشکر ہی اسے خدا کے عذاب سے بچا سکا اور نہ ہی مملکت کی وسعت اور حکومت کی قدرت اور ان کے دولت مند اس کام کو روک سکے، اور آخر کار وہ سب کے سب نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں میں ——— جن پر وہ فخر کیا کرتے تھے ——— غرق ہو گئے، تو تم جو ان سے بہت ہی پست سطح پر ہو اور تعداد اور تیاری کے لحاظ سے فرعون اور فرعونیوں سے کئی درجے زیادہ ضعیف ہو اپنے بارے میں

شیطا سوچتے ہو؟ اور اس مختصر سے مال اور افراد پر کس طرح سے مغرور ہوتے ہو؟

"و بیبل" "وبل" کے مادہ سے اصل میں شدید اور سنگین بارش کے معنی میں ہے اور اس کے بعد ہر شدید سنگین چیز پر اس کا اطلاق ہوا ہے، خصوصاً عذاب کے بارے میں اور زیر بحث آیت میں بھی شدت عذاب کی طرف ہی اشارہ ہے، گویا لوگوں کو شدید بارش کی طرح اپنے طوفان اور بارش میں قرار دیتا ہے۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام کے زمانے کے کفار کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے، انہیں اس طرح خبردار کرتا ہے: "اگر تم کافر ہو گئے تو اپنے آپ کو خدا کے شدید عذاب سے کس طرح بچا سکو گے، وہ دن تو ایسا ہوگا جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا" (فكيف تتقون ان كفرتم يوماً يجعل الولدان شيبا)۔[1][2]

ہاں! اس دن کا عذاب اتنا زیادہ سنگین، شدید، ہولناک اور کمر شکن ہے، جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا، اور یہ اس کی شدت سے کنایہ ہے۔

آخرت کا عذاب تو آسان ہے، بعض نقل کرتے ہیں کہ اسی دنیا میں بعض اوقات جب انسان حد سے زیادہ شدید سختی اور تنگی سے گزرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ بہت جلدی اس کے بال سفید ہو گئے ہیں۔

بہر حال اوپر والی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بالفرض اگر تم اس جہان میں فرعونیوں کی طرح نابود کرنے والے عذاب میں گرفتار نہ بھی ہوئے، تب بھی قیامت اور قیامت کے عذاب کا ذکر کیا کرو گے۔

بعد والی آیت میں اس وحشت ناک دن کے بارے میں مزید حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "اس دن آسمانی کُرّے پھٹ جائیں گے اور خدا کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا" (السماء منفطر به كان وعده مفعولا)۔[3]

قیامت اور "اشراط الساعة" کی بہت سی آیات (وہ واقعات جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز میں صورت پذیر ہوں گے) عظیم انفجارات، شدید زلزلوں اور سریع تبدیلیوں کا حال بیان کرتی ہیں جبکہ زیر بحث آیت ایک طرف ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جب آسمان اور آسمانی کُرّے، اس عظمت کے باوجود اس دن کے عظیم حوادث کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتے تو اس ضعیف و ناتواں انسان سے کیا ہو سکتا ہے؟

---

[1] "یوماً" "تتقون" کا مفعول ہے، اور اس دن سے بچنے کا معنی، اس دن کے عذاب سے بچنا ہے۔ بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ یہ "تتقون" کا ظرف یا "كفرتم" کا مفعول ہے، لیکن یہ دونوں بعید نظر آتے ہیں۔

[2] "شیب" (بروزن عیب) "اشیب" کی جمع ہے جو بوڑھے کے معنی میں ہے اور اصل میں "شیب" (بروزن عیب) کے مادہ سے لیا گیا ہے اور شیب بالوں کے سفید ہونے کے معنی میں ہے۔

[3] "منفطر" "انفطار" کے مادہ سے اشتقاق اور پھٹ جانے کے معنی میں ہے اور "به" کی ضمیر یوم کی طرف لوٹتی ہے، یعنی آسمان اس دن کی وجہ سے پھٹ جائے گا۔ (توجہ رہے کہ سماء مذکر کی صورت میں بھی اور مؤنث ہونے کی صورت میں بھی استعمال ہوتا ہے)۔

اس بحث کے آخر میں تمام گزشتہ تنبیہوں اور انذاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ نصیحت اور یاد دلانے کے لیے ہے" (انّ ھٰذہ تذکرۃ)۔

تم راستہ کا انتخاب کرنے میں آزاد ہو: "اور جو شخص چاہے کہ اس کی ہدایت ہو اور وہ سعادتِ ابدی کا طالب ہو تو وہ اپنے پروردگار کی طرف راستہ انتخاب کر لیتا ہے" (فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلاً)۔

اگر اس راستہ کو طے کرنا جبر واکراہ کے ذریعہ ہو تو وہ نہ کوئی افتخار کی بات ہے اور نہ ہی فضیلت کی، فضیلت کی بات تو یہ ہے کہ انسان اپنے ارادہ واختیار سے اس راستہ کا انتخاب کرے اور پھر اسے طے کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا نے راہ اور چاہ کی نشاندہی کر دی ہے اور دیکھنے والی آنکھ اور روشنی بخشنے والا سورج اختیار میں دے دیا ہے، اور لوگوں کو یہ صلاحیت بخش دی ہے کہ وہ اس کے فرمان کی اطاعت میں ارادہ واختیار کے ساتھ عمل کریں۔

اس بارے میں کہ "انّ ھٰذہ تذکرۃ" (یہ نصیحت اور یاد آوری ہے) کا جملہ کس چیز کی طرف اشارہ ہے، مفسرین نے کئی احتمال دیئے ہیں: کبھی تو انھوں نے یہ کہا ہے کہ یہ ان مواعظ کی طرف اشارہ ہے جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں اور کبھی یہ کہا گیا کہ یہ پوری سورت کی طرف اشارہ ہے یا تمام قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ممکن ہے یہ حکم نماز اور رات کی عبادت کی طرف اشارہ ہو جو اس سورہ کی ابتدائی آیات میں آئے ہیں، اور اس میں مخاطب پیغمبر تھے، یہ جملہ چاہتا ہے کہ اسے باقی مسلمانوں کے لیے وسعت دے کر عام کر دے، اس بنا پر بعد والے جملے میں بھی "سبیل" (راستہ) سے مراد نماز تہجد ہی ہے، جو پروردگار کی طرف اہم راستوں میں سے ہے، جیسا کہ سورۂ دہر کی آیہ ۲۶ میں رات کی عبادت کا حکم دینے کے بعد (ومن اللیل فاسجد لہ وسبحہ لیلاً طویلاً) مختصر سے فاصلہ کے بعد فرماتا ہے (انّ ھٰذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلاً) جو بالکل وہی زیرِ بحث آیت ہے۔[1]

یقیناً یہ ایک مناسب تفسیر ہے لیکن زیادہ مناسب یہ ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہو اور اس سورہ میں جتنے انسان ساز پروگرام ہیں تمام کو احاطہ کیے ہوئے ہو، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

ایک نکتہ

عذابِ الٰہی کے چار مرحلے

اوپر والی آیات میں مغرور اور نعمت میں مست تکذیب کرنے والوں کو چار دردناک عذابوں کی تہدید کرتا ہے:

طوق اور زنجیریں: (انکال)

جہنم کی جلانے والی آگ (جحیم)

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۱۴۷

گلوگیر ہونے والی مرگبار غذائیں: (وطعامًا ذا غصة)

اور دوسرے انواع و اقسام کے دردناک عذاب جو انسانی فکر میں بھی نہیں آ سکتے: (وعذابًا الیمًا)

یہ سزائیں حقیقت میں ان کی اس دنیاوی زندگی میں ان کی وضع و کیفیت کا نقطہ مقابل ہیں۔

ایک طرف ایسی آزادی کا ملنا جس کی کوئی حد اور سرحد نہ ہو

دوسری طرف سے مرفہ اور خوشحال زندگی

تیسری طرف خوشگوار غذائیں اور کھانے

چوتھی طرف سے انواع و اقسام کے آرام اور آسائشیں

اور چونکہ ان تمام چیزوں کو دوسروں کے حقوق پر ظلم و تجاوز اور کبر و غرور اور خدا سے غفلت کی قیمت پر حاصل کیا ہے، لہٰذا وہ قیامت میں اس قسم کی سرزنشت میں گرفتار ہوں گے۔

۲۰۔ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ؕ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع

ترجمہ

۲۰۔ تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو اور ان لوگوں میں سے ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہے، رات کی دو تہائی کے قریب یا آدھی رات یا اس کی ایک تہائی قیام کرتے ہیں اور خدا رات اور دن کا اندازہ رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ تم اس کی مقدار کا (وقت کے ساتھ) اندازہ نہیں کر سکتے، اس لیے اس نے تمھیں بخش دیا، اب تم قرآن کی صرف اتنی ہی مقدار جو تمھارے لیے میسر ہو، تلاوت کرو، وہ جانتا ہے کہ عنقریب تم میں سے ایک گروہ بیمار بھی ہو جائے گا اور ایک گروہ فضل خدا حاصل کرنے (اور روزی کمانے کے لیے) سفر پر جائے گا اور ایک گروہ راہِ خدا میں جہاد کرے گا۔ پس جتنی مقدار تمھارے لیے ممکن ہو، اس کی تلاوت کرو اور نماز قائم کرو اور زکات ادا کرو اور خدا کو قرضِ حسنہ دو (اس کی راہ میں خرچ کرو) اور (یہ جان لو) کہ جو کارِ خیر تم اپنے لیے آگے بھیجتے ہو، تم اس کا خدا کے ہاں بہترین صورت میں عظیم ترین اجر پاؤ گے اور خدا سے طلب مغفرت کرو کہ خدا غفور و رحیم ہے۔

تفسیر

جتنا تمھارے لیے ممکن ہے اتنا قرآن پڑھو

یہ آیت جو اس سورہ کی طویل ترین آیت ہے بہت سے ایسے مسائل پر مشتمل ہے جو گزشتہ آیات کے مضامین کی تکمیل کرتے ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ آیت اس سورہ کی ابتدائی آیات کے احکام کی ناسخ ہے، یا یہ ان کی توضیح و تفسیر ہے، اور اسی طرح یہ کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی ہے یا مدینہ میں مفسرین کے درمیان شدید اختلاف ہے۔

ان سوالات کا جواب آیت کی تفسیر کے بعد واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "تیرا پروردگار جانتا ہے کہ تو اور ان لوگوں میں سے ایک گروہ جو تیرے ساتھ ہیں، تقریباً رات کی دو تہائی یا آدھی رات یا اس کی ایک تہائی قیام کرتا ہے۔ خدا اس سے آگاہ کیوں نہ ہوگا، جبکہ رات اور دن کا اندازہ وہی کرتا ہے۔ (ان ربك يعلم انك تقوم ادنی من ثلثی اللیل ونصفه وثلثه وطائفة من الذين معك والله يقدر اللیل والنهار)[1]

یہ اسی حکم کی طرف اشارہ ہے، جو سورہ کے آغاز میں پیغمبر کو دیا گیا ہے صرف ایک چیز جس کا یہاں اضافہ کیا گیا ہے یہ ہے کہ اس عبادت شبانہ میں مومنین کا ایک گروہ بھی پیغمبر کے ہمراہ ہوتا تھا (ایک استحبابی حکم کے عنوان سے یا احتمالاً ایک وجوبی حکم کی بناء پر، کیونکہ آغاز اسلام کے حالات کا تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ تلاوت قرآن کے ذریعہ، جو انواع واقسام کے اعتقادی، عملی اور اخلاقی درسوں پر مشتمل ہے، اور اسی طرح عبادات شبانہ کے ذریعہ اپنی تربیت اور اصلاح کریں، اور اسلام کی تبلیغ اور اس کے دفاع کے لیے خود کو آمادہ اور تیار کریں)

لیکن جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، بہت سے مسلمان ایک تہائی، آدھی رات اور دو تہائی رات کا حساب رکھنے میں مشکل اور دو دسری میں گرفتار ہو جاتے ہیں (کیونکہ اس زمانے میں وقت کی مقدار اور اندازہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا) اور اسی بناء پر وہ مجبوراً احتیاط سے کام لیتے تھے اور اس وجہ سے کبھی تو وہ ساری رات بیدار رہتے تھے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ ان کے پاؤں عبادت شبانہ کے قیام میں ورم کر جاتے ہیں۔

لہٰذا خدا نے ان پر اس حکم میں تخفیف کر دی اور فرمایا: وہ جانتا ہے کہ تم مذکورہ مقدار کا پورے طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے، اس بناء پر اس نے تمھیں بخش دیا ہے۔ لہٰذا اب قرآن میں سے جتنی مقدار تمھارے لیے میسر اور آسان ہو اتنی تلاوت کرو" (علم ان لن تحصوه فتاب علیکم فاقرءوا ما تیسر من القرآن)۔

---

[1] اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ "نصفه" اور "ثلثه" "کا عطف" ادنیٰ "پر ہے نہ کہ" ثلثی اللیل" پر اس بناء پر اس جملے کا مفہوم یہ ہے تقریباً رات کی دو تہائی یا ٹھیک آدھی رات کی مقدار یا ایک تہائی رات۔ ضمنی طور پر توجہ کرنی چاہیے کہ لفظ "ادنیٰ" عام طور پر نزدیک مکان کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن یہاں قریبی زمانہ کی طرف اشارہ ہے۔

"لن تحصوه" "احصاء" کے مادہ سے شمار کرنے کے معنی میں ہے، یعنی تم پورے طور پر دقت کے ساتھ رات کا وقت دو تہائی، آدھی رات اور ایک تہائی کی مقدار کے لحاظ سے تعیین نہیں کر سکتے اور زحمت میں پڑ جاتے ہو۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم اس کام پر سال کے سارے دنوں میں مداومت نہیں کر سکتے۔

یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں بھی جب کہ کئی وسائل کے ذریعہ موقع پر نیند سے بیدار ہو سکتے ہیں۔ سارے سال میں ان مقداروں کی دقت کے ساتھ تعیین ——— خصوصاً رات اور دن میں مسلسل فرق پڑتے رہنے کے ساتھ ——— کوئی آسان کام نہیں ہے

"تاب علیکم" کے جملہ کو اکثر مفسرین نے "اس تکلیف اور ذمہ داری کی تخفیف" کے معنی میں بیان کیا ہے، نہ کہ "گناہ سے توبہ" کے معنی میں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جب وجوب کا حکم اٹھ جائے تو پھر کوئی گناہ نہیں ہوتا اور نتیجہ میں خدا کی بخشش کے مانند ہوگا۔

اس بارے میں کہ "فاقرءوا ما تیسر من القرآن" "جو کچھ قرآن میں سے تمہارے لیے میسر ہو پڑھو" کے جملہ سے کیا مراد ہے؟ بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ایک جماعت نے اس کی نماز تہجد سے تفسیر کی ہے، کیونکہ اس میں حتمی طور پر قرآنی آیات پڑھی جاتی ہیں اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہی تلاوت قرآن ہے، چاہے وہ نماز کے اندر نہ ہو، اس کے بعد بعض نے اس کی مقدار پچاس آیات، بعض نے سو آیات اور بعض نے دو سو آیات کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی بھی تعداد کے لیے کوئی خاص دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جتنی مقدار سے انسان زحمت و تکلیف میں نہ پڑے اتنا قرآن پڑھے۔

یہ بات واضح ہے کہ "تلاوت قرآن" سے مراد یہاں وہ تلاوت ہے، جو درس و خودسازی اور ایمان و تقویٰ کی پرورش میں تعلیم کے عنوان سے ہو۔

اس کے بعد اس تخفیف کے لیے ایک اور دلیل کے بیان کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "خدا جانتا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ بیمار بھی ہوں گے اور دوسرا گروہ تحصیل معاش اور خدا کے فضل کی تلاش میں سفر کی راہ اختیار کرے گا اور تیسرا گروہ راہ خدا میں جہاد کرے گا۔ یہ امور اس چیز سے مانع ہوں گے کہ رات کی عبادت کو اس حساب اور نصاب سے جو پہلے معین ہوا ہے، ہمیشہ کے لیے انجام دیتے رہیں" (علم ان سیکون منکم مرضٰی واٰخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ واٰخرون یقاتلون فی سبیل اللہ)۔

اور یہی چیز اس پروگرام میں تخفیف کا ایک سبب ہے لہٰذا دوبارہ تکرار کرتا ہے: "اب جبکہ ایسا ہے تو جس قدر تمہارے لیے ممکن ہے اور جتنی تم میں طاقت ہے بس اتنا رات کو قرآن کی تلاوت کرو" (فاقرءوا ما تیسر منہ)۔

یہ بات واضح ہے کہ بیماری اور ضروری سفروں اور اللہ کی راہ میں جہاد کا ذکر، نمایاں عذروں کی تین مثالوں میں سے ہے۔ لیکن انہیں تک منحصر نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ چونکہ خدا جانتا ہے کہ تم دنیا میں زندگی کے مختلف مشکلات میں گرفتار ہوگے اور یہ چیز اس سنگین پروگرام کو دائمی رکھنے میں مانع ہے۔ لہٰذا اس نے تمہارے لیے اس میں تخفیف کر دی ہے۔

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا یہ حکم، اس چیز کو، جو سورہ کے آغاز میں آئی ہے، منسوخ کرتا ہے؟ یا اس کے لیے استثنائی صورت میں ہے؟ آیات کا ظاہر حکم سابق کے نسخ کو بتاتا ہے۔ حقیقت میں یہ بات ضروری تھی کہ یہ پروگرام ایک مدت تک جاری رہے، اور وہ

جاری رہا، اور اس حکم کا مقصد، جو ایک موقت اور فوق العادۃ پہلو رکھتا تھا وہ حاصل ہو گیا اور اس مدت کے ختم ہونے کے بعد تخفیف کی صورت میں باقی رہ گیا، کیونکہ آیت کا ظاہر یہ ہے کہ معذور افراد کے موجود ہونے کی وجہ سے، اس حکم کی سب کے لیے تخفیف ہو گئی، نہ کہ صرف معذور لوگوں کے لیے، اس طرح سے یہ استثناء نہیں ہو سکتی، بلکہ اسے نسخ ہونا چاہیے (غور کیجیے)

یہاں ایک اور سوال سامنے آتا ہے کہ، کیا قرآن میں سے ممکن مقدار کی تلاوت، جس کا اس آیت میں دو مرتبہ امر ہوا ہے، واجب ہے، یا مستحب ہے؟

بعض نے تو یہ کہا ہے کہ یہ یقینی طور پر مستحب ہے اور بعض نے وجوب کا احتمال دیا ہے، کیونکہ قرآن کی تلاوت، توحید کے دلائل، ارسال رسل اور اس آسمانی کتاب کے اعجاز سے آگاہی اور باقی واجبات دین کی تعلیم حاصل کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ اس بناء پر تلاوت قرآن مقدمہ واجب ہے لہٰذا یہ واجب ہو گیا۔

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ اس صورت میں ضروری نہیں ہے کہ قرآن کو رات کو ہی پڑھے، یا نماز تہجد کے درمیان پڑھے۔ بلکہ ہر مکلف (بالغ و عاقل) پر واجب ہے کہ بقدر لازم، تعلیم و تربیت اور اصول و فروع اسلام سے آگاہی کے لیے، اور اسی طرح قرآن کو محفوظ رکھنے اور اسے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کے لیے، تلاوت کرے، بغیر اس کے کہ کوئی خاص وقت اور زمانہ اس میں پیش نظر ہو۔

لیکن حق بات یہ ہے کہ "فاقرءوا ....." کے جملہ میں ظاہر امر وجوب ہے (جیسا کہ اصول فقہ میں بیان ہوا ہے)، مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ یہ "امر" عدم وجوب پر فقہاء کے اجماع کی بناء پر ایک امر استحبابی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آغاز اسلام میں تو حالات و شرائط کی بناء پر یہ تلاوت اور شبانہ عبادت واجب تھی اور بعد میں مقدار کے لحاظ سے بھی اور حکم کے لحاظ سے بھی اس میں تخفیف کر دی گئی ہے اور اس نے ایک استحبابی حکم کی صورت اختیار کر لی ہے اور وہ بھی اتنا جتنا کہ آسانی سے ہو سکے، لیکن بہرحال پیغمبر اسلام پر نماز تہجد کا وجوب آخر عمر تک ثابت رہا۔ (تمام آیات قرآن اور روایات کے قرینے سے)۔

ایک روایت میں امام باقر سے آیا ہے:

"دو تہائی رات یا آدھی رات یا ایک تہائی رات سے مربوط حکم منسوخ ہو گیا ہے، اور اس کی جگہ "فاقرءوا ما تیسر من القراٰن" قرار پایا ہے"[1]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں تین قسم کے عذر بیان کیے گئے ہیں۔ جن میں سے ایک تو جسمانی پہلو رکھتا ہے (بیماری) اور دوسرا مالی پہلو رکھتا ہے (معاش کے لیے مسافرت) اور تیسرا دینی جنبہ رکھتا ہے (راہِ خدا میں جہاد) لہٰذا بعض نے یہ کہا ہے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاش کی تلاش اور اس کے لیے کوشش کرنا، جہاد فی سبیل اللہ کے ہم ردیف ہے۔

اور اس جملہ کو اس بات کی بھی ایک دلیل سمجھا ہے کہ خاص یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ مکہ میں جہاد کا وجوب نہیں تھا، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وہ فرماتا ہے: سیکون: (عنقریب ہو گا)، ممکن ہے یہ جملہ آئندہ زمانہ میں تشریع جہاد کی خبر ہو یعنی چونکہ کچھ مدت تو تم زمانۂ حال میں رکھتے ہو اور کچھ اور عذر آئندہ تمہارے لیے پیدا ہوں گے۔ اس لیے یہ حکم دائمی صورت میں نہیں آیا اور اس صورت میں

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۵۱

آیت کے مکی ہونے کے ساتھ تضاد نہیں رکھتا۔

اس کے بعد اسی آیت کے آخر میں چار اور احکام کی طرف اشارہ کیا ہے اور خود سازی کا جو پروگرام پیش کیا گیا تھا، اس کی اس چیز کے ذریعہ تکمیل کرتا ہے فرماتا ہے: "نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اور مستحب انفاق کرنے سے خدا کو قرض حسنہ دو، اور یہ جان لو کہ جو کار ہائے خیر تم اپنے لیے آگے بھیجتے ہو، تم اس کا خدا کے ہاں بہترین صورت میں عظیم ترین اجر پاؤ گے":

(واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللّٰہ قرضاً حسناً وما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللّٰہ ھو خیراً واعظم اجراً)۔

"اور استغفار کرو اور خدا سے بخشش طلب کرو کہ خدا غفور و رحیم ہے":

(واستغفروا اللّٰہ ان اللّٰہ غفور رحیم)۔

یہ چار عملی حکم (نماز، زکوٰۃ، مستحب انفاق اور استغفار) تلاوت کے حکم اور قرآن میں تدبر کے ضمیمہ کے ساتھ ـــــــ جو ماقبل کے جملوں میں بیان ہوا تھا ـــــــ مجموعی طور پر خود سازی کا ایک مکمل پروگرام پیش کرتے ہیں، جو ہر عصر اور زمانہ میں خصوصاً آغاز اسلام میں ناقابل انکار تاثیر رکھتا تھا اور رکھتا ہے۔

یہاں "نماز" سے مراد پنجگانہ نمازیں ہیں اور "زکوٰۃ" سے مراد زکوٰۃ واجب ہے اور "قرض حسنہ" دینے سے مراد وہی مستحب انفاق اور خرچ ہیں، اور یہ انتہائی خوبصورت تعبیر ہے جس کا اس سلسلہ میں تصور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ تمام ملکیتوں کا مالک اس شخص سے قرض طلب کر رہا ہے جس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہے، تاکہ اس طریقہ سے انفاق دائمی اور اس عمل خیر کے ذریعہ کسب فضیلت کا شوق بڑھے اور اس طریقہ سے اس کی تربیت ہو اور وہ کمال و ارتقاء حاصل کرے۔

ان احکام کے آخر میں استغفار کا ذکر ممکن ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان اطاعتوں کی انجام دہی کی وجہ سے خود کو انسان کامل سمجھ بیٹھو، اور اصطلاح کے مطابق خود کو طلب گار تصور کرنے لگو، بلکہ تمہیں ہمیشہ اپنے آپ کو مقصر شمار کرنا چاہیے اور بارگاہ خدا میں عذر و معذرت کرتے رہنا چاہیے، ورنہ جو کچھ اس کی خداوندی کے لائق اور سزاوار ہے وہ کوئی شخص بھی بجا نہیں لا سکتا۔

بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ان احکام پر اس لیے تکیہ کیا گیا ہے تاکہ یہ تصور نہ کیا جائے کہ گزشتہ شبانہ قیام اور تلاوت قرآن میں تخفیف کر دی گئی ہے تو باقی پروگراموں اور دینی احکام میں بھی یہ اثر انداز ہوگی، بلکہ وہ اسی طرح اپنی حالت پر باقی ہیں۔[1]

ضمنی طور پر زکوٰۃ واجب کے ذکر کو یہاں اس آیت کے مدنی ہونے کی ایک اور دلیل قرار دیتے ہیں، کیونکہ زکوٰۃ کا حکم مدینہ میں نازل ہوا تھا نہ کہ مکہ میں۔ لیکن بعض نے لکھا ہے، اصل حکم زکوٰۃ مکہ میں ہی نازل ہوا تھا لیکن اس کا نصاب اور اس کی مقدار بیان نہیں ہوئے تھے، وہ چیز جو مدینہ میں تشریع ہوئی وہ زکوٰۃ کے نصاب اور مقدار کا مسئلہ تھا۔

---

[1] تفسیر المیزان، جلد ۲۰ ص ۱۵۶

چند نکات

۱۔ عقیدت کے ساتھ علمی آمادگی کی ضرورت

اہم اجتماعی کاموں کو انجام دینے کے لیے ——— خاص طور پر زندگی کے تمام حالات میں ایک وسیع و عریض انقلاب پیدا کرنے کے لیے ——— ہر چیز سے پہلے ایک انسانی پختہ اور مستحکم طاقت کی ضرورت ہے، جو اس کام کے لیے راسخ اعتقاد، مکمل آگاہی، ضروری علمی و فکری تعلیمات اور اخلاقی تربیت کے ساتھ بنی ہو۔

اور یہ ایسا دقیق کام تھا جسے پیغمبر اسلامؐ نے، مکہ میں بعثت کے ابتدائی سالوں میں، بڑا اچھی طرح کے سارے دور میں انجام دیا اور اسی بنا پر، اور اسی محکم بنیاد کی وجہ سے، اسلام کے پودے نے سرعت کے ساتھ نشو و نما پائی، کونپلیں پھوٹیں اور شاخ و برگ نکالے۔

جو کچھ اس سورہ میں آیا ہے، وہ اس جاذب، شاداب اور پختہ کے پروگرام کا ایک زندہ اور بہت ہی منہ بولتا نمونہ ہے۔ وہ تہائی رات یا کم از کم ایک تہائی رات کی محکم عبادت نے ——— جو تلاوت اور قرآن مجید کی آیات میں غور و خوض کے ساتھ توام تھی ——— مسلمانوں کی روح میں عجیب و غریب تاثیر پیدا کر دی اور انھیں "قول ثقیل" اور "سبح طویل" کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کر دیا۔ یہ رات کی حرکات اور "ناشئۃ اللیل" جو قرآنی تعبیر کے مطابق "اشد وطاً" اور "اقوم قیلاً" تھیں، آخرکار انھوں نے اپنا کام دکھایا اور محروم عوام اور مستضعف طبقات کو ایک چھوٹا سا گروہ اس طرح کا بن گیا کہ انھوں نے جہان کے ایک عظیم حصہ پر حکومت کرنے کی لیاقت پیدا کر لی۔

اور آج بھی اگر ہم مسلمان چاہیں کہ اپنی دیرینہ عظمت و شوکت کو دوبارہ حاصل کر لیں تو راستہ یہی راستہ ہے اور وہ پروگرام یہی پروگرام ہے ہمیں ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہم ایسے افراد کے ساتھ، جو فکر و نظر اور ایمان کے لحاظ سے ضعیف و ناتواں ہیں، ایسے افراد جنھوں نے ضروری علمی اور اخلاقی تربیت حاصل نہیں کی ہے، "یہودیوں" کے تسلط اور غلبہ کو اسلامی ممالک کے اندر سے باہر نکال پھینکیں گے اور جہانی جنایتکار سپر طاقتوں کے ہاتھ کو اسلامی ممالک تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے، لیکن آخرکار "کس بات کی حرف بس است"۔

۲۔ غور و فکر کے ساتھ تلاوت قرآن

روایات اسلامی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ تلاوت قرآن کی فضیلت زیادہ پڑھنے سے نہیں ہے بلکہ اچھی طرح سے پڑھنے اور اس میں سوچ بچار اور غور و فکر کرنے سے ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت کے ذیل میں جو یہ حکم دیتی ہے کہ قرآن میں سے جتنا تمھارے لیے میسر ہے، اتنا پڑھو "فاقرءوا ما تیسر منہ" ایک روایت امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے آئی ہے کہ آپ نے اپنے جد بزرگوارؐ سے اس طرح نقل فرمایا ہے:

ماتیسر منه لكم فيه خشوع القلب وصفاء السر

"بس اتنا پڑھو جس میں خشوع قلب، صفائے باطن اور روحانی و معنوی نشاط حاصل ہو"[1]

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ تلاوت کا ہدف اور مقصد اصلی تعلیم و تربیت ہے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۲

اور اس سلسلہ میں روایات بہت ہیں۔

۲۔ معاش کی تلاش جہاد کے ہمردیف

اوپر والی آیت میں ــــــ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے ــــــ زندگی بسر کرنے کے لیے تلاش معاش کو "جہاد فی سبیل اللہ" کے ساتھ قرار دیا ہے اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام اس موضوع کے لیے بہت زیادہ اہمیت کا قائل ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ حالانکہ ایک فقیر، بھوکی اور دوسروں کی محتاج قوم ہرگز استقلال، عظمت اور سربلندی حاصل نہیں کر پائے گی اور اصولی طور پر "جہاد اقتصادی" "دشمن کے ساتھ جہاد" کا ایک حصہ ہے۔

اس سلسلہ میں مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود کا ایک جملہ نقل ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ایما رجل جلب شیئًا الی مدینة من مدائن المسلمین، صابرًا محتسبا، فباعه بسعر یومه، کان عند اللہ بمنزلة الشهداء، ثم قرأ "وآخرون یضربون فی الارض"....

جو شخص کچھ مال مسلمانوں کے کسی شہر میں لے جائے اور اس راہ میں اپنی زحمتوں کو خدا کے لیے محسوب کرے اور پھر اس کو اس دن کی بازاری قیمت پر فروخت کر دے تو ایسا شخص خدا کی بارگاہ میں شہیدوں کی منزلت رکھتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے سورۂ مزمل کی آخری آیت کے اس جملہ کو شاہد کے عنوان سے تلاوت کیا "وآخرون یضربون فی الارض"[1]

خداوندا! ہمیں تمام ابعاد و جہات میں جہاد کرنے کی توفیق عطا فرما۔

بارالٰہا! ہم سب کو رات کے قیام، اور قرآن کریم کی تلاوت اور اس آسمانی کتاب کے نور کے سایہ میں اپنی اصلاح کی توفیق مرحمت فرما۔

پروردگارا! ہمارے اسلامی معاشرے کو اس عظیم سورہ سے پر سورہ سے ہدایت حاصل کرنے کے ساتھ شائستہ مقام اور دیرینہ عظمت تک پہنچا!

آمین یارب العالمین

اختتام سورۂ مزمل

اول ماہ صفر ۱۴۰۷، ۸۵/۷/۱۴

اختتام ترجمہ

بروز منگل بوقت تقریباً ساڑھے چار بجے سہ پہر ۵ صفر ۱۴۰۸ھ

مطابق ۲۹ ستمبر ۱۹۸۷ء - ۸۱ ۔ ای ماڈل ٹاؤن ۔ لاہور

---

[1] "مجمع البیان" "تفسیر ابوالفتوح رازی" "تفسیر قرطبی" زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ ضمنی طور پر ایک دوسری حدیث سے جو اس حدیث کے مشابہ ہے اور تفسیر قرطبی میں رسول اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے یہ بات اپنی طرف سے نہیں کہی تھی، بلکہ پیغمبرؐ سے لی تھی۔

سورۂ مُدّثر

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۵۶ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲، صفر ۱۴۰۷ ہجری

سورۂ مدثر کے مضامین

اس میں شک نہیں کہ یہ سورہ ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن اختلاف اس مسئلہ میں ہے کہ کیا یہ وہ پہلی سورت ہے جو پیغمبر پر نازل ہوئی ہے یا یہ سورۂ اقراء کے بعد نازل ہوئی ہے۔

لیکن سورہ "اقرأ" اور "سورۂ مدثر" کے مضامین میں غور و خوض کرنے سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ "اقراء" آغاز دعوت میں نازل ہوئی تھی ملاوہ سورۂ مدثر اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جب پیغمبر آشکار دعوت پر مامور ہوئے، اور پوشیدہ اور پنہاں دعوت کا دور ختم ہوا، لہٰذا بعض نے کہا ہے کہ سورہ "اقراء" وہ پہلا سورہ ہے جو آغاز بعثت میں نازل ہوئی اور سورۂ "مدثر" وہ پہلا سورہ ہے جو آشکار دعوت کے بعد ہے اور یہ بات بہت اچھی نظر آتی ہے۔

بہرحال مکی سورتوں کا مزاج و طبیعت۔ جو مبداء و معاد کی دعوت اور شرک سے مبارزہ اور مخالفین کو عذاب الٰہی کا انذار اور تہدید ہے۔ اس سورہ میں مکمل طور سے منعکس ہے۔

اس سورہ کے مباحث مجموعی طور سے سات محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر کو قیام، انذار، آشکار تبلیغ کی دعوت اور اس راہ میں صبر و استقامت اور اس کام کے لیے ضروری آمادگیوں کی تیاری۔

۲۔ قیامت کی طرف اشارہ؛ دوزخیوں کی صفات، وہی جو قرآن سے مقابلہ کے لیے کھڑے ہوئے اور جنہوں نے حق کا مذاق اڑایا۔
۳۔ کافروں کو ڈرانے کے ساتھ دوزخ کی خصوصیات کا ایک حصہ۔
۴۔ بار بار کی قسموں کے ذریعہ امر قیامت پر تاکید۔
۵۔ ہر انسان کی سرنوشت کا اس کے اعمال کے ساتھ ربط اور اس سلسلہ میں ہر قسم کے غیر منطقی افکار کی نفی۔
۶۔ جنتیوں اور دوزخیوں کی بعض خصوصیات اور ان میں سے ہر ایک کی سرنوشت۔
۷۔ جاہل، بے خبر، مغرور اور خود غرض لوگوں کے حق سے فرار کی کیفیت۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر گرامی اسلام سے ایک حدیث میں آیا ہے:

من قرأ سورة المدثر اعطی من الاجر عشر حسنات بعدد من صدّق بمحمد (ص) وكذب به بمكة

"جو شخص سورۂ مدثر کو پڑھے گا، اسے ان لوگوں کی تعداد میں جنھوں نے مکہ میں پیغمبرِ اسلامؐ کی تصدیق یا تکذیب کی تھی، دس نیکیاں دی جائیں گی"[1]

ایک اور دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے:

من قرأ فی الفریضة سورة المدثر کان حقا علی الله ان یجعله مع محمد (ص) فی درجته، ولا یدرکه فی حیاة الدنیا شقاء ابدا

"جو شخص سورۂ مدثر کو واجب نماز میں پڑھے تو خدا پر حق ہے کہ اس کو پیغمبرؐ کے ہمراہ ان کے جوار میں اور ان کے درجہ میں قرار دے اور دنیا کی زندگی میں بدبختی اور رنج و تکلیف اسے دامن گیر نہ ہو"[2]

یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کے نتائج صرف سورہ کے الفاظ پڑھنے پر مترتب نہیں ہوں گے بلکہ ضروری ہے کہ سورہ کے مضامین کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس پر پوری طرح عمل کیا جائے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۔ یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ

۲۔ قُمْ فَاَنْذِرْ

۳۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ

۴۔ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ

۵۔ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ

۶۔ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ

۷۔ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ

۸۔ فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ

۹۔ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ

۱۰۔ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ

ترجمہ

شروع اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے

۱۔ اے بستر خواب میں آرام کرنے والے

۲۔ اٹھ کھڑا ہو اور انذار کر (اور عالمین کو ڈرا)

۳۔ اور اپنے پروردگار کی بزرگی بیان کر

۴۔ اور اپنے لباس کو پاک کر

۵۔ اور پلیدگیوں سے پرہیز کر۔
۶۔ اور کسی پر منت نہ رکھ اور زیادتی کا مطالبہ نہ کر۔
۷۔ اور اپنے پروردگار کے لیے صبر کر۔
۸۔ جس وقت صور پھونکا جائے گا۔
۹۔ وہ دن بہت ہی سخت دن ہوگا۔
۱۰۔ اور کافروں کے لیے آسان نہیں ہوگا۔

تفسیر

اٹھ اور عالمین کو ڈرا !

اس میں شک نہیں کہ ان آیات میں مخاطب خود پیغمبرؐ کی ذات ہے۔ اگرچہ اس بات کی ان میں صراحت نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان آیات میں موجود قرائن اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "اے بستر خواب میں آرام کرنے والے اور اے چادر اوڑھ کر سونے والے" (یا ایھا المدثر)۔

"اٹھ کھڑا ہو اور انذار کر اور عالمین کو ڈرا" (قم فانذر)۔

کیونکہ سونے اور آرام کرنے کا وقت گزر گیا ہے اور قیام و تبلیغ کا زمانہ آگیا ہے۔

خصوصیت کے ساتھ انذار پر تکیہ۔ حالانکہ پیغمبرؐ "بشیر" بھی ہیں اور "نذیر" بھی۔ اس بنا پر ہے، چونکہ "انذار" خصوصیت کے ساتھ کام کے آغاز میں، سوئی ہوئی اور دماغ کو بیدار کرنے میں، زیادہ عمیق اور گہری تاثیر رکھتا ہے۔

اس بارے میں کہ پیغمبر بستر میں کیوں آرام کر رہے تھے، کہ اس خطاب نے آپ کو قیام کی دعوت دی، مفسرین نے بہت سے احتمال دیئے ہیں۔

۱۔ مشرکین عرب موسم حج کے قریب جمع ہوئے اور ان کے سرداروں مثلاً ابوجہل، ابوسفیان، ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث وغیرہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ باہر سے مکہ میں آنے والے لوگوں کے سوالات کے مقابلہ میں، جنھوں نے ادھر اُدھر سے پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کے سلسلہ میں مختلف مطالب سنے ہیں کیا کہیں؟

• اگر ہر ایک الگ الگ جواب دینا چاہے، ایک اسے کاہن کہے، دوسرا مجنون کہے، تیسرا ساحر کہے تو یہ اختلاف ان کے لیے اچھا اثر نہ چھوڑے گا لہٰذا ضروری ہے کہ پیغمبر کے برخلاف پروپیگنڈے کی جگہ متحد ہو کر کھڑے ہو جائیں۔ بحث و گفتگو کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ سب سے بہتر یہ ہے

کہ سب کے سب اسے "ساحر" کہیں، کیونکہ "جادو" کے واضح آثار میں سے ایک بیوی اور شوہر اور باپ اور بیٹے کے درمیان جدائی ڈالنا ہے اور پیغمبر نے دینِ اسلام کو پیش کرکے اس قسم کا کام انجام دیا ہے۔

یہ بات پیغمبرؐ کے کان تک پہنچی تو آپ کو بہت دکھ ہوا اور بیماروں کی طرح غمگین حالت میں گھر میں آئے اور بستر میں لیٹ گئے، تو اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور آپ کو قیام اور مبارزہ کی دعوت دی۔

۲۔ یہ آیات وہ پہلی آیات تھیں جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئیں، کیونکہ "جابر بن عبداللہ" کے واسطے سے پیغمبرؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "میں کوہ حرا پر تھا کہ ایک آواز بلند ہوئی اور کہا، اے محمدؐ! "تو خدا کا رسول ہے"۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا تو مجھے کوئی چیز نظر نہ آئی، میں نے اپنے سر کے اوپر دیکھا، تو ایک فرشتے کو عرش پر آسمان و زمین کے درمیان دیکھا، میں ڈر گیا اور خدیجہ کی طرف لوٹ آیا، اور میں نے کہا: "مجھ پر کپڑا ڈال دو، مجھ پر کپڑا ڈال دو اور ٹھنڈا پانی مجھ پر ڈالو"۔ یہ وہ منزل تھی کہ جبرئیل مجھ پہ نازل ہوئے اور " یا ایھا المدثر" لائے۔"

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس سورہ کی آیات آشکارا دعوت کو بیان کر رہی ہیں، اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آیات کم از کم تین سال تک پوشیدہ طور سے دعوت کرنے کے بعد نازل ہوئی ہیں، اور یہ بات اس چیز سے جو اوپر والی روایت میں بیان کی گئی ہے سازگار نہیں ہے۔ مگر یہ کہ یہ کہا جائے کہ اس سورہ کی چند ابتدائی آیات آغاز دعوت میں نازل ہوئی تھیں اور بعد والی آیات چند سال کے بعد سے تعلق رکھتی ہیں۔

۳۔ پیغمبر سوئے ہوئے تھے اور اوپر چادر لی ہوئی تھی کہ جبرئیل نازل ہوئے اور آپ کو بیدار کیا اور یہ آیات آپ کے سامنے پڑھیں کہ اٹھ جائیے اور بستر اور نیند سے کنارہ کشی کیجیے اور رسالت اور پیغام الٰہی کو انجام دیجیے۔

۴۔ کپڑا اوڑھنے سے مراد ظاہری کپڑا نہیں ہے، بلکہ لباس نبوت و رسالت ہے۔ جیسا کہ پرہیزگاری کو "لباس التقوٰی" کہا گیا ہے۔

۵۔ "مدثر" سے مراد ایسا شخص ہے جس نے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا ہو اور علیحدگی اور تنہائی میں زندگی بسر کرتا ہو، اس بناء پر آیت یہ کہتی ہے کہ عزلت اور گوشہ نشینی سے باہر نکل آؤ اور مخلوق کو انذار اور خدا کے بندوں کو ہدایت کرو۔

ان سب تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "فانذر" (انذار کرو) کا جملہ یہ بیان کرتا ہے کہ کس چیز سے ڈراؤ؟ اور کس موضوع میں انذار کرو؟ اور یہ حقیقت میں عمومیت کے بیان کے لیے ہے، یعنی بت پرستی، شرک و کفر، ظلم و بیدادگری اور فساد و عذاب الٰہی اور حساب محشر وغیرہ کے بارے میں لوگوں کو خبردار کرو، (اور اصطلاح کے مطابق متعلقات کا محذوف ہونا عمومیت پر دلالت کرتا ہے) ضمنی طور پر یہ عذاب دنیا کو بھی شامل ہے اور عذاب آخرت کو بھی اور انسان کے اعمال کے بُرے نتائج کو بھی جو اسے دامن گیر ہوں گے۔

اور قیام و انذار کی دعوت کے بعد پیغمبر اسلامؐ کو پانچ حکم دیتا ہے، جو دوسروں کے لیے ایک نمونہ ہیں، ان میں سے پہلا حکم توحید کے بارے میں ہے۔ فرماتا ہے: "صرف اپنے پروردگار کو بڑا سمجھ" (وربّک

فکبّر) [1]

وہی خدا جو تیرا مالک و مربی ہے اور جو کچھ تیرے پاس ہے وہ اسی کی طرف سے ہے۔

تو اس کے غیر کو بالکل بھول جا اور تمام جھوٹے معبودوں پر سرخ لکیر پھیر دے، اور ہر قسم کے شرک اور بت پرستی کے آثار کو محو کر دے۔

لفظ "رب" پر تکیہ اور اس کو "کبّر" پر مقدم رکھنا انحصار کی دلیل ہے، اس مختصر سی عبارت میں مسئلہ توحید کو دلیل کے ذکر کے ساتھ پیش کرتا ہے، قرآن کی تعبیریں کتنی عمدہ اور مضامین سے پُر ہیں کہ ایک مختصر سی عبارت میں یہ سب معنی بیان ہو گئے ہیں۔

"فکبّر" کے جملے سے مراد صرف "اللہ اکبر" کہنا نہیں ہے ——— اگرچہ اللہ اکبر بھی کہنا اس کا ایک معنی ہے، جس کی طرف روایات میں بھی اشارہ ہوا ہے ——— بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے خدا کو اعتقاد کے لحاظ سے بھی اور عمل کے لحاظ سے بھی اور گفتگو میں بھی بڑا سمجھ، اور اس کو اوصاف جمال کے ساتھ متصف اور ہر قسم کے نقص و عیب سے منزہ جان، بلکہ اس کو اس سے برتر سمجھ کہ اس کی تعریف و توصیف ہو سکے جیسا کہ روایات اہل بیت میں آیا ہے کہ "اللہ اکبر" کا معنی یہ ہے کہ خدا اس سے برتر ہے کہ اس کی توصیف ہو سکے، اور وہ فکر انسانی میں سما سکے، اس بنا پر "تکبیر" "تسبیح" کی نسبت زیادہ وسیع مفہوم رکھتی ہے جو صرف ہر قسم کے نقص و عیب سے تنزیہ کو شامل ہوتی ہے۔

مسئلہ توحید کے بعد دوسرا حکم آلودگیوں سے پاکیزگی کے بارے میں دیتے ہوئے مزید کہتا ہے، "اور اپنے لباس کو پاک کر"۔ (وثیابک فطھر)۔

"لباس" کی تعبیر ممکن ہے انسان کے عمل سے کنایہ ہو، کیونکہ ہر شخص کے اعمال، اس کے بمنزلہ لباس ہیں، اور اس کا ظاہر اس کے باطن کو بیان کرتا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں لباس سے مراد دل، روح اور جان ہے، یعنی اپنے دل کو ہر قسم کی آلودگی سے پاک کر، جہاں لباس کو پاک ہونا چاہیے، تو صاحب لباس اولویت رکھتا ہے کہ وہ پاک ہو۔

بعض نے اسی ظاہری لباس کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے، کیونکہ لباس کی ظاہری پاکیزگی کسی کی شخصیت کے اہم ترین پہلو اور انسان کی تربیت اور تہذیب و تمدن کی نشانی ہے، خصوصاً زمانۂ جاہلیت میں بہت کم لوگ نجاست سے اجتناب کرتے تھے اور بہت ہی گندا لباس رکھتے تھے خصوصاً معمول یہ تھا (جیسا کہ اس آخری زمانۂ جاہلیت میں گرفتار شدہ افراد میں بھی یہی معمول ہے) کہ لباس کے دامن کو بہت بڑا کرتے ہیں، اس طرح کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہے اور آلودہ ہو جاتا ہے، اور یہ جو بعض روایات میں امام صادق سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: آیت کا معنی یہ ہے کہ ثیابک فقصر (اپنے لباس کو چھوٹا کر) [2] یہ بھی اسی معنی کو بیان کرتا ہے۔

بعض نے اس کی بیویوں کے ساتھ تفسیر کی ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے تم اپنی بیویوں کا لباس ہو اور وہ بھی تمہارا لباس ہیں (کیونکہ تم ایک دوسرے کی آبرو کی حفاظت کرتے ہو اور ایک دوسرے کی زینت ہو) (ھن لباس لکم وانتم لباس لھن) (بقرہ آیہ ۱۸۷)

---

[1] "فکبّر" میں "فا" بعض کے نظریے کے مطابق زائدہ ہے اور تاکید کے لیے آیا ہے اور بعض کے نظریہ کے مطابق "شرط" کے معنی کا فائدہ حاصل کرنے کے لیے اور جملے کا معنی اس طرح ہے، جو بھی واقعہ اور حادثہ پیش آئے خدا کے بڑا ہونے کو نہ بھول جا (بعد والی آیات کے بارے میں بھی یہی گفتگو ہے)

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۸۵

ان معانی کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

حقیقت میں آیت کا اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ رہبرانِ الٰہی کی باتیں اسی وقت نفوذ کر سکتی ہیں جبکہ ان کا دامن ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو اور ان کا تقویٰ و پرہیزگاری ہر لحاظ سے مسلم ہو۔ اسی لیے قیام وانذار کے بعد پاکدامنی کا حکم دیتا ہے

تیسرے حکم میں فرماتا ہے: "ناپاکیوں سے اور ان چیزوں سے جو عذابِ الٰہی کا موجب ہیں پرہیز کر" والرجز فاھجر)۔

رجز (پلیدگی) کے مفہوم کی وسعت کے سبب اس کے لیے گوناگوں تفسیریں بیان کی گئی ہیں۔

کبھی اس کی بتوں کے ساتھ، کبھی ہر قسم کی معصیت و نافرمانی کے ساتھ، کبھی قبیح و ناپسندیدہ اخلاق کے ساتھ، کبھی محبت دنیا کے ساتھ جو ہر گناہ اور خطا کا سرچشمہ ہے، کبھی عذابِ الٰہی کے ساتھ جو شرک و معصیت کا نتیجہ ہے اور کبھی ہر اس چیز کے معنی میں جو انسان کو خدا سے غافل کر دیتی ہے، تفسیر کی ہے۔ نکتہ اصلی یہ ہے کہ "رجز" اصل میں اضطراب و تزلزل کے معنی میں ہے[1] پھر اس کے بعد ہر قسم کے گناہ، شرک، بت پرستی، شیطانی وسوسوں، اخلاق ذمیمہ اور عذابِ الٰہی کے لیے ——— جو انسان کے اضطراب کا سبب بنتے ہیں اور اس کو صحیح راستے سے منحرف کر دیتے ہیں، اطلاق ہونے لگا۔

حالانکہ بعض اس لفظ کا معنی "عذاب" کرتے ہیں[2]۔ اور چونکہ شرک و گناہ، برے اخلاق اور دنیا کی محبت عذابِ الٰہی کو جلب کرتے ہیں، لہٰذا ان پر بھی "رجز" کا اطلاق ہونے لگا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ قرآن مجید میں لفظ "رجز" (بروزن شرک) عام طور پر عذاب کے معنی میں آیا ہے[3]

بعض یہ نظریہ بھی رکھتے ہیں کہ "رجز" اور "رجس" جو "پلیدگی" کے معنی میں ہیں، دونوں مترادف اور ہم معنی ہیں[4]

یہ تینوں معانی اگرچہ آپس میں مختلف ہیں، لیکن پھر بھی ایک دوسرے کے ساتھ قریبی ارتباط رکھتے ہیں۔ بہرحال آیت ایک جامع مفہوم رکھتی ہے جو ہر طرح کے انحراف، پلید اور قبیح عمل اور ہر اس کام کو جو دنیا و آخرت میں خدا کے غیظ و غضب اور اس کے عذاب کا موجب ہو، شامل ہے۔

مسلّم طور پر پیغمبرِ اسلام نبوت سے پہلے بھی ان امور سے پرہیز کرتے تھے اور ان سے نفرت رکھتے تھے اور آپ کی زندگی کی تاریخ بھی جس کے دوست و دشمن سب ہی معترف ہیں، اس پر گواہ ہیں، لیکن یہاں دعوت الی اللہ کی راہ میں ایک اساسی اور بنیادی اصل کے عنوان سے بھی اور سب کے لیے ایک نمونہ اور اسوہ کے عنوان سے بھی، اس پر تکیہ ہوا ہے۔

---

[1] "مفردات" راغب

[2] "المیزان" و "فی ظلال القرآن" (زیر بحث آیت کے ذیل میں)

[3] سورۂ اعراف کی آیہ ۱۳۴، ۱۳۵۔ اور سبا کی آیہ ۵، اور جاثیہ کی آیہ ۱۱ اور بقرہ کی آیہ ۵۹، اور اعراف کی آیہ ۱۶۲، اور عنکبوت کی آیہ ۳۴ کی طرف رجوع کریں۔

[4] فخر رازی کی تفسیر میں یہ معنی ایک احتمال کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ (جلد ۳۰ ص ۱۹۳)

چوتھے حکم میں فرماتا ہے: "احسان نہ جتلاؤ اور زیادتی کا مطالبہ نہ کرو" (ولا تمنن تستکثر)[1]

اس بارے میں کہ احسان جتلانے اور زیادتی طلب کرنے سے نہی کن موارد میں ہے، یہاں پر آیت کا مفہوم پھر کلی اور وسیع ہے، اور خالق اور مخلوق پر ہر قسم کے احسان جتلانے کو شامل ہے، نہ تو پروردگار پر احسان جتلاؤ کہ تم اس کے لیے جہاد اور سعی و کوشش کرتے ہو، کیونکہ یہ تو اس نے تم پر احسان کیا ہے کہ یہ بلند مقام تمہیں عطا کیا ہے۔

اسی طرح اپنی عبادت، اطاعت اور نیک اعمال کو زیادہ شمار نہ کرو، بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو "کمی" اور "تقصیر" میں سمجھو اور عبادت کو اپنے لیے ایک قسم کی بہت بڑی توفیق شمار کرو۔

دوسرے لفظوں میں تمہیں اپنے قیام شب وانذار، توحید کی نشر واشاعت، پروردگار کی عظمت کو بیان کرنے، کپڑوں کو پاک رکھنے اور ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کرو، خدا پر احسان شمار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی انہیں کوئی بڑا کام سمجھنا چاہیے بلکہ انہیں اپنے پروردگار کے گراں بہا ہدیے سمجھنا چاہیے اور ان کی وجہ سے خدا کا ممنون رہنا چاہیے، اس کے عشق ومحبت میں اس طرح غرق رہنا چاہیے، کہ تم ان اہم کاموں کو بہت ہی ناچیز سمجھو۔

اور اگر تم مخلوق کی بھی کوئی خدمت کرتے ہو، چاہے وہ معنوی جہات میں ہو، جیسے تبلیغ وہدایت، اور چاہے مادی جہات میں ہو مثلاً انفاق وبخشش، ان میں سے کسی چیز کو بھی احسان جتانے یا تلافی کی توقع سے اور وہ تلافی بھی زیادتی کے ساتھ توام نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ احسان جتلانا نیک اعمال کو باطل اور بے اثر کر دیتا ہے۔ (یا ایھا الذین اٰمنوا لا تبطلوا صدقاتکم بالمن والاذٰی)

(بقرہ ــــــ ۲۶۴)

"لا تمنن" "منت" کے مادہ سے، ایسے موارد میں ایسی گفتگو کے معنی میں ہے جو اس نعمت کی اہمیت کو بیان کرے جو انسان نے کسی دوسرے کو دی ہے اور یہاں سے اس کا رابطہ "استکثار" (زیادہ طلب کرنے) کے مسئلہ کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنی خدمت کو ناچیز اور حقیر سمجھے، تو پھر وہ کسی اجر کی توقع نہیں رکھتا، چہ جائیکہ وہ زیادتی کا مطالبہ کرے، اس طرح سے احسان جتلانا ہمیشہ "استکثار" کا سرچشمہ بنتا ہے اور یہ ایک ایسا عامل ہے جو نعمت کی قدر وقیمت کو کلی طور پر ختم کر دیتا ہے۔

اور یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے کہ: لا تعط تلتمس اکثر منہا، تو کسی کو کوئی ایسی چیز دیے جس سے بیشتر کی توقع رکھتا ہو[2] حقیقت میں یہ آیہ شریفہ کے کلی مفہوم کی ایک شاخ کا بیان ہے۔

جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ امام صادقؑ نے اس آیہ کی تفسیر میں فرمایا:

لا تستکثر ما عملت من خیر للہ

جو نیک کام تم اللہ کے لیے انجام دیتے ہو اسے ہرگز زیادہ نہ سمجھنا[3] یہ بھی اس مفہوم کلی کی ایک شاخ ہی ہے۔

---

[1] توجہ کیجئے کہ "تستکثر" میں حال ہے، نہ کہ نہی کا جواب (کیونکہ مرفوع صورت میں آیا ہے) اس بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا: "احسان نہ جتلاؤ درحالیکہ تم زیادتی طلب کرتے ہو یا اپنے عمل کو بڑا اور زیادہ سمجھتے ہو۔

[2،3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۴۴، "تفسیر برہان" جلد ۴ ص ۴۰۰

بعد والی آیت میں اس سلسلے کے آخری حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "اور اپنے پروردگار کے لیے صبر و شکیبائی اختیار کر۔" (ولربك فاصبر)۔

یہاں پر پھر "صبر و استقامت اور شکیبائی" کے ایک وسیع مفہوم کا سامنا ہے، جو ہر چیز کو شامل ہے۔

یعنی اس عظیم رسالت کی ادائیگی کی راہ میں صبر و شکیبائی کر، مشرکین اور جاہل و نادان دشمنوں کی تکلیف کے مقابلہ میں صابر رہ، فرمانِ خدا کی اطاعت کی عبودیت میں استقامت دکھا اور نفس سے جہاد اور دشمن کے ساتھ میدانِ جنگ کے جہاد میں صابر و شکیبا رہ۔

مسلّم طور پر صبر و استقامت تمام گزشتہ پروگراموں کے اجراء کی بنیاد اور ضامن ہے۔ اصولی طور پر تبلیغ و ہدایت کی راہ میں اہم ترین سرمایہ یہی صبر و استقامت ہے۔ لہٰذا قرآن مجید میں بارہا اس پر تکیہ ہوا اور اسی وجہ سے امیر المومنین علیؑ کے ارشاداتِ گرامی میں آیا ہے۔

الصبر من الایمان کالرأس من الجسد

"صبر و استقامت کی ایمان کے مقابلہ میں وہی حیثیت ہے جو سر کی بدن کے مقابلہ میں"[1]

اور اسی بناء پر انبیاء اور مردانِ خدا کا ایک اہم ترین پروگرام یہی صبر و استقامت کا پروگرام تھا۔ جتنے زیادہ سخت اور سنگین حوادث ان پر پڑتے جاتے تھے اتنا ہی ان کا صبر و استقامت بڑھتا جاتا تھا۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے آیا ہے کہ آپ نے صابرین کے اجر کے سلسلہ میں فرمایا:

قال الله تعالٰی: اذا وجهت الی عبد من عبیدی مصیبة فی بدنه او ماله او ولده، ثم استقبل ذالك بصبر جمیل استحییت منه یوم القیامة ان انصب له میزانًا او انشر له دیوانًا

خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: جس وقت میں اپنے بندوں میں سے کسی بندے کی طرف، اس کے بدن یا مال یا اولاد کے لیے مصیبت بھیجتا ہوں اور وہ صبرِ جمیل کے ساتھ اس کا سامنا کرتا ہے تو مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس کے لیے قیامت کے دن اعمال تولنے کے لیے میزان نصب کروں یا میں اس کے نامۂ عمل کو کھولوں[2]

اس حکم کے بعد جو قیام و انذار کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں آیا ہے، زیر بحث آیات میں انذار کو ایک بہت ہی تاکیدی اور رسا بیان کے ساتھ شروع کرتا ہے اور فرماتا ہے: "جب صور میں پھونکا جائے گا" (فاذا نقر فی الناقور)۔

تو وہ دن ایک بہت ہی سخت دن ہوگا" (فذالك یومئذ یوم عسیر)[3]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۸۲

[2] تفسیر "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۲۰

[3] اس جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں ان میں سے سب سے پہلا عمدہ ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

"وہ بہت ہی پرمشقت دن ہوگا، جو کافروں کے لیے آسان نہیں ہوگا" (علی الکافرین غیر یسیر)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ "ناقور" اصل میں مادہ "نقر" سے اس طرح دبانے کے معنی میں ہے، جس سے سوراخ ہو جائے اور "منقار" یعنی جانور پرندوں کی چونچ ہے، جس سے پرندے شکار سوراخ کرتے ہیں اسی معنی سے لی گئی ہے، اسی بناء پر بگل کو، جس کی آواز گویا انسان کے کان میں سوراخ کرتی ہے اور دماغ میں اتر جاتی ہے "ناقور" کہا جاتا ہے۔

قرآن کی آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی انتہا اور قیامت کی ابتداء میں دو مرتبہ صور پھونکا جائے گا یعنی دو حد سے زیادہ وحشت انگیز اور ہلا دینے والی صدائیں ــــــ جن میں سے پہلی موت کی صدا ہے اور دوسری بیداری اور حیات کی صدا ہوگی ــــــ پوری دنیا کو گھیر لیں گی، جنہیں "نفخ صور اول" اور "نفخ صور دوم" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور زیر بحث آیت "نفخ دوم" کی طرف اشارہ ہے، جس سے قیامت برپا ہو جائے گی اور وہ کافروں پر سخت اور سنگین دن ہوگا۔

ہم "صور" اور "نفخ صور" کے بارے میں تفصیلی بحث سورۂ زمر کی آیہ ۶۸ جلد ۱۱ میں کر چکے ہیں۔

بہر حال اوپر والی آیات اس واقعیت کو بیان کرتی ہیں کہ قیامت کے دن میں کافروں کی مشکلات پہلے ہی مرحلے سے نمایاں ہوں گی وہ بہت ہی دردناک دن ہوگا اور ایسا مصیبت بار اور طاقت فرسا ہوگا کہ وہ طاقت ور ترین انسان کے بھی گھٹنے ٹکوا دے گا۔

[illegible] اس کا مظہر ہے۔

۱۱۔ ذَرۡنِیۡ وَ مَنۡ خَلَقۡتُ وَحِیۡدًا ۙ

۱۲۔ وَّ جَعَلۡتُ لَہٗ مَالًا مَّمۡدُوۡدًا ۙ

۱۳۔ وَّ بَنِیۡنَ شُہُوۡدًا ۙ

۱۴۔ وَّ مَہَّدۡتُّ لَہٗ تَمۡہِیۡدًا ۙ

۱۵۔ ثُمَّ یَطۡمَعُ اَنۡ اَزِیۡدَ ٭ۙ

۱۶۔ کَلَّا ؕ اِنَّہٗ کَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیۡدًا ؕ

۱۷۔ سَاُرۡہِقُہٗ صَعُوۡدًا ؕ

ترجمہ

۱۱۔ مجھے اس شخص کے ساتھ جسے میں نے اکیلا پیدا کیا ہے چھوڑ دے۔

۱۲۔ وہی شخص جس کے لیے میں نے وسیع مال قرار دیا ہے۔

۱۳۔ اور ایسے بیٹے جو ہمیشہ اس کے پاس (اور اس کی خدمت میں) رہتے ہیں۔

۱۴۔ اور میں نے ہر لحاظ سے اس کے لیے زندگی کے وسائل فراہم کیے ہیں۔

۱۵۔ پھر بھی وہ یہی طمع رکھتا ہے کہ میں اس میں اور اضافہ کر دوں۔

۱۶۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا کیونکہ وہ ہماری آیات کے بارے میں دشمنی کرتا ہے۔

۱۷۔ عنقریب ہم اسے مجبور کر دیں گے کہ وہ زندگی کی چوٹی کے اوپر جائے، (پھر ہم اسے نیچے پھینک دیں گے)

شانِ نزول

ان آیات کے لیے دو شانِ نزول بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ قریش "دارالندوہ" (مسجد الحرام کے قریب ایک مرکز تھا جس میں وہ اہم مسائل میں مشورہ کرنے کے لیے جمع ہوتے تھے) میں جمع ہوئے۔ "ولید" (مکہ کا ایک مشہور اور جانا پہچانا شخص تھا، جس کی عقل اور سمجھ کے مشرکین قائل تھے اور اہم مسائل میں اس سے مشورہ لیا کرتے تھے)

نے ان کی طرف رُخ کر کے کہا: تم بلند نسب اور عقل و خرد کے مالک ہو، اور عرب ہر طرف سے (خانہ کعبہ کی زیارت اور دوسرے امور کے لیے) تمھارے پاس آتے ہیں، اور وہ تم سے مختلف جواب سنتے ہیں، تم اپنی بات کو (متفق ہو کر) ایک کرو۔

پھر اس نے ان کی طرف رُخ کر کے کہا: تم اس شخص کے بارے میں (پیغمبر اکرمؐ کی طرف اشارہ ہے) کیا کہتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہم کہتے ہیں: وہ "شاعر" ہے۔ ولید نے منہ چڑا کر کہا: ہم نے شعر بہت سنے ہیں، لیکن اس کی باتیں شعر کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتیں، انھوں نے کہا، ہم کہتے ہیں کہ وہ کاہن ہے۔ اس نے کہا: جب تم اس کے پاس جاتے ہو تو وہ باتیں جو کاہن (اخبارِ غیبی کی صورت میں) کہتے ہیں، وہ تو اس میں تمھیں نہیں ملتیں، انھوں نے کہا، ہم کہتے ہیں کہ وہ "دیوانہ" ہے۔ اس نے کہا جب تم اس کے پاس جاؤ گے تو تم اس میں جنون کا کوئی اثر نہیں پاؤ گے۔

انھوں نے کہا: ہم کہتے ہیں وہ "ساحر" ہے۔ اس نے کہا ساحر کس معنی میں؟ انھوں نے کہا: ایسا شخص جو دشمنوں اور دوستوں کے درمیان دشمنی پیدا کر دیتا ہے، وہ کہنے لگا: ہاں! وہ "ساحر" ہے، اور وہ ایسا کرتا ہے، (کیونکہ ان میں سے بعض مسلمان ہو جاتے ہیں اور اپنی راہ دوسروں سے الگ کر لیتے ہیں)۔

اس کے بعد وہ "دار الندوۃ" سے باہر نکلے اور حالت ان کی یہ تھی کہ جو بھی ان میں سے پیغمبر اکرمؐ سے ملتا تھا تو کہتا تھا: اے ساحر! اے ساحر!

یہ مطلب پیغمبرؐ پر بہت گراں گزرا تو خدا نے اس سورہ کی ابتدائی آیات اور اوپر والی آیات (آیہ ۲۵ تک) نازل فرمائیں (اور اپنے پیغمبرؐ کی دلداری کی)۔

۲۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جس وقت سورۂ "المؤمن" (سورۂ غافر) کی آیات نازل ہوئیں تو پیغمبرؐ مسجد الحرام میں (نماز میں) کھڑے تھے اور "ولید بن مغیرہ" حضرتؐ کے قریب تھا اور آپؐ کی تلاوت کو سن رہا تھا، جب پیغمبرؐ نے اس بات کی طرف توجہ کی، تو آپؐ نے ان آیات کی تلاوت کو دہرایا۔

"ولید" اپنی قوم ـــــــ قبیلہ بنو مخزوم ـــــــ کی مجلس میں آیا اور کہا، خدا کی قسم ابھی میں نے محمدؐ سے ایسا کلام سنا ہے جو نہ انسانوں کے کلام کے مشابہ ہے اور نہ جنوں کی باتوں کے۔

وان له لحلاوة وان عليه لطلاوة وان اعلاه لمثمر، وان اسفله لمغدق وانه ليعلوا وما يعلى.

اس کی گفتگو میں ایک خاص شیرینی ہے اور اس میں ایک خاص زیبائی اور طراوت ہے، اس کی شاخیں پھلوں سے پر ہیں اور اس کی جڑیں قوی اور طاقتور ہیں، وہ ایسا کلام ہے جو دوسرے ہر کلام سے برتر ہے، اور کوئی کلام اس پر برتری حاصل نہیں کر سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف پلٹ گیا، قریش نے ایک دوسرے سے کہا، خدا کی قسم! وہ محمدؐ کے دین کا فریفتہ ہو گیا ہے، اور ہمارے دین سے نکل گیا ہے اور وہ تمام قریش کو منحرف کر دے گا، اور وہ ولید کو "ریحانة قریش" (قریش کا گل سر سبد) کہتے تھے۔

ابوجہل نے کہا: میں اس کام کا کوئی علاج کرتا ہوں وہ اٹھ کر چل پڑا، اور غمگین چہرے کے ساتھ ولید کے قریب آکر بیٹھ گیا۔
ولید نے کہا: اے بھتیجے! تو کس لیے غمگین ہے؟ اس نے کہا: قریش اس سن وسال کے باوجود تجھ پر عیب لگاتے ہیں اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ تو نے محمد کی بات کو زینت بخشی ہے۔ وہ ابوجہل کے ساتھ اٹھا اور اپنے قبیلہ کی مجلس میں آیا اور کہا: کیا تمھارا گمان یہ ہے کہ محمد دیوانہ ہے؟ کیا تم نے کبھی جنون کے آثار اس میں دیکھے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں!
اس نے کہا: کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ وہ کاہن ہے؟ کیا تم نے اس میں کبھی کہانت کے آثار دیکھے ہیں؟ انھوں نے کہا: نہیں! کیا تم یہ تصور کرتے ہو کہ وہ شاعر ہے۔ کیا تم نے کبھی اسے شعر کہتے ہوئے دیکھا ہے؟۔ انھوں نے کہا: نہیں"۔
اس نے کہا: پھر کیا تمھارا خیال یہ ہے کہ وہ جھوٹا ہے؟ کیا تم نے اسے ماضی میں کبھی جھوٹ بولتے ہوئے دیکھا ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں! وہ دعوائے نبوت سے پہلے بھی ہمارے ہاں ہمیشہ "صادق امین" کے عنوان سے پہچانا جاتا تھا۔
اس مرحلہ پر قریش نے "ولید" سے کہا: تیرے نظریہ کے مطابق ہم اسے کیا کہیں؟ ولید سوچ میں پڑ گیا، نگاہ کی اور منہ چڑا کر بولا: وہ صرف ایک جادوگر ہے، کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ مرد اور عورت، اولاد اور دوستوں کے درمیان جدائی ڈال دیتا ہے؟ (ایک گروہ اس پر ایمان لے آتا ہے اور اپنے خاندان سے جدا ہو جاتا ہے)۔
اس بنا پر وہ جادوگر ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے ایک عمدہ جادو ہے [1]

تفسیر

"ولید" ایک حق ناشناس مغرور ثروت مند

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں کافروں کو مجموعی طور پر ڈرایا گیا ہے۔ زیر بحث آیات، خصوصیت کے ساتھ ان کے بعض افراد پر، جو زیادہ موثر تھے، انگلی رکھتے ہوئے، اس پر گویا دناطق، رسا اور سرکوبی کرنے والی تعبیروں کے ساتھ، شدید ترین انداز وں کی بوچھاڑ کر رہی ہیں۔
پہلے کہتا ہے: مجھے اس کے ساتھ جسے میں نے اکیلے ہی پیدا کیا ہے، چھوڑ دے" (ذرنی ومن خلقت وحیدًا)۔
یہ آیت اور بعد والی آیات ــــ جیسا کہ ہم نے شان نزول میں بیان کیا ہے ــــ ولید بن مغیرہ مخزومی ــــ جو قریش کے مشہور سرغنوں میں سے تھا ــــ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔
"وحیدًا" (اکیلا) کی تعبیر ممکن ہے خالق کی توصیف میں ہو یا مخلوق کی، پہلی صورت میں بھی دو احتمال ہیں، پہلا یہ کہ مجھے اس کے ساتھ تنہا چھوڑ دے کہ میں خود اس کو شدید سزا دوں، یا یہ کہ میں خود تنہا نے اسے پیدا کیا ہے، اور یہ سب نعمتیں اسے بخشی ہیں، لیکن اس نے

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۸۶۔ اس شان نزول کو بہت سے مفسرین مثلاً "قرطبی"، "مراغی"، "فخر رازی"، "فی ظلال القرآن" اور المیزان وغیرہ نے (کچھ اختلاف کے ساتھ) نقل کیا ہے۔

تنگ حراسی کی ہے۔

اور دوسری صورت میں بھی دو احتمال ہیں: ممکن ہے کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ماں کے پیٹ میں بھی اور پیدائش کے وقت بھی یکہ و تنہا تھا، نہ اس کے پاس مال تھا نہ اولاد۔ اور یہ سب کچھ ہم نے اسے بعد میں بخشا ہے۔

یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو "وحید" (بے مثل و بے مثال)، (عربوں میں بے نظیر شخص) کا نام رکھتا تھا، اور وہ یہ کہا کرتا تھا:

إنا الوحيد ابن الوحيد، ليس لي في العرب نظير، ولا لابي نظير

"میں وحید عصر ہوں اور وحید عصر کا بیٹا ہوں، عرب میں نہ کوئی میرا مثل و نظیر ہے اور نہ ہی میرے باپ کا"[1]

اس مطلب کا استہزاء کے عنوان سے آیہ میں تکرار ہوا ہے۔

لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ میں نے اس کیلئے بہت ہی زیادہ وسیع مال قرار دیا" (وجعلت له مالاً ممدودًا)۔

"ممدود" اصل میں کھینچے ہوئے کے معنی میں ہے، جو یہاں اس کے مال کی وسعت اور حجم کے بیان کے لیے آیا ہے، یا زمانہ اور مکان کے لحاظ سے کشش کے معنی میں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اس کے اموال اس قدر وسیع تھے کہ اس کے پاس مکہ اور طائف کے درمیان کے فاصلہ میں بہت سے اونٹ، گھوڑے اور بڑی زمینیں تھیں۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ اس کے پاس اتنے باغات اور کھیت تھے کہ ان میں سے ایک کا غلہ ابھی ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا تیار ہو جاتا تھا علاوہ ازیں وہ ایک لاکھ دینار طلائی کا مالک تھا، اور یہ تمام معانی لفظ "ممدود" میں جمع ہیں۔

اس کے بعد اس کی افرادی قوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: میں نے اس کے لیے ایسی اولاد قرار دی ہے جو ہمیشہ اس کے پاس اور اس کی خدمت میں حاضر رہتی ہے۔ (و بنين شهودًا)۔

وہ ہمیشہ اس کی مدد اور خدمت کے لیے تیار رہتے ہیں اور ان کی موجودگی اس کے انس اور راحت کا سبب تھی اور وہ تنگی معیشت کی وجہ سے ہرگز مجبور نہیں تھے کہ ان میں سے کوئی بھی اور وہ تجارت کے لیے کسی کی طرف سفر کرے اور باپ کو تنہا چھوڑ دے، بلکہ اور تنہائی کا رنج پہنچائیں۔ بعض روایات میں

---

[1] تفسیر "فخر رازی"، "کشاف"، "مراغی" اور "قرطبی" زیر بحث آیات کے ذیل میں، بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "وحید" جہنم کے ایک پہاڑ کے اور غیر شرعی بیٹے کے معنی میں ہے، لیکن اس روایت میں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ آیت کی تفسیر ہے علاوہ ازیں اور سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ معنی اوپر والی آیت کے ساتھ مناسب نہیں ہے۔

آیا ہے کہ اس کے دس بیٹے تھے۔

اس کے بعد ان تمام نعمتوں کی طرف، جو اس نے اسے دے رکھی تھیں، کلی طور پر اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "میں نے اس کے لیے ہر لحاظ سے وسائلِ زندگی فراہم کیے" (ومھدت لہ تمھیدا)۔

نہ صرف مال اور آبرومند بیٹے ہی، بلکہ وہ اجتماعی اور جسمانی پہلوؤں سے بھی، ہر لحاظ سے نعمتوں میں غرق تھا۔

"تمہید" "مہد" کے مادہ سے اصل میں اس جگہ کے معنی میں ہے جسے چھوٹے بچے کے لیے تیار کرتے ہیں (گہوارہ اور اسی قسم کی کوئی چیز) اس کے بعد ہر قسم کے راحت و آرام، پیش رفت اور اجتماعی عمدہ مقام و حیثیت پر اس کا اطلاق ہونے لگا اور مجموعی طور پر اس کا ایک وسیع معنی ہے، جو زندگی کی انواع و اقسام کی نعمتوں، اور پیش رفت و موفقیت کے وسائل کو شامل ہے۔

لیکن وہ ان تمام نعمتوں کے بخشنے والے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے اور اس کے آستانہ پر پیشانی جھکانے کے بجائے کفرانِ نعمت کرنے اور زیادہ طلب کرنے لگا: "اور اس قدر مال اور نعمت رکھنے کے باوجود، پھر بھی یہ لالچ رکھتا ہے کہ ہم اس کی نعمتوں میں اضافہ کریں" (ثم یطمع ان ازید)۔

یہ بات "ولید بن مغیرہ" میں ہی منحصر نہیں تھی، بلکہ تمام دنیا پرست ایسے ہی ہوتے ہیں، ان کی پیاس ہرگز نہیں بجھتی اور اگر ہفت اقلیم بھی ان کے زیرِ نگیں دے دی جائیں تو وہ پھر بھی ایک اور اقلیم کے خواہش مند ہوتے ہیں۔

لیکن بعد والی آیت پوری شدت کے ساتھ اس نامحرم کی خواہشات کو رد کرتے ہوئے کہتی ہے: "ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ ہم اس کی نعمت میں اور اضافہ کریں، کیونکہ وہ ہماری آیات سے دشمنی رکھتا ہے" (کلا انہ کان لاٰیاتنا عنیدًا)۔

اور باوجود اس کے کہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ یہ قرآن نہ تو جن کا کلام ہے اور نہ ہی یہ بشر کا کلام ہے، اور یہ طاقتور جڑیں، پر ثمر شاخیں اور بے مثال کشش رکھتا ہے، پھر بھی وہ اس کو "سحر" کا نام دیتا تھا اور اس کے لانے والے کو ساحر کہتا تھا۔

"عنید" "عناد" کے مادہ سے، بعض کے قول کے مطابق اس قسم کی مخالفت اور دشمنی کے معنی میں بولا جاتا ہے، جو جانتے بوجھتے صورت پذیر ہو، یعنی انسان کسی چیز کی حقانیت کو درک کرے، اور پھر اس کی مخالفت کے لیے کھڑا ہو جائے اور "ولید" اس معنی کا روشن مصداق تھا۔

"کان" کی تعبیر بتاتی ہے کہ اس کا حق کے ساتھ عناد ایک امر مستمر اور ہمیشگی کا تھا، ٹوٹنے والا اور جلدی گزر جانے والا نہیں تھا۔

آخر میں آخری زیرِ بحث آیت میں اس کی دردناک سرنوشت کی طرف مختصر اور پر معنی عبارت کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم عنقریب اسے مجبور کریں گے کہ وہ زندگی کی "صعب العبور" (جس سے گزرنا مشکل ہے) ——— چوٹی پر جا پہنچے" (اور پھر ہم اس چوٹی کی بلندی سے اسے نیچے پھینک دیں)۔ (سارھقہ صعودًا)۔

"سأرهقه" "ارهاق" کے مادہ سے، اصل میں کسی چیز کو سختی کے ساتھ ڈھانپ لینے کے معنی میں ہے اور سخت کاموں کے برداشت کرنے اور انواع واقسام کے عذاب میں مبتلا کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

"صعود" (بروزن قبول) اس جگہ کے معنی میں ہے جس سے اوپر جاتے ہیں اور "صعود" (بروزن قعود) اوپر جانے کے معنی میں ہے۔

اور چونکہ بلند چوٹیوں سے اوپر جانا بہت ہی مشکل کام ہے، اس لیے یہ تعبیر ہر مشکل اور زحمت والے کام کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے اس کی عذاب الٰہی کے ساتھ تفسیر کی ہے اور بعض نے یہ کہا ہے کہ "صعود" جہنم میں آگ کا ایک پہاڑ ہے، اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس کے اوپر چڑھے، یا یہ ایک ایسا پہاڑ ہے جسے عبور کرنا سخت مشکل ہے، جس کی ڈھلان تیز اور زیادہ ہے، جب وہ اس کے اوپر جائے گا تو گر جائے گا اور نیچے آ پڑے گا اور اس بات کا بار بار تکرار ہوگا۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت اس جہان میں "ولید" کے دنیاوی عذاب کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ —— جیسا کہ تاریخ میں آیا ہے —— وہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں کامیابی کی چوٹی کی بلندی پر پہنچنے کے بعد اس طرح گرا کہ آخر عمر تک مسلسل اپنے مال اور اولاد کو ہاتھ سے دیتا رہا یہاں تک کہ بے حد مجبور اور روبہ زوال ہو گیا۔

---

[1] تفسیر "مراغی" جلد ۲۹ ص ۱۳۱

۱۸۔ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَقَدَّرَ
۱۹۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ
۲۰۔ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ
۲۱۔ ثُمَّ نَظَرَ ۙ
۲۲۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۙ
۲۳۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۙ
۲۴۔ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۙ
۲۵۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۭ

ترجمہ

۱۸۔ اس نے (قرآن سے مبارزہ کرنے کے لیے) غور و فکر کی، اور ایک مطلب تیار کر لیا۔
۱۹۔ وہ ہلاک ہو جائے، کس طرح (حق سے مبارزہ کرنے کے لیے) اس نے مطلب تیار کیا۔
۲۰۔ پھر وہ مرے، اس نے کس طرح سے مطلب (اور اپنے شیطانی منصوبہ) کو آمادہ کیا۔
۲۱۔ پھر اس نے نگاہ ڈالی۔
۲۲۔ پھر اس نے اپنا منہ چڑھایا اور جلدی سے کام میں لگ گیا۔
۲۳۔ پھر اس نے (حق کی طرف) پشت کی اور تکبر کیا۔
۲۴۔ اور آخر کار اس نے کہا یہ (قرآن) گزشتہ لوگوں کے جادو کی طرح، ایک پرکشش اور پرتاثیر جادو کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔
۲۵۔ یہ انسان کے قول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

ہلاک ہوجائے وہ، اس نے کتنا بُرا منصوبہ بنایا

ان آیات میں اس شخص کے بارے میں، جسے خدا نے فراواں مال واولاد دی تھی اور وہ پیغمبر اسلامؐ کی مخالفت کرنے لگا —— یعنی "ولید بن مغیرہ مخزومی" کی —— مزید وضاحتیں آئی ہیں۔

فرماتا ہے: "اس نے سوچا کہ پیغمبر اور قرآن کو کس چیز کے ساتھ متہم کرے؟ اور اس نے ایک منصوبہ اپنے ذہن میں تیار کر لیا" (انہ فکر و قدر)۔

واضح رہے کہ غور و فکر کرنا اپنی ذات سے ایک اچھا کام ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ حق کی راہ میں ہو۔ بعض اوقات اس کی ایک ساعت ایک سال کی عبادت، بلکہ عمر بھر کی عبادت کی فضیلت رکھتی ہے، کیونکہ وہی ایک لحظہ ہے کہ انسان کی سرنوشت کو دگرگوں کر دے لیکن اگر غور و فکر کو کفر و فساد اور شیطنت کی راہ میں استعمال کیا جائے تو وہ مذموم اور قبیح ہے اور ولید کی فکر اور سوچ اسی قسم کی تھی۔

"قدّر" ... "تقدیر" کے مادہ سے، یہاں مطلب کو ذہن میں آمادہ کرنے اور اس قبیح منصوبہ کے اجراء کے لیے مصمم ارادہ کرنے کے معنی میں ہے۔

پھر اس کی مذمت کے لیے مزید کہتا ہے: "وہ ہلاک ہوجائے" اس نے حق سے مبارزہ کرنے کے لیے کیسا منصوبہ بنایا ہے (فقتل کیف قدّر)۔

اس کے بعد تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے: "پھر بھی وہ مارا جائے، اس نے حق سے مقابلہ کرنے کے لیے، کس قسم کا منصوبہ تیار کیا ہے" (ثم قتل کیف قدّر)۔

اور یہ اسی چیز کی طرف اشارہ ہے جو شان نزول میں آئی ہے کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ مشرکین کے افکار کو متحد کرے اور انہیں ایک ہی جہت دے، تاکہ یک زبان ہو کر پیغمبرؐ کے خلاف ایک ہی طرح کا پروپیگنڈا کریں اور جب انہوں نے یہ پیش نہاد کی کہ حضرت کو "شاعر" کا لقب دیں تو اس نے قبول نہ کیا،

اس کے بعد انہوں نے "کاہن" کے عنوان کی پیش کش کی تو اس نے اس سے بھی موافقت نہ کی، پھر "مجنون" کے عنوان کو پیش کیا تو اس نے اسے بھی پسند نہ کیا، آخر میں انہوں نے یہ پیش کش کی کہ پیغمبرؐ کو "ساحر" کہہ کر پکاریں تو اس نے ان کے ساتھ موافقت کی، کیونکہ اس کے خیال میں جادو کا اثر دو دوستوں کے درمیان جدائی ڈالنا اور دو مخالف افراد کے درمیان دوستی پیدا کرنا تھا اور یہ بات اسلام اور قرآن کے ظہور کے بعد پیدا ہوگئی تھی، اور چونکہ یہ نقشہ اور منصوبہ مطالعہ کرنے اور سوچ بچار کرنے کے بعد تیار کیا گیا تھا لہٰذا قرآن انہیں "فکر و قدر" کی تعبیر کے ساتھ جو بہت ہی مختصر اور پُر معنی ہے، پیش کرتا ہے۔ اس طرح اگرچہ پیش نہاد دوسروں کی طرف سے ہوئی تھی، لیکن غور و فکر اور انتخاب "ولید" کی طرف

سے جا تھا۔

بہرحال یہ جملہ ــــــ خصوصاً اس کے تکراروں کی طرف توجہ کرتے ہوئے ــــــ اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اپنے شیطانی افکار و نظریات میں پوری مہارت تھی، اس طرح سے کہ اس کی فکر اور سوچ باعثِ تعجب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس نے دوبارہ نظر کی"۔ (ثم نظر)۔

اور اس نے اپنی ساختہ و پرداختہ فکر کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کی، تاکہ اس کے ضروری استحکام و انجام اور مختلف پہلوؤں سے آگاہ و مطمئن ہو جائے۔

"پھر اس نے اپنا منہ چڑایا اور جلد بازی سے کام لیا"۔ (ثم عبس و بسر)۔

"پھر اس نے حق کی طرف سے پشت پھیرلی اور تکبر کیا" (ثم ادبر واستکبر)۔

اور آخر کار اس نے کہا: "یہ چیز ایک عمدہ اور پرکشش جادو کے سوا ــــــ جیسا کہ گزشتہ لوگوں سے نقل ہوا ہے ــــــ کچھ نہیں ہے" (فقال ان هٰذا الا سحر یؤثر)۔

"یہ صرف انسان کا قول ہے اور اس کا وحی الٰہی کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے" (ان هٰذا الا قول البشر)۔

اس طرح سے اس نے اپنی آخری بات، قرآن سے مبارزہ اور مقابلہ کرنے کے لیے، بار بار کے مطالعہ اور شیطانی سوچ کے بعد کہی، اور زمانۂ جاہلیت و شرک کے اس متفکر دماغ نے اپنی پوری شیطنت خرچ کرنے کے باوجود اپنی اس بات سے قرآن کی حد سے زیادہ مدح و ثنا اور تعریف و تمجید کر ڈالی، حالانکہ وہ خود اس بات کو نہیں سمجھا، اس نے اس بات کی نشاندہی کی کہ قرآن ایک کشش اور حد سے زیادہ قوتِ جاذبہ رکھتا ہے، جو ہر انسان کے دل کو مسخر کر لیتا ہے اور اس کے قول کے مطابق اس میں ایسی سحر انگیز تاثیر ہے جو دلوں کو مسحور کر دیتی ہے اور چونکہ قرآن میں جادوگروں کے جادو سے کسی قسم کی شباہت نہیں ہے، بلکہ وہ منطقی، موزوں اور نپے تلے اقوال اور باتوں کا مجموعہ ہے، لہٰذا یہ بات خود اس چیز کی دلیل ہے کہ وہ انسان کا کلام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک آسمانی وحی ہے اور اس نے ماوراء الطبیعت عالم اور خدا کے بے پایاں علم سے سرچشمہ حاصل کیا ہے جس میں پورے نظم و انجام اور استحکام کے ساتھ تمام خوبیاں اور زیبائیاں جمع ہیں۔

"عبس" "عبوس" (بروزن جلوس) کے مادہ سے، منہ چڑانے کے معنی میں ہے اور "عبوس" (بروزن ناموس) اس شخص کے معنی میں ہے جو اس صفت کا حامل ہو۔

"بسر" "بسور" کے مادہ سے اور "بسر" (بروزن نصر) بعض اوقات تو کسی کام کے وقت آنے سے پہلے اس میں جلدی کرنے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی منہ چڑانے اور چہرہ کو دگرگوں کرنے کے معنی میں ہے۔

زیرِ بحث آیت میں اگر دوسرا معنی مراد ہو تو یہ "عبس" کے جملے سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اگر یہ پہلے معنی میں ہو، تو یہ قرآن کے لیے ایک غلط عنوان چسپاں کرنے میں، لہٰذا گھبراہٹ اور سراسیمگی کے ساتھ جلد بازی سے تصمیم گیری کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

"یؤثر" کا جملہ "اثر" کے مادہ سے، اس روایت کے معنی میں ہے، جو گزشتہ لوگوں سے نقل ہوئی ہو، اور وہ آثار جو ان سے باقی رہ گئے ہوں اور بعض نے اسے "ایثار" کے مادہ سے، انتخاب کرنے، مقدم رکھنا اور ترجیح دینے کے معنی میں کہا ہے۔

پہلے معنی کے مطابق "ولید" کہتا ہے: یہ گزشتہ لوگوں سے نقل شدہ جادو کی مانند ایک جادو ہے اور دوسرے معنی کے مطابق وہ یہ کہتا ہے یہ ایک ایسا جادو ہے جو اپنی حلاوت اور کشش کی بناء پر دلوں میں اثر کرتا ہے، اور لوگ اس کو ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں۔

بہرحال یہ قرآن کے اعجاز کا ایک ضمنی اعتراف ہے، کیونکہ قرآن جادوگروں کے خارق العادۃ کاموں کے ساتھ کوئی مشابہت نہیں رکھتا، یہ ایک ایسا سنجیدہ اور محکم کلام ہے، جو معنویت سے پُر ہے اور بے مثل و نظیر قوت جاذبہ و نفوذ رکھتا ہے۔ اگر یہ "ولید" کے قول کے مطابق بشر کا کلام ہوتا، تو پھر دوسرے بھی اس کی مثل و نظیر لا سکتے تھے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن نے بارہا مقابلہ کی دعوت دی ہے، لیکن اس کے ان سخت ترین دشمنوں میں سے ـــــــ جو عربی زبان میں حد سے زیادہ مہارت رکھتے تھے ـــــــ کوئی بھی اس جیسی چیز نہ بنا سکے، بلکہ وہ اس سے کمتر بھی نہ لا سکے، اور معجزہ کا معنی یہی ہے۔

۲۶۔ سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ○

۲۷۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ○

۲۸۔ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ○

۲۹۔ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ○

۳۰۔ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ○

ترجمہ

۲۶۔ (لیکن) ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے۔

۲۷۔ اور تو نہیں جانتا کہ دوزخ کیا چیز ہے؟

۲۸۔ (وہ ایک ایسی آگ ہے جو) نہ کسی چیز کو باقی رہنے دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے۔

۲۹۔ وہ بدن کی جلد کو کلی طور پر دگرگوں کر دیتی ہے۔

۳۰۔ انیس (عذاب کے فرشتے) اس پر مقرر کیے گئے ہیں۔

تفسیر

اس کی سرنوشتِ شوم

گزشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے، جو شرک کے بعض سرغنوں کی وضع و کیفیت، اور قرآن مجید اور پیغمبرِ اسلامؐ کی رسالت کی نفی و انکار کی بات کرتی تھیں، ان آیات میں قیامت میں ان کے دہشت ناک عذاب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "ہم عنقریب اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور دوزخ کی آگ میں جلائیں گے" (ساصلیہ سقر)۔

"سقر" اصل میں "سقر" (بروزن فقر) کے مادہ سے دگرگوں ہونے اور سورج کی گرمی کے اثر سے پگھل جانے کے معنی میں ہے اس کے بعد جہنم کے ناموں میں سے ایک نام کے عنوان سے انتخاب ہوا ہے اور بارہا قرآنی آیات میں آیا ہے اور اس نام کا انتخاب دوزخ کے ہولناک عذابوں کی طرف اشارہ ہے، جو اہلِ دوزخ کو دامن گیر ہوں گے۔ اور بعض نے جہنم کے ہول انگیز طبقات و درکات میں سے ایک کا

نام سمجھا ہے۔

اس کے بعد عذابِ دوزخ کی عظمت و شدت کے بیان کے لیے کہتا ہے: "تو کیا جانتا ہے کہ سقر کیا ہے" (وما ادراك ما سقر)۔ یعنی اس کا عذاب اس قدر شدید ہے جو دائرہ تصور سے باہر ہے اور کسی شخص کے فکر و خیال میں نہیں سماتا، جیسا کہ جنت کی نعمتوں کی اہمیت و عظمت کسی کی فکر و خیال میں نہیں سماتیں۔

"وہ نہ کسی چیز کو باقی رہنے دیتی ہے اور نہ ہی کسی چیز کو چھوڑتی ہے" (لا تبقی ولا تذر)۔

یہ جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جہنم کی آگ، دنیا کی آگ کے برخلاف ——— جو کبھی بدن کے ایک حصہ پر اثر انداز ہوتی ہے اور دوسرا حصہ صحیح و سالم رہ جاتا ہے اور کبھی جسم پر اثر کرتی ہے، لیکن روح اس سے امان میں رہتی ہے ——— ایک ایسی گھیرنے والی آگ ہے جو انسان کے پورے وجود کو اپنے احاطہ میں لے لی گی اور کسی چیز کو نہیں چھوڑے گی۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دوزخیوں کو نہ تو مارے گی اور نہ ہی زندہ رہنے دے گی، بلکہ وہ ہمیشہ موت و حیات کے درمیان گرفتار رہیں گے، جیسا کہ سورۂ اعلیٰ کی آیہ ۱۳ میں آیا ہے: لا یموت فیھا ولا یحییٰ "نہ وہ اس میں مریں گے اور نہ ہی وہ زندہ رہیں گے"۔

یا یہ ہے کہ نہ تو جلد اور گوشت بدن پر رہنے دے گی اور نہ ہی ہڈیوں کو صحیح و سالم چھوڑے گی، اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کلی طور پر جلا دے گی اور نابود کر دے گی، کیونکہ یہ معنی اس چیز سے، جو سورۂ نساء کی آیہ ۵۶ میں آئی ہے، سازگار نہیں ہے، جہاں فرماتا ہے: (کلما نضجت جلودھم بدلنٰھم جلوداً غیرھا لیذوقوا العذاب) "جس وقت ان کے بدن کی جلدیں جل جائیں گی تو ہم ان پر دوسری جلدیں تبدیل کر دیں گے، تاکہ وہ خدا کے عذاب کا مزہ چکھیں"۔

اس کے بعد قہرِ الٰہی کی اس جلانے والی آگ کی دوسری صفت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ بدن کی جلد کو کامل طور پر جلا کر رکھ دے گی، جو بہت دور کے فاصلے سے انسانوں کے لیے نمایاں ہوگی" (لواحة للبشر)[1]

وہ چہرے کو اس طرح سے سیاہ اور تاریک بنا دے گی کہ وہ شبِ تاریک سے زیادہ سیاہ نظر آئے گا۔

"بشر" یہاں "بشرہ" کی جمع ہے، جو بدن کی ظاہری جلد کے معنی میں ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ انسانوں کے معنی میں ہو، "لواحة" "لوح" کے مادہ سے، کبھی تو ظاہر و آشکار ہونے کے معنی میں آتا ہے، اور کبھی تغیر دینے اور دگرگوں کرنے کے معنی میں۔

پہلے معنی کی بناء پر آیت کی تفسیر اس طرح ہوگی: دوزخ دور کے فاصلے سے انسانوں کے لیے نمایاں ہوگی، جیسا کہ سورۂ نازعات کی آیہ ۳۶ میں آیا ہے، وبرزت الجحیم لمن یرٰی "دوزخ دیکھنے والوں کے لیے ظاہر و آشکار ہوگی"۔

---

[1] "لواحة" مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور تقدیر میں "ھی لواحة" ہے۔

اور دوسرے معنی کی بناء پر آیت کی تفسیر اس طرح ہے: "دوزخ بدن کی جلد کے رنگ کو کلی طور پر دگرگوں کر دے گی"۔

اور آخری زیر بحث آیت میں فرماتا ہے: "انیس عذاب کے فرشتے جہنم پر مقرر کیے گئے ہیں (علیها تسعة عشر)[1]

وہ فرشتے جو قطعی طور سے ترحم، شفقت اور مہربانی پر مامور نہیں ہیں، بلکہ سزا دینے، عذاب اور سختی پر مامور ہیں۔

اگرچہ اوپر والی آیت میں صرف انیس کے عدد کا ذکر ہوا ہے اور عذاب پر مامور ملائکہ کی تصریح نہیں ہوئی، لیکن بعد والی آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تعداد عذاب پر مامور فرشتوں کی تعداد کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ فرشتوں کے انیس گروہوں کی طرف اشارہ ہے، نہ کہ انیس افراد کی طرف، اور "وما یعلم جنود ربك الا هو" (تیرے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا اور کوئی نہیں جانتا) کا جملہ، جو بعد والی آیت میں آیا ہے، اس کو اس معنی پر قرینہ سمجھتے ہیں۔

لیکن مامورین عذاب الٰہی کے لیے اعداد میں سے صرف انیس کا عدد ہی کیوں انتخاب کیا گیا، کوئی بھی شخص وقت کے ساتھ ٹھیک ٹھیک نہیں جانتا، لیکن کچھ لوگوں نے یہ احتمال دیا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انیس کے عدد میں، اکائیوں میں سب سے بڑا عدد (نو کا عدد) اور دہائیوں میں سے سب سے چھوٹا عدد (دس کا عدد) جمع ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق رذیلہ کی جڑیں انیس ظاہری و باطنی اخلاق کی طرف لوٹتی ہیں اور چونکہ اخلاق رذیلہ میں سے ہر ایک عذاب الٰہی کا ایک عامل ہے، اس لیے دوزخ کے انیس طبقے ہیں، جو ان کی تعداد کے مطابق ہیں اور ہر طبقہ پر ایک فرشتہ یا فرشتوں کا ایک گروہ عذاب پر مامور ہے۔

اصولی طور پر قیامت، بہشت و دوزخ اور ان کے جزئیات و خصوصیات سے مربوط مسائل ہم لوگوں کے لیے، جو محدود دنیا کے محیط میں اسیر ہیں، پورے طور پر واضح نہیں ہیں، جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ان کے کلیات ہیں۔ اسی لیے روایات میں یہ آیا ہے کہ ان انیس فرشتوں میں سے ہر ایک بہت بڑی قدرت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے وہ ایک بہت بڑے قبیلہ کو آسانی کے ساتھ جہنم میں پھینک سکتا ہے۔

اور یہاں سے ان لوگوں کے افکار کا ضعف و ناتوانی واضح ہو جاتا ہے، جو ابوجہل کی طرح سوچتے ہیں، اس نے جب یہ آیت سنی تو اس نے قبیلہ قریش سے بطور استہزاء کے یہ کہا کہ تمہاری مائیں تمہاری عزا میں بیٹھیں، کیا تم سنتے نہیں ہو کہ "ابن ابی کبشہ" (پیغمبر اکرمؐ کی طرف اشارہ ہے)[2]

---

[1] اس جملہ میں "علیها" خبر مقدم ہے اور "تسعة عشر" مبتدائے مؤخر ہے اور ہم جانتے ہیں کہ یہ لفظ مبنی بر فتح ہے، اس لیے ظاہری طور پر اس پر رفع نہیں آ سکتا اور اس کی وجہ نحویوں نے یہ بتائی ہے کہ وہ واو عاطفہ کے معنی کو متضمن ہے۔

[2] اس بارے میں کہ قریش پیغمبر کو اس عنوان سے کیوں پکارتے تھے، بعض نے تو یہ کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قبیلہ "خزاعہ" کا ایک شخص "ابوکبشہ" نامی تھا جو زمانہ جاہلیت میں بت پرستی کی حالت سے دستبردار ہو گیا تھا اور چونکہ پیغمبر بت پرستی کے شدید مخالف تھے لہٰذا وہ آپ کو "ابوکبشہ" کے بیٹے کے نام سے پکارتے تھے اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ ابوکبشہ پیغمبر کے مادری اجداد میں سے تھا لیکن بہرحال اس میں شک نہیں کہ ان کا مقصد اس نام کے انتخاب کرنے میں تمسخر و استہزاء تھا کیونکہ عربی زبان میں "کبش" "مینڈھے" کے معنی میں ہے، اگرچہ یہ نام

کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ دوزخ کے خازن انیس افراد ہیں، لیکن تم بہادروں کا ایک بہت بڑا گروہ ہو، کیا تم میں سے ہر دس آدمی بھی ان میں سے ایک کو مغلوب نہیں کر سکتا؟ "ابوالاسد جمحی" (قریش میں سے ایک طاقت ور شخص) نے کہا: میں ان میں سے سترہ کے لیے کافی ہوں، باقی دو نفر کا حساب چکا لینا۔[1]

یہ پست دماغ کے لوگ یہ چاہتے تھے کہ اس تمسخر اور استہزاء کے ذریعہ، نورِ حق کا راستہ روک دیں، اور اپنے آپ کو حتمی اور یقینی نابودی سے نجات دیں۔

ایک نکتہ

انیس کا عدد، عذاب کے فرشتوں کا عدد ہے

اوپر والی آیات میں، جہنم کے خازنوں کی تعداد واضح طور پر انیس افراد یا انیس گروہ اور لشکر بتائی گئی ہے اور بعد والی آیات میں اسی مطلب پر تکیہ ہوا ہے، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض منحرف فرقے اس عدد کے مقدس ہونے پر اصرار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ سال کے مہینوں کی تعداد اور مہینوں کے دنوں کی تعداد ـــــــ تمام طبعی اور فلکی موازین کے برخلاف ـــــــ اسی انیس کے محور پر منظم کریں، اور اپنے عملی احکام بھی اسی کے مطابق قرار دیں۔

اور اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک مؤلف جو شاید ان کے نظریات کے ساتھ ارتباط رکھتا ہے، ایک ہنسانے والا، اور عجیب اصرار رکھتا ہے کہ وہ قرآن کی ہر چیز کی انیس کی بنیاد پر توجیہ کرے، اور بہت سے ایسے موارد ہیں، جہاں یہ عدد اس کی دلی خواہش کے مطابق، آیات قرآنی میں موجود حقیقتوں سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ وہاں وہ اپنی مرضی سے کچھ کم اور کچھ زیادہ کرتا ہے تاکہ وہ انیس کے عدد یا انیس کے عدد کی فروں سے ہم آہنگ ہو جائے اور ان کے مطالب کو ذکر کرنے میں وقت صرف کرنا، یا ان کے جواب دینا شاید اتلافِ وقت میں محسوب ہوگا۔

ہاں! ایک "دوزخی مذہب" کو "دوزخی عدد" کے محور پر ہی گردش کرنا چاہیے اور ایک دوزخی گروہ کو عذاب کے فرشتوں کے عدد کے ساتھ ہی ہم آہنگ ہونا چاہیے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۸۸ اور دوسری تفاسیر

۳۱- وَمَا جَعَلْنَآ أَصْحٰبَ النَّارِ إِلَّا مَلٰٓئِكَةً ۙ وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا إِيْمَانًا وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۚ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ ۚ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝

ترجمہ

۳۱- ہم نے جہنم کے مامورین (عذاب کے) فرشتوں کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا، اور ان کی تعداد بھی کافروں کی آزمائش کے علاوہ اور کسی بات کے لیے معیّن نہیں کی، تاکہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) یقین کر لیں اور مومنین کے ایمان میں اضافہ ہو اور اہلِ کتاب اور مومنین (اس آسمانی کتاب کی حقانیت میں) شک و تردد نہ کریں، وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے اور کافر یہ کہیں، خدا کا اس تعریف سے کیا مقصد ہے؟ ہاں! خدا جسے چاہتا ہے، اسی طرح سے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور تیرے پروردگار کے لشکروں کو اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور یہ انسانوں کی تنبیہ اور تذکر کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

تفسیر

دوزخ کے مامورین کی یہ تعداد کس لیے ہے؟

جیسا کہ گزشتہ آیات میں بیان ہو چکا ہے کہ خدا نے دوزخ کے خازنوں اور مامورین کی تعداد انیس افراد (یا انیس گروہ) بیان کی ہے نیز یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اس عدد کا ذکر مشرکین اور کفار کے درمیان گفتگو کا سبب بنا، اور ایک گروہ نے اس کا مذاق اڑایا اور ان کی تعداد کے کم ہونے کو

اس بات کی دلیل خیال کیا کہ ان پر غلبہ حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

زیر بحث آیت جو اس سورہ کی طویل ترین آیت ہے انھیں جواب دیتی ہے، اور اس سلسلہ میں بہت سے حقائق کو واضح کرتی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے جہنم کے مامورین (عذاب کے) فرشتوں کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا" (وما جعلنا اصحاب النار الا ملائکۃ)۔[1]

طاقت ور اور قدرت والے فرشتے اور قرآن کی تعبیر میں، "غلاظ" و "شداد" بہت شدید اور سخت گیر، جن کے سامنے تمام گنہگار ضعیف و ناتواں ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، "ہم نے ان کی تعداد کا فروں کی آزمائش کے سوا اور کسی بات کے لیے قرار نہیں دی ہے" (وماجعلنا عدتهم الا فتنة للذين كفروا)۔

یہ آزمائش دو لحاظ سے تھی، ایک تو یہ کہ وہ استہزاء اور تمسخر کرتے تھے کہ تمام اعداد میں سے انیس (۱۹) کا عدد ہی کیوں انتخاب کیا گیا حالانکہ دوسرا بھی عدد انتخاب ہوتا۔ اسی میں یہ سوال پیدا ہوتا۔

اور دوسری طرف وہ اس تعداد کو بہت کم سمجھتے تھے، اور بطور تمسخر و استہزاء کے کہتے تھے، کہ ہم ان میں سے ہر ایک کے مقابلہ کے لیے دس دس افراد کھڑے کر دیں گے اور انھیں درہم برہم کرکے رکھ دیں گے۔

حالانکہ غلاظ فرشتے ایسے ہیں کہ قرآن کے قول کے مطابق) ان میں سے چند افراد (ہی قوم لوط کی ہلاکت پر مامور ہوئے تھے، اور انھوں نے ان کے آباد شہروں کو زمین سے اٹھا کر زیر و زبر کر دیا تھا اور اس سے قطع نظر، جہنم کے خازنوں کے لیے انیس کے عدد کا انتخاب، دوسرے معانی بھی رکھتا ہے، جو گزشتہ آیات کے ضمن میں بیان ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے، "اس سے مقصد یہ تھا کہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) یقین پیدا کریں" (ليستيقن الذين اوتوا الكتاب)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے بعض اصحاب پیغمبرؐ سے خازنین جہنم کی تعداد کے بارے میں سوال کیا تو اس نے کہا کہ خدا اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ اسی وقت جبرئیل نازل ہوئے اور پیغمبرؐ کو خبر دی، "عليها تسعة عشر" "انیس افراد (یا انیس گروہ) اس پر مقرر کیے گئے ہیں"۔[2]

اور چونکہ انھوں نے اس موضوع پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے اپنی کتب کے ساتھ ہم آہنگ پایا، اور پیغمبر اسلام کی نبوت پر ان کے یقین میں اضافہ ہوا، اور یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ مومنین بھی اپنے عقیدہ اور ایمان میں زیادہ راسخ ہو جائیں۔

---

[1] "اصحاب النار" کی تعبیر قرآن مجید کی آیات میں بہت زیادہ ذکر ہوئی ہے، اور ہر جگہ "دوزخیوں" کے معنی میں ہے۔ سوائے اس جگہ کے کہ یہاں "خازنین" کے معنی میں ہے، ضمنی طور پر ان کے بارے میں اس تعبیر کا ذکر یہ بتاتا ہے کہ گزشتہ آیات میں "سقر" کا معنی سارا جہنم ہے، نہ کہ اس کا ایک حصہ۔

[2] اس حدیث کو "بیہقی"، "ابن ابی حاتم" اور "ابن مردویہ" نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے۔ (تفسیر مراغی، جلد ۲۹ ص ۱۴۴)

اس لیے بعد والے جملے میں مزید کہتا ہے: "اس سے مقصد یہ تھا کہ مومنین کے ایمان میں اضافہ ہو جائے" (ویزداد الذین امنوا ایمانًا)۔

اور اس جملہ کے ذکر کے بعد بلا فاصلہ انہی ضمنی اہداف و مقاصد کی طرف، تاکید کے عنوان سے لوٹتا ہے اور نئے سرے سے اہل کتاب کے ایمان، اس کے بعد مومنین کے ایمان اور پھر کفار و مشرکین کی آزمائش پر تکیہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "اور مقصد یہ تھا اور اہل کتاب اور مومنین قرآن کی حقانیت میں شک اور تردد نہ کریں اور کافر اور وہ لوگ کہ جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ کہیں کہ خدا کا اس توصیف سے کیا ارادہ ہے اور کیا مقصد ہے؟ (ولا یرتاب الذین اوتوا الکتاب والمؤمنون و لیقول الذین فی قلوبھم مرض و الکافرون ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً)۔[1]

اس بارے میں کہ "الذین فی قلوبھم مرض" (وہ لوگ کہ جن کے دل میں بیماری ہے) سے کون لوگ مراد ہیں؟ ایک گروہ نے یہ کہا ہے کہ اس سے مراد "منافقین" ہیں، کیونکہ قرآنی آیات میں یہ تعبیر ان کے بارے میں آئی ہے، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۰ میں آیا ہے، جو کہ ما بعد کی آیات کے قرینہ سے منافقین کے بارے میں گفتگو کرتی ہے: فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا:
ان کے دلوں میں ایک قسم کی بیماری ہے اور خدا ان کی بیماری کو مزید بڑھا دیتا ہے اور اسی بات کو وہ آیت کے مدنی ہونے کی دلیل قرار دیتے ہیں کیونکہ گروہ منافقین اسلام کی قدرت کے موقع پر مدینہ میں پیدا ہوا تھا نہ کہ مکہ میں۔

لیکن آیات قرآنی میں اس تعبیر کے ذکر کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ تعبیر منافقین میں منحصر نہیں ہے، بلکہ یہ ان تمام کفار کے لیے جو حق تعالیٰ کی آیات کے بارے میں عناد، ہٹ دھرمی اور دشمنی رکھتے تھے، —————— اطلاق ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کا منافقین پر عطف ہوا ہے، جو ممکن ہے کہ ان کی دوگانگی اور الگ الگ ہونے پر دلیل ہو، مثلاً سورۂ انفال کی آیہ ۴۹ میں آیا ہے۔

اذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم مرض غرّ ھؤلاء دینھم

"جس وقت منافقین اور ان لوگوں نے جن کے دلوں میں بیماری تھی یہ کہا کہ مسلمانوں کو ان کے دین نے مغرور کر دیا ہے۔"

اور اسی طرح اور دوسری آیات۔

اس بنا پر اس آیت کے مکی ہونے کی نفی پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے، خصوصاً جبکہ یہ ماقبل کی آیات کے ساتھ مکمل ہم آہنگی اور ارتباط رکھتی ہے۔ جن میں مکی ہونے کی نشانیاں مکمل طور پر نمایاں ہیں۔ (غور کیجئے)

پھر ان باتوں کے بعد، جو مومنین اور بیمار دل کافروں کی ارشادات الٰہی سے فائدہ اٹھانے کی کیفیت کے بارے میں تھیں، مزید کہتا ہے اس طرح سے خدا جسے چاہتا ہے، گمراہ کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے (کذالک یضل اللہ من یشاء و

---

[1] اس بات پر توجہ رہے کہ "لیستیقن" میں "لام" تو "لام علت" ہے اور "لیقول" میں "لام غایت" اور شاید اسی بناء پر تکرار ہوا ہے۔ ورنہ اگر دونوں کا ایک ہی معنی ہوتا تو پھر تکرار کی ضرورت نہیں تھی اور دوسرے لفظوں میں مومنین میں یقین پیدا کرنا، خدا کی مشیت اور اس کا حکم تھا، لیکن کافروں کی کفر آمیز باتیں اس کی مشیت اور حکم نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ان کے اس کام کا انجام اور نتیجہ تھیں۔

ویھدی من یشاء)۔

گزشتہ جملے، اس بات کی اچھی طرح سے نشاندہی کرتے ہیں کہ بعض کی ہدایت اور بعض دوسرے کی گمراہی کے بارے میں یہ مشیت و ارادۂ الٰہی، بے حساب نہیں ہے، وہ لوگ جو معاند، ہٹ دھرم اور دل کے بیمار ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی حق نہیں رکھتے، اور وہ لوگ جو خدا کے فرمان کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور وہ مومن ہیں وہ اسی قسم کی ہدایت کے مستحق ہیں۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "بہرحال تیرے پروردگار کے لشکر کو اس کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، اور یہ چیز انسانوں کو تنبیہ کرنے اور تذکر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے (و مایعلم جنود ربک الا ھو وما ھی الا ذکری للبشر)۔

اس بنا پر اگر دوزخ کے انیس خازنین کا ذکر درمیان میں آیا ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ خدا کے لشکر انہیں میں محدود ہیں، بلکہ پروردگار کے لشکر اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض روایات کی تعبیر کے مطابق تمام زمین اور آسمانوں کو انہوں نے بھر رکھا ہے، یہاں تک کہ تمام عالمِ ہستی میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں ہے مگر یہ کہ وہاں خدا کا ایک فرشتہ تسبیح میں مشغول ہے۔

اس بارے میں کہ "وما ھی الا ذکری للبشر" (اور یہ انسانوں کے لیے تذکرہ کے علاوہ کچھ نہیں) کے جملہ میں "ھی" کی ضمیر کس چیز کی طرف لوٹتی ہے، مفسرین نے مختلف احتمال دیئے ہیں۔

کبھی تو یہ کہا ہے کہ: یہ جنود اور خدا کے لشکروں کی طرف لوٹتی ہے، جن میں سے ایک گروہ خازنینِ دوزخ ہیں۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ: سقر یعنی خود دوزخ کی طرف لوٹتی ہے۔

اور کبھی یہ کہا ہے کہ: قرآن مجید کی آیات کی طرف اشارہ ہے۔

اگرچہ یہ سب چیزیں تذکر، بیداری اور آگاہی کا سبب ہیں، لیکن آیات کے لب و لہجہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے کیونکہ مقصد اس حقیقت کو بیان کرنا ہے کہ اگر خدا نے اپنے لیے لشکروں کا انتخاب کیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ خود معاندین اور گنہگاروں کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا سکتا، اور عذاب نہیں دے سکتا، بلکہ یہ سب کچھ تذکر و بیداری اور عذابِ الٰہی کے مسئلہ کے حقیقت ہونے کی طرف توجہ کے لیے ہے۔

ایک نکتہ

پروردگار کے لشکروں کی تعداد

ہر چند کہ خدا کا حضور اور اس کی قدرت کی وسعت، تمام عالمِ ہستی میں، اس کی پاک ذات کو ہر قسم کے یار و مددگار اور لشکر سے بے نیاز کر دیتی ہے لیکن اس کے باوجود مخلوقات کو اپنی عظمت بتانے، اور ان کے تذکر اور یاد دہانی کے لیے اس نے فراواں لشکروں کا انتخاب کیا ہے، جو سارے عالم میں اس کے فرمان کو اجراء کرنے والے ہیں۔

اسلامی روایات میں پروردگار کے لشکروں کی کثرت، عظمت اور قدرت کے لیے عجیب و غریب تعبیریں وارد ہوئی ہیں، چونکہ وہ ان موجودات کے ساتھ، جن سے ہم سروکار رکھتے ہیں سازگار نہیں ہیں، اسی لیے ان کا سننا ہمارے لیے بہت تعجب آور ہے۔

یہاں پر ہم علیؑ کے اس عظمت والے کلام پر، جو اس سلسلہ میں نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں نقل ہوا ہے، قناعت کرتے ہیں، اور چونکہ عبارت طولانی ہے، لہٰذا ہم اس کا صرف ترجمہ پیش کرتے ہیں۔

اس وقت اوپر والے آسمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا، اور ان کو فرشتوں کی مختلف اصناف و اقسام سے پُر کر دیا۔

ان میں سے ایک گروہ ہمیشہ سجدہ میں رہتا ہے اور وہ رکوع میں نہیں جاتا۔

اور ایک گروہ ہمیشہ رکوع میں رہتا ہے اور وہ رکوع سے سر نہیں اٹھاتا۔

اور ایک گروہ ہمیشہ قیام میں رہتا ہے اور عبادت میں مشغول رہتا ہے اور وہ اپنی جگہ کو نہیں بدلتا۔

ایک گروہ ہمیشہ تسبیح کرتا ہے اور تھکتا نہیں۔

کبھی نیند ان کی آنکھوں کو بند نہیں کرتی اور سہو و نسیان ان کی عقل پر غالب نہیں آتے۔

ان کے جسم سستی کی طرف مائل نہیں ہوتے اور غفلت اور فراموشی انھیں لاحق نہیں ہوتی۔

اور ایک دوسرا گروہ اس کی وحی کا امین ہے اور اس کے پیغمبروں کی طرف اس کی زبان ہے اور یہ گروہ اس کے فرمان اور امر کی تبلیغ کے لیے مسلسل آتا جاتا رہتا ہے۔

کچھ اور اس کے بندوں کے محافظ ہیں اور بہشت بریں کے دربان ہیں۔

ان میں سے بعض کے پاؤں زمین کے نچلے طبقات میں ثابت اور ان کی گردنیں آسمان بریں سے آگے نکل گئی ہیں اور ان کے وجود کے ارکان ابعاد و اطراف جہان سے خارج ہو گئے ہیں اور ان کے کندھے عرش خدا کے پایوں کی حفاظت کے لیے آمادہ ہیں[1]

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں (ملک) ایک وسیع و عریض مفہوم رکھتا ہے جو ان فرشتوں کو بھی شامل ہے جو عقل و شعور اور اطاعت و تسلیم کے حامل ہیں اور عالم ہستی کی بہت سی قوتوں اور توانائیوں کو بھی۔

ہم نے اس موضوع کے بارے میں سورۂ فاطر کے آغاز کی آیات میں (جلد ۱۰ ص ۱۶۲ سے آگے) مزید تفصیل بیان کی ہے۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ اول

۳۲۔ كَلَّا وَالْقَمَرِ ۝

۳۳۔ وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ ۝

۳۴۔ وَالصُّبْحِ إِذَا أَسْفَرَ ۝

۳۵۔ إِنَّهَا لَإِحْدَى الْكُبَرِ ۝

۳۶۔ نَذِيرًا لِلْبَشَرِ ۝

۳۷۔ لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ أَنْ يَتَقَدَّمَ أَوْ يَتَأَخَّرَ ۝

ترجمہ

۳۲۔ جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے، چاند کی قسم۔

۳۳۔ اور رات کی قسم جب (وہ دامن سمیٹے اور) پشت پھیرے۔

۳۴۔ اور صبح کی قسم جب وہ چہرہ کھولے۔

۳۵۔ کہ وہ (قیامت کے ہولناک حوادث) اہم مسائل میں سے ہیں۔

۳۶۔ تمام انسانوں کے لیے تنبیہ اور انذار ہے۔

۳۷۔ تم میں سے ان لوگوں کے لیے جو یہ چاہتے ہیں کہ آگے بڑھ جائیں یا پیچھے رہ جائیں (یعنی نیکیوں کی ہدایت کے لیے آگے بڑھ جائیں یا آگے نہ بڑھیں)

تفسیر

پیغمبر اسلام کی نبوت کے منکرین اور قیامت کے انکار کی بحث کو جاری رکھتے ہوئے، ان آیات میں کئی ایک قسمیں کھائی ہیں، اور قیامت، قبروں سے اٹھنے اور دوزخ و عذاب کے مسئلہ پر تاکید ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "جیسا کہ وہ خیال کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے، چاند کی قسم (کلا والقمر)۔

"کلا" "حرف ردع" ہے اور عام طور پر ان باتوں کی نفی کے لیے آتا ہے جنہیں طرف مقابل نے پہلے ذکر کیا ہو اور کبھی بعد والی باتوں کی نفی کے لیے بھی ہوتا ہے اور یہاں گزشتہ آیات کے قرینہ سے ان منکرین کے گمان کی جو دوزخ اور اس کے عذاب کے منکر تھے، اور

جہنم کے خازن فرشتوں کا مذاق اڑاتے اور تمسخر کرتے تھے، نفی کرتا ہے۔

"چاند" کی قسم کا ذکر اس بناء پر ہے کہ وہ خدا کی عظیم نشانیوں میں سے ایک ہے، خلقت کے لحاظ سے بھی اور منظم دورہ اور گردش کرنے کے لحاظ سے بھی، اور روشنی و خوبصورتی اور مد بھی تنویرات کے لحاظ سے بھی، جو دنوں کی تشخیص کے لیے خود ایک زندہ تقویم اور جنتری ہے

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور قسم ہے رات کی جس وقت وہ پشت پھیرے اور دامن سمیٹے (واللیل اذ ادبر)۔

"اور قسم ہے صبح کی جس وقت وہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹائے" (والصبح اذا اسفر)[1]

حقیقت میں یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ چاند کی جلوہ گری راتوں میں ہے اور دن کے وقت چاند کی روشنی، سورج کی روشنی کے تحت الشعاع میں ہوتی ہے اور وہ مطلقاً جلوہ نہیں دکھاتا۔

رات بھی اگرچہ آرام بخش ہوتی ہے اور خاموش اور حق تعالیٰ کے عاشقوں کے راز و نیاز کا وقت ہوتا ہے، لیکن یہ شب تاریک اس وقت بہت ہی عمدہ دکھائی دیتی ہے جب وہ پشت پھیرتی ہے اور صبح روشن کی طرف رُخ کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے اور آخر سحر کا وقت ہوتا ہے اور صبح کا طلوع کرنا، جو شب تاریک کا اختتام ہے، سب سے زیادہ دل آویز ہوتا ہے، جو ہر انسان کو وجد و نشاط میں لاتا ہے اور نور و صفا میں غرق کر دیتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ تینوں قسمیں "قرآن" کے نور ہدایت اور "شرک و بت پرستی" کی تاریکیوں کے پشت پھیرنے اور "توحید" کی صبح کی سفیدی کے پھوٹنے کے ساتھ مناسبت رکھتی ہیں۔

ان قسموں کو بیان کرنے کے بعد اس چیز کی طرف رُخ کرتا ہے جس کے لیے یہ قسمیں کھائی گئی ہیں، فرماتا ہے: "یقیناً قیامت کے ہولناک حوادث، دوزخ اور عذاب کے گزشتہ اہم مسائل میں سے ہیں" (انها لاحدى الكبر)[2]

"انها" کی ضمیر یا تو "سقر" (دوزخ) کی طرف لوٹتی ہے یا "جنود" "اور پروردگار کے لشکروں کی طرف، یا قیامت کے تمام حوادث کی طرف اور ان میں سے جو بھی ہو، اس کی عظمت واضح ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "دوزخ کی خلقت کا مقصد انتقام جوئی ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تو انسانوں کو ڈرانے کا ایک ذریعہ ہے (نذيرا للبشر)[3]

---

[1] ۳۴ "اسفر" "سفر" (بروزن فقر) کے مادہ سے ڈھکن کھولنا اور حجاب کو دور کرنے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے بے پردہ عورتوں کو "سافرات" کہا جاتا ہے اور یہ تعبیر طلوع صبح کے لیے ایک خوبصورت اور عمدہ تشبیہ ہے۔

[2] "کبر" کبریٰ کی جمع ہے جو بزرگ اور بڑی چیز کے معنی میں ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ "سقر" دوزخ کا ایک بہت بڑا طبقہ ہے۔ لیکن یہ تفسیر اس چیز کے ساتھ جس کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے مناسبت سے معلوم ہوتا ہے، مناسب نہیں ہے۔

[3] "نذیرا" "انہا" کی ضمیر کا حال ہے جو "سقر" کی طرف لوٹتی ہے اور بعض نے تفسیر کی بنا پر حال ہے یہ اس صورت میں ہے کہ "نذیر" مصدر کے معنی میں ہو جیسا کہ "انذار" کے معنی دیتا ہو لیکن

تاکہ سب کو ڈرائے اور انذار کرے اور اس وحشت ناک عذاب سے، جو کافروں، گنہگاروں اور حق کے دشمنوں کے انتظار میں ہے، بچائے۔

آخر میں زیادہ تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "یہ انذار کسی معین گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ تو تمام افراد بشر کے لیے ہے، تم میں سے ان سب لوگوں کے لیے، جو آگے بڑھنا چاہتے ہیں اور نیکیوں اور فرمانِ خدا کی اطاعت کی طرف پیش دستی کرنا چاہتے ہیں اور چاہے وہ لوگ ہوں جو اس قافلہ سے پیچھے رہ جانے کی طرف مائل ہوں" (لمن شاء منکم ان یتقدم او یتأخر)۔

جو شخص آگے بڑھنے کی راہ پر چل پڑے، تو اس کا کیا ہی کہنا ہے اور جو تاخیر کی راہ اپنائے اور پیچھے کو ہٹے تو اس کا برا حال ہوگا۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہاں تقدم و تاخر سے مراد جہنم کی آگ کی طرف تقدم اور اسی سے پیچھے ہٹنا ہے۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد نفسِ انسانی کا تقدم اور تکامل وارتقاء ہے یا اس کا انحطاط اور تاخر ہے۔

پہلا اور تیسرا معنی زیادہ مناسب ہے، اور دوسری تفسیر چنداں مناسب نہیں ہے۔

۳۸- كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۙ
۳۹- إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۚ
۴۰- فِي جَنَّاتٍ يَتَسَاءَلُونَ ۙ
۴۱- عَنِ الْمُجْرِمِينَ ۙ
۴۲- مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝
۴۳- قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۙ
۴۴- وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۙ
۴۵- وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۙ
۴۶- وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۙ
۴۷- حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ۭ
۴۸- فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ۭ

ترجمہ

۳۸- ہر شخص اپنے اعمال کے لیے گرو ہے۔
۳۹- مگر "اصحاب یمین" (جن کا اعمال نامہ ایمان و تقویٰ کی نشانی کے طور پر ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا)۔
۴۰- وہ جنت کے باغات میں ہوں گے اور وہ سوال کریں گے۔
۴۱- مجرموں سے
۴۲- تمھیں دوزخ کی طرف کس چیز نے بھیجا۔
۴۳- وہ کہیں گے: ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

۴۴۔ اور مسکینوں اور محتاجوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

۴۵۔ اور ہمیشہ اہلِ باطل کے ہم نشین و ہم صدا رہتے تھے۔

۴۶۔ اور ہمیشہ روزِ جزا کا انکار کرتے تھے۔

۴۷۔ یہاں تک کہ ہمیں موت آگئی۔

۴۸۔ لہٰذا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کے لیے سود مند نہیں ہوگی۔

تفسیر

تم اہلِ دوزخ کیوں ہوگئے؟

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے جو گزشتہ آیات میں دوزخ اور دوزخیوں کے بارے میں آئی ہے۔ ان آیات میں مزید کہتا ہے: "ہر شخص اپنے اعمال کے لیے گرو ہے" (کل نفس بما کسبت رهینة)۔

"رهینة" "رھن" کے مادہ سے (گرو) کے معنی میں ہے اور یہ وہ وثیقہ ہے جو عام طور پر "قرض" کے مقابل میں دیتے ہیں گویا انسان کا تمام وجود اس کے وظائف و تکالیف اور ذمہ داریوں کے انجام دینے میں گرو ہے، جس وقت انہیں انجام دے لیتا ہے، آزاد ہو جاتا ہے، ورنہ قیدِ اسارت میں رہے گا۔

اہلِ لغت کے بعض کلمات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ "رہن" کے معانی میں سے ایک ملازمت و ہمراہی ہے[1]۔ اس معنی کے مطابق آیت کا مفہوم اس طرح ہوگا، کہ سب لوگ اپنے اعمال کے ہمراہ ہوں گے چاہے نیکوکار ہوں یا بدکار۔

لیکن بعد والی آیات کے قرینہ سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

لہٰذا بلا فاصلہ فرماتا ہے: "مگر اصحاب یمین، جو اس اسارت کی قید سے آزاد ہیں" (الا اصحاب الیمین)۔[2]

انھوں نے ایمان اور عملِ صالح کے سائے میں، اسارت کے طوق اور زنجیروں کو توڑ دیا ہے، لہٰذا وہ بے حساب جنت میں داخل ہوں گے۔

اس بارے میں کہ یہاں "اصحاب الیمین" سے کون لوگ مراد ہیں، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

---

[1] "لسان العرب" مادہ "رہن"۔

[2] اس بارے میں کہ یہاں استثناء "متصل" ہے یا "منقطع"، بعض نے مثلاً مرحوم شیخ طوسی نے "تبیان" میں اسے "منقطع" تصور کیا ہے اور بعض نے مثلاً صاحب المیزان نے اسے متصل جانا ہے۔ یہ فرق ان مختلف تفسیروں کے ساتھ مربوط ہے جو ہم نے "رهینة" کے مفہوم کے بارے میں ذکر کی ہیں۔ پہلی تفسیر کہ جو ہم نے انتخاب کیا ہے، اس کے مطابق استثناء منقطع ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق استثناء متصل ہوگا۔ (غور کیجیے)

بعض نے تو اس کی ایسے افراد کے ساتھ تفسیر کی ہے جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہوگا۔

اور بعض انھیں ایسے مومنین سمجھتے ہیں، جنھوں نے بالکل گناہ نہ کیا ہو، اور بعض فرشتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور دوسرے احتمالات بھی ہیں۔

لیکن جو کچھ قرآن کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے اور اس پر قرآن گواہ ہے، وہی پہلا معنی ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان اور عمل صالح کے حامل ہیں اور اگر ان سے کوئی چھوٹے موٹے گناہ ہوئے بھی ہوں، تو وہ ان کی نیکیوں کے تحت الشعاع میں ہیں اور ان الحسنات یذھبن السیئات)۔ (ہود ۱۱۴) کے حکم میں ہیں۔

ان کے نیک اعمال ان کے اعمالِ بد کو چھپالیں گے، یا تو وہ بلاحساب کے جنت میں وارد ہو جائیں گے، اور اگر ان کا حساب ہوا بھی، تو وہ سہل، سادہ اور آسان ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ انشقاق کی آیہ ۸ میں آیا ہے: فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حسابًا یسیرًا ۔ لیکن وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا، اس کا حساب آسان ہوگا۔"

اہل سنت کے مشہور مفسر "قرطبی" نے امام باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

نحن و شیعتنا اصحاب الیمین، و کل من ابغضنا اھل البیت فھم المرتھنون

"ہم اور ہمارے شیعہ اصحابِ یمین ہیں اور جو شخص ہم اہلِ بیت کو دشمن رکھتا ہے، تو وہ اپنے اعمال کی قید میں ہے۔"[1]

اس حدیث کو دوسرے مفسرین، منجملہ "مجمع البیان" اور تفسیر "نور الثقلین" کے مؤلف اور بعض دوسروں نے بھی زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

اس کے بعد "اصحاب الیمین" اور ان کے مدمقابل گروہ کے حالات کے ایک گوشہ کی تشریح کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ جنت کے پُرنعمت اور باعظمت باغوں میں ہوں گے اور اس حال میں وہ سوال کریں گے" (فی جنات یتساءلون)[2]

"گنہگاروں سے" (عن المجرمین)۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۸۷۸

[2] "یتساءلون" اگرچہ باب "تفاعل" سے ہے، جو عام طور پر دو افراد یا چند افراد کے درمیان ہونے والے کام کے لیے آتا ہے۔ لیکن یہاں بعض دوسرے مقامات کے مانند ہی یہ معنی نہیں دیتا اور یہاں "یسألون" کے معنی دیتا ہے۔ ضمنی طور پر "جنات" کا نکرہ ہونا اس کی عظمت کے بیان کے لیے ہے۔ اور بہرحال "فی جنات" ایک محذوف مبتدا کی خبر ہے اور تقدیر میں "ھم فی جنات" ہے۔

وہ کہیں گے، "تمھیں دوزخ میں کس چیز نے پہنچا دیا" (ما سلککم فی سقر)۔

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بہشتیوں اور دوزخیوں کے درمیان کلی طور پر رابطہ منقطع نہیں ہوگا، جنتی اپنے عالم سے دوزخیوں کی حالت کا مشاہدہ کر سکیں گے اور ان سے گفتگو کر سکیں گے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مجرمین "اصحاب الیمین" کے اس سوال کا کیا جواب دیتے ہیں؟ وہ اس سلسلہ میں اپنے چار گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

پہلا یہ کہ" وہ کہیں گے: "ہم نماز گزاروں میں سے نہیں تھے"۔ (قالوا لم نک من المصلین)۔

اگر ہم نماز پڑھتے، تو نماز ہمیں خدا کی یاد دلاتی اور فحشاء اور منکر سے روکتی، اور ہمیں خدا کی صراطِ مستقیم کی دعوت دیتی"۔

دوسرا یہ کہ" ہم مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے" (ولم نک نطعم المسکین)۔

"اطعام مسکین" کا معنی اگرچہ غریبوں، مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے، لیکن ظاہراً اس سے مراد، ضرورت مندوں کی ہر ضرورت و حاجت میں مدد کرنا ہے، چاہے وہ خوراک ہو یا پوشاک و مسکن وغیرہ۔

اور بہت سے مفسرین نے تصریح کی ہے، اس سے مراد "زکات واجب" ہے، کیونکہ مستحبی انفاقات کو ترک کرنا جہنم میں داخل ہونے کا سبب نہیں بنتا، اور یہ آیت دوبارہ اس مطلب کی تاکید کرتی ہے کہ زکات کا حکم اجمالی طور پر مکہ میں ہی نازل ہوا تھا، اگرچہ جزئیات کی تشریح اور حدود کی خصوصیات کا تعین، خصوصاً اس کا بیت المال میں مرکز ہونا، مدینہ میں ہوا تھا۔

تیسرا یہ کہ" ہم ہمیشہ اہل باطل کے ساتھ ہم نشین اور ہم صدا ہو جاتے تھے" (وکنا نخوض مع الخائضین)۔

حق کے خلاف جس گوشہ سے بھی کوئی صدا بلند ہوتی اور جو مجلس بھی باطل کی ترویج کے لیے برپا ہوتی، اور ہم اس سے باخبر ہو جاتے تو ہم ان کا ساتھ دیتے، اور جماعت کے رنگ میں رنگے جاتے، ان کی باتوں کی تصدیق کرتے اور ان کے تکذیب اور انکار کرنے کو صحیح قرار دیتے اور حق کا استہزاء کرنے اور تمسخر اڑانے سے لذت حاصل کرتے تھے۔

"نخوض" "خوض" (بروزن حوض) کے مادہ سے، اصل میں پانی میں داخل ہونے اور اس میں حرکت کرنے کے معنی میں ہے، اس کے بعد تمام امور میں داخل ہونے اور ان میں آلودہ ہونے کے لیے بھی بولا جانے لگا، لیکن قرآن مجید میں اکثر باطل اور بے بنیاد مطالب میں وارد ہونے کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

"باطل میں خوض" ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے، جو ان لوگوں کی مجالس میں داخل ہونے کو بھی شامل ہے، جو آیات خدا کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں، یا بدعت کی ترویج کرتے ہیں، یا پست اور چھچھوری باتیں کرتے ہیں یا ان گناہوں کو جنہیں انھوں نے انجام دیا ہے، فخریہ اور مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، اسی طرح غیبت و تہمت اور لہو لعب وغیرہ کی مجالس میں شرکت کرنا، لیکن زیر بحث آیت میں زیادہ تر ان مجالس کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، جو خدا کے دین کو کمزور کرنے اور اس کے مقدسات کا استہزاء اور مذاق اڑانے اور کفر و شرک و

بے دینی کی ترویج کے لیے قائم کی جاتی ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور ہم ہمیشہ روز جزا کا انکار کیا کرتے تھے"۔ (وکنا نکذب بیوم الدین)۔

یہاں تک کہ ہماری موت کا وقت آپہنچا"۔ (حتی اتانا الیقین)۔

یہ بات واضح ہے کہ معاد و قیامت اور حساب و جزا کے دن کا انکار تمام الٰہی اور اخلاقی قدروں کو متزلزل کر دیتا ہے اور انسان کو گناہ کے ارتکاب کی جرأت دلاتا ہے اور اس راستے کی رکاوٹوں کو دور کر دیتا ہے، خصوصاً اگر یہ سلسلہ آخر عمر تک ایک مسلسل عمل کی صورت اختیار کرے۔

بہرحال ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اولاً کفار بھی، اصول دین کی طرح سے، فروع دین کے بھی مکلف ہیں اور اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ چاروں امور یعنی نماز، زکوٰۃ، اہل باطل کی مجالس کو ترک کرنا اور قیامت پر ایمان رکھنا، ایمان کی ہدایت اور تربیت میں حد سے زیادہ اثر رکھتے ہیں اور اس طرح سے جہنم، دائمی نماز گزاروں، زکوٰۃ دینے والوں، باطل کو ترک کرنے والوں اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کی جگہ نہیں ہے۔

البتہ نماز اس لحاظ سے کہ وہ خدا کی عبادت ہے لہٰذا وہ خدا پر ایمان کے بغیر اسے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر اس کا ذکر، خدا پر ایمان و اعتقاد اور اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی ایک رمز ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ چاروں امور توحید سے شروع ہوتے ہیں اور معاد و قیامت پر ختم ہوتے ہیں اور خالق و مخلوق اور انسان کے خود اپنے آپ سے ربط کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "یقین" سے مراد یہاں موت ہے، کیونکہ یہ مومن و کافر دونوں کے لیے ایک یقینی امر شمار ہوتی ہے اور انسان ہر چیز میں شک کر سکتا ہے لیکن موت میں شک نہیں کر سکتا، سورۂ حجر کی آیہ ۹۹ میں بھی آیا ہے و اعبد ربک حتی یأتیک الیقین "اپنے خدا کی عبادت کر یہاں تک کہ تجھے یقین (موت) آجائے"۔

لیکن بعض نے یہاں یقین کی، انسان کی موت کے بعد، برزخ، قیامت کے مسائل کے بارے میں آگاہی حاصل ہونے کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے جو پہلی تفسیر کے ساتھ ایک جہت سے ہم آہنگ ہے۔

آخری زیر بحث آیت میں اس گروہ کے بُرے انجام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "لہٰذا شفاعت کرنے والوں میں سے کسی شفاعت کرنے والوں کی شفاعت ان کی حالت کو کوئی فائدہ نہیں دے گی" (فما تنفعھم شفاعۃ الشافعین)۔

نہ تو خدا کے انبیاء، رسولوں اور آئمہ معصومین کی شفاعت اور نہ ہی فرشتوں، صدیقین، شہداء اور صالحین کی شفاعت، کیونکہ شفاعت کے لیے مناسب حالات کی ضرورت ہے اور انھوں نے تمام اسباب کو کلی طور پر ختم کر دیا ہے۔ شفاعت اس شفاف پانی کے مانند ہے، جسے کسی کمزور پودے کی جڑ پر ڈالا جائے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اگر پودا کلی طور پر مرچکا ہو تو یہ صاف ستھرا پانی اسے زندہ نہیں کر سکتا، دوسرے لفظوں میں جیسا کہ ہم شفاعت کی بحث میں بیان کر چکے ہیں، "شفاعت" شفع کے مادہ سے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ضمیمہ کرنے کے معنی میں ہے اور

اس کا مفہوم یہ ہے کہ جس کی شفاعت کی جارہی ہے اس نے راستہ کا کچھ حصہ اپنے پاؤں سے طے کیا ہے اور سخت قسم کے نشیب و فراز میں پیچھے رہ گیا ہے، شفاعت کرنے والا اس کا ضمیمہ بن کر اس کی مدد کرتا ہے تاکہ وہ باقی راستہ طے کرے [1]

ضمنی طور پر یہ آیت، دوبارہ مسئلہ شفاعت اور بارگاہ خداوندی میں شفاعت کرنے والوں کے تنوع اور تعدد کی تاکید کرتی ہے اور ان لوگوں کے لیے جو اصل شفاعت کے منکر ہیں، ایک دندان شکن جواب ہے۔ اسی طرح یہ اس بات کے لیے ایک تاکید بھی ہے کہ شفاعت بے قید و شرط کے نہیں ہوگی اور گناہ کے لیے ہری جھنڈی کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کی تربیت کا ایک ایسا عامل ہے جو اسے کم از کم اس مرحلہ تک پہنچا دے، کہ اس میں شفاعت کرانے کی قابلیت پیدا ہو جائے، اور خدا اور اس کے اولیاء سے اس کا رابطہ کلی طور پر منقطع نہ ہو جائے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اوپر والی آیت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ شفاعت کرنے والے اس قسم کے لوگوں کی شفاعت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ چونکہ شفاعت ان کی حالت کے لیے سود مند نہیں ہوگی، لہٰذا وہ ان کی شفاعت نہیں کریں گے، کیونکہ اولیاء خدا العٰو، بیہودہ کاموں کے مرتکب نہیں ہوتے۔

ایک نکتہ

روزِ جزا کے شفاعت کرنے والے

زیر بحث آیات اور اسی طرح قرآن مجید کی بعض اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں شفاعت کرنے والے متعدد ہوں گے (اور ان کے شفاعت کا دائرہ مختلف ہو گا) ان تمام روایات سے جو شیعہ اور اہل سنت کے منابع سے نقل ہوئی ہیں ——— اور یہ روایات بہت زیادہ ہیں ——— معلوم ہوتا ہے کہ یہ شفاعت کرنے والے قیامت کے دن ان گنہ گاروں کے لیے، جن میں شفاعت کی استعداد موجود ہے، شفاعت کریں گے۔

۱۔ سب سے پہلی شفاعت کرنے والی ہستی پیغمبر اسلامؐ کی ذات مقدس ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:۔

انا اول شافع فی الجنة [2]

"جنت کے بارے میں سب سے پہلا شفاعت کرنے والا میں ہوں گا۔"

۲۔ تمام انبیاء قیامت کے دن شفاعت کریں گے، جیسا کہ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

یشفع الانبیاء فی کل من یشهد ان لا الٰه الا الله مخلصا فیخرجونهم منها

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول، سورۂ بقرہ کی آیہ ۴۸ کے ذیل میں

[2] صحیح مسلم جلد ۱ ص ۱۳۰

"انبیاء ان تمام افراد کے بارے میں شفاعت کریں گے جو خلوصِ نیت کے ساتھ خدا کی وحدانیت کی گواہی دیں گے اور وہ انھیں دوزخ سے باہر نکال لیں گے۔"[1]

۲۔ فرشتے بھی روزِ محشر شفاعت کریں گے، جیسا کہ رسولِ خدا سے نقل ہوا ہے:

يؤذن للملائكة والنبيين والشهداء ان يشفعوا

"اس دن فرشتوں، انبیاء اور شہداء کو اجازت دی جائے گی کہ وہ شفاعت کریں۔"[2]

۴، ۵۔ آئمہ معصومینؑ اور ان کے شیعہ بھی شفاعت کریں گے، جیسا کہ علیؑ فرماتے ہیں:

لنا شفاعة ولاهل مودتنا شفاعة

"ہمارے لیے حقِ شفاعت ہے اور ہمارے شیعہ اور دوستوں کے لیے بھی مقامِ شفاعت ہے۔"[3]

۶، ۷۔ علماء اور دانشور اور اسی طرح شہداءِ راہِ خدا شفاعت کرنے والوں میں سے ہوں گے، جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

يشفع يوم القيامة الانبياء ثم العلماء ثم الشهداء

روزِ قیامت پہلے انبیاء شفاعت کریں گے، پھر علماء اور اس کے بعد شہداء۔"[4]

یہاں تک کہ ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے:

يشفع الشهيد فی سبعين انسانا من اهل بيته

"شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر افراد تک قابلِ قبول ہوگی۔"[5]

ایک اور دوسری حدیث میں جسے مرحوم "علامہ مجلسیؒ" نے "بحار الانوار" میں نقل کیا ہے:

"ان کی شفاعت ستر ہزار افراد کے لیے قابلِ قبول ہوگی۔"[6]

اور اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ستر اور ستر ہزار کا عدد دونوں اعدادِ تکثیر میں سے ہیں، لہٰذا ان دونوں روایات میں کوئی منافات نہیں ہے۔

۸۔ قرآن بھی قیامت کے دن شفاعت کرے گا، جیسا کہ علیؑ فرماتے ہیں:

---

[1] "مسند احمد" جلد ۳ ص ۱۲

[2] "مسند احمد" جلد ۵ ص ۴۳

[3] "خصال الصدوق" ص ۶۲۴

[4] "سنن ابی ماجہ" جلد ۲ ص ۱۴۴۳

[5] "سنن ابی داؤد" جلد ۲ ص ۱۵

[6] "بحار الانوار" جلد ۱۰۰ ص ۱۴

واعلموا انہ (القرآن) شافع ومشفع

"جان لو کہ قرآن شفاعت کرنے والا ہے اور مقبول الشفاعت ہے"[1]

وہ لوگ جنھوں نے ایک عمر اسلام میں صرف کی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

اذا بلغ الرجل التسعین غفر اللہ ماتقدم من ذنبہ وما تأخر وشفع فی اھلہ

"جب انسان نوے سال کا ہو جاتا ہے (اور ایمان کے راستے پر چل رہا ہوتا ہے) تو خدا اس کے گزشتہ اور آئندہ کے گناہوں کو بخش دیتا ہے اور اس کے گھر والوں کے لیے اس کی شفاعت قبول کی جاتی ہے"[2]

۱۰۔ عبادات بھی شفاعت کریں گی، جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ خدا سے آیا ہے:

الصیام والقرآن یشفعان للعبد یوم القیامۃ

"روزہ اور قرآن قیامت کے دن بندوں کی شفاعت کریں گے"[3]

۱۱۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک اعمال بھی مثلاً وہ امانت جس کی حفاظت کرنے میں انسان نے کوشش کی ہو، قیامت میں انسان کی شفاعت کریں گے[4]

۱۲۔ سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خود خداوندِ عالم بھی گنہ گاروں کی شفاعت کرے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں رسولِ اکرمؐ سے آیا ہے:

یشفع النبیون والملائکۃ والمؤمنون فیقول الجبار بقیت شفاعتی

"قیامت میں انبیاء، فرشتے اور مومنین شفاعت کریں گے اور خدا کہے گا، خود میری شفاعت باقی رہ گئی ہے"[5]

اس بارے میں روایات بہت زیادہ ہیں اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ ان کا ایک گوشہ ہے[6]

ہم دوبارہ اس بات کو دہراتے ہیں کہ شفاعت کے کچھ شرائط و قیود ہیں، جن کے بغیر شفاعت ممکن نہیں ہے، جیسا کہ زیرِ بحث آیات میں بھی صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ مجرموں کے ایک گروہ کے بارے میں تمام شفاعت کرنے والوں کی شفاعت بے اثر ہو گی اور اہم بات یہ ہے کہ قابل میں قابلیت بھی ہو، کیونکہ فاعل کی فاعلیت اکیلی کافی نہیں ہے (ہم اس سلسلے میں مزید تشریح جلد اول میں شفاعت کی بحث میں پیش کر چکے ہیں)۔

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۱۷۶

[2] "مسند احمد" جلد ۲ ص ۸۹

[3] "مسند احمد" جلد ۲ ص ۱۷۴

[4] "مناقب ابن شہر آشوب" جلد ۲ ص ۱۴

[5] "صحیح بخاری" جلد ۹ ص ۱۴۹

[6] مزید وضاحت کے لیے کتاب "مفاہیم القرآن" جلد ۴ ص ۲۰۰ تا ۲۱۱ کی طرف رجوع کریں۔

۴۹۔ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِينَ ۝

۵۰۔ كَأَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ۝

۵۱۔ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ ۝

۵۲۔ بَلْ يُرِيدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُؤْتَىٰ صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ۝

۵۳۔ كَلَّا ۖ بَلْ لَّا يَخَافُونَ الْآخِرَةَ ۝

۵۴۔ كَلَّا إِنَّهُ تَذْكِرَةٌ ۝

۵۵۔ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ ۝

۵۶۔ وَمَا يَذْكُرُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ۚ هُوَ أَهْلُ التَّقْوَىٰ وَأَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۝

ترجمہ

۴۹۔ وہ اس تذکرہ سے گریزاں کیوں ہیں ؟

۵۰۔ گویا وہ وحشت زدہ گدھے ہیں۔

۵۱۔ جو شیر سے بھاگ رہے ہیں۔

۵۲۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک اس بات کا منتظر ہے (کہ خدا کی طرف سے) ایک علیحدہ خط اسے بھیجا جائے۔

۵۳۔ جیسا وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔

۵۴۔ جیسا وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے، وہ (قرآن) تو ایک تذکرا اور یاد آوری ہے۔

۵۵۔ جو شخص چاہتا ہے اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے۔

۵۶۔ اور کوئی شخص نصیحت نہیں لیتا مگر یہ کہ خدا چاہے وہ اہل تقویٰ اور اہل مغفرت ہے۔

تفسیر

حق سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیر سے گدھے

اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے جو گزشتہ آیات میں مجرموں اور دوزخیوں کے بارے میں آئی تھی، زیر بحث آیات میں اس معاند اور ہٹ دھرم گروہ کی حق بات سننے، اور ہر قسم کی پند و نصیحت سے وحشت کرنے کو، واضح ترین صورت میں بیان کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے: "وہ اس تذکرہ اور یاد آوری سے روگرداں کیوں ہیں؟" (فما لھم عن التذکرة معرضین)[1]۔

وہ قرآن جیسی شفا بخش دوا سے فرار کیوں کرتے ہیں؟ وہ ہمدرد طبیب کی بات کو رد کیوں کرتے ہیں؟ واقعاً تعجب کا کام ہے۔

"گویا وہ وحشت زدہ ہو کر بھاگنے والے گدھے ہیں"۔ (کانھم حمر مستنفرة)۔

"جنھوں نے شیر (یا شکاری) سے فرار کیا ہے" (فرت من قسورة)۔

"حمر"، "حمار" کی جمع ہے، گدھے کے معنی ہیں، البتہ یہاں شیر یا شکاری کے چنگل سے فرار کے قرینے سے، وحشی گدھا یا "گورخر" مراد ہے[2] دوسرے لفظوں میں یہ لفظ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو وحشی اور اہلی دونوں قسم کے گدھے کو شامل ہے۔

"قسورة"، "قسر" کے مادہ سے ——— (جو قہر و غلبہ کے معنی میں ہے) ——— لیا گیا ہے، اور وہ شیر کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور بعض نے اس کی تیر انداز یا شکاری کے معنی میں تفسیر کی ہے، لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

مشہور ہے کہ "وحشی گدھا" "شیر" سے عجیب و غریب وحشت رکھتا ہے، یہاں تک کہ وہ شیر کی آواز کو سنتا ہے تو اس طرح کی وحشت اس پر طاری ہو جاتی ہے کہ وہ دیوانہ وار ہر طرف کو بھاگتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب شیر ان کے گلے میں پہنچ جائے تو وہ اس طرح سے پراگندہ ہو کر ہر طرف کو دوڑتے ہیں کہ یہ نظارہ عجیب افراتفری کا عالم پیش کرتا ہے۔ (آج کل فلموں میں شیر کو جانوروں کا شکار کرتے ہوئے عام دکھایا جاتا ہے)

بہرحال یہ آیت، مشرکین کے قرآن کی روح پرور آیات سے وحشت کرنے اور ان سے فرار کرنے کی ایک بہت ہی رسا، گویا اور ناطق تعبیر ہے، ان کو گورخر کے ساتھ تشبیہ دی ہے جس میں عقل و شعور بھی نہیں ہے اور وحشی ہونے کی بناء پر ہر چیز سے گریزاں بھی ہے حالانکہ ان کے سامنے "تذکرہ" (یاد آوری، بیداری اور ہوشیاری کے ایک وسیلہ کے) سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔

---

[1] اس جملہ میں "ما" "مبتدا" ہے اور "لھم" "خبر" اور "معرضین" "لھم" کی ضمیر کے لیے حال ہے اور "عن التذکرة" "جار و مجرور" "معرضین" سے متعلق ہے۔ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "عن التذکرة" کا "معرضین" سے مقدم ہونا حصر پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی وہ صرف مفید قسم کی یاد آوریوں سے منہ پھیرتے ہیں، بہرحال یہاں "تذکرہ" سے مراد، ہر قسم کی مفید و سود مند یاد آوری ہے، جس کا اصل و رکن قرآن مجید ہے۔

[2] "گورخر" "گور" بمعنی "صحرا" اور "خر" بمعنی (گدھا) سے مرکب ہے، اسی لیے اس کو خر وحشی اور خر صحرائی بھی کہتے ہیں۔

لیکن اس نادانی اور بے خبری کے باوجود وہ ایسے مغرور اور متکبر ہیں کہ ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ خدا کی طرف سے اسے ایک علیحدہ خط دیا جائے" (بل یرید کل امرئ منهم ان یؤتی صحفا منشرة)[1]

یہ اس چیز کے مشابہ ہے، جو سورۂ اسراء کی آیہ ۹۲ میں آئی ہے: (ولن نؤمن لرقیك حتی تنزل علینا کتابا نقرؤه) "اگر تو آسمان پر بھی چڑھ جائے تو بھی ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ (خدا کی طرف سے) ہم پر تو کوئی خط نازل کرے"، یا سورۂ انعام کی آیہ ۱۲۴ کی طرح ہے جو یہ کہتی ہے: (قالوا لن نؤمن حتی نؤتی مثل ما اوتی رسل الله) وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان نہیں لائیں گے: جب تک کہ وہی چیز جو اللہ کے رسولوں پر نازل ہوتی ہے، ہمیں نہ دی جائے"۔

اور اس طرح سے ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا تھا کہ وہ اولوالعزم پیغمبر ہو اور خدا کی طرف سے اس کے نام کا خصوصی خط آسمان سے نازل ہو، اور اگر اس قسم کی چیزیں ان پر نازل ہو بھی جاتیں تب بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ ایمان لے آئیں گے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ ابوجہل اور قریش کی ایک جماعت نے کہا: اے محمد! ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے، جب تک تو آسمان سے ایسا ایک خط نہ لے آئے جس کا عنوان یہ ہو: "خداوند رب العالمین کی طرف سے فلاں ابن فلاں کے نام"، اور اس میں رسمی طور پر یہ حکم دیا جائے کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں[2]۔

اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "جس طرح سے وہ کہتے ہیں ایسا نہیں ہے" (کلا)۔

ان پر آسمانی کتاب کا نازل ہونا اور اسی قسم کے دوسرے مطالب یہ سب بہانے ہیں۔

"حقیقت میں وہ آخرت سے نہیں ڈرتے" (بل لا یخافون الآخرة)۔

اگر وہ آخرت سے ڈرتے ہوتے، تو یہ سب بہانے نہ کرتے، رسول خدا کی تکذیب نہ کرتے، آیات الٰہی کا مذاق نہ اڑاتے اور عذاب پر مامور فرشتوں کی تعداد کو استہزاء کا ذریعہ نہ بناتے۔

اور یہاں سے تقویٰ، گناہ سے پرہیز اور انواع و اقسام کے گناہان کبیرہ سے پاک ہونے میں، معاد پر ایمان کا اثر واضح ہو جاتا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ عالم محشر پر ایمان اور قیامت میں جزا و سزا ملنے کا عقیدہ، انسان کو ایک نئی شخصیت عطا کرتا ہے اور بے قید و بند، متکبر، خود خواہ اور ظالم افراد کو، عہد کی پابندی کرنے والے، متقی، متواضع اور عدالت پیشہ انسان میں تبدیل کر سکتا ہے۔

---

[1] "صحف"، "صحیفہ" کی جمع ہے، جو اس ورق کے معنی میں ہے، جسے اس طرف اور اس طرف کرتے ہیں۔ (چونکہ "صحف" اور "صحیفہ" کا اصل مادہ چہرہ کی مانند پھیلی ہوئی چیز کے معنی میں ہے، اس لیے خط اور کتاب پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔

[2] تفسیر "قرطبی"، "تفسیر مراغی" اور دوسری تفاسیر

اس کے بعد ایک مرتبہ اور تاکید کرتا ہے کہ جس طرح وہ قرآن کے بارے میں سوچتے ہیں ایسا نہیں ہے" (کلا)۔
یقیناً قرآن تو تذکر اور یاد آوری ہے" (انہ تذکرۃ)۔

" اور جو شخص چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے" (فمن شاء ذکرہ)۔
قرآن نے راستے کی نشاندہی کر دی ہے ، اور دیکھنے والی آنکھوں کو بھی اختیار دے دیا ہے اور نورِ آفتاب بھی ہے تاکہ انسان اپنے آگے دیکھ کر چلے۔

اس کے باوجود اس سے پند و نصیحت حاصل کرنا، خدا کی مشیت اور توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے، اور وہ نصیحت نہیں لیتے مگر یہ کہ خدا چاہے"
(وما یذکرون الا ان یشاء اللہ)۔
اس جملہ کی کئی تفسیریں ہیں، ایک تو وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، یعنی انسان پروردگار کی عنایت کے دامن سے متوسل ہوئے بغیر ہدایت کی راہ کو طے نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اس کی توفیق و امداد کے بغیر ہدایت پا سکتا ہے۔ ؎

تا کہ از جانبِ معشوق نباشد کششی
کوشش عاشق بے چارہ بہ جائے نرسد

"جب تک محبوب کی طرف سے کشش نہ ہو
بے چارے عاشق کی کوشش کچھ کام نہیں دیتی"

البتہ یہ خدائی امداد استعداد رکھنے والوں پر نازل ہوتی ہے۔
دوسری یہ کہ : " فمن شاء ذکرہ " کا جملہ جو گزشتہ آیت میں آیا ہے، ممکن ہے یہ توہم پیدا کرے کہ ہر چیز خود انسان کے ارادہ کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کا ارادہ ہر لحاظ سے استقلال رکھتا ہے، تو یہ آیت اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے کہتی ہے کہ انسان مختار و آزاد ہونے کے باوجود مشیتِ الٰہی کے ساتھ وابستہ ہے، وہ مشیت جو سارے عالمِ ہستی اور جہانِ آفرینش پر حکم فرما ہے، دوسرے لفظوں میں انسان کا یہی اختیار و آزادی بھی، اس کی مشیت کے ساتھ ہے اور وہ جس لمحہ چاہے، اس کو اس سے لے لے۔
تیسری یہ کہ کہتا ہے، وہ کسی قیمت پر ایمان نہیں لائیں گے، مگر یہ کہ خدا چاہے اور انہیں مجبور کر دے، اور ہم جانتے ہیں کہ خدا کسی کو ایمان یا کفر پر مجبور نہیں کرتا۔
البتہ پہلی اور دوسری تفسیر بہتر اور زیادہ مناسب ہے۔
اور آیت کے آخر میں کہتا ہے : " وہ اہلِ تقویٰ اور اہلِ مغفرت ہیں۔" (ھو اھل التقوٰی واھل المغفرۃ)۔
مناسب یہی ہے کہ اس کے عتاب سے ڈریں اور کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہ دیں، اور یہی شائستہ بات ہے کہ اس کی مغفرت کے امیدوار رہیں۔
حقیقت میں یہ جملہ " خوف " و " رجاء " کے مقام اور " عذاب " و " مغفرت " الٰہی کی طرف اشارہ ہے، اور یہ حقیقت میں پہلی

آیت کے لیے ایک علت کو بیان کرتی ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: خدا فرماتا ہے:

انا اهل ان اتقی، ولا یشرك بی عبدی شیئا وانا اهل ان لم یشرك بی شیئا ان ادخله الجنة

"میں اس لائق ہوں کہ مجھ سے ڈرا جائے اور میرا بندہ کسی چیز کو میرا شریک قرار نہ دے اور میں اس کا اہل ہوں کہ اگر میرا بندہ کسی چیز کو میرا شریک قرار نہ دے تو میں اسے جنت میں داخل کروں"۔[1]

اگرچہ تمام مفسرین نے ــــــ جہاں تک ہم نے دیکھا ہے ــــــ "تقویٰ" کی یہاں مفعول کے معنی میں تفسیر کی ہے، اور یہ کہا ہے کہ خدا اس کا اہل ہے کہ اس سے (اس کے شرک اور نافرمانی سے) پرہیز کریں، لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ فاعل کے معنی میں اس کی تفسیر ہو۔ یعنی خدا اہل تقویٰ ہے اور وہ ہر قسم کے ظلم، قبیح فعل اور ہر قسم کے خلاف حکمت کام سے پرہیز کرتا ہے، اور حقیقت میں تقویٰ کا بالاترین مقام خدا ہی کے لیے ہے، اور بندوں میں جو کچھ ہے وہ اس غیر متناہی تقویٰ کی ایک ضعیف سی چنگاری ہے، اگرچہ خدا کے بارے میں اسم فاعل کے معنی میں "تقویٰ" کی تعبیر بہت کم ہوتی ہے۔

بہرحال یہ سورہ "انذار" اور "وظائف اور ذمہ داریوں" کے حکم سے شروع ہوا اور "تقویٰ" کی دعوت اور "مغفرت کے وعدے" پر ختم ہوا، یہ وہ مقام ہے جہاں ہم انتہائی خضوع اور تضرع کے ساتھ اس کی مقدس بارگاہ میں عرض کرتے ہیں:

پروردگارا! ہمیں تقویٰ اور اپنی مغفرت کے مستحق افراد میں قرار دے۔

خداوندا! جب تک تیری توفیق اور تیرا لطف ہماری دستگیری نہیں کرے گا ہم کچھ نہیں کر سکتے، ہمیں اس حمایت کا مشمول فرما۔

بارالٰہا! جال سخت ہے اور راستہ پر پیچ و خم ہے اور شیطان گمراہ کرنے پر آمادہ ہے، اس راستہ کو تیری مدد کے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا، ہماری مدد فرما۔

آمین یارب العالمین

سورۂ مدثر کا اختتام ۱۹ ماہ صفر ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ

بوقت پانچ بجے سہ پہر بروز منگل ۱۸ صفر ۱۴۰۸ ہجری
مطابق ۵ ستمبر ۱۹۸۷ء - ۱۰۱ ای ماڈل ٹاؤن لاہور
صفدر حسین نجفی

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۰۴

سورۂ قیامت

یہ سورۂ مکہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۴۰ آیات ہیں

تاریخ شروع

۱۹ صفر ۱۴۰۷ھ

سورۂ قیامت کے مضامین

جیسا کہ اس سورہ کے نام سے واضح ہے یہ قیامت کے دن اور معاد سے مربوط مسائل کے محور کے گرد گردش کرتی ہے، سوائے چند آیات کے، جو قرآن مجید اور اس کی تکذیب کرنے والوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور وہ مباحث جو اس سورہ میں قیامت کے بارے میں آئے ہیں وہ مجموعی طور پر چار قسم پر ہیں:

۱۔ اشراط الساعۃ (وہ عجیب و غریب اور بہت ہی ہولناک حوادث، جو اس جہان کے اختتام اور قیامت کے آغاز کے وقت رونما ہوں گے) سے مربوط مسائل۔

۲۔ اس دن نیکوکاروں اور بدکاروں کی حالت سے مربوط مسائل۔

۳۔ موت کے پُر اضطراب لمحوں اور اس جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال سے مربوط مسائل

۴۔ انسان کی خلقت کے مقصد سے مربوط مسائل اور اس کا مسئلہ معاد سے ربط

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

من قرأ سورة القيامة شهدت انا وجبريل له يوم القيامة انه كان مؤمنًا بيوم القيامة، وجاء وجهه مسفر على وجوه الخلائق يوم القيامة

"جو شخص سورۂ قیامت کو پڑھے گا، تو میں اور جبرئیل اس کے لیے قیامت کے دن گواہی دیں گے، کہ وہ قیامت کے دن پر ایمان رکھتا تھا، اور اس دن اس کا چہرہ تمام لوگوں سے زیادہ درخشندہ ہوگا"[1]

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۹۲

من ادمن قرائة "لا اقسم" وکان یعمل بها، بعثها الله یوم القیامة معه فی قبره، فی احسن صورة تبشره وتضحك فی وجهه، حتی یجوز الصراط والمیزان

"جو شخص سورہ "لا اقسم" (قیامت) کو پابندی کے ساتھ پڑھے گا اور اس پر عمل کرے گا، تو خدا اس سورہ کو قیامت کے دن اس کے ہمراہ اس کی قبر سے بہترین چہرے کے ساتھ اٹھائے گا، اور یہ (سورہ) اس کو بشارت دیتی رہے گی اور اس کے سامنے ہنستی رہے گی، یہاں تک کہ وہ پل صراط اور میزان سے گزر جائے گا"[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی اور سورتوں کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں دوسرے مقامات پر جو کچھ ہم نے قرآن سے معلوم کیا تھا وہ یہاں متن روایت میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے، کیونکہ آپ نے فرمایا ہے: "جو شخص اس کو پابندی کے ساتھ پڑھے گا" اور "اس پر عمل کرے گا" اس بناء پر یہ سب کچھ اس کے مضمون کا پابند ہونے اور اس پر عمل کرنے کا ایک مقدمہ ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۲۹۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۱۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ○

۲۔ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ○

۳۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ○

۴۔ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ○

۵۔ بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ○

۶۔ يَسْئَلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ قیامت کے دن کی قسم

۲۔ اور نفسِ لوامہ، بیدار اور ملامت کرنے والے وجدان کی قسم (کہ قیامت حق ہے)۔

۳۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کریں گے۔

۴۔ ہاں! ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ہم اس کی انگلیوں (کے سرے کی لکیروں) کو بھی ٹھیک اسی طرح بنا دیں۔

۵۔ (انسان قیامت کے بارے میں شک نہیں رکھتا) بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ (آزاد رہے اور) زندگی بھر گناہ کرتا رہے۔

۶۔ (اسی لیے) پوچھتا ہے کہ قیامت کب ہوگی۔

تفسیر

قیامت کے دن کی اور ملامت کرنیوالے وجدان کی قسم

یہ سورہ دو پر معنی قسموں کے ساتھ شروع ہو رہا ہے، فرماتا ہے: " قیامت کے دن کی قسم " (لا اُقسم بیوم القیامة)۔

" اور قسم ہے انسان کے بیدار وجدان اور ملامت کرنے والے نفس کی "۔ (ولا اقسم بالنفس اللوّامة)۔

اس بارے میں کہ " لا " ان دونوں آیات میں " زائدہ " اور تاکید کے لیے ہے (اس بنا پر قسم کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اس کی اور زیادہ تاکید کرتا ہے)۔ یا " لا " نافیہ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ کہے کہ یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ میں اس کی قسم نہیں کھاتا، (جیسا کہ لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں، میں تیری جان کی قسم نہیں کھاتا کہ وہ قسم سے برتر ہے) مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

اکثر مفسرین نے پہلے احتمال کو انتخاب کیا ہے، جبکہ بعض دوسری تفسیر کے طرفدار ہیں اور ان کا نظریہ یہ ہے کہ " لا " زائدہ ابتدائے کلام میں نہیں آتا، بلکہ اسے وسطِ کلام میں ہونا چاہیے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے، کیونکہ قرآن نے قیامت سے زیادہ اہم امور مثلاً خدا کی پاک ذات کی قسم کھائی ہے۔ اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہاں قیامت کے دن کی قسم نہ کھائی جائے اور " لا " زائدہ کے آغازِ کلام میں ہونے کی کئی مثالیں موجود ہیں، جیسا کہ امرؤ القیس کے اشعار میں آیا ہے کہ اس نے اپنے قصائد کے آغاز میں لاء زائدہ کا استعمال کیا ہے۔[1]

لیکن ہمارے نظریہ کے مطابق " لا " کے زائدہ ہونے یا نافیہ ہونے کے بارے میں بحث کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ دونوں کا آخری نتیجہ ایک ہی ہے، اور وہ اس موضوع کی اہمیت ہے، جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ ان دونوں قسموں (قیامت کے دن کی قسم اور بیدار وجدان کی قسم) کے درمیان کیا ربط ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاد کے وجود کی ایک دلیل، انسان کی روح کے اندر " محکمہ وجدان " کا وجود ہے، جو نیک کام کو انجام دینے کے وقت، انسان کی روح کو خوشی اور نشاط سے پر کر دیتا ہے، اور اس طریقہ سے اسے جزا دیتا ہے اور برے کام کے انجام دینے یا کسی جرم کا ارتکاب کرنے کے موقع پر، اس کی روح پر سخت دباؤ ڈال کر اسے سزا دیتا ہے اور شکنجہ میں جکڑتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات وجدان کے عذاب سے نجات پانے کے لیے انسان خودکشی تک کا اقدام کر لیتا ہے۔

---

[1] لا وابیک ابنة العامر
لا یدعی القوم انی افر

" اے دختر عامر تیرے باپ کی قسم ہے، قوم ہرگز یہ دعویٰ نہیں کر سکتی کہ میں بھاگ جاؤں گا "۔

یعنی حقیقت میں وجدان نے اس کے قتل کرنے کا حکم صادر کیا ہے اور وہ اسے اپنے ہاتھ سے اجراء کرتا ہے۔

"نفس لوامہ" کا رد عمل اور اثر انسانوں کے وجود میں بہت ہی وسیع و عریض ہے اور ہر لحاظ سے قابلِ غور و مطالعہ ہے، اور ہم نکات کی بحث میں اس کی طرف مزید اشارہ کریں گے۔

جب "عالم صغیر" یعنی انسان کا وجود اپنے اندر ایک چھوٹا سا محکمہ اور عدالت رکھتا ہے تو "عالم کبیر" اپنی اس عظمت کے باوجود ایک عظیم محکمہ عدل کیوں نہ رکھتا ہوگا۔

اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے ہم "وجدان اخلاقی" کے وجود سے "قیامت اور معاد" کے وجود کی ٹوہ لگاتے ہیں اور یہیں سے ان دونوں قسموں کا ایک عمدہ رابطہ واضح ہو جاتا ہے اور دوسرے لفظوں میں دوسری قسم پہلی قسم کی ایک دلیل ہے۔

اس بارے میں کہ "نفس لوامہ"[1] سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس کی بہت سی تفسیریں بیان کی ہیں، ان میں سے ایک مشہور تفسیر تو وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ یعنی "اخلاقی وجدان" جو انسان کو غلط اعمال کے وقت اسی دنیا میں ملامت کرتا ہے اور تلافی و تجدید نظر پر اُسے ابھارتا ہے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد تمام انسانوں کا قیامت میں اپنی خود ملامت کرنا ہے، مومنین اس لیے اپنے آپ کو ملامت کریں گے کہ ہم نے نیک اعمال تھوڑے کیوں کیے؟ اور کفار اس وجہ سے کہ انھوں نے کفر و شرک اور گناہ کی راہ کیوں اختیار کی؟

ایک اور تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد صرف کافروں کا نفس ہے، جو قیامت میں ان کی، ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے بہت زیادہ ملامت اور سرزنش کرے گا۔

لیکن قبل و بعد کی آیت کے ساتھ مناسب وہی پہلی تفسیر ہی ہے۔

ہاں! یہ عدالتِ وجدان اتنی عظمت و احترام کی حامل ہے کہ خدا اس کی قسم کھا رہا ہے اور اس کو عظیم شمار کرتا ہے اور وہ حقیقتاً عظیم و بزرگ ہے کیونکہ وہ انسان کی نجات کا ایک اہم عامل شمار ہوتی ہے، بشرطیکہ وجدان بیدار ہو اور کثرتِ گناہ کی وجہ سے ضعیف و ناتوان نہ ہو جائے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ان دو پراہمیت اور پر معنی قسموں کے بعد یہ بیان نہیں ہوا کہ یہ کس چیز کے لیے قسم کھائی گئی ہے اور اصطلاح کے مطابق "مقسم لہ" محذوف ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد والی آیات کے سیاق سے مطلب بالکل واضح ہے۔ اس بناء پر اوپر والی آیات اس طرح کا معنی دیتی ہیں "قیامت کے دن اور نفس لوامہ کی قسم ہے کہ تم سب قیامت میں اٹھائے جاؤ گے اور اپنے اعمال کا بدلہ پاؤ گے"[2]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قیامت کے دن کی قسم کھائی گئی ہے جو قیامت، اور قبروں سے اٹھنے کا دن ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ قبروں سے اٹھنے کا مسئلہ اتنا مسلّم شمار کیا گیا ہے کہ منکرین کے مقابلہ میں اس کی قسم تک کھائی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد ایک استفہام انکاری کے عنوان سے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو

---

[1] "لوّامہ" مبالغہ کا صیغہ ہے، اور بہت زیادہ ملامت کرنے والے کے معنی میں ہے۔

[2] تقدیر "لتبعثن یوم القیامۃ" یا "انکم تبعثون" ہے۔

جمع نہیں کریں گے" (ایحسب الانسان الّن نجمع عظامہ)۔

ہاں! ہم اس بات پر قادر ہیں، کہ اس کی انگلیوں (کے سروں کی لکیروں) تک کو بھی ٹھیک اسی طرح بنا دیں" (بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوّی بنانہ)۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ مشرکین میں سے ایک شخص جو پیغمبر کی ہمسائیگی میں رہتا تھا اور اس کا نام "عدی بن ربیعہ" تھا، آنحضرت کی خدمت میں آیا اور اس نے روزِ قیامت کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کس طرح ہے؟ اور کب آئے گی؟ اس کے بعد اس نے مزید کہا: اگر میں اس دن کو اپنی آنکھ سے دیکھ لوں تو پھر بھی تیری تصدیق نہیں کروں گا اور تجھ پر ایمان نہیں لاؤں گا، کیا یہ ممکن ہے کہ خدا ان ہڈیوں کو جمع کرے؟ یہ بات قابلِ یقین نہیں ہے۔

اس موقع پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور اس کو جواب دیا، لہٰذا پیغمبر نے اس ہٹ دھرم اور عناد رکھنے والے شخص کے بارے میں فرمایا:

اللّٰھم اکفنی شر جاری السوء

خداوندا! اس برے ہمسایہ کے شر کو مجھ سے دور کر۔[1]

اس معنی و مفہوم کی نظیر قرآن کی دوسری آیات میں بھی نظر آتی ہے، منجملہ ان کے سورۂ یٰس کی آیہ ۷۸ میں آیا ہے کہ معاد کے منکرین میں سے ایک شخص ایک بوسیدہ ہڈی کا ٹکڑا ہاتھ میں لیے ہوئے تھا اور پیغمبر سے یہ کہہ رہا تھا: من یحی العظام وھی رمیم "ان ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا، درآں حالیکہ یہ بوسیدہ ہو چکی ہیں"؟

ضمنی طور پر "یحسب" کی تعبیر ("حسبان" کے مادہ سے گمان کے معنی میں) اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ منکرین اپنی کسی بھی بات پر ہرگز ایمان نہیں رکھتے تھے بلکہ صرف بے ہودہ اور بے بنیاد خیال اور گمانوں پر تکیہ کرتے تھے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ ہڈیوں پر ہی کیوں تکیہ کیا ہے۔

اوّلاً تو ہڈیاں باقی اعضاء کی نسبت زیادہ دیر تک قائم رہتی ہیں، لہٰذا جب یہ بھی بوسیدہ اور خاک ہو جائیں اور ان کے غبار کے ذرات پراگندہ ہو جائیں تو ان کی بازگشت کی امید بھی افراد کی نظر میں کم ہو جاتی ہے۔

ثانیاً ہڈی انسانی بدن کا اہم ترین رکن ہے کیونکہ بدن کا ہر ستون ہڈیوں سے مل کر بنتا ہے اور تمام حرکات اور گھومنا پھرنا اور بدن کی اہم کارکردگیاں ہڈیوں کے ذریعہ ہی انجام پاتی ہیں اور انسان کے بدن میں ہڈیوں کی کثرت اور مختلف اشکال و انداز سے خدا کی خلقت کے عجائبات میں شمار ہوتے ہیں اور انسان کی پشت کے ایک ہی مہرے کی قدر و قیمت کا اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ بیکار ہو جائے اس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کا سارا بدن مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔

"بنان" لغت میں "انگلیوں" کے معنی میں بھی آتا ہے اور "انگلیوں کے سروں" (پوروں) کے معنی میں بھی، اور دونوں صورتوں میں

---

[1] اس روایت کو "مراغی" نے اور اسی طرح "روح المعانی" اور "تفسیر صافی" نے مختصر سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ایک ہی نکتہ کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نہ صرف ہڈیوں کو جمع کرے گا اور انھیں پہلی حالت کی طرف پلٹائے گا بلکہ انگلیوں کی چھوٹی پتلی اور باریک ہڈیوں کو بھی ان کی اپنی جگہ پر قرار دے گا، اور ان سے بھی بالاتر بات یہ ہے کہ انگلیوں کے پوروں تک کو موزوں صورت میں پہلی حالت میں پلٹا دے گا۔

یہ تعبیر ممکن ہے، انسانی پوروں کی لکیروں کی طرف، ایک لطیف اشارہ ہو، کہتے ہیں کہ بہت کم انسان روئے زمین میں ایسے پیدا ہوتے ہیں، جن کے پوروں کی لکیریں ایک دوسرے کے ساتھ ملتی ہوں یا دوسرے لفظوں میں باریک اور پیچیدہ لکیریں جو ہر انسان کے پوروں میں نقش ہوتی ہیں، اس شخص کے تعارف کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ اس لیے ہمارے زمانہ میں "انگشت نگاری" پوروں کی لکیروں کے آثار کو ضبط کرنے کا شعبہ ایک مستقل علم کی صورت اختیار کر گیا ہے اور اس کے ذریعہ بہت سے مجرم پہچانے جاتے ہیں اور بہت سے جرموں کا انکشاف ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جب ایک چور کرے یا کسی گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہ اپنا ہاتھ دروازے کے قبضہ یا کمرے کے شیشے یا تالے اور صندوق پر رکھتا ہے تو اس کی انگلی کی لکیریں اس پر رہ جاتی ہیں، تو فوراً اس کا نمونہ حاصل کر کے، چوروں اور مجرموں کے سابقہ ریکارڈ کے ساتھ مطابقت کر کے، مجرم کو ڈھونڈ لیا جاتا ہے۔

بعد والی آیت میں معاد کے انکار کی ایک حقیقی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "ایسا نہیں ہے کہ انسان ہڈیوں کے جمع کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے پر خدا کی قدرت کے بارے میں شک رکھتا ہو، بلکہ ان کا مقصد انکار کرنے سے یہ ہے کہ وہ ساری زندگی گناہ کرتا رہے" (بل یرید الانسان لیفجر امامہ)۔

وہ چاہتا ہے کہ انکار معاد کے ذریعہ ہر قسم کی ہوس رانی ظلم و بیداد گری اور گناہ کے لیے آزادی حاصل کرے اور اس طریقے سے عجب شاطر سے سیر کرے، اور مخلوقِ خدا کے مقابلہ میں بھی اپنے لیے کسی جوابدہی کا قائل نہ ہو۔ کیونکہ معاد و قیامت پر ایمان رکھنا اور دادگاہ عدل الٰہی کا قائل ہونا، ہر قسم کے عصیان و گناہ کے مقابلہ میں ایک عظیم رکاوٹ ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس لگام کو پکڑے اور اس بند کو توڑ دے اور آزادانہ طور پر جو عمل چاہے وہ کرتا پھرے۔

یہ بات گزشتہ زمانوں کے ساتھ ہی منحصر نہیں تھی آج بھی مادیت کی طرف میلان اور مبداء و معاد کے انکار کا ایک سبب فسق و فجور، ذمہ داریوں سے گریز اور ہر قسم کے خدائی قانون کو توڑنے کے لیے آزادی حاصل کرنا ہے، ورنہ مبداء و معاد کے دلائل واضح و آشکار ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں آیا ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

یقدم الذنب ویؤخر التوبۃ و یقول سوف اتوب

"آیت میں ایسے شخص کی طرف اشارہ ہے جو گناہ کو آگے رکھتا ہے اور توبہ کو تاخیر میں ڈالتا ہے، اور کہتا ہے، میں بعد میں توبہ کروں گا۔"

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت میں "فجور" سے مراد "جھٹلانا" ہے، اس طرح سے آیت کا معنی یہ ہے: انسان چاہتا ہے کہ معاد و قیامت کو جو اس کے سامنے ہے جھٹلائے، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

اعمال سے بعد مزید کہتا ہے: "اس لیے پوچھتا ہے قیامت کب آئے گی؟ (یسئل ایان یوم القیامۃ)۔

ہاں! وہ ذمہ داریوں سے گریز کے لیے قیام قیامت کے وقت کے بارے میں، استفہام انکاری کے طور پر پوچھتا ہے، تاکہ اپنے فسق و فجور کے لیے راستہ ہموار کرے۔

اس نکتہ کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ قیامت کے وقت کے بارے میں ان کا سوال کرنا، اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ اصل قیامت کو قبول کرتے ہیں اور صرف اس کے وقت کے بارے میں سوال کرتے ہیں، بلکہ یہ سوال اصل قیامت کے انکار کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید ہے ٹھیک اس طرح سے جیسا کہ کوئی کہتے فلاں شخص سفر سے آئے گا" اور جب اس کے آنے میں طول ہوا اور وہ نہ آئے تو دوسرا شخص جو اس مسافر کے آنے کا منکر ہو، یہ کہتا ہے: وہ مسافر کب تک آئے گا؟

چند نکات

۱۔ عدالتِ وجدان اور قیامتِ صغریٰ

قرآن مجید سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ روح اور نفسِ انسانی تین مراحل رکھتی ہے۔

۱۔ "نفسِ امارہ" یعنی سرکش نفس، جو انسان کو ہمیشہ برائیوں اور بدیوں کی دعوت دیتا ہے اور شہوات اور فجور کو اس کے سامنے زینت بخشتا ہے، یہ وہی چیز ہے کہ جب اس ہوس باز عورت، عزیز مصر کی بیوی نے اپنے برے کام کے انجام کا مشاہدہ کیا تو کہا: وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء "میں ہرگز اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتی، کیونکہ سرکش نفس ہمیشہ برائیوں کا حکم دیتا ہے"

(یوسف ـــــ ۵۳)

۲۔ "نفسِ لوامہ" جس کی طرف زیرِ بحث آیات میں اشارہ ہوا ہے، وہ بیدار اور نسبتاً آگاہ و باخبر نفس ہے، اگرچہ اس نے گناہ کے مقابلہ میں مصونیت حاصل نہیں کی ہے لہٰذا اس سے بعض اوقات لغزش ہو جاتی ہے۔

اور وہ گناہ کر بیٹھتا ہے لیکن تھوڑی دیر کے بعد بیدار ہو جاتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے اور سعادت کی راہ کی طرف لوٹ آتا ہے، اس کی نظر سے انحراف کامل طور پر ممکن ہے لیکن وہ وقتی ہوتا ہے، دائمی نہیں، اس سے گناہ تو سرزد ہو جاتا ہے لیکن زیادہ دیر نہیں گزرنے پاتی کہ وہ اپنے طور پر ملامت، سرزنش اور توبہ کا آغاز کر دیتا ہے۔

یہ وہی چیز ہے کہ جسے "اخلاقی وجدان" کے عنوان سے یاد کرتے ہیں اور بعض انسانوں میں بہت قوی اور طاقتور ہوتا ہے، بعض میں بہت ضعیف و ناتواں، لیکن اس کے باوجود یہ ہر انسان میں موجود ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کثرتِ گناہ کی وجہ سے اسے بیکار بنا دیا جائے۔

۳۔ "نفسِ مطمئنہ" یعنی تکامل و ارتقاء کو پہنچی ہوئی روح، جو اطمینان کے مرحلہ تک پہنچی ہوئی ہو، جس نے سرکش نفس کو رام کر لیا ہو اور تقوائے کامل اور احساسِ مسئولیت کے مقام پر پہنچ گئی ہو کہ اب اس کے لیے آسانی کے ساتھ لغزش کرنا ممکن نہ رہے۔

یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں سورۂ والفجر کی آیہ ۲۷، ۲۸ میں فرماتا ہے: یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ ــــــ "اے نفسِ مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ، جبکہ تو بھی اس سے راضی ہے اور وہ بھی تجھ سے خوش ہے"۔

بہرحال ــــــ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ــــــ یہ "نفسِ لوامہ" انسان میں ایک چھوٹی سی قیامت ہے اور نیک یا بُرا کام انجام دینے کے بعد جان کے اندر اس کا گویا فاصلہ قائم ہو جاتا ہے اور وہ اس کا حساب و کتاب کرتا ہے۔

اسی لیے بعض اوقات وہ ایک اچھے اور اہم کام کے مقابلہ میں ایسا اندرونی سکون محسوس کرتا ہے اور اس کی روح مسرت و نشاط سے اس طرح لبریز ہو جاتی ہے کہ جس کی لذت شان اور زیبائی کسی بیان اور قلم سے قابلِ توصیف نہیں۔

اس کے برعکس وہ بعض اوقات کسی غلطی اور عظیم جرم کے بعد ایسے وحشت ناک خواب، اور غم واندوہ کے طوفان میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر اس طرح جلتا رہتا ہے کہ زندگی سے کلی طور پر سیر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس پریشانی کے چنگل سے آزاد ہونے کے لیے قاضی کو اپنا تعارف کرانے پھانسی کے پھندے پر چڑھنے کے لیے اپنے آپ کو سپرد کر دیتا ہے۔

یہ عجیب و غریب اندرونی عدالت، قیامت کی عدالت کے ساتھ بالا کی مشابہت رکھتی ہے۔

۱۔ حقیقت میں یہاں قاضی و شاہد اور حکم کا اجرا کرنے والا ایک ہی ہے جیسا کہ قیامت میں بھی اسی طرح ہے: عالم الغیب والشھادۃ انت تحکم بین عبادک "پروردگارا! تو پنہاں اور آشکار بھیدوں سے آگاہ ہے اور تو ہی اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرے گا"۔ (زمر ــــــ ۴۶)

۲۔ یہ وجدانی عدالت سفارش، رشوت، پارٹی بازی اور افسانوں میں رائج سفارشی خطوں کو قبول نہیں کرتی، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی یہی آیا ہے:

واتقوا یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یقبل منھا شفاعۃ ولا یؤخذ منھا عدل ولا ھم ینصرون

"اس دن سے ڈرو جس میں کسی شخص کو کسی دوسرے کی جگہ پر سزا نہیں دی جائے گی اور نہ ہی کوئی سفارش قبول ہوگی، اور نہ ہی کوئی فدیہ و رشوت کو قبول کیا جائے گا اور نہ ہی ان کی کوئی مدد و نصرت کی جائے گی"۔

(بقرہ ــــــ ۴۸)

۳۔ عدالتِ وجدان: اہم ترین اور عظیم ترین اعمال ناموں کی مختصر ترین مدت میں جانچ پڑتال کرتا ہے اور اپنا آخری فیصلہ بڑی تیزی کے ساتھ صادر کر دیتا ہے، نہ اس میں نئے سرے سے درخواست دینے کی ضرورت ہے نہ تجدیدِ نظر کی، اور نہ ہی مہینوں اور سالوں تک جھگڑا لگانے کی، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی یہی بات ہے: واللہ یحکم لا معقب لحکمہ وھو سریع الحساب "خدا حکم کرتا ہے، اور اس کا حکم نہ رد ہوتا ہے اور نہ ہی ٹوٹتا ہے اور اس کا حساب و کتاب بہت ہی تیز ہوگا"۔

(رعد ــــــ ۴۱)

۴۔ اس کی سزا اور کیفرِ کردار، اس جہان کی رسمی عدالتوں کی سزاؤں کے برخلاف، اس کے اولین شعلے اس کے دل و جان کی گہرائیوں میں

جھڑکتے ہیں اور وہاں سے باہر کی طرف سرایت کرتے ہیں، پہلے وہ انسان کی روح کو تکلیف و آزار پہنچاتے ہیں، اس کے بعد اس کے آثار جسم اور چہرے میں اور اس کے خواب و خوراک کے دگرگوں اور تبدیل ہونے میں ظاہر و آشکار ہوتے ہیں، جیسا کہ قیامت کی عدالت کے بارے میں بھی بیان ہوا ہے (نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ) خدا کی روشن کی ہوئی آگ دلوں سے شعلے نکالتی ہے۔

(ہمزہ ــــــ ۶،۷)

۵۔ اس وجدان کی عدالت کو، دیکھنے والوں اور گواہوں کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ خود متہم انسان کی معلومات اور آگاہیوں کو، اس کے نفع میں، یا اس کے برخلاف "گواہیوں" کے عنوان سے قبول کرتا ہے، جیسا کہ قیامت کی عدالت میں بھی، انسان کے وجود کے ذرات، یہاں تک کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے بدن کی جلد اس کے اعمال کے گواہ ہوں گے، جیسا کہ فرماتا ہے:

حتی اذا ما جاءوھا شھد علیھم سمعھم وابصارھم وجلودھم

"جب وہ جہنم کی آگ کے پاس پہنچیں گے تو ان کے کان، آنکھیں اور بدن کی جلد ان کے خلاف گواہی دیں گے"۔ (حم السجدۃ ــــــ ۲۰)

ان دونوں عدالتوں کے درمیان، یہ عجیب و غریب مشابہت مسئلہ معاد کے فطری ہونے کی ایک اور نشانی ہے۔ کیونکر یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ایک انسان کے وجود میں تو ــــــ جو اس عالم ہستی کے عظیم سمندر میں ایک چھوٹا سا قطرہ ہے ــــــ اس قسم کا حساب و کتاب اور مرموز و اسرار آمیز عدالت موجود ہو، لیکن اس عظیم عالم کے اندر بالکل کوئی حساب و کتاب، عدالت و محکمہ موجود نہ ہو، بھلا یہ چیز باور کرنے کے قابل ہے؟[1]

۲۔ قرآن مجید میں قیامت کے نام

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے معارف، اور اس کے اعتقادی مسائل کا ایک اہم حصہ، قیامت و معاد سے مربوط مسائل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے، کیونکہ وہ انسان کی تربیت اور تکامل و ارتقاء کی طرف بڑھنے میں اہم ترین تاثیر رکھتے ہیں۔

قرآن میں اس عظیم دن کے لیے جو نام انتخاب کیے گئے ہیں وہ بھی بہت ہیں، جن میں سے ہر ایک اس دن کے مختلف جہات و ابعاد میں سے ایک جہت و بعد کو بیان کرتا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سے مسائل کو اکیلا ہی واضح کر دیتا ہے۔

"فیض کاشانی" کے قول کے مطابق، جو انہوں نے "محجۃ البیضاء" میں لکھا ہے، ان ناموں میں سے ہر ایک کے پیچھے کوئی نہ کوئی راز چھپا ہوا ہے اور ہر توصیف میں کوئی نہ کوئی اہم معنی بیان ہوا ہے، لہٰذا کوشش سے ان معانی کا ادراک کرنا چاہیے اور ان اسرار کو معلوم کرنا چاہیے۔

انہوں نے قیامت کے ایک سو سے زیادہ نام ذکر کیے ہیں، ان تمام کو یا ان میں سے اکثر کو قرآن مجید سے معلوم کیا جا سکتا ہے مثلاً "یوم الحسرۃ" "یوم الندامۃ" "یوم المحاسبۃ" "یوم المسألۃ" "یوم الواقعۃ"

---

[1] محکمۂ وجدان کے سلسلہ مزید وضاحت کے لیے کتاب "رہبران بزرگ" (بحث وجدان) اور کتاب "معاد و عالم پس از مرگ" (بحث دلائل) کی طرف رجوع کریں۔

"یوم القارعۃ" "یوم الراجفۃ" "یوم الرادفۃ" "یوم الطلاق" "یوم الفراق" "یوم الحساب" "یوم التناد" "یوم العذاب" "یوم الفرار" یوم الحق" "یوم الحکم" یوم الفصل" "یوم الجمع" "یوم الدین" "یوم تبلی السرائر" "یوم لا یغنی مولی عن مولی شیئا" "یوم یفر المرء من اخیہ" "یوم لا ینفع مال ولا بنون" "و یوم التغابن" و ......[1]

لیکن اس کا زیادہ مشہور نام "یوم القیامۃ" ہی ہے جس کا قرآن مجید میں ستر بار ذکر ہوا ہے اور وہ بندوں کے عمومی قیام اور انسانوں کے عظیم معاد کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کی طرف توجہ کرنا بھی، انسان کو اسی دنیا میں، اپنی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے قیام کی دعوت دیتا ہے۔

ہمارے نظریہ کے مطابق، خواب غفلت اور فریب سے بیدار ہونے اور سرکش نفس کو لگام دینے اور انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے یہی کافی ہے کہ ہم ان ناموں میں غور و فکر کریں اور اس عظیم دن میں ـــــــ جس میں ہم سب خدا کی عظیم بارگاہ میں حاضر ہوں گے اور پردے ہٹ جائیں گے اور اندرونی بھید کھل جائیں گے اور بہشت کو مزین کیا جائے گا اور جہنم کو بھڑکایا جائے گا، اور سب کے سب میزان عدل الٰہی کے پاس حاضر ہوں گے ـــــــ ہم اپنی حالت کو نظر میں رکھیں۔ (خداوندا! ہمیں اس دن اپنی پناہ میں جگہ دے دے)۔

---

[1] "المحجۃ البیضاء" جلد ۸ ص ۲۳۱ (تلخیص کے ساتھ)

۷۔ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝
۸۔ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝
۹۔ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝
۱۰۔ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ۝
۱۱۔ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝
۱۲۔ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۝
۱۳۔ يُنَبَّأُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۝
۱۴۔ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝
۱۵۔ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝

ترجمہ

۷۔ اس وقت آنکھیں شدت وحشت سے پھرنے لگیں گی۔
۸۔ اور چاند بے نور ہو جائے گا
۹۔ اور سورج اور چاند ایک جگہ جمع ہو جائیں گے۔
۱۰۔ اس دن انسان کہے گا: بھاگنے کی جگہ کہاں ہے؟
۱۱۔ ہرگز ایسا نہیں ہے، کوئی راہِ فرار اور پناہ گاہ نہیں ہے۔
۱۲۔ اصلی پناہ گاہ تو تیرے پروردگار کی طرف ہی ہے۔
۱۳۔ اس دن انسان کو ان تمام کاموں سے جو آگے یا پیچھے کیے ہیں، آگاہ کیا جائے گا۔
۱۴۔ بلکہ انسان تو خود اپنی حالت سے آگاہ ہے۔
۱۵۔ اگرچہ (ظاہر میں) وہ اپنے لیے عذر (اور بہانے) تراشے۔

تفسیر

انسان خود اپنے لیے بہترین فیصلہ کرنے والا ہے

گزشتہ آیات میں گفتگو اس سوال پر کہ ـــــــ جو منکرین قیامت اور معاد کے بارے میں کرتے تھے ـــــــ ختم ہوئی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر قیامت سچ ہے تو وہ کب آئے گی، زیر بحث آیات گویا اس سوال کا ایک واضح جواب ہیں۔

پہلے قیامت سے قبل کے حوادث کی طرف ـــــــ یعنی اسی انقلاب عظیم کے سلسلے میں جو دنیا میں پیدا ہوگا، اور اس دنیا کا نظام متلاطم اور خراب ہو جائے گا، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جب آنکھیں خوف اور وحشت کی شدت سے گردش کر رہی ہوں گی اور مضطرب ہوں گی" (فاذا برق البصر)[1]

"اور جس وقت چاند بے نور اور منخسف ہو جائے گا" (وخسف القمر)۔

"اور جب سورج اور چاند ایک جگہ جمع ہو جائیں گے (وجمع الشمس والقمر)۔

اس بارے میں کہ "چاند اور سورج کے جمع ہونے سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے مختلف تفاسیر بیان کی ہیں۔

کبھی کہا ہے: دونوں ایک ساتھ اکٹھے ہو جائیں گے یا دونوں اکٹھے مشرق سے طلوع کر کے مغرب میں غروب ہوں گے۔

اور کبھی کہا ہے: دونوں اس صفت میں کہ اپنا نور کھو بیٹھیں گے، جمع ہوں گے[2]

یہ احتمال بھی ہے کہ چاند بتدریج سورج کی قوت جاذبہ کے زیر اثر اس کے نزدیک اور انجام کار اس میں جذب ہو جائے گا اور پھر دونوں بے نور ہو جائیں گے۔

بہر حال یہاں دنیا کے آخر میں ظاہر ہونے والے انقلابوں میں سے دو اہم ترین حصوں، یعنی چاند کے بے نور ہو جانے اور سورج اور چاند کے

---

[1] "برق" کے مادہ سے (بروزن فرق) اصل میں روشنی اور اس بجلی کے معنی میں ہے جو بادلوں کے درمیان ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہر قسم کی روشنی پھیلانے اور آنکھوں کا چکا چوند ہونا، جس کی طرف اس آیت میں اشارہ ہوا ہے، شدید اور اضطراب آمیز حرکت کے معنی میں ہے جو ہول اور خوف کی شدت سے ہوتی ہے۔ بعض نے آنکھ کے ڈھیلے کے گھوم جانے اور ٹکٹکی باندھ کر ایک ہی نکتہ کی طرف نگاہ کرنے کے معنی میں ـــــــ جو عام طور پر وحشت کی نشانی ہے ـــــــ تفسیر کرتے ہیں اور اس معنی پر کہ آنکھ کا چکا چوند ہونا، حیرت کے معنی میں ہے، اضطراب سے کچھ مشابہ ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

[2] مرحوم "طبرسی" مجمع البیان میں فرماتے ہیں کہ جمع کی تعبیر حقیقت کی ہوتی ہے جیسے کسی مکان میں ہاتھ پاؤں کا جمع ہونا اور ایک چیز میں کئی اوصاف کا جمع ہونا (مثلاً علم و عدالت کا ایک شخص میں جمع ہونا) لیکن دو چیزوں کے ایک صفت میں اشتراک کے معنی میں جمع ہونا، مثلاً چاند اور سورج کا بے نور ہونا، ایک قسم کی مجازی تعبیر ہے (جیسا کہ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے)

(مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۹۵)

ایک دوسرے کے ساتھ جمع ہو جانے کی طرف اشارہ ہوا ہے، جن کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی کم و بیش اشارے ہوئے ہیں، مثلاً سورۂ تکویر کی پہلی آیہ میں فرماتا ہے: "اذا الشمس کوّرت" "جس وقت سورج تاریک ہو جائے گا" اور ہم جانتے ہیں کہ چاند کا نور سورج سے ہے۔ تو جب سورج تاریک ہو گا تو پھر چاند بھی تاریک ہو جائے گا اور نتیجہ میں کرۂ زمین ایک وحشت ناک ظلمت اور تاریکی میں ڈوب جائے گا۔

اس طرح سے یہ دنیا ایک عظیم تحول اور انقلاب کے ساتھ ختم ہو جائے گی، اس کے بعد ایک دوسرے انقلاب سے (دوسرے نفخ صور سے جو نفخۂ حیات ہے)، انسانوں کا قبروں سے اٹھنا شروع ہو گا، "اور اس دن انسان کہے گا کہ فرار کی راہ کہاں ہے؟" (یقول الانسان یومئذ این المفر)[1]

ان کافر اور گنہگار انسان، جو قیامت کے دن کی تکذیب کیا کرتے تھے، اس دن شدت خجالت اور شرم سے کوئی پناہ گاہ تلاش کریں گے اور گناہ کے بار کی سنگینی اور عذاب کے خوف سے فرار کی راہ ڈھونڈیں گے، بالکل اسی دنیا کی طرح کہ جب وہ کسی خطرناک حادثہ کا سامنا کرتے تھے تو بھاگنے کی سوچتے تھے، لہٰذا اس جگہ کا بھی اسی جگہ سے قیاس کریں گے۔

لیکن بہت جلد ان سے کہہ دیا جائے گا: "ہرگز ایسا نہیں ہے، یہاں راہ فرار اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہے" (کلا لا وزر)[2]

"بلکہ سب سے اصلی قرار گاہ پروردگار کی طرف ہے" اور اس کے علاوہ کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے (الیٰ ربک یومئذ المستقر)۔

اس آیت کے لیے پہلے والی تفسیر کے علاوہ دوسری تفسیریں بھی بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ، اس دن آخری حکم خدا کے ہاتھ میں ہے۔

یا یہ کہ آخری قرار گاہ، جنت اور دوزخ میں اس کے حکم سے ہوگی۔

یا یہ کہ محاکمہ اور حساب کے لیے اسی کی بارگاہ میں ٹھہرنا ہوگا۔

لیکن بعد والی آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے، وہ تفسیر جو ہم نے انتخاب کی ہے سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو انسان کے ابدی تکامل وارتقاء کے راستے کو بیان کرتی ہیں اور یہ آیت ان آیات کے زمرے میں ہے جو کہتی ہیں "و الیہ المصیر" "سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (تغابن ــــ ۳) اور

---

[1] "مفر" "فرار" سے اسم مکان ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر ہے، لیکن یہ احتمال یہاں بعید نظر آتا ہے۔

[2] "وزر" (بر وزن قمر) اصل میں پہاڑی پناہ گاہ وغیرہ کے معنی میں ہے اور "وزیر" کو اس لیے "وزیر" کہتے ہیں، کہ لوگ اپنے کاموں میں اس کی پناہ لیتے ہیں برحال زیر بحث آیت میں ہر قسم کی پناہ گاہ کے معنی میں ہے۔

(یاایھا الانسان انک کادح الی ربک کدحا فملا قیہ) اے انسان تو سعی و کوشش اور زحمت و مشقت کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف بڑھتا ہے، اور تو اس سے ملاقات کرے گا" (انشقاق ـــــ ۶) و ان الی ربک المنتھٰی" اور یہ کہ سب تیرے پروردگار کی طرف پلٹ جائیں گے" (نجم ـــــ ۴۲)[1]

زیادہ واضح تعبیر میں انسان ایسے رہرو ہیں جو عدم کی سرحد سے چلے ہیں اور انھوں نے سلطنتِ وجود کا یہ سارا راستہ طے کیا ہے، اور اس سلطنتِ وجود میں بھی وہ خدا کے وجودِ مطلق اور بے پایاں ہستی کی طرف چلے جا رہے ہیں، اور اگر وہ اصل راستے اور صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہوں، تو یہ ارتقائی حرکت ابد تک جاری رہے گی اور وہ ہر روز قربِ خدا کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوں گے، لیکن اگر وہ اپنی راہ سے منحرف ہو جائیں تو گر کر تباہ ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اس گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس دن انسان کو ان تمام کاموں سے جنھیں اس نے "مقدم" رکھا تھا یا "مؤخر" کیا تھا، آگاہ کیا جائے گا" (ینبؤا الانسان یومئذ بما قدم و اخر)۔

اس بارے میں کہ ان دونوں تعبیروں سے کیا مراد ہے؟ بہت سی تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔

پہلی تفسیر یہ کہ اس سے مراد وہ اعمال ہیں جو اس نے اپنی زندگی میں آگے بھیجے ہیں، یا وہ آثار جو موت کے بعد اس سے باقی رہ گئے ہیں، چاہے وہ نیک سنت ہو یا بد، جو اس نے لوگوں میں چھوڑی ہے اور وہ اس پر عمل کرتے ہیں اور اس کی نیکیاں اور برائیاں اس کو پہنچتی رہتی ہیں، یا کتاب اور تحریریں اور خیر و شر کی بنیادیں، یا نیک و بد اولاد، جن کے آثار اس تک پہنچیں گے۔

دوسری تفسیر سے مراد وہ اعمال ہیں جو وہ پہلے بجالایا تھا اور وہ آخری اعمال جنھیں اس نے اپنی تمام عمر میں انجام دیئے، دوسرے لفظوں میں وہ اپنے تمام اعمال سے باخبر ہو جائے گا۔

تیسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے وہ مال مراد ہے جو اس نے آگے بھیجا ہے اور وہ مال جو اس نے وارثوں کے لیے چھوڑا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد وہ گناہ ہیں، جنھیں اس نے مقدم رکھا، اور وہ اطاعتیں ہیں جنھیں اس نے مؤخر رکھا تھا، یا اس کے برعکس۔

لیکن سب سے مناسب پہلی تفسیر ہے، خاص طور پر جبکہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

(ینبؤ) بما قدم من خیر و شر و ما اخر من سنة لیس بها من بعده فان کان شرا کان علیه مثل وزرهم ولاینقص من وزرهم شیئا وان کان خیرا کان له مثل اجورهم، ولاینقص من اجورهم شیئا

---

[1] انسان آیات کی تفسیر میں کچھ دوسرے نظریات بھی ہیں جو ہم نے انھیں آیات کے ذیل میں بیان کیے ہیں۔

"اس دن انسان کو اس کے خیر اور شر سے باخبر کیا جائے گا جسے اس نے مقدم رکھا تھا یا موخر کیا تھا ان سنتوں کے طور پر جنہیں اس نے یادگار کے طور پر چھوڑا تھا، تاکہ وہ لوگ جو اس کے بعد آئیں گے اس پر عمل کریں اور اگر وہ بری سنت تھی تو عمل کرنے والوں کے گناہوں کے برابر اس کے گناہ میں اضافہ ہوگا اور ان کے گناہوں میں کسی قسم کی کمی نہیں ہوگی، اور اگر وہ اچھی سنت تھی تو ان ہی جیسے اجر و ثواب اس کے لیے بھی ہوں گے اور ان کے اجر و ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی"[1]

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے، اگرچہ خدا اور اس کے فرشتے انسان کو اس کے تمام اعمال سے آگاہ کریں گے، لیکن اس اطلاع کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ انسان خود اپنی حالت سے آگاہ ہے اور اس عظیم دن میں وہ خود اور اس کے اعضاء اس کی گواہی دیں گے:
(بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ)۔[2]

"چاہے وہ ظاہر میں اپنے لیے کتنے ہی عذر تراشتا ہے" (ولو القیٰ معاذیرہ)۔
یہ آیات حقیقت میں وہی چیز بیان کر رہی ہیں جو قرآن کی دوسری آیات میں، انسان کے اعمال پر اس کے اعضاء کی گواہی کے بارے میں آیا ہے، مثلاً سورۂ حٰم سجدہ کی آیہ ۲۰ میں آیا ہے: (شھد علیھم سمعھم وابصارھم وجلودھم بما کانوا یعملون "ان کے کان اور آنکھیں اور بدن کی جلد ان کے اعمال کی گواہی دیں گے" اور سورہ یٰس کی آیہ ۶۵ میں آیا ہے وتکلمنا ایدیھم و تشھد ارجلھم بما کانوا یکسبون "ان کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے، اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی جنھیں وہ انجام دیتے تھے گواہی دیں گے"
اس بناء پر قیامت کی اس عظیم عدالت میں انسان کے اعمال کا بہترین گواہ وہ خود ہی ہے، کیونکہ وہ اپنی حالت سے سب سے زیادہ آگاہ ہے، اگرچہ خدا نے اتمام حجت کے طور پر بہت سے دوسرے گواہ بھی اس کے لیے تیار کیے ہیں۔
"بصیرۃ" مصدری معنی بھی رکھتا ہے (بینائی و آگاہی) اور وصفی معنی بھی (آگاہ شخص) اس لیے بعض نے اس کی "حجت" دلیل اور برہان کے معنی میں جو آگاہی بخش ہوتی ہے تفسیر کی ہے۔
"معاذیر" "معذرت" کی جمع ہے، جو اصل میں ایسی چیز کے پیدا کرنے کے معنی میں ہے، جو گناہ کے آثار کو ختم کر دے، جو کبھی تو واقعی عذر ہوتا ہے اور کبھی ظاہری، اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "معاذیر" "معذار" کی جمع ہے، جو پردہ اور پوشش کے معنی میں ہے اس تفسیر کے مطابق آیت کا معنی اس طرح ہوتا ہے۔ انسان اپنے اوپر آگاہی رکھتا ہے، چاہے وہ اپنے اعمال پر کتنے ہی پردے ڈالے اور اپنے کاموں کو

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۰۹ ۔ اسی حدیث کے مانند تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۸۹۱ میں بھی آیا ہے۔

[2] پہلے احتمال کی بناء پر اس کی "تاء" مصدری ہے اور دوسرے احتمال کی بناء پر تائے تانیث ہے کیونکہ انسان یہاں اعضاء و جوارح کے معنی میں ہے یا "نفس" کے معنی میں جو تانیث مجازی ہے اور بعض نے "تاء" کو مبالغہ کی سمجھتے ہیں، جو انسان کی اپنے بارے میں شدت آگاہی کی خبر دیتی ہے۔

پوشیدہ کے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

بہر حال اس عظیم دن حساب و جزا پر حاکم وہ ہستی ہے جو ظاہر و باطن کے بھیدوں سے آگاہ ہے اور خود انسان کو بھی اس کے اعمال پر حساب کرنے والا قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ اسراء کی آیہ ۱۴ میں آیا ہے: اقرأ کتابك کفٰی بنفسك الیوم علیك حسیبًا" اپنے نامۂ اعمال کو پڑھ، آج تو اپنے حساب کے لیے خود ہی کافی ہے۔

اگرچہ زیر بحث آیات سب کی سب معاد اور قیامت کے بارے میں گفتگو کررہی ہیں لیکن ان کا مفہوم وسیع ہے اس دنیا کو بھی شامل ہے یہاں بھی لوگ اپنے حال سے آگاہ ہیں، اگرچہ کچھ لوگ جھوٹ موٹ لے پس پشت ڈال کر، ظاہر سازی اور ریاکاری سے اپنے حقیقی چہرے کو چھپا لیتے ہیں۔

اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

مایصنع احدکم ان یظهر حسنًا و یسر سیئًا الیس اذا رجع الی نفسه یعلم انه لیس کذٰلك، والله سبحانه یقول: بل الانسان علی نفسه بصیرة، ان السریرة اذا صلحت قویت العلانیة۔

"جب تم میں سے کوئی شخص اپنے ظاہر کو آراستہ کرے، لیکن پوشیدہ طور پر بدکار ہو تو وہ کہہ سکتا ہے کیا جب وہ اپنے نفس کی طرف لوٹتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ وہ ایسا نہیں ہے؟ جیسا کہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: بلکہ اپنی حالت سے آگاہ ہے جب انسان کا باطن صالح اور درست ہو جائے تو اس کے ظاہر کو بھی تقویت پہنچتی ہے[1]

بیمار کے روزہ کی احادیث میں بھی آیا ہے کہ امام صادقؑ کے ایک صحابی نے آپ سے سوال کیا ماحد المرض الذی یفطر صاحبه اس بیماری کا معیار کیا ہے جس سے افطار جائز ہو جاتا ہے تو امام نے اس کے جواب میں فرمایا:

"بل الانسان علی نفسه بصیرة، هو اعلم بما یطیق"

انسان اپنی حالت پر سب سے زیادہ آگاہ ہے اور وہی بہتر طور پر جانتا ہے کہ اس میں کس قدر توانائی ہے[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۳۹۶

[2] دوسرا مدرک (اسی حدیث کو مرحوم صدوق نے "من لا یحضرہ" کی کتاب صیام میں بھی نقل کیا ہے۔ جلد ۲ ص ۱۳۲۔ باب حد المرض الذی یفطر صاحبه حدیث ۱۹۴۱

۱۶- لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝

۱۷- إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝

۱۸- فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝

۱۹- ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝

ترجمہ

۱۶- اس قرآن کو پڑھنے میں جلدی کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دے۔

۱۷- کیونکہ اس کو جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے۔

۱۸- اور جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر اس کی پیروی کر۔

۱۹- پھر اس کو بیان کرنا (اور اس کی وضاحت کرنا بھی) ہمارے ہی ذمہ ہے۔

تفسیر

قرآن کا جمع کرنا اور اس کی حفاظت ہمارے ذمہ ہے

یہ آیات حقیقت میں جملہ معترضہ کے طور پر آئی ہیں۔ جسے گفتگو کرنے والا اپنی گفتگو کے درمیان میں لاتا ہے، مثلاً کوئی شخص تقریر کر رہا ہے اور وہ یہ دیکھتا ہے کہ مجلس کا آخری حصہ لوگوں سے پُر ہو گیا ہے جبکہ اس کا اگلا حصہ خالی ہے تو وہ وقتی طور پر اپنی تقریر روک کر حاضرین کو آگے آنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے جگہ کھلی ہو جائے اور پھر اپنی تقریر کو شروع کر دیتا ہے یا کوئی استاد درس کے دوران اپنے کسی شاگرد کو غافل دیکھتا ہے تو وہ اپنی گفتگو کو توڑ کر اسے تنبیہ کرتا ہے اور پھر درس کو جاری کر دیتا ہے۔

اگر کوئی بے خبر آدمی اس تقریر یا درس کو ٹیپ سے سنے تو ممکن ہے وہ اشتباہ میں پڑ جائے اور ان جملوں کے قبل و بعد کے جملوں سے غیر مربوط ہونے پر تعجب کرے، لیکن مجلس کے مخصوص حالات میں دقت اور غور کرنے سے ان معترضہ جملوں کا فلسفہ واضح ہو جاتا ہے۔

اس سادہ سے مقدمہ کی طرف توجہ کرنے کے بعد ہم زیر بحث آیات کی تفسیر پیش کرتے ہیں

خدا نے قیامت۔ مومنین اور کفار کے حالات کے بارے میں جو سلسلۂ گفتگو تھا، اسے وقتی طور پر چھوڑ دیا ہے اور اپنے پیغمبر کو قرآن کے بارے میں، ایک مختصر سی یاد دہانی کراتا ہے۔ اور فرماتا ہے: "اپنی زبان کو اس کے پڑھنے میں جلدی کرنے کے لیے حرکت نہ دے" (لا تحرك به لسانك لتعجل به)۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بہت زیادہ اختلاف کیا ہے اور مجموعی طور پر اس کے لیے تین تفاسیر بیان کی گئی ہیں ۔

پہلی تفسیر تو وہی معروف تفسیر ہے جو ابن عباس سے کتب حدیث و تفسیر میں بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبر اس شدید عشق اور لگاؤ کی بناء پر، جو آپ قرآن کو حاصل کرنے اور اسے حفظ کرنے کے بارے میں رکھتے تھے، جب وحی لانے والا فرشتہ آپ کے سامنے قرآنی آیات کو پڑھتا تھا، تو آپ اس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان کو حرکت دیتے تھے اور جلدی کرتے تھے، خدا نے آپ کو منع کیا کہ یہ کام نہ کیجیے ہم خود اسے تیرے لیے جمع کر رہے ہیں ۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ قرآن کے دو نزول ہیں: "نزولِ دفعی" یعنی وہ سارا کا سارا یکجائی طور پر "شب قدر" میں پیغمبر کے پاک دل پر نازل ہوا اور "نزولِ تدریجی" جو ۲۳ سال کے عرصہ میں صورت پذیر ہوا، پیغمبرؐ اس جلدی کی بناء پر جو انھیں دعوت کی تبلیغ کے بارے میں تھی، بعض اوقات نزولِ تدریجی سے پہلے یا اس کے ہمراہ آیات کی تلاوت کرتے تھے، تو انھیں حکم دیا گیا کہ یہ کام نہ کریں اور ہر آیت کی اپنے موقع پر ہی تلاوت اور تبلیغ کریں ۔

اس طرح سے اس آیت کا مضمون سورۂ طٰہٰ کی آیہ ۱۱۴ کے مانند ہے ۔ (ولا تعجل بالقرآن من قبل ان یقضٰی الیك وحیہ)۔ "وحی کے مکمل ہونے سے پہلے قرآن کے بارے میں جلدی نہ کرو"۔

یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے سے کوئی زیادہ فرق نہیں رکھتیں اور مجموعی طور پر ان کی بازگشت اس معنی کی طرف ہے کہ پیغمبر کو وحی کے حاصل کرنے کے لیے بھی عجلت، اور جلد بازی نہیں کرنا چاہیے ۔

تیسری تفسیر جس کے طرفدار بہت ہی کم ہیں، یہ ہے کہ ان آیات میں مخاطب، قیامت میں گنہگار ہیں، جنھیں حکم دیا جائے گا کہ اپنے نامۂ اعمال کو پڑھیں اور اپنا حساب خود کریں اور انھیں کہا جائے گا کہ اس کے پڑھنے میں جلدی نہ کریں ۔ یہ فطری بات ہے کہ وہ اپنا نامۂ اعمال پڑھتے وقت جب اپنی "برائیوں" کے پہنچیں گے تو پریشان ہو جائیں گے اور ان سے جلدی کے ساتھ گزر جانا چاہیں گے تو یہ حکم انھیں دیا جائے گا اور انھیں جلد بازی سے روکا جائے گا اور ان کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ جس وقت خدا کے فرشتے ان کے اعمال نامے پڑھیں تو وہ ان کی پیروی کریں

اس تفسیر کے مطابق، یہ آیات جملہ معترضہ کی صورت میں نہیں ہیں بلکہ یہ گزشتہ اور آئندہ کی آیات کے ساتھ مربوط ہیں اور سب کی سب ایک دوسرے کے ساتھ ربط رکھتی ہیں، کیونکہ یہ سب ہی قیامت و معاد کے حالات کے ساتھ مربوط ہیں، لیکن پہلی اور دوسری تفسیر کے مطابق ——— جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ——— یہ آیات جنبہ معترضہ رکھتی ہیں ۔

لیکن بہرحال تیسری تفسیر ——— خصوصاً قرآن کے نام کے ذکر کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو بعد کی آیات میں آیا ہے ——— بہت بعید نظر آتی ہے اور اصولی طور پر آیات کا لب ولہجہ بخوبی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ گزشتہ دو تفسیروں میں سے کوئی سی ایک مراد ہے اور ان دونوں کے جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے اگرچہ بعد والی آیات کا لب ولہجہ پہلی تفسیر یعنی مشہور تفسیر کے موافق ہے (غور کیجیے)

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس کو جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے"۔ (انّ علینا جمعہ وقرانہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے جمع کرنے کے سلسلہ میں تو پریشان نہ ہو، ہم اس کی آیات کو جمع بھی کریں گے اور وحی لانے والے فرشتے کے ذریعہ تیرے سامنے پڑھیں گے بھی۔

اور جب ہم اسے پڑھ چکیں پھر تو اس کی پیروی کر اور اسے پڑھ" (فاذا قرأناہ فاتبع قرانہ)۔

"پھر اس کو بیان کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے" (ثم ان علینا بیانہ)۔

اس بناء پر قرآن کا جمع کرنا، اور اس کی تیرے سامنے تلاوت کرنا اور اس کے معانی کی توضیح و تفصیل بتانا، یہ تینوں امور ہمارے ذمہ ہیں۔ لہٰذا تو کسی طرح بھی اس سلسلہ میں پریشان نہ ہو، جس ہستی نے اس وحی کو نازل کیا ہے، وہی تمام مراحل میں اس کا محافظ ہے تیری ذمہ داری تو صرف ایک طرف تو وحی لانے والے فرشتے کی تلاوت کی پیروی کرنا ہے اور دوسری طرف عامۃ الناس کو اس رسالت کی تبلیغ کرنا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ جمع کرنے سے مراد وحی کی زبان میں جمع کرنا نہیں ہے، بلکہ پیغمبر کے سینہ میں جمع کرنا اور آنحضرتؐ کی زبان سے اس کی تلاوت ہے، یعنی جلدی نہ کرو۔ ہم ان تمام آیات کو تیرے سینہ میں جمع کر دیں گے اور پھر اس کی قرأت تیری زبان پر جاری کریں گے۔

بہرحال یہ تمام تعبیریں پہلی تفسیر کی تائید کرتی ہیں کہ پیغمبرؐ جبرئیل کے ذریعہ نزول وحی کے وقت، ہمیشہ جلدی کرتے تھے کہ آیات کو جلدی کے ساتھ تکرار کریں کہ کہیں ان کے حافظہ سے نکل نہ جائیں اور اس موقع پر خدا کی طرف سے انہیں یہ بتایا گیا کہ آپ مطمئن رہیں کہ نہ صرف آیات کے جمع کرنے اور ان کے پڑھنے بلکہ ان کے معانی کی توضیح و تشریح کی بھی، خدا کی طرف سے ضمانت دی جاتی ہے

ضمنی طور پر یہ آیات قرآن کی اصالت اور اس کی ہر قسم کی تحریف اور تبدیلی سے حفاظت کو بیان کرتی ہیں، کیونکہ خدا نے اس کے جمع کرنے اس کی تلاوت کرنے اور اس کی معانی کی وضاحت و تشریح کرنے کا وعدہ دیا ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ ان آیات کے نزول کے بعد، جب جبرئیل آپ پر نازل ہوتے تو آپ مکمل طور سے سکوت اختیار کرتے اور جب جبرئیل چلے جاتے، تو پھر آپ آیات کی تلاوت شروع کرتے [1]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۹۷

۲۰۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۙ

۲۱۔ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۭ

۲۲۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ

۲۳۔ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ

۲۴۔ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۢ بَاسِرَةٌ ۙ

۲۵۔ تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ ۭ

ترجمہ

۲۰۔ جیسا کہ تم خیال کرتے ہو ایسا نہیں ہے (تم معاد کے دلائل کو مخفی شمار کرتے ہو) بلکہ تم جلدی گزر جانے والی دنیا کو دوست رکھتے ہو (اور بے قید و شرط کی ہوس رانی کو چاہتے ہو)۔

۲۱۔ اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

۲۲۔ اس دن کچھ چہرے تو شاداب و مسرور ہوں گے۔

۲۳۔ اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے۔

۲۴۔ اور اس دن کچھ چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے۔

۲۵۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بارے میں ایسا عذاب انجام پائے گا، جو کمر کو توڑ کر رکھ دے گا۔

تفسیر

میدانِ محشر میں کچھ چہرے ہنستے ہوئے، اور کچھ بگڑے ہوئے ہوں گے

ان آیات میں پھر دوبارہ معاد و قیامت سے مربوط مباحث کو شروع کرتا ہے قیامت کی کچھ خصوصیات اسی طرح معاد کے انکار کے علل و اسباب کو بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: اس طرح نہیں ہے کہ معاد و قیامت کے دلائل مخفی ہوں اور تم اس کی حقانیت تک۔

نہ پہنچ سکتے ہو، " بلکہ تم اس جلدی گزر جانے والی دنیا کو دوست رکھتے ہو" (کلا بل تحبون العاجلة)۔

اور اسی بناء پر تم آخرت کو چھوڑے ہوئے ہو" (و تذرون الاٰخرة)۔

معاد کے انکار کی اصل وجہ، خدا کی قدرت " بوسیدہ ہڈیوں" کو جمع کرنے اور پراگندہ مٹی کو اکٹھا کرنے میں شک اور تردد نہیں ہے بلکہ دنیا اور سرکش شہوات اور ہوس رانیوں کے ساتھ تمہارا شدید لگاؤ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ تم ہر قسم کے موانع اور رکاوٹوں کو اپنے راستے سے ہٹا دو، اور چونکہ معاد اور خدا کے امر و نہی کو قبول کر لینا اس راستے میں بہت سے موانع اور رکاوٹیں کھڑی کر دیتا ہے اس لیے یہ لوگ اصل مطلب سے انکار کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور آخرت کو کلی طور پر چھوڑ دیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ مادیت کی طرف جھکاؤ اور مبداء و معاد کے انکار کا ایک اہم سبب، شہوات و لذات اور ہر قسم کے گناہ کے مقابلہ میں بے قید و شرط آزادی حاصل کرنا ہے، نہ صرف گزشتہ زمانہ میں بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی یہ معنیٰ زیادہ واضح اور آشکار صورت میں صادق آتا ہے۔

یہ دونوں آیات حقیقت میں اسی چیز کی ایک تاکید ہے جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے، جس میں فرمایا تھا: بل یرید الانسان لیفجر امامه - یسئل ایان یوم القیامة [1]

اس کے بعد اس دن میں نیکوکار مومنین اور بدکار کفار کی حالت کو بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: " اس دن کچھ صورتیں ہنسی خوشی اور نورانی و خوبصورت ہوں گی" (وجوه یومئذ ناضرة)۔

" ناضرة " " نضرة " کے مادہ سے ایک خاص قسم کی خوشی کے معنی میں ہے جو وفور نعمت اور مرفہ حالی کی وجہ سے انسان کو حاصل ہوتی ہے جس میں سرور، زیبائی اور نورانیت ہوتی ہے، یعنی ان کے رخسار کا رنگ ان کی حالت کی خبر دیتا ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں میں کس طرح سے غرق ہیں۔ حقیقت میں یہ اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورۂ مطففین کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے: تعرف فی وجوههم نضرة النعیم ۔۔۔۔۔۔ " تم ان (بہشتیوں) کے چہروں پر نعمت کی شادابی کو مشاہدہ کرو گے"۔

یہ تو مادی جزاؤں کے لحاظ سے ہے، لیکن ان کی روحانی جزاؤں کے بارے میں فرماتا ہے " وہ صرف اپنے پروردگار کی پاک ذات کی طرف دیکھیں گے" (الی ربها ناظرة)۔

دل کی آنکھ اور شہود باطنی کا دیدار، وہ دیدار جس سے وہ اس بے مثال ذات اور اس کمال و جمال مطلق کے مجذوب بن جائیں گے اور ایک

---

[1] بعض نے اوپر والی آیات میں " کلا " کو ان کے قرآن مجید میں تدبر کرنے کی نفی میں سمجھا ہے لیکن یہ تفسیر صحیح نہیں ہے، کیونکہ ۔۔۔۔۔۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ۔۔۔۔۔۔ قرآن سے مربوط آیات میں مخاطب پیغمبر ہیں اور وہ جنبہ معترضہ رکھتی ہیں، لیکن زیر بحث آیات کا قیامت کے سلسلہ میں ایک تسلسل ہے۔

روحانی اور ناقابلِ بیان لذت انھیں حاصل ہوگی، جس کا ایک ایک لمحہ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سب سے برتر و بالاتر ہے۔

اس بات پر توجہ رہے کہ "الیٰ ربہا" کا "ناظرۃ" پر مقدم ہونا حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ یعنی اسی کی طرف دیکھیں گے، نہ کہ اس کے غیر کی طرف۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ بہشتی یقینی طور پر اس کے غیر کی طرف بھی نگاہ کریں گے تو ہم کہتے ہیں: اگر وہ اس کے غیر کی طرف نگاہ کریں گے تو ان سب کو اس کے آثار میں سے سمجھیں گے اور اثر کی طرف نگاہ کرنا مؤثر کی طرف نگاہ کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں وہ ہر جگہ اسی کو دیکھیں گے اور ہر چیز میں اسی کی قدرت اور جمال و کمال کا مشاہدہ کریں گے، لہٰذا جنت کی نعمتوں کی طرف توجہ بھی انھیں خدا کی ذات کی طرف نظر کرنے سے غافل نہیں کرے گی۔

اسی وجہ سے بعض روایات میں —— جو اس آیت کی تفسیر میں بیان کی گئی ہیں —— آیا ہے کہ: وہ خدا کی رحمت، اس کی نعمت اور اس کے ثواب کی طرف نظر کریں گے۔[1] کیونکہ ان چیزوں کی طرف دیکھنا بھی، اس ذاتِ مقدس کی طرف ہی دیکھنا ہے۔

بعض بے خبروں نے اوپر والی آیت کو قیامت میں خدا کے حسی مشاہدہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس دن خدا کو اسی ظاہری آنکھ کے ساتھ دیکھیں گے۔

حالانکہ اس قسم کے مشاہدہ کا لازمہ، خدا کا جسمانی ہونا، اور کسی خاص مکان، کیفیت اور حالتِ جسمانی میں ہونا ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ اس کی پاک ذات ان آلودگیوں سے منزہ ہے، جیسا کہ قرآن کی مختلف آیات میں بارہا اس پر تکیہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے سورۂ انعام کی آیہ ۱۰۳ میں آیا ہے: لا تدرکہ الابصار وھو یدرك الابصار؛ "اس کو آنکھیں نہیں دیکھتیں اور وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے، یہ آیت مطلق ہے اور دنیا کے ساتھ کسی قسم کا اختصاص نہیں رکھتی۔

بہرحال خدا کے حسی مشاہدہ کا نہ ہونا اس سے کہیں زیادہ واضح ہے کہ ہم اس پر مزید بحث کرنا چاہیں، جو شخص قرآن اور معارفِ اسلامی سے معمولی سی بھی آشنائی رکھتا ہے وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا۔

بعض نے "ناظرۃ" کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے اور یہ کہا ہے کہ وہ "انتظار" کے مادہ سے ہے۔ یعنی اس دن مومنین صرف خدا کی ذاتِ پاک سے توقع رکھتے ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نیک اعمال پر بھی تکیہ نہیں کریں گے۔ اور ہمیشہ اس کی رحمت اور نعمت کے منتظر رہیں گے۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس انتظار میں ایک قسم کی پریشانی آمیختہ ہوگی حالانکہ وہاں مومنین کے لیے کسی قسم کی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

تو وہ جواب میں یہ کہتے ہیں: اس انتظار میں پریشانی ہوتی ہے جس کے انجام کے بارے میں اطمینان نہ ہو، لیکن جب اطمینان حاصل ہو، تو پھر ایسا انتظار آرام و سکون کے ساتھ آمیختہ ہوتا ہے۔[2]

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۶۴، ۴۶۵

[2] بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "نظر" بمعنی انتظار کے معنی میں ہے وہ "الیٰ" کے ساتھ متعدی نہیں ہوتا، بلکہ وہ حرفِ جر کے بغیر متعدی ہوگا، لیکن اشعارِ عرب میں سے کچھ ایسے شواہد موجود ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ "نظر" جو انتظار کے معنی میں ہے وہ "الیٰ" کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے (دقت کیجئے)

"نظر کرنے" اور "انتظار کرنے" کے معنی کے درمیان جمع کرنا بھی بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ ایک لفظ کا استعمال متعدد معانی میں جائز ہے لیکن مجموعاً یہ ہو کہ ان دو معانی میں سے صرف ایک ہی مراد ہو تو ترجیح پہلے معنی کو ہے۔

ہم اس گفتگو کو پیغمبر اکرمؐ کی ایک پُرمعنی حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:

"اذا دخل اهل الجنة الجنة يقول الله تعالى تريدون شيئًا ازيدكم؟
فيقولون الم تبيض وجوهنا، الم تدخلنا الجنة و تنجينا من النار؟
قال فيكشف الله تعالى الحجاب فما اعطوا شيئًا احب اليهم من النظر الى ربهم!"

"جب اہلِ جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے تو خداوند عالم فرمائے گا، کیا تم کوئی اور چیز چاہتے ہو، جس کا میں تمہارے لیے اضافہ کروں؟
وہ کہیں گے: (پروردگارا! تو نے ہمیں سب کچھ دیا ہے) کیا تو نے ہمارے چہروں کو سفید نہیں کیا؟ کیا تو نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا؟ اور جہنم سے رہائی نہیں بخشی؟
اس وقت تمام پردے ہٹ جائیں گے (اور وہ خدا کا چشم دل سے مشاہدہ کریں گے) اور اس حالت میں ان کے نزدیک کوئی چیز اپنے پروردگار کی طرف نگاہ کرنے سے زیادہ محبوب نہیں ہوگی"[۱]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں "انس بن مالک" کے واسطے سے آنحضرتؐ سے آیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ينظرون الى ربهم بلا كيفية ولا حد محدود ولا صفة معلومة؛

"وہ اپنے پروردگار کو دیکھیں گے، لیکن کسی کیفیت کو نہیں اور نہ ہی کسی محدود حد اور مشخص صفت کو"[۲]

اور یہ حدیث شہود باطنی پر ایک تاکید ہے، نہ کہ آنکھ سے مشاہدہ کرنے پر۔

مومنین کے اس گروہ کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ بھی ہوگا جن کے چہرے بگڑے ہوئے ہوں گے" (و وجوه يومئذ باسرة)۔

"باسرة" "بسر" (بروزن نصر) کے مادہ سے، ناپختہ چیز اور وعدہ سے پہلے کام کرنے کے معنی میں ہے، اسی لیے کھجور کے کچے پھل کو "بسر" (بروزن بسر) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد چہرے کے بگڑنے اور ترشرو ہونے پر بولا جانے لگا، کیونکہ یہ وہ عکس العمل ہے جس کا انسان رنج، تکلیف اور پریشانی کے آنے سے پہلے اظہار کرتا ہے۔

بہرحال جس وقت وہ لوگ عذاب کی نشانیوں کو دیکھیں گے اور اپنے نامۂ اعمال کو نیکیوں سے خالی اور برائیوں سے بھرا ہوا پائیں گے تو سخت پریشان، رنجیدہ اور غمگین ہوں گے اور منہ چڑھا لیں گے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ) مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۹۸، اور تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۹۰۰ کی طرف رجوع کریں۔

[۱] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۴۵

[۲] "تفسیر المیزان" جلد ۲۰ ص ۲۰۴"

انھیں معلوم ہے کہ وہ سخت عذاب جوان کی کمر کو توڑ ڈالے گا ان پر واقع ہو کر رہے گا (تظن ان یفعل بھا فاقرۃ)۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ یہاں "ظن" علم کے معنی میں ہے یعنی انھیں اس قسم کے عذاب کے بارے میں یقین ہو جائے گا جبکہ بعض نے یہ کہا ہے کہ یہاں "ظن" اپنے اصلی معنی یعنی گمان میں ہے البتہ وہ اجمالی طور پر یہ یقین رکھتے ہیں کہ انھیں عذاب ہوگا، البتہ اس قسم کے کمر توڑ عذاب کے بارے میں وہ گمان کرتے ہیں[1]

"فاقرۃ" "فقرۃ" (بروزن ضربۃ) کے مادہ سے ہے اور اس کی جمع فقار ہے جو پشت کے مہروں کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر "فاقرہ" اس سنگین حادثہ کو کہتے ہیں جو کمر کے مہروں کو توڑ دیتا ہے اور "فقیر" کو اس وجہ سے فقیر کہا گیا ہے کہ گویا اس کی کمر ٹوٹی ہوئی ہے[2]

بہرحال یہ تعبیر ان سنگین اور سخت سزاؤں سے کنایہ ہے جو دوزخ میں اس گروہ کے انتظار میں ہیں۔ یہ گروہ کمر شکن عذابوں کا منتظر ہے جبکہ سابقہ گروہ پروردگار کی رحمت کے انتظار میں ہے اور محبوب کی ملاقات کے لیے آمادہ ہے۔ ان کے لیے بدترین عذاب ہے اور ان کے لیے بدترین جسمانی رحمت، نعمت اور روحانی لذت ہے۔

---

[1] بعنوان شواہد کے جو اس موضوع کے سلسلہ میں بعض نے نقل کیے ہیں یہ ہے کہ اگر "ظن" علم کے معنی میں ہو تو اس کے بعد "ان" ہے لہٰذا "مثقلہ" نہیں ہونا چاہیے، بلکہ مخففہ ہونا چاہیے حالانکہ زیر بحث آیت میں "ان" مصدریہ ہے اور اس میں قرینہ یہ ہے کہ اس نے نصب دی ہے۔

[2] "فاقرۃ" ایک محذوف موصوف کی صفت ہے اور تقدیر میں "داھیۃ فاقرۃ" ہے اور "تظن" فعل ہے جس کا فاعل "وجوہ" ہے اور تقدیر میں "ارباب الوجوہ" یا "ذوات الوجوہ" ہے۔

۲۶۔ كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۙ

۲۷۔ وَقِيْلَ مَنْ ٜ رَاقٍ ۙ

۲۸۔ وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ۙ

۲۹۔ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۙ

۳۰۔ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ۨالْمَسَاقُ ۞

ترجمہ

۲۶۔ اس طرح نہیں ہے، جب تک اس کی جان گلے تک نہ پہنچے، وہ ایمان نہیں لائے گا۔

۲۷۔ اور یہ کہا جائے گا: کیا کوئی ہے جو اس بیمار کو موت سے نجات دے؟!

۲۸۔ اور دنیا سے فراق کا یقین پیدا کرے۔

۲۹۔ اور پاؤں کی پنڈلیاں (جان کنی کی شدت سے) ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھائیں۔

۳۰۔ (ہاں) اس دن سب کا راستہ تیرے پروردگار (کی دادگاہ) کی طرف ہی ہوگا۔

تفسیر

دوسرے عالم اور مومنین و کفار کی سرنوشت سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے، ان آیات میں، موت کے دہشت ناک لمحہ کے بارے میں گفتگو ہے جو دوسرے جہان کا ایک دریچہ ہے۔

فرماتا ہے: "اس طرح نہیں ہے، جب تک اس کی جان اس کے گلے تک نہ پہنچ جائے، وہ ایمان نہیں لائے گا" (کلا اذا بلغت التراقی)[1]۔

اس دن اس کی برزخی آنکھ کھل جائے گی، حجاب اور پردے ہٹ جائیں گے اور وہ عذاب و کیفر کردار کی نشانیاں دیکھیں گے اور اپنے اعمال سے واقف ہو جائیں گے اور اس لمحہ میں وہ ایمان لے آئیں گے لیکن وہ ایسا ایمان ہوگا جو ان کی حالت کے لیے ہرگز مفید نہیں ہوگا۔

---

[1] یہاں "اذا" شرطیہ ہے اور اس کی جزا محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "اذا بلغت التراقی انکشف لہ حقیقۃ الامر و وجد ما عملہ مثلاً" بلغت "کا فاعل نفس" ہے جو محذوف ہے اور قرینہ کلام سے معلوم ہو جاتا ہے۔

"تراقی" "ترقوہ" کی جمع ہے جو حلق اور گلے کے گرد کی ہڈیوں کے معنی میں ہے اور روح کا گلے تک پہنچنا، عمر کے آخری لمحوں کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جس وقت روح بدن سے نکلتی ہے تو وہ اعضاء جو دل سے زیادہ فاصلہ رکھتے ہیں (مثلاً ہاتھ پاؤں) وہ جلدی بیکار ہوجاتے ہیں، گویا روح خود کو بدن سے منقطع کرتی ہے، یہاں تک کہ گلے تک پہنچ جاتی ہے۔

اس موقع پر اس کے اردگرد کے لوگ سراسیمہ اور پریشان ہوجاتے ہیں اور اس کی نجات کی تدبیریں کرتے ہیں" اور یہ کہا جاتا ہے کہ کوئی ہے جو آکر اس بیمار کو نجات دے" (و قیل من راق)۔

یہ بات عجز، ناامیدی اور بے چارگی کی بنا پر کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ اب کام بس سے باہر ہوگیا ہے۔ اور طبیب سے بھی اب کچھ نہیں ہوسکتا۔

"راق" "ساقی" (بروزن نہی) کے مادہ سے اور "رقیہ" (بروزن خفیہ) "اوپر جانے" کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ "رقیہ" ان اور اد اور دعاؤں پر بولا جاتا ہے جو بیمار کے لیے موجب نجات ہیں، خود طبیب کو بھی اسی وجہ سے کہ وہ بیمار کو رہائی بخشتا ہے اور اسے نجات دیتا ہے "راقی" کہا جاتا ہے، اس بنا پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ مریض کے اردگرد کے لوگ اور کبھی وہ خود تکلیف کی شدت کی وجہ سے پکارتا ہے، کیا کوئی طبیب مل جائے گا؟ کیا کوئی ہے جو دعا پڑھے اور بیمار رہائی پائے۔؟

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ آیت کا معنی یہ ہے، کہ فرشتوں میں سے کون اس کی روح کو قبض کرے گا اور اوپر لے جائے گا؟ کیا عذاب کے فرشتے، یا رحمت کے فرشتے؟

اور بعض نے یہ اضافہ کیا ہے کہ چونکہ خدائی فرشتے اس قسم کے بے ایمان انسان کی روح کو قبض کرنا اور اوپر لے جانا پسند نہیں کرتے، تو ملک الموت کہتا ہے، کون ہے جو اس کی روح کو اوپر لے کر جائے؟

لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ صحیح اور سب سے زیادہ مناسب ہے۔

بعد والی آیت میں "محتضر" کی مکمل مایوسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "اس حالت میں وہ زندگی سے مطلق طور پر مایوس ہوجائیگا اور اسے دنیا کے فراق اور جدائی کا یقین ہوجائے گا" (و ظن انه الفراق)۔

"اور پاؤں کی پنڈلیاں ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھائیں گی اور موت کا لمحہ آن پہنچے گا" (والتفت الساق بالساق)۔

ان کا ایک دوسرے کے ساتھ پیچ کھانا یا تو جان کنی کی تکلیف کی شدت کی وجہ سے ہوگا، یا ہاتھ پاؤں کے بیکار ہوجانے اور ان سے روح کے نکل جانے کے نتیجہ میں ہوگا۔

اس آیت کے لیے اور تفسیریں بھی نقل کی گئی ہیں منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے۔

التفت الدنیا بالاٰخرة

"دنیا آخرت کے ساتھ لپیٹ دی جائے گی" [1]

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی یہی معنی بیان ہوا ہے۔ [2]

ابن عباس سے بھی یہی نقل ہوا ہے کہ اس سے مراد امر آخرت کی شدت میں امر دنیا سے مل جاتا ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد موت کے شدائد کا قیامت کے شدائد کے ساتھ مل جاتا ہے۔

ظاہر یہ ہے کہ یہ سب تفاسیر اسی معنی کی طرف لوٹتی ہیں جو امام باقرؑ سے نقل ہوئے ہیں۔

یہ تفسیر اس وجہ سے کی گئی ہے کہ لغت عرب میں ساق کا ایک معنی شدید حادثہ، مصیبت اور بلائے عظیم بھی ہے۔

اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد پاؤں کی پنڈلیوں کا کفن میں لپیٹا جانا ہے۔

البتہ یہ تفاسیر آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتیں اور یہ سب کی سب آیت کے معنی میں جمع ہو سکتی ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں فرماتا ہے: "اس دن تمام مخلوق کی بازگشت تیرے پروردگار کی عدالت کی طرف ہوگی" (الٰی ربك یومئذ المساق)۔

ہاں! سب کے سب اسی کی طرف لوٹیں گے اور اس کی دادگاہ عدل میں حاضر ہوں گے اور تمام راستے اس پر جاکر ختم ہو جائیں گے۔

یہ آیت مسئلہ معاد و قیامت اور بندوں کی عمومی رستاخیز پر ایک تاکید بھی ہے اور اس کی ذات پاک کی طرف مخلوق کی حرکت تکاملی کے رخ کرنے کا اشارہ بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ ایک ایسی ذات ہے جو ہر لحاظ سے غیر متناہی ہے۔

ایک نکتہ

موت کا دردناک لمحہ

جیسا کہ ہم جانتے ہیں قرآن بار بار موت کے مسئلہ کی بات کرتا ہے اور انسانوں کو خبردار کرتا ہے کہ ان سب کو اس قسم کا لمحہ درپیش ہے کبھی تو اسے "سکرة الموت" (موت کی حالت کی مستی اور تنگی) سے تعبیر کیا ہے [3]

اور کبھی "غمرات الموت" یعنی موت کے شدائد" سے تعبیر کیا ہے [4]

کبھی "روح کے حلق تک پہنچنے" کی تعبیر کی ہے [5] اور کبھی "روح کی تراقی تک پہنچنے کی تعبیر ہے، یعنی گلے کے گرد کی ہڈیوں تک۔

---

[1] [2] "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۶۵

[3] وجاءت سکرة الموت بالحق۔ (ق — ۱۹)

[4] سورۂ انعام ۹۳

[5] فلولا اذا بلغت الحلقوم (واقعہ — ۸۳)

(زیرِ بحث آیات)۔

ان تمام باتوں سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ لمحہ ——— بعض مادئیین کے کہنے کے برخلاف ——— سخت اور دردناک لمحہ ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ وہ اس جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال کا لمحہ ہوگا۔ یعنی جس طرح انسان کے عالم جنین (شکم مادر) سے عالم دنیا کی طرف انتقال کا لمحہ بہت زیادہ درد اور تکلیف سے وابستہ ہوتا ہے، دوسرے جہان کی طرف انتقال بھی طبعی طور پر ایسا ہی ہوگا۔

لیکن اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لمحہ پے مومنین پر آسانی کے ساتھ گزر جائے گا، جبکہ بے ایمان افراد کے لیے سخت دردناک ہوگا یہ اس بناء پر ہوگا کہ پروردگار کی لقاء اور اس کی بے پایاں رحمت اور نعمتوں کا شوق پہلے گروہ کو اس طرح اپنے آپ سے بے خود کر دے گا کہ وہ انتقال کے لمحہ کی تکلیف کو محسوس ہی نہیں کرے گا۔

جبکہ دوسرے گروہ کے لیے سزا کی وحشت ایک طرف سے اور اس دنیا کے فراق کی مصیبت جس سے اس نے دل لگایا ہوا تھا، دوسری طرف سے دنیا کے انتقال کے لمحہ کی تکلیفوں کو کئی گنا کر دے گا۔

ایک حدیث میں امام علی بن الحسین سے آیا ہے، جب آپ سے موت کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا:

"موت مومن کے لیے میلے کچیلے جوؤں سے بھرے ہوئے لباس کو اتارنے اور سنگین اور وزنی طوق اور زنجیروں کو کھولنے، اور انہیں بہترین لباسوں، خوشبو ترین عطروں، تیز رو سواریوں اور مرفہ ترین مکانوں سے تبدیل کرنے کے مانند ہے اور کافر کے لیے ایک فاخرہ لباس اتارنے، مرفہ مکانوں سے نقل مکانی کرنے اور اس کے کثیف ترین اور سخت ترین لباسوں، وحشت ناک ترین مکانوں اور عظیم ترین عذابوں میں بدل جانے کے مانند ہے۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے موت کی تعریف کرنے کی درخواست کی، تو آپ نے فرمایا:

للمؤمن کالطیب ریح یشمہ فینعس لطیبہ و ینقطع التعب والالم کلہ عنہ، وللکافر کلسع الافاعی ولدغ العقارب او اشد!

"مومن کے لیے تو بہت ہی خوشبودار عطر کی مانند ہے، جسے سونگھنے سے نیند کے مانند کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے اور درد اور تکلیف کلی طور پر اس سے منقطع ہو جاتا ہے اور کافر کے لیے سانپوں اور بچھوؤں کے کاٹنے کی مانند ہے یا اس سے بھی زیادہ شدید۔"[2]

بہر حال موت عالم بقاء کے لیے ایک دریچہ ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں علیؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

لکل دار باب و باب دار الآخرۃ الموت

"ہر گھر کا ایک دروازہ ہوتا ہے اور آخرت کے گھر کا دروازہ موت ہے۔"[3]

---

[1] بحار الانوار، جلد ۶ ص ۱۵۵

[2] وہی مدرک، ص ۱۵۲

[3] "شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۲۰ ص ۲۴۵

ہاں! موت کی طرف توجہ، شہوات کے توڑنے، لمبی چوڑی آرزوؤں کو توڑنے ، اور آئینۂ دل سے غفلت کا زنگ اتارنے میں ایک گہرا اثر رکھتی ہے، اسی لیے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"ذکر الموت یمیت الشهوات فی النفس و یقلع منابت الغفلة و یقوی القلب بمواعد الله و یرق الطبع، و یکسر اعلام الهوی، و یطفی نار الحرص، و یحقر الدنیا، و هو معنی ما قال النبی (ص) فکر ساعة خیر من عبادة سنة"

موت کی یاد انسان کے اندر سرکش شہوتوں کو مار دیتی ہے اور غفلت کی جڑوں کو دل سے اکھاڑ دیتی ہے، دل کو خدائی وعدوں کے ساتھ تقویت بخشتی ہے، اور انسان کی طبیعت میں نرمی اور لطافت پیدا کرتی ہے ہوا پرستی کی نشانیوں کو توڑ دیتی ہے حرص کی آگ کو بجھا دیتی ہے اور دنیا کو انسان کی نظروں میں حقیر بنا دیتی ہے اور اس بات کا مطلب جو پیغمبرؐ نے فرمائی تھی یہی ہے: ایک ساعت کی فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔[1]

البتہ اس سے مراد غور و فکر کرنے کے ایک واضح مصداق کو بیان کرنا ہے، نہ یہ کہ غور و فکر کرنے کا موضوع بس اسی میں منحصر ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اور بحث جلد ۱۷ ص ۵۱۹ پر (سورۂ ق کی آیہ ۱۹ کے ذیل میں) گزر چکی ہے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۶ ص ۱۳۳

۳۱۔ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰی ۝

۳۲۔ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۝

۳۳۔ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓی اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰی ۝

۳۴۔ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ۝

۳۵۔ ثُمَّ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ۝

۳۶۔ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًی ۝

۳۷۔ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰی ۝

۳۸۔ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ۝

۳۹۔ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰی ۝

۴۰۔ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ يُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی ۝

ترجمہ

۳۱۔ وہ ہرگز ایمان نہیں لایا اور نہ اس نے نماز پڑھی۔

۳۲۔ بلکہ اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی۔

۳۳۔ پھر وہ اپنے گھر والوں کی طرف متکبرانہ چال سے قدم اٹھاتے ہوئے پلٹ گیا۔

۳۴۔ عذاب الٰہی تیرے لیے زیادہ شائستہ ہے، زیادہ شائستہ۔

۳۵۔ پھر بھی عذاب الٰہی ہی تیرے لیے زیادہ شائستہ ہے، زیادہ شائستہ۔

۳۶۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے یونہی فضول اور بغیر کسی مقصد کے چھوڑ دیا جائے گا؟

۳۷۔ کیا وہ اس منی کا نطفہ نہیں تھا جو رحم میں ڈالا جاتا ہے۔؟

۳۸۔ پھر اس نے جمے ہوئے خون کی صورت اختیار کرلی۔ پھر اس کو خلق کیا اور موزوں بنایا۔

۳۹۔ اور اس سے دو جوڑے مذکر و مؤنث بنائے۔

۴۰۔ کیا ایسی ہستی اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو زندہ کر دے۔

تفسیر

وہ خدا جس نے انسان کو ایک ناچیز نطفہ سے پیدا کیا

گزشتہ آیات میں آچکے ہیں، زیر بحث آیات موت سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے، جو سفر آخرت کا پہلا قدم ہے اور وہ

میں، کافروں کے اس توشہ مسافرت سے خالی ہاتھ ہونے کی بات کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "یہ منکر معاد انسان ہرگز ایمان نہیں لایا، نہ ہی اس نے آیات خدا کی تصدیق کی، اور نہ ہی اس کے لیے نماز پڑھی" (فلا صدّق ولا صلّی)۔[1]

"بلکہ اس نے تکذیب کی راہ اختیار کی، اور حکم خدا کی طرف سے پشت پھیر لی" (ولکن کذّب وتولّی)۔

"فلا صدّق" کے جملے سے مراد قیامت، حساب و کتاب، جزا و سزا، آیات الٰہی، توحید، نبوت اور پیغمبر اسلام کی تصدیق نہ کرنا ہے، لیکن بعض نے اسے، اس کے نماز کے ساتھ ذکر ہونے کے باعث، کنجوس کی طرف سے "انفاق و صدقہ" کو ترک کرنے کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

لیکن دوسری آیت اچھی طرح سے اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اس تصدیق کا نقطۂ مقابل تکذیب ہے۔ اس بناء پر پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "پھر وہ اپنے گھر والوں کی طرف پلٹ گیا جبکہ وہ متکبرانہ چال کے ساتھ چل رہا تھا" (ثم ذھب الی اھلہ یتمطّی)۔

وہ اس گمان میں کہ اس نے بے اعتنائی اور پیغمبر اور آیات الٰہی کی تکذیب کی بناء پر اہم کامیابی حاصل کر لی ہے، بادۂ غرور سے مست اپنے گھر والوں کی طرف آرہا تھا تاکہ معمول کے مطابق ان افتخار آمیز مسائل کو جو گھر سے باہر رونما ہوئے تھے ان کے سامنے بیان کرے، یہاں تک کہ اس کا چلنا اور اس کے جسم کے اعضاء کی حرکت، سب ہی اس کے کبر و غرور کو بیان کر رہے تھے۔

---

[1] "صدّق و صلّی" کے جملوں میں جو ضمیر ہے وہ معاد کے منکر انسان کی طرف لوٹتی ہے جو کلام کے لب و لہجہ سے سمجھا جاتا ہے، اور سورہ کے آغاز میں بھی اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

"یتمطی" "مطی" کے مادہ سے اصل میں پشت کے معنی میں ہے اور "تمطی" بے اعتنائی، غرور یا تھکان اور بے حالی سے پشت کو کھینچنے کے معنی میں ہے اور یہاں وہی پہلا معنی مراد ہے۔

بعض اس کو "مط" (بروزن خط) کے مادہ سے، پاؤں یا باقی اعضاء بدن کو بے اعتنائی یا تھکان کے اظہار کے وقت کھینچنے کے معنی میں لیتے ہیں۔ لیکن اس کا "مطا" سے اشتقاق ظاہر لفظ کے ساتھ زیادہ مناسب ہے[1]

بہر حال یہ مطلب اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ "مطففین" کی آیہ ۳۱ میں آیا ہے: واذا انقلبوا الی اهلهم انقلبوا فکهین: جس وقت وہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ کر جاتے ہیں تو استہزاء کے طور پر مومنین کے بارے میں باتیں کرتے ہیں۔

پھر اس قسم کے بے ایمان افراد کو مخاطب کرتے ہوئے تہدید کے طور سے کہتا ہے: "عذاب الٰہی تیرے لیے زیادہ مناسب ہے اور زیادہ مناسب ہے" (اولی لك فاولی)۔

"پھر بھی عذاب الٰہی ہی تیرے لیے زیادہ مناسب ہے اور زیادہ مناسب ہے" (ثم اولی لك فاولی)۔

مفسرین نے اور دوسری متعدد تفاسیر بھی اس آیت کے لیے بیان کی ہیں منجملہ ان کے یہ ہیں کہ:

یہ ان کے لیے ایک تہدید ہے کہ تجھ پر عذاب ہو اور پھر تجھ پر عذاب ہو۔

یا یہ حالت جو تو رکھتا ہے یہی تیرے لیے زیادہ لائق ہے اور زیادہ لائق ہے۔

یا سرزنش اور مذمت تیرے لیے بہتر ہے اور پھر بہتر ہے۔

یا وائے ہو تجھ پر اور پھر بھی وائے ہو تجھ پر

یا دنیا کی نیکیاں تجھ سے دور ہیں اور آخرت کی بھلائیاں بھی تجھ سے دور ہیں۔

یا شر و عذاب تجھے دامن گیر رہے اور پھر شر و عذاب تجھے دامن گیر رہے۔

یا جس عذاب کا میدان بدر میں تو نے مشاہدہ کیا ہے وہ تیرے لیے اس دنیا میں زیادہ مناسب ہے اور قبر و قیامت کا عذاب بھی تیرے لیے زیادہ مناسب ہے[2]

---

[1] کیونکہ اگر "مطا" کے مادہ سے ہو تو پھر تو ظاہر لفظ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن اگر "مط" کے مادہ سے ہو تو پھر "یتمطی" کا مادہ اصل میں "یتمطط" تھا جس کی آخری "طاء" "یاء" کے ساتھ تبدیل ہو گئی ہے۔

[2] بعض تفاسیر کے مطابق یہاں "اولی" "افعل تفضیل" ہے اور بعض کے مطابق "اولی" "فعل ماضی" ہے، باب افعال سے "ولی" کے مادہ سے اور جملہ کا مفہوم اس طرح سے ہوگا "قاربك الله العذاب" اور بعض نے یہ کہا ہے کہ "اولی" اسماء افعال سے ہے اور "قارب" کا معنی رکھتا ہے لیکن مناسب وہی پہلا معنی ہے۔ (البیان فی غریب اعراب القرآن، روح المعانی، المیزان اور مجمع البیان کی طرف رجوع کریں)۔

لیکن یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ ان معانی میں سے اکثر ایک ہی اور واضح معنی کی طرف لوٹتے ہیں، جو عذاب، مذمت، شر اور عقاب کی تہدید کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے، چاہے وہ عذاب دنیا ہو یا عذاب برزخ و قیامت۔

روایات میں آیا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجہل کا ہاتھ پکڑا (اور بعض روایات کے مطابق اس کا گریبان پکڑا) اور فرمایا:

اولی لك فاولی ثم اولی لك فاولی

تو ابوجہل نے کہا:

"مجھے کس چیز کی دھمکی دیتے ہو تم اور تمہارا پروردگار مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، میں اس سرزمین کے قدرت مند ترین افراد میں سے ہوں"۔

اس موقع پر یہی جملے پیغمبر پر آیات کی صورت میں نازل ہوئے۔[1]

اس کے بعد قیامت کے بارے میں دو بہت ہی عمدہ استدلال پیش کرتا ہے، جن میں سے ایک تو "خلقت کے ہدف اور خدا کی حکمت" کے بیان کے طریق سے ہے اور دوسرا عالم جنین کے مختلف مراحل میں انسانی نطفہ کی تبدیلیوں اور تکامل وارتقاء کے استناد سے اس کی قدرت کے بیان کے طریق سے۔

پہلے فرماتا ہے: "کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے فضول اور بے مقصد چھوڑ دیا جائے گا" (ایحسب الانسان ان یترك سدی)۔

"سدی" (بروزن ہدیٰ) مہمل، فضول، بے ہودہ اور بے مقصد کے معنی میں ہے۔ عرب کہتے ہیں "ابل سدی" اس اونٹ کے بارے میں جو ساربان کے بغیر چھوڑ دیا گیا ہو اور جہاں چاہے چرنے کے لیے چلا جائے۔

اس آیت میں "انسان" سے مراد وہی انسان ہے، جو معاد و قیامت کا منکر ہے، آیت کہتی ہے کہ اسے کیسے یقین آگیا کہ خدا نے اس وسیع و عریض عالم کو تو اس عظمت اور ان تمام عجائبات کے ساتھ انسان کے لیے پیدا کیا ہے، لیکن خود انسان کی خلقت میں کوئی ہدف اور مقصد نہ رکھا ہو۔ یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ انسان کے اعضاء میں سے ہر عضو تو کسی خاص ہدف اور مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہو، آنکھ دیکھنے کے لیے، کان سننے کے لیے اور دل غذا، آکسیجن اور پانی تمام بدن کے سلولوں تک پہنچانے کے لیے، یہاں تک کہ انسان کی انگلیوں کے پوروں کی لکیریں بھی حکمت و فلسفہ رکھتی ہیں لیکن اس کے پورے وجود کا کوئی ہدف و مقصد نہ ہو اور وہ یونہی فضول، مہمل اور کسی امر و نہی اور ذمہ داری اور مسئولیت کے پروگرام کے بغیر ہی پیدا کر دیا گیا ہو؟

ایک عام آدمی بھی اگر ایک چھوٹی سی چیز بغیر کسی مقصد کے بنائے تو اس پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کا نام عقل مند انسانوں کی فہرست سے خارج کر دیتے ہیں تو پھر حکیم علی الاطلاق خدا سے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس قسم کی بے مقصد مخلوق کو پیدا کرے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۱۹۱

اب اگر یہ کہا جائے کہ ہدف و مقصد یہی دنیا کی چند روزہ زندگی ہے۔ یہی بار بار کا کھانا اور سونا، جس میں ہزاروں قسم کے درد اور تکلیفیں ملی ہوئی ہیں، تو یقیناً یہ ایسی چیز نہیں ہے جو اس عظیم خلقت کی توجیہ کر سکے۔

اس بناء پر ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ انسان ایک عظیم ترین ہدف، یعنی جوار قرب رحمت حق تعالیٰ میں جاودانی زندگی اور بے وقفہ اور بے پایاں تکامل و ارتقاء کے لیے پیدا ہوا ہے۔[1]

اس کے بعد دوسری دلیل کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "کیا انسان ابتداء میں منی کا ایک نطفہ نہیں تھا، جو رحم میں ڈالا جاتا ہے" (الم یک نطفۃ من منی یمنی)۔

"پھر اس مرحلہ کے بعد جمے ہوئے خون کی صورت اختیار کی اور خدا نے اسے نئی خلقت بخشی اور موزوں بنایا" (ثم کان علقۃ فخلق فسوٰی)۔

"پھر اس مرحلہ میں بھی توقف نہ رہا، خدا نے اسی نطفہ سے دو جفت مرد و عورت پیدا کیے" (فجعل منہ الزوجین الذکر والانثیٰ)۔

کیا وہ ہستی، جو ایک چھوٹے سے حقیر و ناچیز نطفہ کو ظلمت کدہ رحم مادر میں، ہر روز ایک نئی آفرینش عطا کرتی ہے اور حیات و زندگی کا ایک نیا لباس اسے پہناتی ہے، اور ایک نئے سے نیا چہرہ اسے دیتی ہے، یہاں تک کہ وہ ایک کامل مذکر و مؤنث انسان ہو جاتا ہے اور ماں سے متولد ہوتا ہے، تو کیا ایسی ذات مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے!؟" (الیس ذالک بقادر علی ان یحیی الموتیٰ)۔

یہ بیان حقیقت میں ایسے منکرین کے مقابلہ میں ہے جو معاد جسمانی کے مسئلہ میں عام طور پر اس کے محال ہونے کا دم بھرتے ہیں اور مرنے اور خاک ہو جانے کے بعد زندگی کی بازگشت کے امکان کی نفی کرتے ہیں اور قرآن اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے انسان کا ہاتھ پکڑ کر اسے اس کی خلقت کے آغاز کی طرف پلٹاتا ہے۔ جنین کے عجیب و غریب مرحلے اور ان مرحلوں میں، انسان کی حیرت انگیز تبدیلیاں کی، اسے نشاندہی کراتا ہے۔ تاکہ وہ جان لے کہ خدا ہر چیز پر قادر و توانا ہے، اور دوسرے لفظوں میں کسی چیز کے وقوع کی بہترین دلیل اس کا وقوع میں آ جانا ہے۔

---

[1] ہم نے اس مسئلہ میں ایک اور بحث سورۂ مومنون کی آیہ ۱۱۵ کے ذیل میں (جلد ۸ ص ۲۰۰ پر) بیان کی ہے۔

چند نکات

جنین کی تبدیلیاں یا بار بار کی رستاخیز

"نطفہ" اصل میں تھوڑے یا صاف پانی کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد پانی کے ان قطرات پر بولا جانے لگا جو لقاح اور جفتی کرنے کے طریقے سے انسان یا حیوان کی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔

حقیقت میں نطفہ کا جنینی دور میں مختلف مراحل میں تبدیل ہونا، عالم ہستی کے عجیب ترین مراحل میں سے ہے جو "جنین شناسی" کے علم کا موضوع ہے اور آخری صدیوں میں اس کے اسرار سے بہت زیادہ حد تک پردہ اٹھ چکا ہے۔

قرآن نے اس زمانہ میں جبکہ ابھی تک یہ مسائل واضح نہیں ہوئے تھے۔ بارہا خدا کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک ہونے کے تحت اس کا ذکر کیا ہے، اور یہ بات خود اس عظیم آسمانی کتاب کی عظمت کی ایک نشانی ہے۔

اگرچہ ان آیات میں صرف جنین کے بعض مراحل ذکر ہوئے ہیں، لیکن قرآن کی دوسری آیات میں مثلاً سورۂ حج کے آغاز کی آیات اور سورہ مومنون کے اوائل میں بہت سے مراحل بیان ہوئے ہیں اور ہم نے ان آیات کے ذیل میں اس ضمن میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے[1]

" ذالك " جو اسم اشارہ بعید ہے، خدا کے لیے اس کے مقام کی عظمت سے کنایہ ہے، اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی پاک ذات اس قدر بلند ہے کہ وہ افکار بشر کی دسترس سے باہر ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ جس وقت الیس ذالك بقادر علی ان یحیی الموتی : کیا خدا ان تمام توانائیوں کے ساتھ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ مردوں کو زندہ کرے" ؟ کی آیات نازل ہوئیں ؟ تو رسولِ خدا نے فرمایا:

سبحانك اللّٰھم و بلی

"اے خدا! تیری ذات پاک ہے، بیشک تو یہ توانائی رکھتا ہے"

یہی معنی امام باقرؑ اور امام صادقؑ سے بھی نقل ہوا ہے۔[2]

۲۔ جہانِ بشریت میں نظامِ جنسیت

ان تمام باتوں کے باوجود، جو جنین کی جنسیت کے عوامل کے بارے میں ہوئی ہیں اور اس بارے میں کہ کن امور کے ماتحت "مذکر" یا "مونث" کی جنس میں تبدیلی ہوتی ہے، ابھی تک کوئی شخص ٹھیک طرح سے نہیں جانتا کہ اس کے عوامل اصلی کیا ہیں؟

یہ ٹھیک ہے کہ بعض مواد غذائی یا چند ایک دوائیاں ممکن ہے کہ اس مسئلہ میں بے اثر ہوں، لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یقینی طور پر تعین کنندہ شمار نہیں ہوتی، دوسرے لفظوں میں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا علم خدا ہی کے پاس ہے۔

دوسری طرف تمام معاشروں میں ہمیشہ ایک تعادل نسبی ان دونوں صنفوں کے درمیان نظر آتا ہے۔ اگرچہ اکثر معاشروں میں عورتوں کی تعداد کچھ زیادہ

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۷

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۰۲

ہوتی ہے اور بعض معاشروں میں شاذ و نادر مردوں کی تعداد کچھ زیادہ ہوتی ہے لیکن مجموعی طور پر ان دونوں اصناف میں ایک تعادل نسبی پایا جاتا ہے۔

اگر فرض کریں کہ کوئی ایسا وقت آجائے کہ یہ تعادل اور برابری ٹوٹ جائے اور مثلاً عورتوں کی تعداد مردوں سے دس گنا ہو جائے یا مردوں کی تعداد عورتوں سے دس گنا ہو جائے تو پھر خود دیکھیے کہ انسانی معاشرے کا نظام کس طرح درہم برہم ہو سکتا ہے اور اس طرح سے کیسے عجیب و غریب مفاسد وجود میں آئیں گے کہ ہر ایک عورت کے مقابلہ میں دس مرد ہوں گے یا پھر دس عورتوں کے مقابلہ میں ایک مرد ہو تو کیسا جنجال برپا ہونے کا خطرہ ہے اوپر والی آیات جو کہتی ہیں: فجعل منه الزوجين الذكر والانثى تو یہ ان دونوں موضوعات کی طرف ایک لطیف اور سربستہ اشارہ ہے: ایک طرف تو انسانوں کے پراسرار تنوع اور ان کے جنسی مذہب میں ان دو جنسوں میں تقسیم ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اور دوسری طرف اس تعادل نسبی[1] اور برابری کی طرف اشارہ ہے۔

خداوندا! ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ ایک ہی لحہ میں تمام مردوں کو حیات و زندگی کا لباس پہنا دے، کوئی بھی چیز تیری قدرت کے مقابلہ میں مشکل اور پیچیدہ نہیں ہے۔

پروردگارا! جس دن ہم موت کے نزدیک پہنچ جائیں گے، اور ہم ہر چیز سے قطع امید کرلیں گے، تیری پاک ذات ہی ہماری امید ہے۔

بارالہا! ہمیں خلقت و آفرینش کے ہدف سے آشنا فرما۔

آمین یا رب العالمین

سورۂ قیامت کا اختتام

۷ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ

۲۰ صفر ۱۴۰۸ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۷ء

بروز بدھ وقت تقریباً ساڑھے سات بجے شب

۱۱ ر ای ماڈل ٹاؤن ـــــــ لاہور

صفدر حسین نجفی

---

[1] یہ جو مشہور ہے کہ ہر معاشرے میں عورتوں کی تعداد مردوں کی نسبت زیادہ ہوتی ہے اور اسے وہ تعدد ازدواج کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں۔ قابل قبول ہے، لیکن یہ بات تعادل نسبی کے ساتھ منافات نہیں رکھتی مثال کے طور پر ایک معاشرے میں ۵ ملین افراد ہیں، جن میں سے کل ساڑھے ۲ ملین عورتیں اور ۲۴۸ ملین مرد ہوں یعنی ان دونوں کا فرق بڑا یا اس سے بھی کم کا ہو۔ لیکن یہ بات کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے کئی گنا زیادہ ہو کسی بھی معاشرے میں نہیں دیکھی گئی۔

سورۂ انسان (دہر)

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوئی
اور
اس کی ۳۱ آیات ہیں

تاریخ شروع

۷ ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ

سورۂ انسان (دہر) کے مضامین

یہ سورہ مختصر ہونے کے باوجود عمیق، متنوع اور جامع مضامین رکھتا ہے اور ایک لحاظ سے اسے پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے حصہ میں: انسان کی آفرینش اور اس کی نطفۂ امشاج (ملے جلے) سے خلقت اور پھر اس کی ہدایت اور ارادہ کی آزادی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے۔

دوسرے حصہ میں ابرار اور نیک افراد کے اجر و ثواب کے بارے میں گفتگو ہے، جو اہل بیت کے بارے میں ایک خاص شان نزول رکھتا ہے، جس کی طرف اشارہ ہوگا۔

تیسرے حصہ میں ان ثوابوں کے استحقاق کے دلائل کو مختصر اور موثر جملوں میں بیان کرتا ہے۔

چوتھے حصہ میں قرآن کی اہمیت، اور اس کے احکام کے اجراء کے طریقہ اور خود سازی کی نشیب و فراز سے بھری ہوئی راہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

اور پانچویں حصہ میں (انسان کے مختار ہونے کے باوجود) مشیت الٰہی کی حاکمیت کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔

اس سورہ کے متعدد نام ہیں جن میں سے زیادہ مشہور سورۂ "انسان" اور سورۂ "دہر" اور سورۂ "ہل اتیٰ" ہے، جن میں سے ہر ایک اس سورہ کے اوائل کے الفاظ سے لیا گیا ہے۔ اگرچہ ان روایات میں جو بعد میں اس سورہ کی فضیلت کے متعلق بیان ہوں گی، صرف "ہل اتیٰ" کا ذکر آیا ہے۔

کیا یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے؟

اس بارے میں کہ سورہ "ہل اتیٰ" مدنی ہے یا مکی؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے، لیکن شیعہ علماء و مفسرین کا اجماع و اتفاق اس بات پر ہے کہ سارا کا سارا سورہ، یا کم از کم سورہ کے آغاز کی آیات کا وہ حصہ جو ابرار کے مقام اور ان کے اعمال صالح کو بیان کرتا ہے، وہ مدینہ میں نازل ہوا ہے، جس کا شانِ نزول، یعنی علیؑ، فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور فضہ کے نذر کرنے کی داستان تفصیل کے ساتھ بیان ہوگی اور اسی طرح سے علماء اہلِ سنت کے درمیان بھی مشہور اس کا مدینہ میں نزول ہی ہے جیسا کہ اہلِ سنت کے مشہور مفسر قرطبی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں۔

وقال الجمھور مدنیة

"مشہور علماء کا نظریہ اور عقیدہ یہ ہے کہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے"۔[1]

---

۱ تفسیر قرطبی، جلد ۱۰، ص ۶۹۰۹

ان علماء میں سے جو اس ساری سورت کو یا اس کی آیات کے ایک حصہ کو ــــــــ جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے ــــــــ مدنی سمجھتے ہیں، ذیل کے علماء کا نام لیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حاکم ابوالقاسم حسکانی نے ابن عباس سے ان آیات کی تعداد جو کہ مکہ اور مدینہ میں نازل ہوئی ہیں، بالترتیب تفصیل کے ساتھ نقل کی ہیں اور اس سورہ کو مدنی سورتوں میں شمار کیا ہے، جو سورۂ رحمٰن کے بعد اور سورۂ طلاق سے پہلے نازل ہوا ہے[۱]

صاحب کتاب "ایضاح" استاد احمد زاہد نے بھی یہی معنی ابن عباس سے نقل کیا ہے[۲]

۲۔ "تاریخ القرآن" میں ابوعبداللہ زنجانی نے کتاب "نظم الدرر و تناسق الآیات والسور" سے اہل سنت کے بزرگوں کی ایک جماعت سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے سورۂ انسان کو مدنی سورتوں کی ردیف میں شمار کیا ہے[۳]

۳۔ اور اسی کتاب میں "فہرست ابن ندیم" سے بھی ابن عباس ہی سے یہ نقل ہوا ہے کہ وہ سورہ ہل اتی کو گیارہویں مدنی سورت شمار کرتے ہیں[۴]

۴۔ سیوطی نے "اتقان" میں بیہقی کی "دلائل النبوت" سے عکرمہ سے نقل کیا ہے کہ سورۂ ہل اتی مدینہ میں نازل ہوا ہے[۵]

۵۔ "در المنثور" میں بھی یہی مضمون ابن عباس سے مختلف طریقوں سے نقل ہوا ہے[۶]

۶۔ زمخشری نے "تفسیر کشاف" میں اس سورہ کی ابتدائی آیات کا مشہور شانِ نزول علیؑ اور ان کی زوجہ محترمہ اور ان کے بچوں کی نذر کے بارے میں نقل کیا ہے[۷]

۷۔ مذکورہ بالا موارد کے علاوہ اہل سنت کے دوسرے بزرگ علماء کی ایک کثیر جماعت نے اس سورہ کی ابتدائی آیات (ان الابرار ...) کا نزول علیؑ، فاطمہ زہراؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے بارے میں نقل کیا ہے، جو اس بات کی شہادت ہے کہ یہ سورہ مدنی ہے (کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی ولادت مدینہ میں ہوئی ہے)۔ مثلاً واحدی نے "اسباب النزول" میں، بغوی نے "معالم التنزیل" میں، سبط ابن جوزی نے "تذکرہ" میں، گنجی شافعی نے "کفایت الطالب" میں، اور بہت سے دوسرے علماء نے[۸]

یہ مسئلہ اس قدر مشہور و معروف ہے کہ (اہل سنت کے چار اماموں میں سے ایک) "محمد بن ادریس شافعی" اپنے مشہور اشعار میں کہتے ہیں:

الیٰ م الیٰ م و حتی متی ؟   اعاتب فی حب ھذا الفتی

---

[۱] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۰۵۔

[۲] گزشتہ مدرک

[۳] تاریخ القرآن ص ۵۵

[۴] تاریخ القرآن

[۵] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۲۱۱

[۶] کشاف جلد ۴ ص ۶۷۰

[۸] احقاق الحق جلد ۳ ص ۱۵۷ تا ۱۷۰ (کتابوں کے نام اور مصنفات کے ذکر کے ساتھ)۔

وفی غیرہ ھل اتی ؛ وھل زوجت فاطمہ غیرہ ؛

کب تک، کس وقت تک اور کس زمانہ تک:

مجھے اس جوان مرد کی محبت میں سرزنش کرتے رہو گے

کیا فاطمہ کی اس کے علاوہ کسی اور سے شادی ہوئی ہے؟

اور کیا سورۂ ہل اتی اس کے علاوہ کسی اور کے بارے میں نازل ہوئی ہے[1]

اس سلسلہ میں اور بھی بہت سے مدرک موجود ہیں، جن کے ایک حصہ کی طرف ہم ان الابرار یشربون ...... والی آیات کا شانِ نزول بیان کرتے وقت اشارہ کریں گے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بعض متعصب افراد کا اصرار ہے کہ اس سورہ کو مکی کہیں اور مدینہ میں اس کے نزول کی تمام روایات کا اور اسی طرح اس سورہ کے علیؑ، فاطمہؑ اور حسنینؑ کے بارے میں نزول کا انکار کریں۔

واقعاً عجیب بات ہے کہ جب کوئی آیت یا روایت علیؑ اور اہل بیتؑ کے فضائل بیان کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے تو ایک گروہ داد و فریاد جنگ کرنے لگ جاتا ہے اور حد سے زیادہ حساسیت دکھانے لگتا ہے، گویا کہ اسلام خطرے میں پڑ گیا ہے۔

حالانکہ وہ خود یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ علیؑ کو خلفاء راشدین اور اسلام کے عظیم پیشواؤں میں سے سمجھتے ہیں اور اہل بیت کے بارے میں بھی اظہار عقیدت کرتے ہیں۔ ہمارے نظریہ کے مطابق یہ تعصب اس گروہ کے افکار پر روح اموی کی حاکمیت کا نتیجہ ہے اور اسی شوم دشمنوں والے پروپیگنڈوں کی پیداوار ہے۔ خدا ہم سب کو اسی قسم کے اشتباہات سے محفوظ رکھے۔

سورۂ انسان (دھر) کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

من قرأ سورة "ھل اتی" کان جزاؤہ علی اللّٰہ جنۃ وحریرًا

"جو شخص سورۂ ہل اتی کو پڑھے گا اس کی جزا اور ثواب خدا پر جنت اور جنت کے ریشمی لباس ہیں"[2]

اور ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے:

"جو شخص ہر جمعرات کی صبح کو سورۂ ہل اتی پڑھے گا، اس کی جزاؤں میں سے ایک جزا یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن پیغمبرؐ خدا کے ساتھ ہوگا"[3]

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۷۰

[2-3] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۰۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

۱۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا○

۲۔ اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا○

۳۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا○

۴۔ اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَاۡ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا○

ترجمہ

رحمن و رحیم خدا کے نام سے

۱۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ انسان پر ایک طویل زمانہ ایسا گزرا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر شے نہیں تھا؟

۲۔ ہم نے انسان کو ملے جلے نطفہ سے پیدا کیا ہے، ہم اس کو آزمائیں گے (اس لیے) ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا قرار دیا ہے۔

۳۔ ہم نے اسے راستے کی نشاندہی کردی ہے، اب چاہے وہ شاکر ہو جائے (اور قبول کرلے) یا کفران کرے۔

۴۔ ہم نے کفار کے لیے زنجیریں، طوق اور جلانے والے شعلے تیار کر رکھے ہیں۔

تفسیر

ہم نے ناچیز نطفہ کو انسان بنا دیا، اور ہدایت کے تمام ذرائع اس کے اختیار میں دے دیئے

اس کے باوجود کہ اس سورہ کے زیادہ تر مباحث قیامت اور جنت کی نعمتوں کے بارے میں ہیں، لیکن اس کی ابتدا میں گفتگو انسان کی خلقت کے بارے میں ہے، کیونکہ اس زمینہ ساز خلقت کی طرف توجہ کرنا قیامت و معاد کی طرف توجہ کرنا ہے۔ جیسا کہ ہم سورہ قیامت کی تفسیر میں اس سے چند صفحہ پہلے تشریح کر چکے ہیں۔

فرماتا ہے: "کیا ایسا نہیں ہے کہ انسان پر ایک طویل زمانہ ایسا گزرا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا" (ھل اتی علی الانسان حین من الدھر لم یکن شیئاً مذکوراً)۔

ہاں! اس کے وجود کے ذرات میں سے ہر ذرہ کسی گوشہ میں بکھرا پڑا تھا۔ مٹی کے درمیان، دریاؤں اور سمندروں کے پانی کے قطروں میں، اس ہوا میں جو زمین کی فضا میں موجود ہے، اس کے وجود کا اصلی مادہ ہر ایک ان تینوں وسیع محیطوں کے کسی ایک گوشہ میں پڑا ہوا تھا، اور وہ حقیقت میں ان کے درمیان گم شدہ اور بالکل قابلِ ذکر نہیں تھا۔

کیا یہاں "انسان" سے مراد نوعِ انسانی ہے، اور یہ تمام افرادِ بشر کو شامل ہے؟ یا اس سے خاص طور [illegible] مراد ہیں؟

بعد والی آیت جو یہ کہتی ہے کہ ہم نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا ہے، وہ پہلے معنی پر ایک واضح اور روشن قرینہ ہے، اگرچہ بعض کا نظریہ یہ ہے کہ "انسان" پہلی آیت میں حضرت آدمؑ کے معنی میں ہے اور دوسری آیت میں اولادِ آدم کی طرف اشارہ ہے لیکن اس مختصر سے فاصلہ میں یہ جدائی بعید نظر آتی ہے۔

"لم یکن شیئاً مذکوراً" (کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھا) کے جملہ کی تفسیر میں اور دوسرے [illegible] کا بھی اظہار ہوا ہے، منجملہ ان کے یہ ہے کہ: انسان جب عالمِ نطفہ میں تھا اور جنین تھا تو وہ کوئی قابلِ ذکر وجود نہیں تھا، لیکن بعد میں جب اس نے تکامل و ارتقاء کے مراحل طے کر لیے تو وہ ایک قابلِ ذکر وجود میں تبدیل ہو گیا۔

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"انسان" "علمِ خدا میں" مذکور تھا، اگرچہ "عالمِ خلق" میں مذکور نہیں تھا"۔[2]

بعض تفاسیر میں یہ بھی آیا ہے کہ یہاں "انسان" سے مراد علماء اور دانشمند ہیں، جو علم کے حاصل کرنے سے پہلے قابلِ ذکر نہیں تھے لیکن علم حاصل کرنے کے بعد، زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی، تمام لوگوں کے درمیان ہر جگہ ان کا ذکر ہوتا ہے۔

بعض نے یہ نقل کیا ہے کہ "عمر بن خطاب" نے کسی سے یہ آیت سنی تو کہا: اے کاش! آدم اسی طرح سے غیر مذکور رہتا اور ہم سے...

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۰۶

[2] ایضاً

پیدا ہی نہ ہوا ہوتا اور اس کی اولاد امتحان میں مبتلا نہ ہوتی۔[1]

یہ بات حیرت انگیز ہے چونکہ یہ تو مسئلہ آفرینش و خلقت پر ایک اعتراض ہے۔

بہرحال اس مرحلے کے بعد انسان کی خلقت اور اس کے قابلِ ذکر موجود ہونے کی بات آتی ہے۔ فرماتا ہے: "ہم نے انسان کو ایک ملے جلے نطفے سے پیدا کیا ہے اور ہم اس کو آزمائیں گے لہٰذا ہم نے اسے سننے والا اور دیکھنے والا قرار دیا ہے" (انا خلقنا الانسان من نطفة امشاج نبتليه فجعلناه سميعا بصيرا)۔

"امشاج" "مشج" (بروزن نسج یا بروزن سبب) کی جمع ہے یا "مشیج" (بروزن مریض) کی جمع ہے جو مخلوط اور ملی جلی چیز کے معنی میں ہے۔

"نطفہ مخلوط" سے انسان کی خلقت ممکن ہے کہ عورت اور مرد کے نطفے کے ملنے "اسپرم" اور "اوول" کی ترکیب کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ روایات اہل بیت میں اجمالاً اس کی طرف اشارہ ہوا ہے یا ان مختلف استعدادوں کی طرف اشارہ ہے جو قانون وراثت کے لحاظ سے، کہ جو اجداد اس کے علاوہ دوسری چیزوں کے طریق سے نطفے کے اندر پائی جاتی ہیں، یا نطفے کی ترکیب میں مختلف مواد کے اختلاط کی طرف اشارہ ہے کیونکہ وہ وسیع مختلف اجزاء سے تشکیل پاتا ہے یا ان سب کا ایک دوسرے کے ساتھ اختلاط، آخری معنی سب سے زیادہ جامع اور سب سے زیادہ مناسب ہے۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ امشاج جنینی دور میں نطفے کی مختلف حالات میں تبدیلیوں کی طرف اشارہ ہے۔[2]

"نبتليه" کا جملہ انسان کے "تکلیف و ذمہ داری" "تعہد و مسئولیت اور آزمائش و امتحان" کے مقام تک پہنچنے کی طرف اشارہ ہے اور یہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے، جو اس نے انسان کو ودیعت فرمائی ہے اور اسے "تکلیف، ذمہ داری اور مسئولیت" کے لیے شائستہ اور اہل قرار دیا ہے۔

اور چونکہ آزمائش اور تکلیف "آگاہی اور علم" کے بغیر ممکن نہیں ہے، اس لیے آیت کے آخر میں شناخت اور معرفت کے آلات، آنکھ اور کان کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس نے انسانوں کے اختیار میں دے دیے ہیں۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ابتلاء و آزمائش سے مراد وہ تبدیلیاں ہیں جو جنین کو نطفے کے مرحلے سے لے کر ایک مکمل انسان تک پہنچنے کے لیے پیش آتی ہیں، لیکن "نبتليه" کی تعبیر اور اسی طرح "انسان" کی تعبیر کی طرف توجہ کرنے سے پہلی تفسیر ہی زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے تمام ادراکات کی اصل اور بنیاد اس کے حسی ادراکات ہوتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۰۶

[2] اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ نطفے کے مفرد ہونے کے باوجود اس کی صفت "امشاج" جمع کی صورت میں آئی ہے۔ یہ اس بنا پر ہے کہ نطفہ مختلف اجزاء سے تشکیل پایا ہے اور جمع کے حکم میں ہے اور بعض مفسرین مثلاً زمخشری نے "کشاف" میں کہا ہے کہ امشاج مفرد ہے اگرچہ جمع کے وزن پر ہے۔

جیسی کمالات تمام "معقولات" کی "ماں" ہوتے ہیں، اور بہت سے اسلامی فلاسفہ کا یہی نظریہ ہے، اور فلاسفہ یونان میں "ارسطو" بھی اسی نظریہ کا طرفدار تھا۔

چونکہ انسان کی تکلیف و ذمہ داری اور آزمائش، علم و آگاہی اور آلات شناخت کے علاوہ دو اور عوامل کی محتاج ہے، یعنی مسئلہ "ہدایت" و "اختیار" اس لیے بعد والی آیت میں ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "ہم نے اسے راستہ کی نشاندہی کردی ہے، اب چاہے وہ شاکر ہو جائے اور اسے قبول کرے، یا کفران کرکے قبول نہ کرنے والا بن جائے" (انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا واما کفورا)۔[1]

"ھدایت" یہاں ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے جو "ہدایت تکوینی" کو بھی شامل ہے اور "ہدایت فطری" اور "ہدایت تشریعی" کو بھی اگرچہ آیت کا سیاق زیادہ تر ہدایت تشریعی کی طرف ہے۔

اس کی "وضاحت" اس طرح ہے کہ چونکہ خدا نے انسان کو ابتلاء و آزمائش اور تکامل و ارتقاء کے مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ لہٰذا اس مقصد تک پہنچنے کے مقدمات تو اس نے اس کے وجود میں پیدا کیے ہیں اور اسے ضروری قوتیں بخشی ہیں، اور اسی کو ہدایت تکوینی کہتے ہیں، اس کے بعد اس کی خلقت کی گہرائیوں میں اس راستہ کو طے کرنے کا عشق پیدا کردیا اور فطری الہامات کے طریق سے اسے راستہ کی نشاندہی کردی، لہٰذا اس لحاظ سے اسے "فطری" ہدایت بھی کردی اور دوسری طرف سے آسمانی رہبر اور بزرگ انبیاء روشن اور واضح تعلیمات اور قوانین کے ساتھ راستہ دکھانے کے لیے مبعوث کیے اور ان کے ذریعہ "ہدایت تشریعی" فرمائی۔ البتہ ہدایت کے یہ تینوں شعبے عمومی پہلو رکھتے ہیں، اور تمام انسانوں کو شامل ہیں۔

مجموعی طور پر یہ آیت انسانی زندگی میں تین اہم اور سرنوشت ساز مسائل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"مسئلہ تکلیف" و "مسئلہ ہدایت" اور "مسئلہ آزادی ارادہ و اختیار" جو ایک دوسرے کے لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کی تکمیل کرنے والے ہیں۔

ضمنی طور پر "انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا" کا جملہ مکتب جبر پر خط بطلان کھینچتا ہے۔

"شاکرا" اور "کفورا" کی تعبیر وہ مناسب ترین تعبیر ہے جو یہاں ممکن ہو سکتی ہے، کیونکہ جن لوگوں نے خدائی ہدایت جیسی عظیم نعمت کو قبول کرتے ہوئے اس کے سامنے سر تسلیم خم کردیا اور راہ ہدایت پر چل پڑے تو وہ اس نعمت کا شکر بجالائے اور جنہوں نے مخالفت کی انہوں نے کفران کیا۔

اور چونکہ ہاتھ اور زبان سے کوئی شخص بھی اس کے شکر سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا شکر کے بارے میں اسم فاعل کی تعبیر لایا ہے، جبکہ کفران کے بارے میں "کفور" (مبالغہ کا صیغہ) آیا ہے کیونکہ وہ لوگ جو اس نعمت کو نظر انداز کردیتے ہیں وہ سب سے بڑے

---

[1] بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق "شاکرا" اور "کفورا" "ھدینٰہ" کے مفعول کی ضمیر سے حال ہے، یہ احتمال بھی ہے کہ یہ "یکون" محذوف کی خبر ہو اور تقدیر میں اس طرح ہو (اما یکون شاکرا و اما یکون کفورا)۔

کفران کا ارتکاب کرتے ہیں، کیونکہ خدا نے انواع و اقسام کے وسائل ہدایت ان کے اختیار میں دے رکھے ہیں اور یہ انتہائی کفران ہے کہ انھیں نظر انداز کر کے خطا اور غلطی کی راہ پر چل پڑیں۔

ضمنی طور پر اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ " کفور " ایک ایسا لفظ ہے جو کفرانِ نعمت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور کفر اعتقادی کے بارے میں بھی (جیسا کہ راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے)۔

آخری زیر بحث آیت میں، ان لوگوں کی سرنوشت کی طرف جو کفر و کفران کا راستہ طے کرتے ہیں، ایک مختصر اور پرمعنی اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: " ہم نے کفار کے لیے زنجیریں طوق اور جلانے والے شعلے تیار کر رکھے ہیں " (انا اعتدنا للکافرین سلاسلاْ واغلالاً وسعیراً)۔

" اعتدنا " (ہم نے تیار کر رکھا ہے) کی تعبیر اس گروہ کی سزا کے حتمی و یقینی ہونے کے مسئلہ پر ایک تاکید ہے یہ ٹھیک ہے کہ پہلے سے تیار کر رکھنا، ایسے لوگوں کا کام ہے جو محدود توانائی رکھتے ہوں اور انھیں یہ احتمال ہو کہ ضرورت کے وقت توانائی پیدا نہ کر سکیں گے لیکن یہ مفہوم خدا کے بارے میں کوئی معنی نہیں رکھتا، کیونکہ خدا تو جس چیز کا ارادہ کرے وہ " کن " کے فرمان سے فوراً موجود ہو جاتی ہے اس کے باوجود کافروں کی سزا کے قطعی ہونے کے بیان کے لیے اعلان کرتا ہے کہ ان کی سزا کے وسائل ابھی سے آمادہ و تیار ہیں۔

" سلاسل " جمع ہے سلسلہ کی، جو زنجیر کے معنی میں ہے اور " اغلال " جمع ہے " غل " کی جو اس حلقہ (طوق) کے معنی میں ہے جسے گردن یا ہاتھوں میں ڈال دیتے ہیں، اس کے بعد اسے زنجیر سے باندھ دیتے ہیں[1]

بہر حال غل و زنجیر کا ذکر اور اس کے بعد آگ کے جلانے والے شعلوں کا تذکرہ، اس گروہ کی بہت بڑی سزا کو بیان کرتے ہیں جس کی طرف قرآن کی دوسری آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے، اور اس میں " عذاب " اور " اسارت " دونوں جمع ہیں۔
یہاں کی شہوات میں آزادی ان کے لیے وہاں کی اسارت کا سبب بن جائے گی اور وہ آگ جو انھوں نے اس دنیا میں بھڑکائی ہے وہ وہاں جسم اختیار کرے گی اور وہ ان کے دامن گیر ہو جائے گی۔

ایک نکتہ

جنین کا حیرت انگیز عالم

ہم جانتے ہیں کہ انسان کا نطفہ، مرد اور عورت کے نطفہ سے ـــــــ جن میں سے پہلا " اسپر " یا (جرثومہ) اور دوسرا " اوول " یا (بیضہ) کہلاتا ہے ـــــــ مل کر بنتا ہے۔

" نطفہ " کا اصل وجود، اور اس کے بعد اس کی ترکیب، اور پھر جنین کے مختلف مراحل، عالم آفرینش کے عظیم عجائبات میں سے ہیں، جس کے اسرار سے " جنین شناسی " کے علم کی پیش رفت کے باعث پردہ ہٹ چکا ہے۔ اگرچہ بہت سے اسرار

---

[1] " اغلال " کے معنی کی مزید وضاحت سورہ یٰسین کی آیہ ۸ کے ذیل میں جلد ۱۰۔

ابھی تک پردۂ اخفا میں ہیں۔

مذکورہ عجائبات میں سے، جو ایک چھوٹے سے گوشہ کو تشکیل دیتے ہیں، ذیل کے امور ہیں۔

۱۔ "سپرم" جو مرد کے نطفہ کے پانی کے ساتھ خارج ہوتا ہے، ایک بہت ہی چھوٹا سا موجود یعنی زندہ و متحرک موجود ہے، جو ایک سر، گردن اور متحرک دم کا حامل ہوتا ہے، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ مرد کے ہر انزال میں دو سو سے پانچ سو ملین تک اسپرم موجود ہو سکتے ہیں جو کئی ملکوں کی لوگوں کی تعداد کے برابر ہوتے ہیں۔ لیکن اس بے شمار تعداد میں سے صرف ایک یا چند عدد بیضہ میں داخل ہوتے ہیں، اور وہ بارور ہو جاتا ہے۔ مرد کے نطفہ کی اس تعداد کے وجود کی وجہ یہ ہے کہ سپرموں کے بیضوں تک پہنچنے اور اس سے ترکیب پانے کے لیے، بہت زیادہ تلف ہو جاتے ہیں اور اگر یہ اتنی بڑی تعداد نہ ہوتی تو شاید بارآور ہونے کا معاملہ مشکل ہو جاتا۔

۲۔ رحم حاملہ ہونے سے پہلے صرف ایک اخروٹ کے برابر ہوتا ہے، لیکن نطفہ کے انعقاد، اور جنین کی پرورش کے بعد اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ وہ کافی جگہ کو گھیر لیتا ہے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کی دیوار اپنی پہلی حالت پر آجانے کی اتنی قابلیت رکھتی ہے کہ اس عظیم حجم کا بخوبی مقابلہ کر سکتی ہے۔

۳۔ رحم کی دیوار کی رگوں میں خون نہیں ہوتا، بلکہ وہ عضلات کے اندر پرنالے کی صورت میں جاری ہوتا ہے، کیونکہ اگر اس میں کوئی رگ ہوتی تو یقینی طور پر رحم کی دیوار کی حد سے زیادہ کشش کے مقابلہ میں نہ ٹھہر سکتی۔

۴۔ بعض ماہرین کا نظریہ یہ ہے کہ عورت کا نطفہ "مثبت برقی بار" کا حامل ہوتا ہے اور "سپرم" "منفی برقی بار" رکھتا ہے، لہٰذا وہ ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں، اور اسی بناء پر دوسرے "سپرم" جو اس کے اطراف میں ہوتے ہیں، پیچھے دھکیل دیئے جاتے ہیں، اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "سپرم" کے داخل ہونے کے ساتھ ہی اس سے مخصوص کیمیائی مادہ نکلتا ہے جو باقی تمام سپرموں کو دور دھکیل دیتا ہے۔

۵۔ جنین ایک بڑے تھیلے کے اندر ایک گاڑھے قسم کے پانی میں ــــــ جسے "آمنی یوس" کہا جاتا ہے، غوطہ ور ہوتا ہے، جو ماں کی طرح طرح کی تند و تیز حرکات، یا شکم کے اوپر کسی چیز کے لگنے کے مقابلہ میں ضد ضرب کی خاصیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں جنین کو ایک خاص حد تک گرم رکھنے کی صورت میں حفاظت کرتا ہے اور بیرونی حرارت میں تبدیلیاں اس میں جلدی سے اثر نہیں کرتیں، اور سب سے زیادہ عمدہ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اسے بے وزنی کی حالت میں قرار دے دیتا ہے؛ اور جنین کے مختلف اعضاء کو، ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے سے ــــــ جو بعض نقصانات کا سبب بن سکتے ہیں ــــــ روکتا ہے۔

۶۔ جنین کی خوراک اور غذا "جفت" (آنول) "بند ناف" کے راستہ سے صورت پذیر ہوتی ہے۔ یعنی ماں کا خون تمام غذائی مواد اور آکسیجن کے ساتھ آنول نال میں داخل ہو جاتا ہے اور نئے سرے سے صاف ہو کر بند ناف کی راہ سے جنین کے دل میں داخل ہو جاتا ہے، اور وہاں سے تمام اعضائے بدن میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ دل کا دایاں اور بایاں بطن ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ چونکہ وہاں خون کے صاف ہونے کا سلسلہ پھیپھڑے کے ذریعہ نہیں ہوتا، کیونکہ جنین سانس نہیں لیتا، لیکن پیدا ہونے کے ساتھ ہی بطن کے دونوں غار (گڑھے) ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں، اور آلاتِ تنفس اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔[1]

---

[1] اس بحث میں کتاب اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر کی جلد اول اور دوسری کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

۵۔ إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝
۶۔ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۝
۷۔ يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝
۸۔ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝
۹۔ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝
۱۰۔ إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝
۱۱۔ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝

ترجمہ

۵۔ ابرار (نیک لوگ) ایسے پیالے سے پئیں گے، جس میں عمدہ عطر کی آمیزش ہو گی۔
۶۔ وہ ایسا چشمہ ہو گا جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے اور وہ اسے جہاں چاہیں گے جاری کر لیں گے۔
۷۔ وہ اپنی نذر کو پورا کرتے ہیں، اور اس دن سے کہ جس کا عذاب وسیع ہو گا، ڈرتے رہتے ہیں۔
۸۔ اور "اپنا" کھانا، اس کی خواہش اور احتیاج رکھنے کے باوجود، مسکین و یتیم و اسیر کو دے دیتے ہیں۔
۹۔ (اور وہ یہ کہتے ہیں:) ہم تو تمھیں خدا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، اور ہم تم سے نہ تو کسی قسم کا کوئی اجر مانگتے ہیں اور نہ ہی ہم تم سے کسی شکریہ کے طلبگار ہیں۔
۱۰۔ ہم تو اپنے پروردگار سے اس دن سے ڈرتے ہیں جو بہت ہی سخت اور شدید ہو گا۔
۱۱۔ اسی وجہ سے خدا انھیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور ان کا اس حال میں استقبال کرے گا کہ وہ شادمان اور مسرور ہوں گے۔

شانِ نزول

اہلِ بیت پیغمبرؐ کی فضیلت پر ایک عظیم سند

ابن عباس کہتے ہیں کہ حسنؑ و حسینؑ بیمار ہوئے تو پیغمبرؐ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی عیادت کے لیے آئے اور علیؑ سے کہا اے ابوالحسن بہتر یہ ہے کہ تم اپنے بچوں کی شفا کے لیے نذر مانو، تو علیؑ اور فاطمہؑ اور فضہ نے ـــــــــ جو ان کی خادمہ تھیں، نذر مانی، کہ اگر انھوں نے شفا پائی تو وہ تین دن روزہ رکھیں گے۔ (بعض روایات کے مطابق حسنؑ و حسینؑ نے بھی کہا کہ ہم بھی نذر مانتے ہیں کہ ہم بھی روزہ رکھیں گے) زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ دونوں شفا یاب ہوگئے لیکن حالت یہ تھی کہ ان کے پاس کھانے کا کوئی سامان موجود نہ تھا۔ علیؑ نے تین صاع جَو قرض لیے اور فاطمہؑ نے اس میں سے ایک تہائی کا آٹا پیسا اور روٹیاں پکائیں، ایک سائل گھر کے دروازے پر آیا اور اس نے کہا: السلام علیکم اہل بیت محمدؐ: اے اہلِ بیت محمدؐ تم پر سلام ہو! میں ایک مسلمان فقیر و مسکین ہوں، مجھے کھانا دو، خدا تمھیں بہشتی کھانے دے، ان سب نے مسکین کو اپنے اوپر ترجیح دی اور اپنا اپنا حصہ اس کو دے دیا اور اس رات انھوں نے صرف پانی سے افطار کیا۔

دوسرے دن اسی طرح روزہ رکھا اور افطار کے وقت جب اسی نانِ جویں کا کھانا تیار ہوگیا تو ایک یتیم گھر کے دروازے پر آیا، تو اس دن بھی ایثار کیا اور اپنا کھانا اسے دے دیا (دوبارہ پھر پانی سے ہی افطار کیا اور تیسرا روزہ بھی رکھا)۔

تیسرے دن غروب آفتاب کے وقت ایک اسیر (قیدی) گھر کے دروازے پر آیا، پھر سب نے اپنے اپنے کھانے کا حصہ اسے دے دیا، جب صبح ہوئی تو علیؑ نے حسنؑ و حسینؑ کا ہاتھ پکڑا اور پیغمبرؐ کی خدمت میں آئے، جب پیغمبرؐ نے مشاہدہ کیا تو دیکھا کہ وہ بھوک کی شدت سے کانپ رہے تھے، آپ نے فرمایا: تمھاری یہ حالت جو میں دیکھ رہا ہوں میرے لیے بہت ہی گراں ہے۔ پھر آپ کھڑے ہوگئے اور ان کے ساتھ چل پڑے جب آپ فاطمہؑ کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ محرابِ عبادت میں کھڑی ہیں اور بھوک کی شدت سے ان کا پیٹ پشت سے لگا ہوا ہے اور آنکھیں دھنسی ہوئی ہیں، پیغمبرؐ کو سخت دکھ ہوا۔

اسی وقت جبرئیل نازل ہوئے اور کہا اے محمدؐ! یہ سورہ لیجیے، خدا ایسے اہلِ بیت کے لیے آپ کو مبارک باد دیتا ہے۔ اس کے بعد سورہ "ہل اتیٰ" کی تلاوت کی، (بعض نے کہا ہے کہ آیہ "ان الابرار" سے لے کر "کان سعیکم مشکورًا" کی آیت تک، جو مجموعی طور پر اٹھارہ آیات ہیں اسی موقع پر نازل ہوئی ہیں)۔

ہم نے جو کچھ اوپر بیان کیا ہے، یہ اس حدیث کی نص ہے جو کتاب "الغدیر" میں اسی سلسلہ کی بہت سی روایات میں قدرِ مشترک کے عنوان سے، تھوڑے سے اختصار کے ساتھ بیان کی گئی ہیں اور اسی کتاب میں اہلِ سنت کے مشہور علماء میں سے ۳۴ افراد کے نام لکھے ہیں، جنھوں نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے (کتاب کے نام اور اس کے صفحہ کے ذکر کے ساتھ)۔

اس طرح سے اوپر والی روایت ان روایات میں سے ہے جو اہلِ سنت میں مشہور بلکہ متواتر ہے[1]

---

[1] "الغدیر" جلد ۳ ص ۱۰۷ تا ۱۱۱، اور کتاب "احقاق الحق" جلد ۳ ص ۱۵۷ تا ۱۷۱، میں اوپر والی حدیث اہلِ سنت کے ۳۶ علماء سے مأخذ کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔

باقی رہے شیعہ علماء تو وہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ اٹھارہ آیات، یا یہ سارے کا سارا سورہ، اوپر والے واقعہ میں نازل ہوا ہے اور سب نے بلا استثناء، تفسیر یا حدیث کی کتابوں میں، اس واقعہ سے مربوط روایت کو، علیؑ و فاطمہؑ اور ان کے بیٹوں کے افتخارات اور اہم فضائل میں سے ایک کے عنوان سے نقل کیا ہے۔

یہاں تک کہ ــــــ جیسا کہ ہم نے سورہ کے آغاز میں بیان کیا تھا ــــــ یہ مطلب اتنا مشہور و معروف ہے کہ شعراء کے اشعار اور حتیٰ کہ "امام شافعی" کے مشہور اشعار میں آیا ہے۔

یہاں بہانہ جوئی کرنے والے لوگوں نے ــــــ جو علیؑ کے فضائل تک پہنچتے ہی حد سے زیادہ حساس ہو جاتے ہیں ــــــ اس شانِ نزول کے سلسلہ میں انتہائی محنت کے ساتھ اعتراض گھڑے ہیں اور بہت زیادہ نکتہ چینیاں کی ہیں، منجملہ ان کے یہ ہیں۔

۱۔ یہ سورہ "مکی" ہے، جبکہ شانِ نزول کی داستان امام حسینؑ اور امام حسنؑ کی ولادت کے بعد سے مربوط ہے، جو یقینی طور پر مدینہ میں ہوئی ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے آغاز میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہمارے پاس ایسے واضح اور روشن دلائل موجود ہیں، جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ سارے کا سارا سورہ "ہل اتی" یا کم از کم اس کی اٹھارہ آیات مدینہ میں نازل ہوئی ہیں۔

۲۔ آیت کے الفاظ عام ہیں، انھیں معین افراد کے ساتھ کس طرح تخصیص دی جا سکتی ہے۔

لیکن یہ بات کیسے بغیر واضح ہے کہ آیت کے مفہوم کا عام ہونا، اس کے خاص محل میں نازل ہونے کے ساتھ منافات نہیں رکھتا، قرآن کی بہت سی آیات عام اور وسیع مفہوم رکھتی ہیں، لیکن اس کی شانِ نزول جو اس کا کامل اور اعلیٰ مصداق ہے۔ وہ ایک خاص محل کے لیے ہوتا ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ کوئی شخص آیت کے مفہوم کو شانِ نزول کی نفی پر دلیل قرار دے۔

۳۔ بعض نے کچھ اور دوسرے شانِ نزول نقل کیے ہیں جو اوپر والے شانِ نزول کے ساتھ سازگار نہیں ہیں، منجملہ ان کے "سیوطی" نے "در المنثور" میں یہ نقل کیا ہے کہ ایک سیاہ فام آدمی پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا، اور اس نے "تسبیح" و "تہلیل" کے بارے میں سوال کیا۔ تو عمر نے کہا بس کرو، رسولِ خداؐ سے زیادہ سوالات نہ کرو، پیغمبرؐ نے فرمایا: اے عمر خاموش رہ، تو اس موقع پر "سورہ ہل اتی" پیغمبرؐ پر نازل ہوئی [1]۔

ایک اور دوسری حدیث میں اسی کتاب میں آیا ہے کہ حبشہ کا ایک شخص رسولِ خداؐ کی خدمت میں آیا، وہ آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا تھا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا، کہ سوال کرو اور اس کا جواب لو، اس نے عرض کیا: اے رسولِ خدا آپ کا گروہ رنگ، صورت اور نبوت کے لحاظ سے ہم پر برتری رکھتا ہے، لیکن اگر میں اس چیز پر ایمان لے آؤں جس پر آپ ایمان لائے ہیں اور جو عمل آپ کرتے ہیں میں بھی وہ عمل کروں، تو کیا میں جنت میں آپ کے ساتھ ہوں گا؟ آپ نے فرمایا: ہاں! قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جنت میں سیاہ رنگ والوں کی سفیدی ہزار سال کی راہ سے نظر آئے گی اور پھر پیغمبرؐ نے لا الٰہ الا اللہ اور سبحان اللہ وبحمدہ کہنے کے لیے بہت سے اہم ثواب بیان فرمائے اور اس موقع پر سورہ "ہل اتی" نازل ہوئی [2]۔

---

[1] "در المنثور" جلد ۶ ص ۲۹۷

[2] گزشتہ ماخذ

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ روایات تقریباً کسی قسم کی مناسبت، سورۂ "ہل اتی" کی آیات کے مضمون کے ساتھ نہیں رکھتیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ شانِ نزول کو پائمال کرنے کے لیے، بنی امیہ کے کارندوں یا ان ہی جیسے لوگوں کی طرف سے گھڑی گئی ہے۔

۴۔ ایک اور بہانہ جو ممکن ہے یہاں پیش کیا جائے، یہ ہے کہ انسان تین دن تک کس طرح سے مجبور کا رہ سکتا ہے کہ صرف پانی پر ہی افطار کرے؟

لیکن یہ ایک عجیب اعتراض ہے، کیونکہ ہم نے خود کئی ایسے افراد کو دیکھا ہے کہ انہوں نے بعض طبی علاجوں کے لیے ——— تین دن تو بہت ہی آسان ہیں ——— مشہور "چالیس دن" کا چلّہ کاٹا ہے، یعنی مکمل چالیس دن تک صرف پانی پیا ہے اور بالکل کوئی کھانا نہیں کھایا اور یہی چیز ان کو بہت سی بیماریوں کی شفا کا باعث بن گئی۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم مشہور طبیب "الکسی سوفورین" نے ایک کتاب اس قسم کے صبر کرنے سے علاج کے اہم اثرات کے سلسلہ میں، اس کے دقیق پروگرام کے ذکر کے ساتھ لکھی ہے[1]

یہاں تک کہ اگر آپ تعجب نہ کریں تو تفسیر نمونہ کے بعض ہم کاروں نے یہ چلّہ ۲۲ دن تک عملاً انجام دیا ہے۔

۵۔ بعض دوسرے افراد اس بناء پر کہ آسانی کے ساتھ اس فضیلت کے قریب سے گزر جائیں، ایک اور طریقہ سے وارد ہوئے ہیں مثلاً "آلوسی" کہتا ہے کہ اگر ہم یہ کہیں کہ یہ سورہ علیؑ و فاطمہؑ کے بارے میں نازل نہیں ہوا تو ان کی قدر و منزلت میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی۔ کیونکہ ان کا "ابرار" کے عنوان میں داخل ہونا ایک واضح و آشکار مطلب ہے، جسے ہر شخص جانتا ہے، اس کے بعد ان کے بعض فضائل پیش کر کے کہتا ہے، ان دو بزرگ ہستیوں کے بارے میں انسان کیا کہہ سکتا ہے، سوائے اس کے کہ علیؑ مومنین کے مولا اور پیغمبرؐ کے وصی ہیں، اور فاطمہ پیغمبر کے بدن کا حصہ اور وجودِ محمدیؐ کا جزء ہیں اور حسنینؑ روح و ریحان اور جوانانِ جنت کے سردار ہیں، لیکن اس بات کا مفہوم دوسروں کو چھوڑ دینا اور انہیں ترک کرنا نہیں ہے، بلکہ جو شخص اس راستہ کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرے وہ گمراہ ہے[2]

لیکن ہم کہتے ہیں کہ اگر بناء یہ ہو کہ اس فضیلت کو باوجود اس شہرت کے نظر انداز کر دیں، تو باقی فضائل بھی آہستہ آہستہ اس قسم کی سرنوشت سے دوچار ہو جائیں گے اور ایک دن ایسا آ جائے گا کہ بعض لوگ علیؑ اور خاتونِ اسلام اور حسنین علیہما السلام کی اصل فضیلت کا ہی انکار کر دیں گے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض روایات میں خود علیؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے متعدد موارد میں، ان آیات کے اپنے اور اپنے شہزادوں کے بارے میں نزول سے مخالفین کے مقابلہ میں استدلال کیا ہے[3]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "اسیر" عام طور پر "مدینہ" میں ہی موجود تھے اور مکہ میں اس بناء پر کہ ابھی اسلامی جنگیں شروع ہی نہیں ہوئی تھیں، لہٰذا کسی اسیر کا وجود ہی نہیں تھا، اور یہ اس سورۂ کے مدنی ہونے کی ایک اور گواہی ہے۔

---

[1] یہ کتاب "روزہ، روش نوین برائے درمان بیماریہا" کے نام سے فارسی میں ترجمہ و نشر ہو چکی ہے۔

[2] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۵۸

[3] "احتجاج طبرسی" و "خصال صدوق" (مطابق نقل المیزان جلد ۲۰ ص ۲۲۴)

آخری نکتہ کہ جس کا ذکر کرنا ہم یہاں ضروری سمجھتے ہیں یہ ہے کہ علماءِ اسلام کی ایک جماعت کے قول کے مطابق جن میں اہلِ سنت کے مشہور مفسر "آلوسی" بھی ہیں، اس سورہ میں جنت کی بہت سی نعمتوں کو شمار کیا گیا ہے۔ لیکن حورالعین کے بارے میں ـــــــ جنہیں عام طور پر قرآن مجید میں جنت کی نعمتوں کو شمار کرتے وقت بیان کیا جاتا ہے ـــــــ بالکل گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ امر اس بناء پر ہو کہ چونکہ اس سورہ کا نزول فاطمہ زہراؑ، ان کے شوہر نامدار اور ان کے فرزندانِ عالی قدر کے بارے میں ہے، لہٰذا بانوئے اسلام کے احترام کو مدِنظر رکھتے ہوئے "حور" کا کوئی ذکر درمیان میں نہیں آیا ہے۔[1]

اگرچہ ہماری بحث اس شانِ نزول کے سلسلہ میں طویل ہو گئی ہے، لیکن بہانہ گھڑنے والے لوگوں کی اعتراض تراشیوں کے مقابلہ میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

تفسیر

ابرار کے لیے عظیم اجر

گزشتہ آیات میں، انسانوں کو دو گروہوں "شکور" و "کفور" یا "شکر گزار" اور "کفران کرنے والوں" میں تقسیم کرنے کے بعد، کفران کرنے والوں کے لیے سخت سزا اور عذاب کا ایک مختصر سا اشارہ ہوا تھا۔ زیرِ بحث آیات میں شکر کرنے والوں اور ابرار (نیک و پاک) لوگوں کی جزا کو بیان کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں بہت ہی عمدہ نکات پیش کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "نیک لوگ ایسے جام سے نوش کریں گے، جس میں بہت ہی اچھے عطر کی آمیزش ہو گی" (انّ الابرار یشربون من کأس کان مزاجھا کافورًا)۔

"ابرار" جمع ہے "بر" (بروزن رب) کی جو اصل میں وسعت اور پھیلاؤ کے معنی میں ہے اور اسی بناء پر وسیع و عریض صحراؤں کو "بر" کہتے ہیں اور چونکہ نیکوکار افراد کے اعمال معاشرے کی سطح پر وسیع نتائج رکھتے ہیں، لہٰذا اس لفظ کا ان پر اطلاق ہوتا ہے اور "بر" (باء کی زیر کے ساتھ) "نیکوکاری" کے معنی میں ہے، بعض نے کہا ہے کہ اس کے اور "خیر" کے درمیان یہ فرق ہے کہ "بر" اس نیکی کے معنی میں ہے جو توجہ کے ساتھ ملی ہوئی ہو، جبکہ خیر اس سے عام معنی رکھتا ہے۔

"کافور" کے لغت میں متعدد معنی ہیں، اس کے مشہور معانی میں سے ایک اچھی خوشبو ہے اسی طرح سے ایک خوشبودار گھاس ہوتی ہے اور اس کے معانی میں سے ایک وہی عام "کافور" ہے جس کی بو تیز ہوتی ہے اور طبی مصارف کے لیے، منجملہ ان کے متعفن کے توڑ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بہرحال اوپر والی آیت بتاتی ہے کہ جنت کی یہ شراب طہور بہت ہی معطر اور خوشبودار ہے، جس سے قوتِ ذائقہ بھی لذت

---

[1] روح المعانی جلد ۲۹ ص ۱۵۸

حاصل کرتی ہے اور قوت شامہ بھی۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "کافور" جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے، لیکن یہ تفسیر کان مزاجھا کافورًا کی تعبیر کے ساتھ جو یہ کہتی ہے کہ کافور کی اس میں آمیزش ہوگی، سازگار نہیں ہے۔

دوسری طرف اس بات پر توجہ کرتے ہوئے کہ "کافور" "کفر" کے مادہ سے "ڈھانپنے" کے معنی میں ہے۔ بعض ارباب لغت کا نظریہ جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں لکھا ہے، یہ ہے کہ "کافور" کے لیے اس نام کا انتخاب اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ اس درخت کا پھل ــــــ جس سے یہ مادہ لیا جاتا ہے ــــــ غلافوں کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے۔

بعض نے "کافور" کی تعبیر کو اس کی حد سے زیادہ سفیدی اور ٹھنڈک کی طرف اشارہ سمجھا ہے، کیونکہ عام کافور بھی "ٹھنڈک" اور "سفیدی" کے لحاظ سے ضرب المثل ہے۔

لیکن مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب نظر آتی ہے خصوصًا اس بناء پر کہ بعض اوقات تعبیروں میں کافور کو مشک و عنبر کا ہم پلہ شمار کرتے ہیں جو بہترین خوشبوؤں میں سے ہیں۔

اس کے بعد اس سرچشمہ کی طرف جس سے شراب طہور کا یہ جام پُر ہوتا ہے، اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "یہ ایک خاص چشمہ ہے جس سے خدا کے خاص بندے پئیں گے اور اسے جہاں چاہیں گے، جاری کریں گے" (عینًا یشرب بها عباد الله یفجرونها تفجیرًا)۔[1]

ہاں! یہ شراب طہور کا چشمہ کچھ اس طرح سے ابرار اور عباد اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ جہاں کہیں سے ارادہ کریں گے وہیں سے پھوٹ پڑے گا اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام باقرؑ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے اس کی تعریف و توصیف میں فرمایا:

هی عین فی دار النبی (ص) تفجر الی دور الانبیاء والمؤمنین

یہ ایک ایسا چشمہ ہے جو پیغمبر اسلامؐ کے گھر میں ہے اور وہاں سے تمام انبیاء اور مومنین کے گھروں میں جاری ہوگا۔[3]

ہاں! جس طرح دنیا میں علم و رحمت کے چشمے پیغمبر اکرمؐ کے گھر سے خدا کے بندوں اور نیک لوگوں کی طرف جاتے ہیں، آخرت میں بھی جو اس

---

[1] اس بارے میں کہ "عینًا" کی نصب کس بناء پر ہے بہت سے احتمال دیئے گئے ہیں، شاید سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ "عینًا" منصوب بنزع خافض ہے اور تقدیر میں "من عین" تھا اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "کافورًا" سے "بدل" ہے یا اختصاص پر دلالت کی بناء پر منصوب ہے، یا ایک مقدر فعل کا مفعول ہے اور تقدیر میں "یشربون عینًا" ہے لیکن جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

[2] "یشرب" "باء" کے ساتھ بھی متعدی ہوتا ہے اور اس کے بغیر بھی، اور "بها" کی "باء" ممکن ہے کہ "من" کے معنی میں ہو۔

[3] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۷۷ اور روح المعانی جلد ۲۹ ص ۱۵۵

پروگرام کا ایک عظیم تجسم ہے۔ خدا کی شراب طہور کا چشمہ اسی بیت وحی سے پھوٹے گا، اور اس کی شاخیں مومنین کے گھروں تک جائیں گی

"یفجرون" "تفجیر" کے مادہ سے اصل میں "فجر" سے لیا گیا ہے، جو وسیع پیمانہ پر شگاف کرنے کے معنی میں ہے چاہے زمین میں شگاف کرنا ہو، یا کسی دوسری چیز میں اور چونکہ صبح کی روشنی گویا رات کے پردے کو پھاڑ دیتی ہے، اس لیے اس کو فجر کہا جاتا ہے اور فاسق شخص کو اس لیے "فاجر" کہتے ہیں، کیونکہ اس نے حیاء و شرم اور پاکیزگی کے پردہ کو چاک کر دیا ہے، اور حق کے راستہ سے باہر ہوگیا ہے۔

لیکن زیر بحث آیت میں زمین میں شگاف کرنے کے معنی میں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ جنت کی فراواں نعمتوں میں سے جو اس سورہ میں بیان کی گئی ہیں، پہلی نعمت "خاص قسم کی معطر شراب طہور" کا ذکر ہوا ہے، اور یہ شاید اس بناء پر ہے کہ محشر کے حساب سے فارغ ہونے کے بعد، پہلے ہی قدم میں جو وہ جنت میں رکھیں گے، تو اس شراب کے پیتے ہی ہر قسم کے غم واندوہ پریشانی اور آلائش کو اپنی جان سے دھو ڈالیں گے، اور حق تعالیٰ کے عشق سے سرمست ہو کر جنت کے باقی اسباب اور نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔

بعد والی آیت میں ان اعمال و اوصاف کا ذکر کرتا ہے جو "ابرار" اور "عباد اللہ" میں پائے جاتے ہیں، پانچ صفات کا ذکر کرنے کے ساتھ ان بے مثل و بے نظیر نعمتوں کے لیے ان کے استحقاق کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ اپنی نذر کو پورا کرتے ہیں" (یوفون بالنذر)۔

"اور اس دن سے کہ جس کا شر اور عذاب پھیلا ہوا ہوگا، ڈرتے ہیں" (ویخافون یومًا کان شرّہ مستطیرًا)۔

"یوفون" و "یخافون" اور اس کے بعد والے جملے، جو سب کے سب "فعل مضارع" کی صورت میں آئے ہیں اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ ان کا دائمی اور ہمیشہ کا پروگرام ہے۔ البتہ جیسا کہ ہم نے شانِ نزول میں بیان کیا ہے۔ ان آیات کے اتم و اکمل مصداق امیر المومنین علیؑ و فاطمہ زہراؑ اور ان کے فرزند حسنؑ و حسینؑ سلام اللہ علیہم اجمعین ہیں، جنہوں نے تین دن روزہ رکھنے کے سلسلہ میں اپنی نذر پوری کی، اور انہوں نے پانی کے علاوہ اور کسی چیز سے افطار نہیں کیا اور ان کا دل خوفِ خدا اور خوفِ قیامت سے مالا مال تھا۔

"مستطیر" وسیع اور پھیلے ہوئے کے معنی میں ہے اور اس دن کے گوناگوں اور وسیع عذابوں کی طرف اشارہ ہے۔

بہر حال جب وہ ان نذروں کو جو انہوں نے اپنے اوپر واجب کر لی ہیں، پورا کرتے ہیں، تو واجبات الٰہی کو تو بطریق اولیٰ احترام کے ساتھ پورا کرتے ہیں، یعنی ان کو بخوبی انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس عظیم دن کے شر سے ان کا خوف مسئلہ معاد کے بارے میں ان کے ایمان، اور حکم خدا کے مقابلہ میں شدید احساسِ مسئولیت کی طرف اشارہ ہے۔

وہ معاد پر اچھی طرح یقین رکھتے ہیں اور بدکاروں کی تمام سزاؤں پر ان کا ایمان ہے اور اس ایمان کا اثر ان کے اعمال میں پورے طور پر نمایاں ہے۔

اس کے بعد ان کے تیسرے اچھے عمل کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہ اپنا کھانا اس کی ضرورت و احتیاج ہونے کے باوجود مسکین، یتیم اور اسیر کو دے دیتے ہیں"۔ (و یطعمون الطعام علی حبه مسکینا و یتیما و اسیرا)۔

ان کا کھانا کھلانا کوئی آسان بات نہیں ہے، بلکہ شدید ضرورت اور احتیاج کے وقت میں ایثار و قربانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور دوسری طرف وہ ایک ایسا وسیع پیمانہ کا کھانا کھلانا ہے جو کئی قسم کے ضرورت مندوں، مسکین، یتیم و اسیر کو شامل ہے، تو اس طرح سے ان کی رحمت عام اور ان کی خدمت وسیع ہے۔

"علی حبه" کی ضمیر "طعام" کی طرف لوٹتی ہے، یعنی باوجود اس کے کہ انہیں کھانے کی خود ضرورت ہے، پھر بھی وہ انفاق کر دیتے ہیں، اس طرح یہ اسی چیز سے مشابہ ہے جو سورۂ آلِ عمران کی آیہ ۹۲ میں آئی ہے، (لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون) تم ہرگز بھی نیکوکاری کی حقیقت کو نہ پہنچو گے، جب تک کہ تم اس میں سے خرچ نہ کرو، جسے تم دوست رکھتے ہو۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ مذکورہ ضمیر "اللہ" کی طرف لوٹتی ہے، جو گزشتہ آیات میں آیا ہے، یعنی وہ پروردگار کے عشق میں کھانا کھلاتے ہیں، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ معنی بعد والی آیت میں آرہا ہے، پہلا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

"مسکین" و "یتیم" و "اسیر" کے معنی واضح ہیں، لیکن اس بارے میں کہ اسیر سے مراد کون سا اسیر ہے؟ مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بہت سوں نے تو یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہ اسیر ہیں جنہیں مشرکین و کفار میں سے پکڑ کر حکومت اسلامی کے لئے مدینہ میں لے آتے تھے، بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ اس سے مراد وہ غلام ہیں جو اپنے مالک کے ہاتھوں میں اسیر ہوتے ہیں اور بعض نے اس کی زندان کے قیدی کے ساتھ تفسیر کی ہے، لیکن پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب اور زیادہ مشہور ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ شانِ نزول کے مطابق وہ اسیر شخص علیؑ کے گھر کے دروازے پر افطار کے وقت آیا، تو کیا قیدی زندان میں نہیں ہوتے تھے؟

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ سوال واضح ہو جاتا ہے کہ تواریخ کی نقل کے مطابق پیغمبرؐ کے زمانہ میں کوئی قید خانہ نہیں تھا، اور آنحضرتؐ اسیروں کو تقسیم کر کے مسلمانوں کے سپرد کر دیا کرتے تھے، اور انہیں یہ حکم دیا کرتے تھے کہ تم ان کی نگرانی کرو، اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو، مگر جب وہ ان کو کھانا دینے کی توانائی نہیں رکھتے تھے، تو وہ دوسرے مسلمانوں سے قیدیوں کے کھانے کے سلسلہ میں مدد لیتے تھے، اور انہیں اپنے ہمراہ لے جا کر یا کبھی اپنی ہمراہی کے بغیر بھی دوسرے مسلمانوں کی طرف بھیج دیتے تھے، تاکہ وہ ان کی مدد کریں، کیونکہ اس وقت مسلمان انتہائی تنگی میں تھے۔

البتہ بعد میں جب سلطنت اسلامی میں وسعت پیدا ہو گئی اور اسیروں کی تعداد بڑھ گئی، اور حکومت کے دامن کی وسعت کی بنا پر مجرمین کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو پھر قید خانے بنائے گئے اور اسیروں اور مجرموں کے کھانے پینے کا انتظام بیت المال کے ذریعہ ہونے لگا۔[۱]

---

[۱] مزید وضاحت کے لیے کتاب "احکام زندان در اسلام" کی طرف رجوع کریں۔

بہرحال اوپر والی آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بہترین اعمال میں سے ایک عمل محروم اور ضرورت مندوں کو کھانا کھلانا ہے، نہ صرف مسلمان ضرورت مند بلکہ بادشرک کے اسیر بھی اسلام کے اس حکم کے ماتحت آتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کو کھانا کھلانا "ابرار" کے عمدہ کاموں میں سے ایک عمدہ کام شمار ہوا ہے۔

ایک حدیث میں رسول خداؐ سے آیا ہے:

استوصوا بالاسرٰی خیرًا وکان احدھم یؤثر اسیرہ بطعامہ

اسیروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو، مسلمانوں نے جب یہ بات سنی تو وہ بعض اوقات اپنا کھانا بھی قیدی کو دے دیتے تھے، اور اسے اپنے اوپر ترجیح دیتے تھے[1]

ابرار کا چوتھا عمدہ عمل اخلاص کو شمار کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہیں صرف خدا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، ہم تم سے نہ تو اس کا کوئی اجر مانگتے ہیں، اور نہ ہی کسی شکریہ کے طالب ہیں" (انما نطعمکم لوجہ اللہ لانرید منکم جزاءً ولا شکورًا)۔

یہ پروگرام مسئلہ اطعام پر ہی منحصر نہیں ہے، بلکہ ان کے تمام اعمال مخلصانہ اور خدا کی پاک ذات کے لیے ہوتے تھے، اور وہ لوگوں کی طرف سے کسی اجر کی امید، بلکہ ان کی طرف سے کسی قدردانی اور تشکر کی تمنا بھی نہیں کرتے، اور اسلام میں اصولی طور پر عمل کی قدروقیمت خلوص نیت پر ہے، ورنہ وہ اعمال جو غیر اللہ کے لیے کیے جائیں، چاہے وہ ریاکارانہ ہوں یا ہوائے نفس کی بناء پر ہوں، یا لوگوں کے تشکر اور قدردانی کی وجہ سے یا مادی اجر و پاداش کی بناء پر، ان کی کوئی معنوی اور خدائی قدروقیمت نہیں ہے، اور پیغمبر اکرمؐ کی مشہور حدیث:

"لاعمل الّا بالنیة و انما الاعمال بالنیات"

بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔

"وجہ اللہ" سے مراد، وہی خدا کی ذات ہی ہے، ورنہ خدا کوئی جسمانی چہرہ نہیں رکھتا، اور یہ وہی چیز ہے، جس پر قرآن کی تمام آیات میں تکیہ و تاکید ہوئی ہے، سورۂ بقرہ کی آیہ ۲۷۲ میں آیا ہے: (وما تنفقون الّا ابتغاء وجہ اللہ) تم خدا کے علاوہ اور کسی کے لیے انفاق نہ کرو، اور سورۂ کہف کی آیہ ۲۸ میں پیغمبر کے شائستہ اصحاب کی توصیف میں اس طرح آیا ہے،

(واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ)

"ایسے لوگوں کے ساتھ رہ جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں اور صرف اسی کی ذات کو چاہتے ہیں۔

اور "ابرار" کی آخری توصیف میں فرماتا ہے: "وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو اپنے پروردگار سے اس دن کے لیے خائف ہیں جو بہت ہی سخت اور شدید ہوگا" (انا نخاف من ربنا یومًا عبوسًا قمطریرًا)۔

---

[1] "کامل ابن اثیر" جلد ۲ ص ۱۳۱

یہ بات " ابرار " کی زبانِ حال بھی ہوسکتی ہے اور زبانِ قال بھی ۔

روزِ قیامت کی " عبوس " اور " سخت " دن کے ساتھ تعبیر ، جبکہ عبوس انسان کی ایک صفت ہے اور ایسے افراد کو کہتے ہیں ، جن کے چہرے بگڑ جائیں ، یہ اس دن کی وحشت ناک وضع و کیفیت کی تاکید کے لیے ہے ، یعنی اس دن کے حوادث اس قدر سخت اور تکلیف دہ ہیں کہ نہ صرف انسان اس دن عبوس اور ترشرو ہوں گے ، بلکہ گویا خود وہ دن بھی عبوس اور بگڑے ہوئے چہرہ والا ہوگا ۔

اس بارے میں کہ " قمطریر " کس مادہ سے لیا گیا ہے ، مفسرین اور اربابِ لغت کے درمیان اختلاف ہے ، بعض اس کو " قمطر " سے سمجھتے ہیں اور بعض اس کو " قطر " (بروزن مرغ) سے مشتق اور اس کی میم کو زائد سمجھتے ہیں ۔

لیکن مشہور وہی پہلا ہے جو شدید اور عبوس کے معنی میں ہے [1]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر " ابرار " صرف خدا ہی کی پاک ذات کے لیے کام کرتے ہیں تو پھر وہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ ہم قیامت کے دن کے عذاب سے ڈرتے ہیں ، کیا خدائی محرک ، قیامت کے عذاب کے خوف کے محرک کے ساتھ سازگار ہے ؟ :

لیکن ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ بہر حال خدا کے لیے قدم اٹھاتے ہیں ، اور اگر وہ قیامت کے عذاب سے ڈرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کا عذاب ہے ، اور اگر وہ جنت کی نعمتوں کو چاہتے ہیں تو اس بناء پر کہ وہ نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں ، اور یہ وہی چیز ہے جو فقہ میں " نیتِ عبادت " کے باب میں بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ : عبادات میں قصدِ قربت ، ثواب کی آرزو ، عذاب کے خوف ، یہاں تک کہ خدا سے اس دنیا کی مادی نعمتوں کے طلب کرنے (مثلاً بارش کے طلب کرنے کے لیے نماز استسقاء) کے محرکات کے ساتھ کوئی منافات نہیں رکھتا ، کیونکہ ان سب کی بازگشت خدا کی طرف سے ہے اور اصطلاح کے مطابق " داعی پر داعی " کی قسم سے ہے ، اگرچہ عبادت کا اعلیٰ ترین مرحلہ یہ ہے کہ جنت کی نعمتوں کی خواہش اور دوزخ کے عذاب کا خوف بھی اس کا محرک نہ ہو بلکہ وہ سراسر " حبا للہ " کے عنوان سے انجام پائے ۔

" انا نخاف من ربنا یوما عبوسا قمطریرا " کی تعبیر بھی اس بات پر شاہد ہے کہ یہ خوف بھی پروردگار کے خوف میں سے ہے ۔

قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ان پانچوں اوصاف میں سے دوسرا وصف اور پانچواں وصف ، دونوں خوف کا مسئلہ ہیں ، اس فرق کے ساتھ کہ پہلی میں صرف قیامت کے دن کے خوف کے متعلق گفتگو ہے اور دوسری میں قیامت کے دن پروردگار کا خوف ہے ، ایک موقع پر روزِ قیامت کی اس طرح سے توصیف ہوئی ہے کہ اس کا شر اور عذاب وسیع اور پھیلا ہوا ہے اور دوسرے موقع پر عبوس اور شدید ہے ، جو حقیقت میں ایک تو اس کی وسعت کو بتاتی ہے اور دوسری اس کی کیفیت کی وسعت کو ۔

آخری زیرِ بحث آیت میں " ابرار " کے نیک اعمال اور پاک نیتوں کے اجمالی نتیجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : " انھیں امور کی بناء پر خدا انھیں اس دن کے شر سے بچائے گا اور ان کا مسرت و شادمانی کی حالت میں استقبال کرے گا (فوقاھم اللہ شر

---

[1] " مفردات " " راغب " " لسان العرب " " المنجد " " قرطبی " و " مجمع البیان "

ذالك اليوم ولقّاهم نضرة وسرورًا)۔

" نضرۃ " طراوت، فرحی اور ایک خاص قسم کی شادابی کے معنی میں ہے جو وفور نعمت اور آسودگی کے زیر اثر انسان کو حاصل ہوتی ہے، ہاں! اس دن ان کے رخساروں کا رنگ ان کے سکون و آرام اور اندرونی سرور و نشاط کی خبر دے گا۔

اس بنا پر اگر وہ دنیا میں اس دن کے احساس مسئولیت سے خوف زدہ تھے، تو خدا اس کے بدلے میں انھیں قیامت کے دن سرور و شادمانی میں غرق کر دے گا۔

" لقّاهم " کی تعبیر بہت ہی عمدہ تعبیروں میں سے ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ خداوند عالم ان گرامی قدر مہمانوں کا اپنے خاص لطف سے استقبال کرے گا اور انھیں جو خوشی و سرور میں غرق ہوں گے، اپنی رحمت کے سایہ میں جگہ دے گا۔

ایک نکتہ

بھوکوں کو سیر کرنا بہترین حسنات میں سے

نہ صرف زیر بحث آیات میں، کھانا کھلانے کو ابرار اور عباد اللہ کے عمدہ کاموں میں سے ایک شمار کرتا ہے، بلکہ قرآن کی بہت سی آیات میں اس معنی پر تکیہ اور تاکید ہوئی ہے، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ کام خدا کی بارگاہ میں ایک خاص قسم کی محبوبیت رکھتا ہے۔

اور اگر ہم آج کی دنیا پر نگاہ کریں تو منتشر ہونے والی خبروں کے مطابق، ہر سال کئی ملین افراد بھوک سے مر جاتے ہیں، جبکہ دنیا کے دوسرے امیر علاقوں میں، اس قدر زیادہ بچے ہوئے کھانے کوڑے میں پھینک دیئے جاتے ہیں کہ جس کا کوئی حساب نہیں ہے، اس سے ایک طرف تو اس اسلامی حکم کی اہمیت اور دوسری طرف سے آج کی دنیا کا اخلاقی اقدار و موازین سے دور ہو جانا واضح ہو جاتا ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس سلسلہ میں بہت زیادہ تاکید نظر آتی ہے، ہم نمونہ کے طور پر یہاں چند احادیث نقل کرتے ہیں۔

۱۔ ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

من اطعم ثلاثة نفر من المسلمين اطعمه الله من ثلاث جنان في ملكوت السماوات

" جو شخص مسلمانوں میں سے تین افراد کو کھانا کھلائے گا تو خدا اسے آسمانوں کے ملکوت میں جنت کے تین باغوں سے کھانا کھلائے گا۔" [1]

---

[1] " اصول کافی " جلد دوم باب " اطعام المؤمن " حدیث ۲

۲۔ ایک اور حدیث میں امام صادق سے یہ آیا ہے:

من اطعم مؤمنا حتى يشبعه لم يدر احد من خلق الله ماله من الاجر في الأخرة، لا ملك مقرب ولا نبي مرسل الا الله رب العالمين

"جو شخص کسی مومن کو کھانا کھلائے گا، یہاں تک کہ وہ سیر ہو جائے، تو مخلوقِ خدا میں سے کوئی شخص بھی نہیں جانتا کہ اسے آخرت میں کس قدر اجر و ثواب ملے گا، نہ کوئی خدا کا مقرب فرشتہ اور نہ ہی کوئی نبی مرسل، سوائے خدا کے جو عالمین کا پروردگار ہے"[1]

۳۔ ایک اور حدیث میں اسی امام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

لان اطعم مؤمنا محتاجا احب الي من ان ازوره، ولان ازوره احب الي من ان اعتق عشر رقاب

"اگر میں کسی محتاج مومن کو کھانا کھلاؤں، تو یہ بات میرے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں صرف اس کے دیدار اور زیارت کے لیے جاؤں، اور اگر میں اس کے دیدار اور زیارت کے لیے جاؤں تو یہ میرے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں دس غلاموں کو آزاد کروں"[2]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ روایات میں صرف محتاجوں اور بھوکوں پر تکیہ نہیں ہوا ہے، بلکہ بعض روایات میں تو صراحت کے ساتھ آیا ہے، کہ مومنین کو کھانا کھلانا، اگرچہ وہ بے نیاز ہی کیوں نہ ہوں، غلام آزاد کرنے کے مانند ہے، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس کام کا مقصد احتیاجات کو دور کرنے اور ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ، جلبِ محبت اور دوستی والفت کے رشتوں کی مضبوطی بھی ہے۔ اس کے برعکس کہ جو کچھ آج کی مادی دنیا میں معمول ہو چکا ہے کہ بعض اوقات دو قریبی دوست یا دو رشتہ دار کسی ہوٹل یا مہمان خانے میں جاتے ہیں، تو ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے حصہ کی رقم ادا کرتا ہے، گویا مہمان بنانے کا مسئلہ خصوصاً زیادہ افراد کو مہمان بنانا گویا ان کے لیے بہت ہی تعجب کا باعث ہے۔

۴۔ بعض روایات میں یہ تصریح بھی ہوئی ہے کہ بھوکوں کو مطلق طور پر کھانا کھلانا (چاہے وہ مومن اور مسلمان نہ بھی ہوں) افضل اعمال میں سے ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں پیغمبر گرامیِ اسلام سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

من افضل الاعمال عند الله ابراد الكباد الحارة واشباع الكباد الجائعة والذى نفس محمد صلى الله عليه وآله، بيده لا يؤمن بى عبد يبيت شبعان واخوه - اوقال جاره - المسلم جائع

"خدا کے نزدیک افضل اعمال میں سے ایک عمل پیاسوں کو ٹھنڈا پانی پلانا، اور بھوکے شکموں کو

---

[1] اصولِ کافی جلد دوم باب "اطعام المومن" حدیث ۶۔

[2] مدرک بالا، حدیث ۱۰۔

سیر کرتا ہے، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے، جو بندہ رات کو سیر ہو کر سو جائے اور اس کا بھائی ———— یا یہ فرمایا کہ اس کا مسلمان ہمسایہ ———— بھوکا ہو تو وہ مجھ پر ایمان نہیں لایا[1]

اوپر والی حدیث کا آخری حصہ اگرچہ مسلمانوں کو سیر کرنے کے بارے میں ہے، لیکن اس کا آغاز ہر پیاسے اور بھوکے سے ہوا ہے اور بعید نہیں ہے کہ اس کے مفہوم کی وسعت جانوروں تک کو بھی شامل ہو۔

اور اس سلسلہ میں روایات بہت ہیں[2]

---

[1] "بحار الانوار" جلد ۷۴، ص ۳۶۹، قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مرحوم علامہ مجلسی نے اس سلسلہ میں ایک باب عنوان کیا ہے جس میں ۱۱۲ احادیث نقل کی ہیں جو مومن کو کھانا کھلانے، سیراب کرنے، لباس پہنانے اور اس کا قرض ادا کرنے کے بارے میں ہیں اور ان میں سے بعض بہت ہی دلکش ہیں۔

[2] مدرکِ بالا

۱۲۔ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝

۱۳۔ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝

۱۴۔ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝

۱۵۔ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ۝

۱۶۔ قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝

۱۷۔ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝

۱۸۔ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝

۱۹۔ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝

۲۰۔ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝

۲۱۔ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۡ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝

۲۲۔ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝

ترجمہ

۱۲۔ خدا ان کے صبر کرنے کے صلہ میں بطور جزا، انھیں جنّت اور بہشت کے ریشمی لباس عطا کرے گا۔

۱۳۔ وہ اس میں خوبصورت تختوں کے اوپر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، نہ وہاں وہ سورج کو دیکھیں گے اور نہ ہی سخت سردی کو۔

۱۴۔ اور ان (بہشتی درختوں) کے سایے ان کے اوپر پڑ رہے ہوں گے، اور ان کے پھلوں کو توڑنا ان

کے لیے بہت ہی آسان ہو گا۔

۱۵۔ اور ان کے گرداگرد (بہترین کھانوں اور مشروبات سے پُر) چاندی کے برتنوں اور بلورین پیالوں کو گردش دے رہے ہوں گے۔

۱۶۔ چاندی کے بلورین ظروف، جنھیں ضروری اندازوں کے مطابق تیار کیا ہوا ہو گا۔

۱۷۔ اور وہاں ایسے پیالوں سے سیراب کیا جائے جو ایسی شرابِ طہور سے لبریز ہوں گے، جس میں زنجبیل کی آمیزش ہو گی۔

۱۸۔ بہشت کے ایک چشمہ سے جس کا نام سلسبیل ہے۔

۱۹۔ اور ان کے گرد ہمیشہ رہنے والے نوجوان (پذیرائی کے لیے) گردش میں ہوں گے، جس وقت تو انھیں دیکھے گا تو گمان کرے گا کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔

۲۰۔ اور جس وقت تو اس جگہ کو دیکھے گا، تو پھر تو نعمتوں اور ایک ملکِ عظیم کو دیکھے گا۔

۲۱۔ ان (بہشتیوں) کے جسموں پر نازک سبز رنگ کے ریشمی اور دیباج کے لباس ہوں گے، اور انھوں نے چاندی کے دست بند پہنے ہوئے ہوں گے اور ان کا پروردگار انھیں شرابِ طہور پلائے گا۔

۲۲۔ یہ تو تمھاری جزا ہے اور تمھاری سعی و کوشش لائقِ قدردانی ہے۔

تفسیر

بہشت کی عظیم جزائیں

گزشتہ آیات میں "ابرار اور نیک افراد" کے قیامت کے دن کے دردناک عذاب سے نجات پانے اور لقائے محبوب کو پہنچنے، اور سرور و شادی میں غرق ہونے کی طرف اجمالی اشارہ کرنے کے بعد زیرِ بحث آیات میں ان بہشتی نعمتوں کی تشریح کرتا ہے اور ان آیات میں کم از کم پندرہ نعمتوں کو شمار کرتا ہے۔

سب سے پہلے ان بہشتیوں کے مکان اور لباس کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، اور فرماتا ہے: "خدا ان کے صبر و شکیبائی کے صلہ میں انھیں جنت اور ریشمی لباس و فرش جزا کے طور پر دے گا" (وجزاھم بما صبروا جنة و حریرًا)۔

ہاں! اس استقامت، پامردی اور ایثار کے مقابلہ میں ــــــ جس کا ایک نمونہ، نذر کو پورا کرنا اور روزے رکھنا اور اپنا وہ کھانا جس کی انھیں خود ضرورت تھی، مسکین و یتیم و اسیر کو بخش دینا ہے ــــــ خدا انھیں جنت کے باغات میں جگہ دے گا، اور انھیں بہترین

لباس پہنائے گا۔

نہ صرف ان آیات میں بلکہ قرآن کی دوسری آیات میں بھی اس حقیقت کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کی جزائیں انسان کے صبر و شکیبائی کے مقابلہ میں ہیں (اطاعت کی راہ میں صبر کرنا، معصیت کے مقابلہ میں صبر کرنا اور مشکلات و مصائب کے مقابلہ میں صبر کرنا)۔

سورہ رعد کی آیہ ۲۴ میں آیا ہے کہ فرشتے جنتیوں کو اس طرح خوش آمدید کہیں گے: سلام علیکم بما صبرتم اس صبر و استقامت پر جو تم نے کیا تم پر سلام ہے۔

اور سورہ مومنون کی آیہ ۱۱۱ میں آیا ہے (انی جزیتھم الیوم بما صبروا انھم ھم الفائزون) میں نے آج انہیں ان کے صبر و استقامت کی جزا دی ہے، یقیناً وہ کامیاب و رستگار ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ اس میں خوبصورت تختوں کے اوپر تکیہ لگائے ہوئے ہوں گے، نہ وہاں سورج کی گرمی ہوگی اور نہ ہی ہوا کی سردی لگے گی" (متکئین فیھا علی الارائک لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا)۔

(تختوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنے کی) اس حالت کا ذکر ان کے مکمل راحت و آرام کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ انسان عام طور پر آرام و سکون کی حالت میں اس طرح بسر کرتا ہے۔ اور آیت کے ذیل میں بھی جنت کی فضا کے مکمل اعتدال کی طرف اشارہ ہے۔

نہ یہ کہ سورج اور چاند وہاں موجود ہی نہ ہوں گے، بلکہ سورج کی تکلیف دینے والی تپش نہیں ہوگی، کیونکہ وہاں جنت کے درختوں کا سایہ ہوگا۔

"زمھریر" "زمھر" کے مادہ سے سردی کی شدت یا غضب کی شدت یا غصہ کے اثر سے آنکھ کے سرخ ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں وہی پہلا معنی مراد ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جہنم میں ایک جگہ ایسی ہے، جہاں سردی کی شدت کی وجہ سے جسم کے اعضاء ریزہ ریزہ ہو کر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے[1]

"ارائک" "اریکہ" کی جمع ہے، اصل میں ان پلنگوں کو کہتے ہیں، جنہیں حجلۂ عروسی میں رکھتے ہیں، اور یہاں خوبصورت، زیبا اور فاخرہ پلنگ مراد ہیں۔

اہلسنت کے مشہور مفسر آلوسی "روح المعانی" میں ابن عباس سے ایک حدیث اس طرح نقل کرتے ہیں:

"بینا اھل الجنۃ فی الجنۃ اذ رأوا ضوءاً کضوء الشمس وقد اشرقت الجنان بہ فیقول اھل الجنۃ یا رضوان ما ھذا!

وقد قال ربنا لا یرون فیھا شمسا ولا زمھریرا فیقول لھم رضوان لیس ھذا بشمس ولا قمر، ولکن علی (ع) و فاطمہ (ع) ضحکا و

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۳۰۰

اشرقت الجنان من نور ثغریهما

"جب بہشتی، بہشت میں داخل ہوں گے تو اچانک سورج کی روشنی کی مانند ایک روشنی مشاہدہ کریں گے، جو جنت کے منظر کو روشن کردے گی۔ جنت والے رضوان (جنت پر مامور فرشتہ) سے کہیں گے: یہ نور کیسا ہے حالانکہ ہمارے پروردگار نے فرمایا ہے، کہ جنت میں نہ تو سورج کو دیکھیں گے اور نہ ہی سردی کو، تو وہ جواب میں کہے گا، یہ سورج اور چاند کا نور نہیں ہے، یہ تو علیؑ اور فاطمہؑ ہنسے ہیں، اور جنت ان کے دانتوں سے روشن ہوگئی ہے۔"[1]

بعد والی آیت ان نعمتوں کے بیان کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتی ہے: "اور ان بہشتی درختوں کے سایے ان کے اوپر پڑ رہے ہوں گے اور ان کے پھلوں کو توڑنا ان کے لیے بہت ہی آسان ہوگا۔" (ودانية عليهم ظلالها وذللت قطوفها تذليلا)۔[2]

نہ تو کوئی مشکل پیش آتی ہے اور نہ ہاتھ میں کوئی کانٹا چبھتا ہے اور نہ ہی پھلوں کو توڑنے کے لیے کوشش کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ ہی کہیں چل کر جانے کی۔

ہم ایک مرتبہ پھر اس نکتہ کو یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ اصول جو انسان کی زندگی پر اس جہان پر حاکم ہیں وہ اس جہان سے بہت ہی مختلف ہیں اور قرآن کی ان آیات میں اور دوسری آیات میں، جنت کی نعمتوں کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ان عظیم نعمتوں کی طرف صرف پرمعنی اشارے ہیں، ورنہ بعض روایات کی تصریح کے مطابق وہاں اس قسم کی نعمتیں ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے، اور نہ ہی کسی کان نے سنا ہے اور نہ کبھی کسی کے وہم و گمان میں آئی ہیں۔

"ابن عباس" کا ایک کلام ہے جو انھوں نے اس سورہ کی بعض آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا نے قرآن میں جن نعمتوں کا ذکر کیا ہے، اس کی مثل و نظیر دنیا میں نہیں ہے، لیکن خدا نے ہمارے جانے پہچانے ناموں کے ساتھ ان کا نام لیا ہے، مثلاً شراب طہور کا ذکر کرتا ہے کہ جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی یہ ایک معطر مادہ ہوتا تھا جسے عرب بہت ہی پسند کرتے تھے۔[3]

بعد والی آیت میں خدا کے ان جنتی مہمانوں کی پذیرائی کی کیفیت کے ایک حصہ کی وضاحت، ان کی پذیرائی کے وسائل اور پذیرائی کرنے والوں کی حالت بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "ان کے گرد گرد چاندی کے برتنوں اور بلوریں پیالوں کو گردش دے

---

[1] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۵۹

[2] "قطوف" بروزن "ظروف" جمع "قطف" (بروزن حفظ) یا جمع "قطف" (بروزن حرف) ہے، جس میں سے پہلا تو مصدر ہے اور دوسرا اسم مصدر اور چنے ہوئے پھلوں یا پھل کے چننے کے معنی میں ہے۔

[3] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۱۱

ہوں گے: (و یطاف علیھم بآنیۃ من فضۃ واکواب کانت قواریرا)۔

"چاندی کے بلوریں ظروف، جنھیں ضروری اندازوں کے مطابق تیار کیا ہوگا" (قواریرا من فضۃ قدروھا تقدیرا)۔

ان برتنوں میں جنت کے انواع واقسام کے کھانے، اور ان بلوریں پیالوں میں انواع واقسام کے لذت بخش اور نشاط آفریں مشروبات جتنی مقدار میں وہ چاہیں گے اور پسند کریں گے موجود ہوں گے اور جنت کے خدمت گار مسلسل ان کے گرداگرد گھوم رہے ہوں گے، اور ان کے سامنے پیش کر رہے ہوں گے۔

"آنیۃ" جمع ہے "اناء" کی، ہر قسم کے برتن کے معنی میں ہے اور "اکواب" جمع ہے "کوب" (بر وزن خوب) کی، پانی کے برتن کے معنی میں ہے، جس میں دستہ نہیں ہوتا، جسے بعض اوقات "قدح" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

"قواریر" جمع ہے "قارورہ" کی جو بلوریں اور شیشہ کے برتن کے معنی میں ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فرماتا ہے: جنت کے بلوریں اور شیشہ والے برتن چاندی کے بنائے گئے ہیں، جبکہ عالم دنیا میں اس قسم کا برتن مطلقاً موجود نہیں ہے اور بلوریں برتنوں کو مخصوص قسم کے پتھروں کو پگھلا کر بناتے ہیں، لیکن وہی خدا جس نے سیاہ اور تاریک پتھر میں یہ امکان پیدا کر دیا ہے کہ وہ شیشہ اور بلور میں تبدیل ہو جائے، وہ چاندی جیسی دھات میں بھی یہ امکان پیدا کر سکتا ہے۔

بہرحال اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے برتن اور پیالے، بلور اور شیشہ کی طرح صاف و شفاف بھی ہوتے ہیں اور چاندی کی خوبصورتی اور درخشندگی بھی رکھتے ہیں، اور ان میں جو مشروب ہیں وہ مکمل طور پر نمایاں ہیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے، آپ نے فرمایا:

ینفذ البصر فی فضۃ الجنۃ کما ینفذ فی الزجاج

"انسان کی آنکھ کا نور جنت کی چاندی میں اس طرح نفوذ کر جائے گا، جیسا کہ دنیا کے شیشہ اور بلور میں نفوذ کرتا ہے"۔[1]

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں ماہرین نے کچھ ایسی شعاعیں معلوم کر لی ہیں (ایکس شعاعوں کے مانند) جو تاریک اور ٹھوس جسموں سے بھی گزر جاتی ہیں اور انھیں بلور اور شیشہ کی مانند دکھاتی ہیں۔

ابن عباس کہتے ہیں: جنت کی تمام نعمتیں اپنی مشابہ اور مثل و نظیر رکھتی ہیں، سوائے بلوریں اور شیشے کے برتنوں کے جو چاندی سے بنے ہوئے ہوں گے، جس کی دنیا میں شبیہ اور نظیر نہیں ہے۔[2]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۱۰۔

[2] "روح المعانی" جلد ۲۹ ص ۱۵۹

اس کے بعد مزید کہتا ہے : "وہاں ایسے پیالوں سے سیراب ہوں گے جو شراب طہور سے لبریز ہوں گے جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی" :
(ویسقون فیها کاسًا کان مزاجها زنجبیلًا)۔

بہت سے مفسرین نے تصریح کی ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب ایسی شراب سے جس میں زنجبیل کی آمیزش ہوتی تھی، لذت حاصل کرتے تھے، کیونکہ اس سے ایک خاص قسم کی تیزی شراب میں آجاتی تھی، اور قرآن یہاں ایسے جاموں کی بات کرتا ہے، جس کی شراب طہور میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس شراب اور اس شراب میں زمین آسمان کا فرق ہے یا دوسرے لفظوں میں دنیا اور آخرت کا فرق ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب دو قسم کی شراب رکھتے تھے، جن کی دو مختلف حالتیں ہوتی تھیں، ایک تو اصطلاح میں نشاط آور اور محرک ہوتی تھی اور دوسری سست کرنے والی اور آرام بخش، پہلی میں "زنجبیل" کی آمیزش کرتے تھے، اور دوسری میں "کافور" کی اور چونکہ عالم آخرت کے حقائق اس جہان کے الفاظ کے قالب میں نہیں آسکتے، لہٰذا اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ان عظیم حقائق کو بیان کرنے کے لیے انھیں الفاظ کو زیادہ وسیع اور زیادہ بلند معانی کے ساتھ استعمال کیا جائے۔

اگرچہ "زنجبیل" کے معنی کے بارے میں مختلف تفسیریں نقل ہوئی ہیں، لیکن زیادہ تر اسی معطر اور خوشبودار جڑ کے ساتھ اس کی تفسیر کی ہے جو کھانے پینے کی مخصوص دواؤں میں استعمال ہوتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : "یہ جام بہشت کے ایک چشمے سے پُر کیے جاتے ہیں، جسے سلسبیل کہا جاتا ہے" (عینًا فیها تسمّٰی سلسبیلًا)[1]

"سلسبیل" بہت ہی لذیذ قسم کے مشروب کو کہتے ہیں، جو آرام کے ساتھ منہ اور گلے سے اترتا ہے اور بڑا ہی خوش گوار ہوتا ہے، بہت سوں کا نظریہ یہ ہے کہ یہ "سلاسہ" کے مادہ سے لیا گیا ہے جو "روانی" کے معنی میں ہے، جیسا کہ رواں اور شستہ عبارتوں کو بھی "سلیس" کہا جاتا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ "تسلسل" کے مادہ سے لیا گیا ہے، جو پے در پے "حرکت" کے معنی میں ہے اور نتیجہ میں کسی چیز کے رواں ہونے کو بیان کرتا ہے، اس بناء پر دونوں معانی ایک دوسرے کے قریب ہیں، اور ہر صورت میں "باء" اس میں اضافی ہے۔

بعض کا یہ بھی نظریہ ہے کہ یہ لفظ دو الفاظ سے مرکب ہے "سل" اور "سبیل" اور بعض اسے "سال" اور "سبیل" سے مرکب سمجھتے ہیں، پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ "راستہ طلب کرو"، اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ "اس نے راستہ طلب کیا" اور دونوں کا کنائی معنی "خوشگوار" ہے۔

---

[1] "عینا" کے محل اعراب کے سلسلہ میں جو بات ہم نے پہلے کی چند آیات میں کہی ہے، وہ بعینہٖ جاری ہے، اور مناسب یہ ہے کہ یہ "منصوب بنزع خافض" کی قسم سے ہو۔

بعض نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ عربی زبان میں "سلسبیل" کے لفظ کا وجود ہی نہیں تھا اور یہ قرآن مجید کی ایجادات میں سے ہے[1] لیکن پہلا معنی سب سے زیادہ مشہور اور زیادہ مناسب ہے۔

اس کے بعد اس پرسرور بزم کی پذیرائی کرنے والوں کے بارے میں ـــــ جو بہشت بریں میں حق تعالیٰ کے جوارِ رحمت میں برپا ہوگی ـــــ گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: "اور ان کے گرد ہمیشہ رہنے والے نوجوان گردش میں ہوں گے، جب تو انھیں دیکھے گا، تو گمان کرے گا کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں"۔ (ویطوف علیھم ولدان مخلدون اذا رأیتھم حسبتھم لؤلؤا منثورا)۔

وہ خود بھی جنت میں ہمیشہ رہیں گے اور ان کی جوانی کی طراوت و زیبائی اور نشاط و خوشی بھی جاودانی اور ہمیشہ رہے گی، اور ان کا پذیرائی کرنا بھی، کیونکہ "مخلدون" کی تعبیر ایک طرف سے، اور "یطوف علیھم" (ان کے گرد طواف کریں گے) کی تعبیر دوسری طرف سے، اس واقعیت کو بیان کرتی ہے۔

"لؤلؤا منثورا" (بکھرے ہوئے موتی) کی تعبیر ان کی خوبصورتی و زیبائی، صفا و درخشندگی اور جاذبیت کی طرف بھی اشارہ ہے اور اس روحانی بزم خداوندی میں، ان کے ہر جگہ پر حاضر رہنے کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اور چونکہ دوسرے جہان کی نعمتوں کی تعریف و توصیف ہو ہی نہیں سکتی، چاہے الفاظ کتنے ہی گویا اور رسا کیوں نہ ہوں، لہٰذا بعد والی آیت میں سربستہ طور پر مزید کہتا ہے: "اور جس وقت تو وہاں دیکھے گا تو پھر بہت سی نعمتوں اور ایک ملک عظیم کو دیکھے گا"۔ (واذا رأیت ثم رأیت نعیما و ملکا کبیرا)[2]۔

"نعیم" اور "ملک کبیر" کے لیے بہت سی تفسیریں بیان کی گئی ہیں، منجملہ ان کے ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ:

"اس آیت کا معنی یہ ہے کہ وہ ایک ایسا ملک ہے جو کبھی زائل اور فنا پذیر نہیں ہوگا"۔[3]

یا جنت کی نعمتیں اس قدر وسیع ہیں کہ کثرت کے لحاظ سے ان کی تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔

---

[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "سلسبیل" تانیث غیر منصرف ہے، کیونکہ علمیت اور عُجمہ اس میں جمع ہے اور وہ تنوین جو اس میں پائی جاتی ہے، وہ اس سورہ کی دوسری آیات سے ہم آہنگی کی بناء پر ہے۔

[2] بعض مفسرین نے تصریح کی ہے کہ "ثم" یہاں "ظرف مکان" ہے اور "رأیت" فعل لازم کا معنی رکھتا ہے اور آیت کا معنی اس طرح ہو گا "اذا رمیت ببصرك ثم رأیت نعیما و ملکا کبیرا۔ (جب تو نظر ڈالے گا تو نعمتوں اور ملک کبیر کو دیکھے گا)۔ یہ احتمال بھی ہے کہ "ثم" وہاں کے لیے اسم اشارہ ہو اور "رأیت" کا مفعول ہو۔

[3] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۱۱

یا "ملک کبیر" یہ ہے کہ فرشتے اہل جنت کے پاس جانے کے وقت ان سے اجازت لیں گے، اور سلام کے ساتھ ان کو خوش آمدید کہیں گے۔

یا یہ ہے کہ جنت والے جس چیز کا ارادہ کریں گے، وہ انھیں مل جائے گی۔

یا ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کا قلمرو نے ملک اس قدر ہوگا کہ جب وہ نگاہ کرے گا تو ایک ہزار سال راہ کے فاصلہ کو دیکھے گا۔

یا یہ دائمی اور ابدی ملک کے معنی میں ہے، جس میں اس کی تمام آرزوئیں پوری ہوں گی۔

"نعیم" کا لفظ جو لغت میں "فراواں نعمتوں" کے معنی میں ہے اور "ملک کبیر" جو جنت کے باغات کی عظمت اور وسعت کی خبر دیتا ہے، ایک وسیع اور عریض مفہوم رکھتا ہے۔ جو اوپر کی تمام تفاسیر کو شامل ہے۔

یہاں تک جنت کی نعمتوں کے ایک حصہ کی طرف جو مکانوں، پلنگوں، سایوں، پھلوں، مشروبات، بہ تجمل اور پذیرائی کرنے والوں کی قسم سے ہیں اشارہ ہوا ہے، اب جنتیوں کی زینت و آراستگی کے وسائل کی نوبت ہے، فرماتا ہے:

"ان کے جسموں پر نازک سبز رنگ کے ریشمی اور دیبا کے لباس ہوں گے" (عالیهم ثیاب سندس خضر و استبرق)۔[1]

"سندس" ریشم کے نازک کپڑے کے معنی میں ہے جبکہ "استبرق" موٹے ریشمی کپڑے کے معنی میں ہے، بعض اسے فارسی کا لفظ استبر یا ستبر سمجھتے ہیں، بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ عربی اصل "برق" سے جو چمکنے کے معنی میں ہے، لیا گیا ہے، اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور ان کی چاندی کے دست بندوں کے ذریعہ تزئین کی گئی ہوگی" (و حلوا اساور من فضة)۔

ایسی صاف شفاف چاندی، جو موتی کی طرح چمکتی ہے، اور یاقوت، ڈُر اور مروارید سے زیادہ خوبصورت ہے۔

"اساور" جمع ہے "اسورة" (بروزن مغفرة) کی اور وہ بھی اپنی نوبت پر "سوار" (بروزن غبار) یا سوار (بروزن کتاب) کی جمع ہے، جو اصل میں فارسی کے لفظ "دستوار" سے لیا گیا ہے، جو "دست بند" (کنگن) کے معنی میں ہے اور عربی زبان کی طرف منتقل ہونے وقت اس میں مختصر سی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے اور اس نے "سوار" کی صورت اختیار کر لی ہے۔

جنت کے لباسوں کے لیے سبز رنگ کو انتخاب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ بہت ہی نشاط آفریں ہوتا ہے، درختوں کے خوبصورت پتوں کی طرح، البتہ سبز رنگ کی بھی کئی انواع و اقسام ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے مقام پر بہت عمدہ ہوتا ہے۔

بعض آیات قرآنی: مثلاً سورۂ کہف کی آیہ ۳۱ میں آیا ہے کہ جنتیوں کے سونے کے کنگنوں سے زینت کی جائے گی "یحلون فیها من اساور من ذهب۔" لیکن یہ بات اس لیے کہ جو زیر بحث آیت میں آئی ہے کوئی منافات نہیں رکھتی،

---

[1] "عالیهم" کے محل اعراب کے بارے میں دو احتمال ہیں۔ پہلا یہ کہ یہ ظرف ہے "فوق" (اوپر) کے معنی میں ہے، اس قول کی بناء پر آیت کا مفہوم اس طرح ہے "فوقهم ثیاب سندس" دوسرا یہ کہ یہاں "هم" ضمیر کا حال ہے جو پہلی آیات میں آئی ہے اور "ابرار" کی طرف لوٹتی ہے اور جملہ کا معنی اس طرح سے ہوگا "حالکونهم یعلوهم ثیاب سندس خضر" (جبکہ سبز نازک ریشم کے کپڑے ان کے اوپر ہوں گے)

کیونکہ ہوسکتا ہے کہ تنوع کی بناء پر کبھی اس سے زینت کریں اور کبھی اس سے ۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا سونے اور چاندی کے کنگن عورتوں کی زینت نہیں ہیں ؟ تو پھر جنت کے مردوں کے لیے اس زینت کا ذکر کیوں کیا گیا ہے ؟

لیکن اس کا جواب واضح ہے کیونکہ بہت سے معاشرے اور ماحول ایسے ہیں جن میں سونا اور چاندی مردوں کے لیے بھی زینت ہے اور عورتوں کے لیے بھی (اگرچہ اسلام نے سونے کی زینت کو مردوں کے لیے حرام قرار دیا ہے) لیکن یقینی طور پر مردوں اور عورتوں کے دست بندوں کی نوعیت مختلف ہوگی اور سورۂ زخرف کی آیہ ۵۳ میں فرعون کے قول سے جو نقل ہوا ہے ــــــ فلولا القی علیہ اسورۃ من ذھب " موسیٰ کو سونے کے کنگن کیوں نہ دیئے گئے ــــــ یہ معلوم ہوتا ہے کہ سونے کے دست بند مصر کے ماحول میں مردوں کے لیے عظمت کی نشانی سمجھے جاتے تھے ۔

علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے بارہا اشارہ کیا ہے ، چونکہ جنت کی نعمتوں کے بیان کے لیے اس دنیا کے عام الفاظ ہرگز کافی نہیں ہیں ، لہٰذا اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ ان عظیم اور ناقابلِ تعریف و توصیف نعمتوں کی طرف انہی الفاظ کے ساتھ کچھ اشارے کیے جائیں ۔

اور بالآخر آیت کے آخر میں نعمتوں کے اس سلسلہ کی آخری اور اہم ترین نعمت کے عنوان سے فرماتا ہے : "اور ان کا پروردگار انہیں شرابِ طہور پلائے گا" (و سقاھم ربھم شرابا طھورا)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان نعمتوں کے بیان کے درمیان بھی ، خوشگوار مشروبات کے بارے میں ــــــ جو ایسے جاموں سے جو سلسبیل کے چشمے سے پُر ہوں گے اور جنتی ان سے سیراب ہوں گے ــــــ ذکر ہوا تھا لیکن ان میں اور جو کچھ اس آیت میں بیان ہوا ہے ، بہت فرق ہے ، کیونکہ ایک طرف تو وہاں ساقی " ولدان مخلدون " تھے لیکن یہاں ساقی " خدا " ہے اور کیا ہی عجیب و غریب تعبیر ہے ۔ خصوصاً " رب " کے لفظ پر تکیہ کے ساتھ وہ خدا جس نے ہمیشہ اس انسان کی پرورش کی ہے اور اس کا مالک و مربی ہے ، اسے تکامل و ارتقاء کے مراحل میں ہمیشہ آگے لے گیا ہے ، یہاں تک کہ وہ آخری مرحلہ تک آپہنچا ہے اور اب اس بات کی نوبت آگئی ہے کہ وہ اپنی ربوبیت کو حدِ اعلیٰ تک پہنچا دے ، اور اپنے دستِ قدرت سے ابرار اور نیک بندوں کو شرابِ طہور کے جام سے سیراب اور سرمست کر دے ۔

اور دوسری طرف " طھور " اس چیز کے معنی میں ہے جو خود بھی پاک ہے اور دوسروں کو بھی پاک کرتی ہے ، اس طرح سے یہ شراب انسان کے جسم و روح کو ہر قسم کی آلودگی اور ناپاکی سے پاک کرتی ہے اور ایسی روحانیت ، نورانیت اور نشاط بخشتی ہے کہ کسی عبارت سے اس کی توصیف نہیں ہو سکتی ، یہاں تک کہ ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے ؛

یطھرھم عن کل شیء سوی اللہ

" ان کے دل و جان کو خدا کے علاوہ ہر چیز سے پاک کر دے گی " [1]

غفلت کے پردوں کو چاک کر دیتی ہے ، حجابوں کو دور کر دیتی ہے ، اور انسان کو خدا کے جوارِ قرب میں دائمی حضور کے لیے شائستہ

---

[1] " مجمع البیان " جلد ۱۰ ص ۴۱۱

اور لائق بنا دیتی ہے، اس شرابِ طہور کا نشہ ہر نعمت سے برتر اور ہر موہبت سے بالاتر ہے۔

اگر دنیا کی آلودہ اور گندی شراب عقل کو زائل کر دیتی ہے اور خدا سے دور کر دیتی ہے، تو یہ شرابِ طہور جو ساقی "الست" کے ہاتھ سے دی جائے گی وہ اسے "ماسویٰ اللہ" سے بیگانہ کر کے اس کے جمال و جلال میں غرق کر دے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو لطف اس آیت اور اس نعمت میں چھپا ہوا ہے وہ سب سے برتر اور بالاتر ہے۔

ایک حدیث سے جو رسولِ خدا سے نقل ہوئی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شرابِ طہور کا چشمہ جنت کے دروازے پر واقع ہے:

فیسقون منها شربة فیطهر الله بها قلوبهم من الحسد...... وذٰلك قول الله عزوجل وسقاهم ربهم شرابًا طهورًا۔

"انھیں اس شرابِ طہور کا ایک گھونٹ پلایا جائے گا اور خدا اس کے ذریعہ سے ان کے دلوں کو حسد (اور ہر قسم کے صفاتِ رذیلہ سے) پاک کر دے گا۔"[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں "طهور" کی تعبیر صرف دو موقعوں پر آئی ہے، ایک تو بارش کے بارے میں (فرقان ۴۸) جو ہر چیز کو پاک اور زندہ کر دیتی ہے اور دوسرے زیرِ بحث آیت میں جنت کی مخصوص شراب کے بارے میں کہ وہ بھی پاک کرنے والی اور حیات بخش ہے۔

اور آخری زیرِ بحث آیت میں، اس سلسلہ میں آخری بات بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا کی طرف سے انھیں کہا جائے گا: یہ عظیم نعمتیں اور بے نظیر مواہب تمھارے اعمال کا اجر ہیں، اور حق تعالیٰ کے فرمان کی اطاعت کی راہ میں تمھاری سعی و کوشش اور جد و جہد مقبول و مشکور ہے" (ان هذا كان لكم جزاءً وكان سعيكم مشكورًا)۔

شاید کوئی یہ تصور کرے کہ یہ مواہب اور عظیم اجر انھیں کسی حساب کے بغیر ہی دے دیا جائے گا، یہ سب کچھ کوشش اور عمل کی جزا ہے اور مجاہدت، خود سازیوں اور گناہ سے چشم پوشی کا اجر ہے۔

اس مطلب کو بیان کرنے میں خود ایک خاص لذت اور لطف ہے کہ خداوند تعالیٰ یا اس کے فرشتے ابرار اور نیک لوگوں کو مخاطب کر کے قدر دانی اور تشکر کے طور پر ان سے کہیں: "یہ سب کچھ تمھارے اعمال کا اجر ہے اور تمھاری سعی و کوشش قابلِ قدر ہے۔" بلکہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق یہ تو ایک ایسی نعمت ہے، جو تمام نعمتوں اور مواہب سے بالاتر ہے کہ خدا انسان کا شکریہ ادا کرے۔

"کان" کی تعبیر، جو فعل ماضی ہے، گزشتہ زمانہ کی خبر دیتا ہے، ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ نعمتیں پہلے سے ہی تمھارے لیے فراہم ہو چکی ہیں، کیونکہ جب کوئی شخص اپنے کسی مہمان کو زیادہ اہمیت دیتا ہے تو اس کی پذیرائی کے وسائل مدتوں پہلے سے آمادہ کر لیتا ہے۔

---

[1] اس آیت میں حقیقت میں ایک جملہ مقدر ہے مثلاً "یقال لهم" یا "یقول الله لهم" (خدا ان سے کہے گا)۔

۲۳۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ۝

۲۴۔ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ۝

۲۵۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝

۲۶۔ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝

ترجمہ

۲۳۔ یقیناً ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے۔

۲۴۔ پس تم اپنے پروردگار کے حکم (کی تبلیغ اور اس کے اجراء) کے لیے صبر و شکیبائی اختیار کرو، اور ان میں سے کسی گنہ گار اور کافر کی اطاعت نہ کرو۔

۲۵۔ اور اپنے پروردگار کے نام کا صبح و شام ذکر کرو۔

۲۶۔ اور رات کو اس کے لیے سجدہ کرو اور رات کے ایک طویل حصہ میں اس کی تسبیح کرو۔

تفسیر

خدا کے حکم کے اجراء پر موفق ہونے کے لیے پانچ احکام

اس سورہ کی آیات میں آغاز سے لے کر اب تک، انسان کی خلقت اور اس کے بعد معاد و قیامت کی بات ہو رہی تھی۔ زیر بحث آیات میں روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے، انسانوں کی ہدایت اور اس راہ میں صبر و استقامت کے تاکیدی احکام انہیں دیتا ہے۔ حقیقت میں یہ آیات ان سب بے نظیر نعمتوں تک پہنچنے کی راہ بتاتی ہیں کہ یہ صرف قرآن سے تمسک اور پیغمبر اسلامؐ جیسے رہبر کی پیروی، اور ان کے احکام سے الہام و ہدایت لینے کے طریق سے ہی امکان پذیر ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "یقیناً ہم نے تم پر قرآن نازل کیا ہے" (انا نحن نزلنا علیک القرآن تنزیلًا)۔

بعض مفسرین نے "تنزیلاً" کو جو اوپر والی آیت میں مفعول مطلق کی صورت میں آیا ہے، "قرآن کے تدریجی نزول" کی طرف اشارہ سمجھا ہے، جس کا تربیتی اثر واضح ہے اور بعض اسے آسمانی کتاب کے مقام کی عظمت کی طرف ایک اشارہ قرار دیتے ہیں، اور خدا کی طرف سے اس کے نزول پر ایک تاکید گردانتے ہیں ــــــــ خصوصاً دوسری تاکیدوں کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو اس آیت میں آئی ہیں۔

(ان "و" نحن" اور "جملہ اسمیہ" کے ذریعہ تاکید) ـــــــــ اور حقیقت میں یہ ان لوگوں کا ایک جواب ہے جو پیغمبر کو کہانت، سحر اور خدا پر افتراء باندھنے سے متہم کرتے تھے۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام کو پانچ اہم حکم دیتا ہے، جن میں سے اولین صبر واستقامت کی دعوت ہے، فرماتا ہے: "اب جبکہ یہ بات ہے، تو اپنے پروردگار کے احکام کی تبلیغ اور ان کے اجراء میں صبر و شکیبائی سے کام لے" (فاصبر لحکم ربک)۔

یعنی راستے کی مشکلات اور رکاوٹوں، دشمنوں کی کثرت اور ان کی سختی سے نہ ڈرو اور اسی طرح سے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ صبر واستقامت کے حکم کو "فاصبر" میں "فاء تفریع" کی طرف توجہ کرتے ہوئے) خدا کی طرف سے قرآن کے نزول کی فرع قرار دیتا ہے، یعنی چونکہ تیرا مددگار خدا ہے، لہٰذا قطعی طور پر اس راستے میں صبر واستقامت سے کام لے اور "رب" کی تعبیر بھی اسی معنی کی طرف ایک اور لطیف اشارہ قرار پاتی ہے۔

اور دوسرے حکم میں پیغمبر کو مشرکین کے ساتھ ہر قسم کے میل جول سے منع کرتے ہوئے کہتا ہے: "ان میں سے کسی گنہگار اور کافر کی اطاعت نہ کر" (ولا تطع منہم آثمًا او کفورًا)۔

حقیقت میں یہ دوسرا حکم پہلے حکم پر ایک تاکید ہے، کیونکہ دشمنوں کی جماعت اس کوشش میں رہتی تھی کہ پیغمبر کو مختلف طریقوں سے سازش کرکے، باطل کے راستہ پر کھینچ لے جائیں، جیسا کہ نقل ہوا ہے کہ "عتبہ بن ربیعہ" اور "ولید بن مغیرہ" پیغمبر سے یہ کہتے تھے کہ تم اپنی دعوت سے رُک جاؤ، ہم تمہیں اتنا مال و دولت دے دیں گے کہ تم راضی ہو جاؤ گے اور عرب کی خوبصورت ترین عورت کے ساتھ تمہاری شادی کر دیں گے اور اسی قسم کی دوسری پیشکش اور پیغمبر کو ایک سچے عظیم رہبر کے طور پر، ان شیطانی وسوسوں یا ان دھمکیوں کے مقابلہ میں، جو ان لالچوں کے بے اثر ہو جانے کے بعد دی جاتی ہیں، صبر واستقامت سے کام لینے کی ضرورت تھی کہ وہ نہ تو ان کے کسی لالچ میں آئے اور نہ ہی ان کی کسی دھمکی کے آگے سر جھکائے۔

یہ ٹھیک ہے کہ پیغمبر کبھی بھی ان کے آگے نہیں جھکے، لیکن یہ آنحضرت کے بارے میں اس موضوع کی اہمیت کے لیے ایک تاکید ہے اور تمام راہِ حق کے رہبروں کے لیے ایک ہمیشہ کا دستورالعمل قرار پاتا ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے "آثم" کی "عتبہ بن ربیعہ" سے اور "کفور" کی "ولید بن مغیرہ" یا "ابوجہل" کے ساتھ ـــــــــ جو تینوں ہی مشرکین عرب میں سے تھے ـــــــــ تفسیر کی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ "آثم" (گنہگار) اور "کفور" (کافر اور کفران کرنے والا) ایک وسیع و عریض مفہوم رکھتے ہیں، جو تمام مجرموں اور مشرکین کو شامل ہے، اگرچہ یہ تینوں افراد اس کے واضح مصداق میں سے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ "آثم" ایک عام مفہوم رکھتا ہے جو "کفور" کو بھی شامل ہے۔ اس بناء پر "کفور" کا ذکر "عام" کے بعد "خاص" کے ذکر کی قسم سے ہے اور تاکید کے لیے ہے۔

لیکن چونکہ ان عظیم مشکلات کے ہجوم کے مقابلہ میں صبر واستقامت کوئی آسان کام نہیں ہے اور اس راستے کو طے کرنے کے لیے دو خاص قسم کے زادِ راہ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اپنے پروردگار کے نام کا ہر صبح و شام ذکر کر"

(واذکر اسم ربک بکرۃ واصیلا)۔

"اور رات کے وقت اس کے لیے سجدہ کر، اور رات کے زیادہ حصہ میں اس کی تسبیح کر" (ومن اللیل فاسجد لہ وسبحہ لیلا طویلا)۔

تاکہ اس "ذکر" اور اس "سجدہ" اور اس "تسبیح" کے سایے میں اس راستے کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے مزید قدرت و توانائی، قدرت معنوی اور کافی مدد فراہم کرے۔

بکرۃ "(بروزن نکتہ) دن کی ابتداء اور آغاز کے معنی میں ہے اور" اصیل "اس کا نقطۂ مقابل ہے، یعنی دن کا آخری حصہ اور شام کا وقت۔

بعض نے کہا ہے کہ اس لفظ کا دن کے آخری حصہ پر اطلاق اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وہ "اصل" کے مادہ سے لیا گیا ہے، اس بنا پر ہے کہ دن کا آخری حصہ رات کی اصل اور بنیاد ہوتا ہے۔

بعض تعبیرات سے معلوم ہوتا ہے کہ "اصیل" کا بعض اوقات ظہر اور غروب کے درمیانی فاصلہ پر اطلاق ہوتا ہے۔

—— (مفردات راغب) ——

اور بعض دوسری تعبیروں سے پتہ چلتا ہے کہ "اصیل" رات کے اوائل حصہ کو بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ انھوں نے اس کی "عشی" کے ساتھ تفسیر کی ہے اور "عشی" رات کے آغاز کو کہا جاتا ہے، اسی لیے مغرب اور عشاء کی نماز کو "عشائین" کہتے ہیں، یہاں تک کہ بعض کلمات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "عشی" زوال ظہر سے لے کر اگلے دن کی صبح تک کو بھی شامل ہے[1]

لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ اس آیہ شریفہ میں "اصیل" "بکرۃ" "(صبح) کے مقابلہ میں آیا ہے اور اس کے بعد بھی رات کی عبادت کی بات ہوئی ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد دن کے آخری حصہ کی طرف ہی ہے۔

بہر حال یہ دونوں آیات حقیقت میں پروردگار کی مقدس ذات کی طرف ہمیشہ توجہ رکھنے کے لزوم کو بیان کرتی ہیں۔

بعض نے اس کی خصوصیت کے ساتھ نماز پنجگانہ سے یا نماز تہجد کے اضافہ کے ساتھ، یا خصوصیت سے صبح، عصر اور مغرب و عشاء کے ساتھ تفسیر کی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ نمازیں خدا کے اس دائمی و مسلسل ذکر اور اس کی مقدس بارگاہ میں تسبیح و سجدہ کے مصادیق میں سے ہیں۔

"لیلا طویلا" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رات کی زیادہ تر مقدار میں تسبیح خدا کر۔ ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام سے اس کی تفسیر میں آیا ہے کہ آپ نے اس سوال کے جواب میں کہ اس تسبیح سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس سے مراد نماز شب ہے[2]

لیکن بعید نہیں ہے کہ یہ تفسیر بھی ایک واضح مصداق کے بیان کی قسم سے ہو، کیونکہ تہجد کی نماز، روح ایمان کی تقویت، تہذیب نفوس اور خدا کی

---

[1] مفردات راغب

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۱۳

اطاعت کی راہ میں انسان کے ارادہ کو زندہ رکھنے میں حد سے زیادہ تاثیر رکھتی ہے۔

یہاں اس نکتہ کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ اوپر والی آیات کے پانچ احکام اگرچہ پیغمبر اسلامؐ کے لیے ایک پروگرام کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ان تمام افراد کے لیے ایک دستور العمل ہے جو انسانی معاشرے کی معنوی اور انسانی رہبری کے راستے میں قدم اٹھاتے ہیں۔

انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ انھیں اس ہدف اور پیغام رسالت پر اطمینان اور ایمان کامل کے بعد صبر واستقامت اختیار کرنا لازم ہے۔ اور راستے کی انبوہ مشکلات سے گھبرانا نہیں چاہیے، کیونکہ ایک معاشرے کی ہدایت میں خصوصاً اس وقت جبکہ جاہل اور ہٹ دھرم دشمن مقابلہ میں ہوں ہمیشہ عظیم مشکلات ہوتی ہیں، اگر رہبروں کی طرف سے صبر واستقامت نہ ہو تو کوئی رسالت بھی بارآور نہیں ہو سکتی۔

اور بعد والے مرحلہ میں شیاطین کے وسوسوں کے مقابلہ میں جو آثم وکفور کے مصداق ہیں اور مختلف حیلوں اور بہانوں سے رہبروں اور پیشواؤں کو منحرف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ ان کی رسالت بیکار اور بے ثمر رہ جائے، پوری طاقت کے ساتھ ڈٹ جانا چاہیے، نہ لالچ کے فریب میں آنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی دھمکیوں سے خوف کھانے کی ضرورت۔

اور تمام مراحل میں روحانی قدرت، قوت ارادی، عزم راسخ اور پختہ ارادے کے حصول کے لیے ہر صبح وشام خدا کی یاد میں رہیں اور اس کی بارگاہ میں اپنی پیشانی جھکا دیں، خصوصاً رات کی عبادتوں اور اس سے راز ونیاز کے ذریعہ مدد حاصل کریں، کیونکہ اگر ان امور کی رعایت کی جائے، تو پھر کامیابی حتمی ویقینی ہے۔

اور اگر بعض مراحل میں کسی مصیبت یا شکست سے دوچار ہونا پڑے تو ان اصولوں کے ساتھ ان کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کا پروگرام اعلان کی دعوت ورسالت، اس راستہ کے راہرو افراد کے لیے ایک مؤثر دستور العمل ہے۔

۲۷۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ یَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا ۝

۲۸۔ نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَ شَدَدْنَآ اَسْرَهُمْ ۚ وَ اِذَا شِئْنَا بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ تَبْدِیْلًا ۝

۲۹۔ اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِیْلًا ۝

۳۰۔ وَ مَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۝

۳۱۔ یُّدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَ الظّٰلِمِیْنَ اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا ۝

ترجمہ

۲۷۔ وہ دنیا کی جلدی گزر جانے والی زندگی کو دوست رکھتے ہیں، اور سخت اور سنگین دن کو اپنے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔

۲۸۔ ہم نے انھیں پیدا کیا اور ان کے وجود کے جوڑ بند مضبوط بنائے اور جب بھی ہم چاہیں گے، ان کی جگہ دوسروں کو دے دیں گے۔

۲۹۔ یہ ایک تذکرہ اور یاد آوری ہے، پس جو شخص چاہے (اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے) اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرلے۔

۳۰۔ اور تم کسی چیز کو نہیں چاہتے، مگر یہ کہ خدا چاہے، بیشک خدا عالم و حکیم ہے۔

۳۱۔ جسے وہ چاہتا ہے (اور لائق سمجھتا ہے) اپنی رحمت میں داخل کرلیتا ہے، اور ظالموں کے لیے اس نے دردناک عذاب فراہم کیا ہے۔

تفسیر

یہ ایک تنبیہ ہے اور راستہ کا انتخاب کرنا تمھارے اختیار میں ہے

گزشتہ آیات میں پیغمبر کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ "آثم" و "کفور" (مجرم اور ناشکرے لوگوں) کی اطاعت نہ کریں، اور تاریخ گواہ ہے کہ وہ ایسے لوگ تھے جو اپنے خام خیال میں پیغمبر کے ارادوں میں نفوذ کرنے کے لیے، مال و دولت، مقام و منصب اور خوبصورت عورتوں کا لالچ دے کر کام چلانا چاہتے تھے۔

زیر بحث آیات ان کا مزید تعارف کراتے ہوئے کہتی ہیں: "وہ اس دنیا کی جلدی گزر جانے والی زندگی کو دوست رکھتے ہیں، جب کہ ایک سخت اور سنگین دن کو اپنے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں اور اسے نظر انداز کر دیتے ہیں"۔ (ان ھؤلاء یحبون العاجلة ویذرون وراءھم یوما ثقیلا)۔

ان کے افکار کھانے، سونے اور شہوت رانی سے آگے نہیں بڑھتے اور ان کا آخری نقطۂ نظر یہی بے قید و شرط مادی لذتیں ہیں، اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ پیغمبر کی عظیم روح کو بھی اسی حدود میں تولیں۔

لیکن یہ بے خبر دل کے اندھے اس بات پر توجہ نہیں کرتے کہ کیسا سنگین دن ان کے آگے آرہا ہے؟! سزا، ہول اور عذاب کے لحاظ سے سنگین، حساب و کتاب کے لحاظ سے سنگین، زمانے کے طول کے لحاظ سے سنگین، اور فضیحت و رسوائی کے لحاظ سے سنگین۔

"وراءھم" (اپنے پس پشت) کی تعبیر، حالانکہ اسے قاعدے کی رو سے آگے کہا جانا چاہیے، تو یہ اس بنا پر ہے کہ وہ اس دن کو فراموشی کے سپرد کریں گے، گویا انھوں نے اسے پس پشت ڈال دیا ہے۔ لیکن بعض مفسرین کے قول کے مطابق "وراء" کبھی تو پشت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور کبھی آگے کے معنی میں۔[1]

بعد والی آیت میں انھیں خبردار کرتا ہے کہ وہ اپنی قدرت و توانائی پر غرور نہ کریں، کیونکہ یہ سب خدا کی عطا ہے، اور جب وہ چاہے گا اچانک واپس لے لے گا، لہٰذا فرماتا ہے: "ہم نے انھیں پیدا کیا ہے، اور ان کے جوڑ بندوں کو مضبوط بنایا ہے اور انھیں قدرت و طاقت عطا کی ہے اور جس وقت ہم چاہیں گے انھیں لے جائیں گے اور ان کی جگہ دوسرے گروہ کو ان کا جانشین بنا دیں گے۔" (نحن خلقناھم و شددنا اسرھم واذا شئنا بدلنا امثالھم تبدیلا)۔[2]

"اسر" بروزن "عصر" اصل میں کسی چیز کو زنجیر سے باندھنے کے معنی میں ہے اور اسیروں کو اسی وجہ سے "اسیر" کہا جاتا ہے

---

[1] تفسیر "روح البیان" میں آیا ہے کہ اگر "وراء" کی "فاعل" کی طرف اضافت ہو تو پشت سر کے معنی میں ہے اور اگر "مفعول" کی طرف اضافت ہو تو آگے کے معنی میں ہے۔ (روح البیان جلد ۱۰ ص ۲۷۹)

[2] اس جملہ میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں یوں تھا: "بدلناھم امثالھم" (توجہ رہے کہ تبدیل عام طور پر دو مفعول لیتا ہے۔ یہاں "ھم" کی ضمیر مفعول اول ہے اور "امثالھم" مفعول دوم۔)

کہ انھیں زنجیروں سے باندھ دیتے ہیں۔ لیکن یہاں "اسر" انسانی وجود کے جوڑ بندوں کو مستحکم کرنے کی طرف اشارہ ہے جو اہم کاموں کے انجام دینے کے لیے اسے حرکت کی قدرت اور توانائی بخشتے ہیں۔

واقعاً قرآن نے یہاں ایک حساس نقطہ پر انگلی رکھی ہے اور وہ وجود انسانی کے مختلف اجزاء کے جوڑ بند ہیں چھوٹے اور بڑے اعصاب —— جو لوہے کی رسیوں کی طرح عضلات کو ایک دوسرے کے ساتھ جکڑ دیتے ہیں —— لہٰذا پٹھوں اور مختلف عضلات تک، انسانی بدن کی چھوٹی اور بڑی ہڈیوں اور گوشت کے ٹکڑوں کو اس طرح سے ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دیتے ہیں کہ جن کے مجموعے سے جسم کی ایک ایسی کامل صورت تیار ہو جاتی ہے، جو ہر قسم کی فعالیت کے انجام دینے کے لیے آمادہ و تیار ہوتی ہے۔ لیکن عمومی طور پر یہ جملہ قدرت و قوت سے کنایہ ہے۔

یہ آیت ضمنی طور پر خدا کی پاک ذات کی، ان سے، اور ان کی اطاعت و ایمان سے بے نیازی اور استغناء کو واضح کرتی ہے، تاکہ وہ یہ جان لیں کہ اگر ان کے ایمان کے لیے کچھ اصرار ہے تو حقیقت میں یہ پروردگار کی طرف سے ایک لطف و رحمت ہے۔

اس معنی کی نظیر سورۂ انعام کی آیہ ۱۳۳ میں بھی آئی ہے، جہاں فرماتا ہے: (وربك الغنى ذوالرحمة ان يشا يذهبكم ويستخلف من بعدكم ما يشاء) تیرا پروردگار بے نیاز و مہربان ہے، اگر وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور تمھارے بعد جسے چاہے تمھارا جانشین بنا دے۔

اس کے بعد ان تمام مباحث کی طرف —— جو اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں اور جو سعادت و نیک بختی کا ایک جامع پروگرام پیش کرتے ہیں —— اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "یہ ایک تذکرہ اور یاد آوری ہے، پس جو شخص چاہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کر لیتا ہے" (ان هذه تذكرة فمن شاء اتخذ الى ربه سبيلاً)[1]

ہماری ذمہ داری تو راستہ دکھا دینا ہے، نہ کہ انتخابِ راہ پر مجبور کرنا، اب یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ اپنی عقل و ادراک کے ذریعے حق کو باطل سے پہچانو، اور اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ راستہ کا انتخاب کرو۔

حقیقت میں یہ اس چیز کے لیے ایک تاکید ہے جو اس سورہ کے آغاز میں گزر چکی ہے، جس میں فرمایا ہے: انا هدينه السبيل اما شاكرا و اما كفورا۔ ہم نے اسے راستے کی نشاندہی کر دی اب چاہے وہ اسے قبول کر لے اور اس نعمت کا شکر ادا کرے یا روگردانی کر کے کفران کرے۔

اور چونکہ یہ ممکن ہے کہ کوتاہ فکر افراد اوپر والی تعبیر سے بندوں کے لیے تفویض اور مطلق سپردگی کا تصور کر لیں، لہٰذا بعد والی آیت میں اس توہم کی نفی کے لیے مزید کہتا ہے: "تم کسی چیز کو نہیں چاہتے مگر یہ کہ خدا چاہے" (وما تشاءون

---

[1] بعض لوگ اس آیت کے لیے ایک محذوف کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تقدیر میں اس طرح ہے "فمن شاء اتخذ الى رضا ربه سبيلاً" یا "الى طاعة ربه سبيلاً" لیکن انصاف یہ ہے کہ تقدیر کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تمام کے سب راستے خدا ہی کی طرف جا کر منتہی ہوتے ہیں۔

اِلَّا اَن یَّشَآءَ اللّٰہُ[1]

کیونکہ خدا علیم و حکیم ہے (اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا)۔

اور یہ حقیقت میں (الامر بین الامرین) والے مسئلہ اصل کا اثبات ہے، ایک طرف فرماتا ہے: "خدا نے راستہ تو بتا دیا ہے، اس کا انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف مزید کہتا ہے: "تمہارا انتخاب مشیتِ خدا پر موقوف ہے، یعنی تم مکمل استقلال نہیں رکھتے، بلکہ قدرت و توانائی اور تمہارے ارادے کی آزادی سب مشیتِ خداوندی اور اس کی جانب سے ہے اور جس وقت وہ چاہے اس قدرت و آزادی کو تم سے چھین سکتا ہے۔

اس طرح نہ تو "تفویض" اور مکمل سپردگی ہے اور نہ ہی جبر اور سلب اختیار، بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک دقیق و لطیف حقیقت ہے یا دوسرے لفظوں میں، آزادی کی نوعیت خدائی مشیت کے ساتھ وابستہ ہے کہ جس وقت بھی وہ چاہے اسے واپس لے سکتا ہے، تاکہ بندے تکلیف و مسئولیت اور ذمہ داری کے بوجھ کو —— جو ان کے تکامل و ارتقاء کی رمز ہے —— اپنے کندھوں پر بھی اٹھا سکیں، اور اپنے آپ کو خدا سے بے نیاز بھی خیال نہ کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ تعبیر اس بناء پر ہے کہ بندے اپنے آپ کو خدا کی پاک ذات کی ہدایت، حمایت اور توفیق و تائید سے بے نیاز نہ سمجھیں اور کاموں میں عزم راسخ کے باوجود اپنے آپ کو اسی کے سپرد کریں، اور اس کی حمایت کے تحت کام کریں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض جبری مسلک والے مفسرین مثلاً "فخر رازی" اس آیت کے ساتھ چپکے ہیں تو یہ ان پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں کی بناء پر ہے جو انہوں نے اس مسئلہ میں اپنائے ہوئے ہیں، وہ کہتا ہے:

واعلم ان ھٰذہ الآیۃ من جملۃ الآیات التی تلاطمت فیھا امواج الجبر و القدر

جان لے کہ یہ آیت ان آیات میں سے ایک ہے جس میں جبر کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں[2]

ہاں اگر اس آیت کو قبل کی آیات سے جدا کر دیں تو پھر اس توہم کی گنجائش ہے، لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ ایک آیت میں اختیار کی تاثیر بیان ہوئی ہے اور دوسری آیت میں مشیت پروردگار کی تاثیر، تو پھر "الامر بین الامرین" کا مسئلہ اچھی طرح سے ثابت ہو جاتا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ تفویض کے طرفدار صرف اسی آیت سے واسطہ رکھتے ہیں جو اختیار مطلق کی بات کرتی ہے، اور جبر کے طرفدار محض اس آیت کو دیکھتے ہیں کہ اگر وہی سامنے ہو تو پھر جبر کی بو آتی ہے اور پھر ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ اپنے پہلے سے کیے ہوئے فیصلوں سے اس کی توجیہ کریں، حالانکہ کلام الٰہی (اور ہر دوسرے کلام) کے صحیح فہم و ادراک کا تقاضا یہ ہے کہ سارے کلام کو ایک دوسرے کے پاس رکھ کر دیکھا جائے اور کسی تعصب اور پہلے سے کیے ہوئے فیصلے کے بغیر فیصلہ کریں۔

---

[1] اس بارے میں کہ "ان یشاء اللّٰہ" کا محل اعراب کیا ہے، مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ ظرفیت کی وجہ سے منصوب ہے اور معنوی طور پر اس طرح ہے: "ما تشاؤون الا وقت مشیت اللّٰہ" لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ یہاں "مشیئا" مقدر ہو، اور معنا اس طرح ہو "وما تشاؤون الا شیئا یشاء اللّٰہ"۔

[2] تفسیر فخر رازی، جلد ۳۰ ص ۲۶۲

آیت کے ذیل میں جو فرمایا ہے: ان اللہ کان علیما حکیما ممکن ہے یہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ خدا کے علم و حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بندوں کو راہِ تکامل و ارتقاء کے طے کرنے میں آزاد چھوڑ دے، ورنہ اجباری و تحمیلی تکامل، تکامل نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس کا علم و حکمت اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کچھ افراد کو تو کارِ خیر پر مجبور کرے اور کچھ افراد کو کارِ شر پر، اور اس کے بعد پہلے گروہ کو اجر و پاداش دے، اور دوسرے گروہ کو عذاب و سزا دے۔

اور آخر کار اس سورہ کی آخری آیت میں نیکوکاروں اور بدکاروں کی سرنوشت کی طرف ایک مختصر اور پر معنی جملہ کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:
"خدا جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے اور ظالموں کیلئے اس نے دردناک عذاب فراہم کر رکھا ہے" (یدخل من یشاء فی رحمته والظالمین اعد لهم عذابا الیما)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آیت کے آغاز میں کہتا ہے: "جس شخص کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے" لیکن آیت کے آخر میں عذاب کو ظالموں کے لیے مخصوص قرار دیتا ہے اور یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس کی عذاب کے لیے مشیت، انسان کے ظلم و گناہ کا ارادہ کرنے کے بعد ہے، اور مقابلہ کے قرینہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ رحمت میں بھی اس کی مشیت ایمان، عمل صالح اور اجرائے عمل میں انسان کے ارادے کے بعد ہے اور ایک حکیم و دانا سے اس کے علاوہ اور کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس واضح قرینے کے باوجود پھر بھی کچھ افراد، مثلاً فخر رازی آیت کے مضمون کو جبر کی دلیل قرار دیتا ہے، اور آیت کے ذیل میں ارادہ کی آزادی اور ظالموں کے بارے میں جو گفتگو ہوئی ہے اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔[1]

خداوندا! ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر، اور دردناک عذاب سے جو ظالموں کے انتظار میں ہے رہائی دے۔

پروردگارا! تو نے راستہ بتادیا ہے، ہم بھی اس راہ کو طے کرنے کا عزم کر چکے ہیں، ہماری مدد فرما۔

بارِ الٰہا! اگر ہم "ابرار" نہیں ہیں تو ان کے دوست اور محبت کرنے والے تو ہیں، ہمیں ان کے ساتھ ملحق کر دے۔

سورۂ انسان (دہر) کا اختتام
یکم ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

اختتام ترجمہ
یکم ربیع الاول ۱۴۰۸ھ
مطابق ۲۵ اکتوبر ۱۹۸۷ء
بروز بدھ چار بج کر پینتیس منٹ
۸۰، ای ماڈل ٹاؤن - لاہور

---

[1] ذاتِ مشیت کے بارے میں مزید تشریح کے لیے جلد ۱۱ سورہ مدثر کی آیہ ۵۶ کے ذیل میں مطالعہ فرمائیں۔

سورۂ مرسلات

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہوا
اور
اس کی ۵۰ آیات ہیں

تاریخ شروع

۲، ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

سورۂ "مرسلات" کے مضامین

مشہور یہ ہے کہ یہ سورہ "مکہ" میں نازل ہوا، لیکن بعض نے یہ تصریح کی ہے کہ آیہ ۴۸ "واذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون" مدنی ہے، اگرچہ انھوں نے اس چیز کی کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی ہے اور اگر "رکوع" و "نماز" کا مسئلہ ان استثناء کا سبب بنا ہے تو یہ درست نظر نہیں آتا، کیونکہ مسلمان مدتوں مکہ میں نماز پڑھتے اور رکوع کرتے رہے۔

بہرحال زیادہ تر مطالب جو اس سورہ میں بیان کیے گئے ہیں، وہ قیامت اور مکذبین و منکرین کی تہدید و انذار سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس سورہ کے امتیازات میں سے یہ ہے کہ آیہ "ویل یومئذ للمکذبین" "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" کا اس میں دس مرتبہ تکرار ہوا ہے، اور ہر مرتبہ نئے مطلب کے بعد ہے۔

کئی قسمیں کھانے کے بعد قیامت اور حوادث سنگین اور سخت حوادث کی خبر دیتا ہے اور اس کے بعد اسی آیت کو ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے"

اس کے بعد والے مرحلہ میں گزشتہ گنہگار اقوام کی غم انگیز سرگزشت ہے۔

اور تیسرے مرحلہ میں انسان کی خلقت کے خصوصیات کا ایک گوشہ ہے۔

اور چوتھے مرحلہ میں زمین میں خدا کی نعمتوں کے ایک حصّہ کا بیان ہے۔

اور پانچویں مرحلہ میں تکذیب کرنے والوں کے عذاب کے کچھ حصّوں کی تشریح کرتا ہے۔

اسی طرح ہر مرحلہ میں ایک بیدار کرنے اور ہلا دینے والے مطلب کی طرف اشارہ کرکے، اس کے بعد اس آیت کا تکرار کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے ایک حصّہ میں بہشت کی ان نعمتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جو پرہیزگاروں کو نصیب ہوئی ہیں، تاکہ انذار کو بشارت کے ساتھ ملا دے اور تہدید کو تشویق کے ساتھ۔

بہرحال یہ تکرار سورہ الرحمٰن کی بعض آیات کے تکرار کے مشابہ ہے، اس فرق کے ساتھ کہ وہاں گفتگو نعمتوں کے متعلق تھی اور یہاں زیادہ تر تکذیب کرنے والوں کے عذابوں کے بارے میں ہے۔

اس سورہ کے لیے "مرسلات" کے نام کا انتخاب اس سورہ کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے:

من قرء سورۃ والمرسلات کتب انه لیس من المشرکین

"جو شخص سورۂ مرسلات کو پڑھے گا تو یہ لکھا جائے گا کہ یہ مشرکین میں سے نہیں ہے"۔[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

من قرأها عرف الله بينه و بين محمد (ص)

"جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا تو خدا اسے پیغمبرؐ کا آشنا (اور ہم جوار) بنادے گا"۔[2]

اس میں شک نہیں کہ یہ ثواب اور فضیلت انھی لوگوں کے لیے ہے جو پڑھ کر غور و فکر کریں اور اس پر عمل کریں، اور اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اصحاب پیغمبرؐ میں سے بعض نے آنحضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا اسرع الشيب اليك يا رسول الله (ص)

"اے رسول خدا! آپ میں بڑھاپے کے آثار کتنا جلدی ظاہر ہو گئے ہیں"؟

آپؐ نے فرمایا:

شيبتني هود، والواقعة والمرسلات وعم يتساءلون

"مجھے سورۂ ہود، واقعہ، مرسلات اور عم یتساءلون نے بوڑھا کر دیا ہے"۔[3]

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان تمام سورتوں میں قیامت کے حالات اور اس عظیم دادگاہ کے ہولناک مسائل بیان کیے گئے ہیں، اور یہی وہ امور تھے جنھوں نے پیغمبرؐ کی روح مقدس میں اثر کیا۔

یہ بات واضح ہے کہ غور و فکر اور عمل کے لیے پختہ ارادہ کے بغیر جو تلاوت ہو، وہ اس قسم کا اثر نہیں چھوڑ سکتی۔

---

[1]، [2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۱۴

[3] خصال صدوق "باب الاربعہ" حدیث ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

۱۔ وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ○

۲۔ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ○

۳۔ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ○

۴۔ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ○

۵۔ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ○

۶۔ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ○

۷۔ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ○

۸۔ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ○

۹۔ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ○

۱۰۔ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ○

۱۱۔ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ○

۱۲۔ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ○

۱۳۔ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ○

۱۴۔ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ○

۱۵۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱۔ قسم ہے ان فرشتوں کی جنھیں پے در پے بھیجا جاتا ہے۔
۲۔ اور ان کی جو تیز ہوا کی طرح چلتے ہیں۔
۳۔ اور قسم ہے ان کی جو (بادلوں کو) پھیلاتے اور منتشر کرتے ہیں۔
۴۔ اور ان کی جو جدا کرتے ہیں۔
۵۔ اور قسم ہے ان کی جو (خدا کی) بیدار کرنے والی آیات (انبیاء کی طرف) القاء کرتے ہیں۔
۶۔ اتمام حجت یا انذار کے لیے
۷۔ تمھیں جو کچھ (قیامت کے بارے میں) وعدہ دیا جاتا ہے، وہ وقوع پذیر ہوگا۔
۸۔ جب ستارے محو اور تاریک ہو جائیں گے
۹۔ اور آسمان (کے ستارے) پھٹ جائیں گے۔
۱۰۔ اور جب پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے۔
۱۱۔ اور جب پیغمبروں کے لیے (شہادت دینے کے لیے) وقت کا تعین ہوگا
۱۲۔ یہ امر کس دن کے لیے تاخیر میں ڈالا گیا ہے؟
۱۳۔ (حق کی باطل سے) جدائی کے دن کے لیے
۱۴۔ تمھیں کیا معلوم ہے کہ جدائی کا دن کیا ہے؟
۱۵۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

تفسیر

خدا کے وعدے حق ہیں، وائے ہے تکذیب کرنے والوں کے لیے

اس سورہ کے آغاز میں مقدمہ کے طور پر پانچ آیات میں پانچ قسمیں آئی ہیں، جن کے معنی کی تفسیر میں بہت اختلاف ہے۔

فرمایا ہے: "قسم ہے ان کی جو پے درپے بھیجے جاتے ہیں"۔ (والمرسلات عرفًا)[1]۔

"اور ان کی جو طوفان اور تیز آندھی کی طرح حرکت کرتے ہیں"۔ (فالعاصفات عصفًا)۔

"اور قسم ہے ان کی جو پھیلاتے اور منتشر کرتے ہیں" (والناشرات نشرًا)۔

"اور ان کی جو جدا کرتے ہیں" (فالفارقات فرقًا)۔

"اور ان کی جو بیدار کرنے والی آیات القاء کرتے ہیں" (فالملقیات ذکرًا)۔

"اتمام حجت یا ڈرانے کے لیے" (عذرًا او نذرًا)[2]۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان سربستہ قسموں کا ——— جو اہم مسائل کی خبر دیتی ہیں ——— مفہوم کیا ہے؟

یہاں تین مشہور تفسیریں ہیں۔

۱۔ یہ پانچوں کی پانچوں قسمیں "آندھیوں اور طوفانوں" کی طرف اشارہ ہیں، جن کا طبیعیات کے بہت سے مسائل میں ایک مؤثر نقش ہے۔ اس قول کی بناء پر ان آیات کا مفہوم اس طرح ہوگا، قسم ہے ان ہواؤں کی جو پے در پے چلتی ہیں۔

اور قسم ہے ان طوفانوں کی جو تیزی کے ساتھ چلتی ہیں۔

اور قسم ہے ان کی جو بادلوں کو پھیلاتی اور منتشر کرتی ہیں اور بارش کے حیات بخش قطرات کو ان کے درمیان سے خشک سرزمینوں کی طرف بھیجتی ہیں۔

اور قسم ہے ان کی جو بادلوں کو بارش برسانے کے بعد پراگندہ کر دیتی ہیں۔

اور قسم ہے ان ہواؤں کی جو اس پروگرام کے ساتھ انسانوں کو خدا کی یاد میں مصروف کر دیتی ہیں۔

(بعض نے "فالعاصفات عصفًا" کو عذاب کے طوفانوں کی طرف بھی اشارہ سمجھا ہے، جو حیات بخش ہواؤں کی نقطۂ مقابل ہیں کہ وہ بھی اپنی نوعیت میں تذکرے اور بیداری کا سبب ہیں)۔

۲۔ یہ تمام قسمیں "آسمانی فرشتوں" کی طرف اشارہ ہیں، یعنی قسم ہے ان فرشتوں کی جو پے در پے انبیاء کی طرف بھیجے جاتے ہیں

---

[1] "عرف" پیچھے بعد دیگرے اور پے درپے کے معنی میں آیا ہے اور اصل میں "گھوڑے کی گردن کے بال" کے معنی میں ہے جو ایک دوسرے پر پڑے ہوتے ہیں اور بعض اوقات اس کی "اچھی اور جانے پہچانے کام" کے معنی کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

[2] "عذرًا او نذرًا" پر نصب (زبر) کا اعراب مفعول لاجلہ کی بناء پر ہے اور بعض نے اسے حال سمجھا ہے۔

(یا وہ فرشتے جو جانے پہچانے اور مشہور پروگراموں کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں)۔

اور قسم ہے ان کی جو طوفانوں کی طرح پوری سرعت اور تیزی کے ساتھ اپنے کاموں کے پیچھے جاتے ہیں۔

اور ان کی جو آسمانی کتابوں کی آیات کو پیغمبروں کے سامنے کھول کر نشر کرتے ہیں۔

اور ان کی جو اس عمل کے ساتھ حق کو باطل سے جدا کرتے ہیں۔

اور ان کی جو حق تعالیٰ کے ذکر اور اس کے احکام کو انبیاء پر القاء کرتے ہیں۔

۲۔ پہلی اور دوسری قسم "ہواؤں اور طوفانوں" کے بارے میں ہے اور تیسری، چوتھی اور پانچویں قسم فرشتوں کے ذریعہ حق تعالیٰ کی آیات کی نشر و اشاعت کے بارے میں اور پھر حق کو باطل سے جدا کرنے اور اس کے بعد اتمام حجت اور انذار کے مقصد سے خدا کے ذکر اور اس کے احکام کو پیغمبروں پر القاء کے بارے میں ہے۔

وہ چیز جو تیسری تفسیر پر شاہد بن سکتی ہے، اولاً آیات میں "واو" کے ذریعہ ان دو قسم کی قسموں کی جدائی ہے۔ جبکہ باقی کا "فاء" کے ذریعہ عطف ہوا ہے جو ان کے ارتباط اور تعلق کی نشانی ہے۔

ثانیاً ــــــ جیسا کہ ہم دیکھیں گے ــــــ یہ تمام قسمیں ایک ہی مطلب کے لیے ہیں، جو ساتویں آیت میں بیان ہوا ہے، یعنی قیامت معاد کی حقانیت و واقعیت، اور ہم جانتے ہیں کہ قیامت سے قریب ایک عظیم تغیر عالم میں پیدا ہو گا۔ ایک طرف تو شدید طوفان، آندھیاں، زلزلے اور ہلا دینے والے حوادث ہوں گے، اور اس کے بعد دوسری طرف عدل الٰہی کی عدالت اور دادگاہ قائم ہو گی، جہاں فرشتے اعمال ناموں کو پھیلائیں گے اور نشر کریں گے، اور مومنین اور کفار کی صفوں کو الگ اور جدا کر دیں گے اور اس سلسلہ میں حکم الٰہی کا القاء کریں گے۔

اگر اوپر والی پانچ قسمیں اس تفسیر کے مطابق بیان ہوں تو مقسم بہ یعنی وہ چیز جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، مناسب ہو گی اور آخری تفسیر کو اس لحاظ سے برتری حاصل ہے۔

"فالملقیات ذکرًا" کے جملہ میں ذکر یا تو ان علوم و معارف کے معنی میں ہے جو انبیاء کی طرف القاء ہوئے ہیں، یا ان آیات کے معنی میں ہے جو ان پر نازل ہوئی ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ آیات قرآنی میں خود قرآن کو بھی "ذکر" سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ حجر کی آیہ ۶ میں آیا ہے۔ و قالوا یا ایھا الذی نزل علیہ الذکر انک لمجنون ــــــ (دشمن) کہتے تھے، اے وہ کہ جس پر ذکر نازل ہوا ہے، تو تو دیوانہ ہے"!

"الملقیات" کی تعبیر جمع کی صورت میں ہے، حالانکہ وحی کا فرشتہ یعنی جبرئیل ایک سے زیادہ نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات قرآنی آیات کے نزول کے لیے فرشتوں کے بہت سے گروہ جبرئیل کے ہمراہ ہوتے تھے سورہ عبس کی آیہ ۱۵ میں بھی یہ آیا ہے "بایدی سفرہ" یعنی آیات قرآنی خدا کے سفیروں (فرشتوں) کے ہاتھ پیغمبر اسلام پر نازل ہوئی ہیں)۔"

• اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ قسمیں کس مقصد کے لیے ہیں، بعد والی آیت میں اس معنی سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتا ہے: "جو کچھ تمھیں وعدہ دیا جاتا ہے وہ واقع ہو کے رہے گا" (انما توعدون لواقع)۔

بعث ونشور، ثواب وعقاب، حساب وجزا سب حق ہے اور ان میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔

بعض نے اسے خدا کے تمام وعدوں کی طرف بھی اشارہ سمجھا ہے، چاہے وہ نیکوں سے وعدے ہوں یا بدوں سے، دنیا میں ہوں یا آخرت میں، لیکن بعد والی آیات اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ مراد صرف وعدۂ قیامت ہے۔[1]

اگرچہ اس آیت میں مسئلۂ معاد پر کوئی استدلال نہیں ہوا ہے، اور صرف دعوے پر قناعت کی گئی ہے، لیکن مطلب کی عمدگی یہ ہے کہ گزشتہ قسموں میں ایسے مطالب آئے ہیں جو خود معاد اور قیامت کے دلائل ہیں، منجملہ ان کے مردہ زمینوں کا بارشوں کے نزول کے ذریعے زندہ ہونا جو خود معاد کے منظر کا نمونہ ہے دوسرے پیغمبروں پر خدائی احکام وتکالیف کا نزول اور رسولوں کا بھیجنا جس کا معاد کے بغیر کوئی مفہوم نہیں ہے، خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ قیامت کا وعدہ قطعی ویقینی ہے۔

اس مطلب کی نظیر سورہ ذاریات کی آیہ ۲۳ میں بھی آئی ہے، خدا فرماتا ہے: "فورب السماء والارض انه لحق"

"آسمان کے پروردگار کی قسم تمہاری روزی حق ہے۔" "رب" کی قسم، جو پروردگار کی ربوبیت اور عالم خلقت میں اس کی تدبیر کی طرف اشارہ ہے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ بندوں کو روزی کے بغیر نہ چھوڑے۔

اس کے بعد اس موعودہ دن کی نشانیوں کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ موعودہ دن اس وقت آن پہنچے گا، جب ستارے صفحۂ آسمان سے محو اور تاریک ہو جائیں گے" (فاذا النجوم طمست)۔

اور آسمان (آسمان کے ستارے) پھٹ جائیں گے" (واذا السماء فرجت)۔

اور جب پہاڑ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے" (واذا الجبال نسفت)۔

"طمست" "طمس" (بروزن شمس) کے مادے سے کسی چیز کے آثار کو محو اور زائل کرنے کے معنی میں ہے، اور یہاں ممکن ہے ستاروں کی روشنی کے محو ہونے کی طرف اشارہ ہو، یا ان کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جانے کی طرف، لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے، جیسا کہ سورۂ تکویر کی آیہ ۲ میں آیا ہے: واذا النجوم انکدرت، "جب ستارے تاریک ہو جائیں گے"۔

اور "نسفت" "نسف" (بروزن حذف) کے مادہ سے، اصل میں غذا کے دانوں کو چھلنی میں ڈال کر جھاڑنے کے معنی میں ہے، تاکہ چھلکا دانہ سے الگ ہو جائے اور یہاں پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہونے اور پھر ہوا میں بکھر جانے کے معنی میں ہے۔

اصولی طور پر قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا اختتام بہت ہی ہولناک اور سرکوبی کرنے والے حوادث کے ایک سلسلے کے ساتھ ہوگا، اس طور پر کہ اس کے نظام کو کلی طور پر پراگندہ کر دے گا، اور عالم آخرت ایک نئے نظام کے ساتھ اس کی

---

[1] "فا" کا عطف بھی اسی مطلب کی تائید کرتا ہے۔

جگہ لے لے گا۔

یہ حوادثات اتنے عجیب و غریب اور دہشت ناک ہوں گے کہ کسی بیان کے ساتھ ان کی وضاحت نہیں ہو سکتی، کیا وہ حوادثات جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اکھیڑ پھینکیں گے اور انھیں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے کہ وہ گرد و غبار میں تبدیل ہو جائیں گے، اور دھنکی ہوئی اون کی صورت اختیار کر لیں گے، قابلِ تعارف ہیں۔

بعض مفسرین کی تعبیر کے مطابق یہ حوادثات اتنے عظیم ہوں گے، کہ وہ عظیم ترین زلزلے جنھیں انسان نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے ان کے مقابلہ میں ایسے ہوں گے جیسے کہ چھوٹے چھوٹے پٹاخے ——— جنھیں بچے کھیلتے ہوئے چلاتے ہیں ——— بہت بڑے ایٹم بم کے مقابلہ میں۔

بہرحال یہ قرآنی تعبیریں نظام ہائے آخرت اور دنیا کے نظاموں میں بہت زیادہ فرق کی دلیل ہیں۔

اور اس کے بعد قیامت کے منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اور یہ اس وقت کی بات ہے جب پیغمبروں کے لیے وقت معین ہوگا، کہ وہ اپنی اپنی باری پر آئیں، اور اپنی امتوں کے بارے میں شہادت دیں" (و اذا الرسل اقتت)[1]

جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیہ ۶ میں آیا ہے، (فلنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین)۔ ہم ان لوگوں سے بھی سوال کریں گے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے، اور رسولوں سے بھی سوال کریں گے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "امتوں کے لیے ان رسولوں کی شہادت اور ان کی گواہی کو کس دن کے لیے تاخیر میں ڈالا گیا ہے": (لای یوم اجلت)[2]

"جدائی کے دن کے لیے" (لیوم الفصل)۔

حق سے باطل کی جدائی کا دن، مومنین کی صفوں کا کافروں کی صفوں سے جدا ہونے کا دن، اور نیکوکاروں کے بدکاروں سے جدا ہونے کا دن، اور سب کے بارے میں حق تعالیٰ کی مطلق قضاوت اور انصاف کا دن۔

---

[1] "اقتت" اصل میں "وقت" کے مادہ سے "وقتت" تھا، جس میں واو مضموم ہمزہ کے ساتھ تبدیل ہو گئی اور یہ پروردگار کے رسولوں کے لیے "توقیت وقت" کے معنی میں ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ وقت خود ان کیلئے معین نہیں ہوگا، بلکہ ان کے عمل یعنی ان کی شہادت کے بارے میں ہوگا، لہٰذا بعض نے یہ کہا ہے کہ آیت میں مقدر ہے۔

[2] اس تفسیر کے مطابق "اجلت" کی ضمیر انبیاء و رسل کی شہادت کی طرف لوٹتی ہے، جو گزشتہ آیت سے معلوم ہوتی ہے، لیکن بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ ان تمام امور کی طرف لوٹتی ہے جو انبیاء اور ان اخبار سے مربوط ہیں، جو انھوں نے ثواب، عقاب اور قیامت وغیرہ کے حوادث کے بارے میں دیئے ہیں، اور بعض نے ان تمام امور کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں، مثلاً ستاروں کا تاریک ہونا وغیرہ ...... لیکن واضح ہے کہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے کیونکہ آیت میں ضمیر کا مرجع اس کے ساتھ متصل ہے۔

یہ سوال وجواب اس دن کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، اور اس دن کے بارے میں کیسی معنی خیز اور منہ بولتی تعبیر ہوئی ہے
"جدائیوں کا دن"

اس کے بعد اس دن کی عظمت کے بیان کے لیے فرماتا ہے، "تو کیا جانے کہ یوم الفصل اور جدائیوں کا دن کیا ہے" (و ما ادرٰک ما یوم الفصل)۔

جہاں پیغمبر اسلام وسیع و عریض علم، اور ان تیز بین نگاہوں کے باوجود ـــــ جو اسرار غیب کا مشاہدہ کرتی تھیں ـــــ اس دن کی عظمت کے ابعاد وجہات کو ٹھیک طرح سے نہ جانتے ہوں تو باقی لوگوں کی ذمہ داری واضح ہے اور جیسا کہ ہم نے بارہا بیان کیا ہے، قیامت کے تمام باعظمت اسرار کا ادراک کرنا، ہم قیدیں دنیا کے قیدیوں کے لیے ممکن نہیں ہے، ہم تو صرف دور سے ان کا ایک سایہ سا دیکھتے ہیں، اور اس پر ایمان رکھتے ہیں۔

اور آخری زیر بحث آیت میں، اس دن کی تکذیب کرنے والوں کو بہت سختی کے ساتھ تہدید کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

"ویل" کی بعض نے "ہلاکت" کے معنی میں، بعض نے "انواع واقسام کے عذاب" کے معنی میں، اور بعض نے "جہنم کی ایک پُرعذاب وادی" کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ یہ لفظ عام طور پر افسوس ناک حوادثات کے بارے میں استعمال ہوتا ہے اور یہاں قیامت کے دن تکذیب کرنے والوں کی دردناک سرنوشت کی حکایت کرتا ہے۔[1]

یہاں مکذبین سے مراد وہ لوگ ہیں جو قیامت کی تکذیب کرتے ہیں، اور ہم جانتے ہیں کہ جو شخص قیامت اور خدا کی دادگاہ و عدل اور حساب جزا پر ایمان نہ رکھتا ہو، وہ آسانی کے ساتھ ہر قسم کے گناہ اور ظلم وفساد کا مرتکب ہوسکتا ہے، لیکن اس دن پر ایمان راسخ، انسان کو ذمہ داری، احساس مسؤلیت، تقویٰ اور پرہیزگاری بخشتا ہے۔

ایک نکتہ

ان قسموں کا مطلب!

اوپر والی آیات میں پہلے ہواؤں اور طوفانوں کی قسم کھائی گئی ہے، اور یہ اس اہم اثر کی وجہ سے ہے جو وہ عالم خلقت میں رکھتی ہیں: بادلوں کو چلاتی ہیں، اور پھر انھیں خشک اور مردہ زمینوں کی بلندی پر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑتی ہیں اور بارش برسانے کے بعد انھیں پراگندہ اور منتشر کر دیتی ہیں۔

---

[1] "ویل" کے معنی کے سلسلہ میں مزید وضاحت اور اس کا "ویس" اور "ویح" کے ساتھ فرق جلد ۱۲ سورۂ ذاریات کی آیہ ۶۰ کے ذیل میں آیا ہے۔

نباتات کے بیجوں کو بکھیرتی ہیں، اور جنگلات اور چراگاہیں وجود میں لاتی ہیں، بہت سے پھولوں اور پھلوں کو بارور کرتی ہیں، اور حرارت و برودت کو زمین کے مختلف مقامات سے دوسرے مقامات کی طرف منتقل کرتی ہیں اور فضا میں اعتدال پیدا کرتی ہیں۔

زندہ اور اوکسیجن سے بھری ہوئی ہوا کو کھیتوں اور صحراؤں سے شہروں کی طرف لے جاتی ہیں، اور گندی ہواؤں کو صاف کرنے کے لیے صحراؤں کی طرف لے جاتے ہیں۔

سمندروں کے پانی کو متلاطم اور مواج بناتی ہیں اور پانی کے اندر زندہ رہنے والی موجودات کے لیے پانی کو اوکسیجن سے پُر کرتی ہیں۔ ہاں! ہوائیں اور بادہائے نسیم، دنیا میں عظیم اور حیات بخش خدمات انجام دیتی ہیں۔

ان قسموں کا دوسرا حصّہ جو فرشتوں کے ذریعہ نزولِ وحی کے پروگرام کی بات کرتا ہے، وہ بھی عالم معنی میں اس نسیم سے مشابہ ہے، جو عالم مادہ میں چلتی ہے، فرشتے، وحی کے کلمات کو، جو بارش کے قطروں کی طرح زندہ کرنے والے ہوتے ہیں، خدا کے پیغمبروں کے دلوں پر نازل کرتے ہیں، اور تقویٰ و معارفِ الٰہی کے پھل اور پھول دلوں میں اگاتے ہیں، اس طرح خدا نے عالم مادہ کی تربیت کرنے والوں کی بھی اور عالم معنی کی تربیت کرنے والوں کی بھی قسم کھائی ہے۔

اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ تمام قسمیں اس دن کی واقعیت کے بیان کے لیے ہیں جس میں یہ تمام کوششیں ثمر بخش ہوں گی، جو قیامت کا دن اور یوم الفصل ہے۔

۱۶۔ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ○

۱۷۔ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ○

۱۸۔ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ○

۱۹۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ○

۲۰۔ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ○

۲۱۔ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ○

۲۲۔ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ○

۲۳۔ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ○

۲۴۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ○

۲۵۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ○

۲۶۔ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ○

۲۷۔ وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ○

۲۸۔ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ○

ترجمہ

۱۶۔ کیا ہم نے پہلی (مجرم) قوموں کو ہلاک نہیں کیا؟

۱۷۔ پھر ہم بعد میں آنے والوں کو ان کے پیچھے بھیجیں گے۔

۱۸۔ (ہاں)! ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں۔

۱۹۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۲۰۔ کیا ہم نے تمھیں پست اور حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا

۲۱۔ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ اور آمادہ قرار گاہ میں ٹھرایا۔

۲۲۔ ایک معین مدت تک

۲۳۔ ہم اس کام پر قدرت رکھتے تھے، پس ہم کیسے اچھے قدرت والے ہیں (لہٰذا معاد کا معاملہ ہمارے لیے آسان ہے)

۲۴۔ وائے ہو اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۲۵۔ کیا ہم نے زمین کو انسانوں کے اجتماع کا مرکز قرار نہیں دیا۔

۲۶۔ ان کی زندگی کی حالت میں بھی اور موت کی حالت میں بھی۔

۲۷۔ اور ہم نے اس میں استوار اور بلند پہاڑ قرار دیئے اور تمھیں ہم نے خوشگوار پانی پلایا۔

۲۸۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے

تفسیر

ان تمام مظاہر قدرت کے باوجود پھر بھی تم معاد میں شک رکھتے ہو؟!

ان آیات میں بھی منکرین قیامت کو مختلف طریقوں سے خبردار کرتا ہے، اور گوناں گوں بیانات کے ساتھ انھیں غفلت کی گہری نیند سے بیدار کرتا ہے۔

پہلے ان کا ہاتھ پکڑ کر گزشتہ تاریخ کی طرف لے جاتا ہے اور انھیں گزشتہ مصیبت زدہ اقوام کی سرزمین دکھاتا ہے، اور فرماتا ہے "کیا ہم نے پہلی قوموں کو جنھوں نے کفر و انکار کی راہ اختیار کی تھی ہلاک نہیں کیا" (الم نهلك الاولین)۔

ان کے آثار نہ صرف صفحات تاریخ پر، بلکہ سطح روئے زمین پر بھی نمایاں ہیں، قوم "عاد" و "ثمود" اور "قوم نوح" و "قوم لوط" اور قوم "فرعون" جیسی اقوام، جن میں سے کوئی گروہ طوفان سے، کوئی گروہ صاعقہ (بجلی) سے، کوئی گروہ تیز آندھی سے، اور کوئی قوم زلزلہ اور آسمانی پتھروں کے عذاب سے نابود ہو گئی۔

"پھر ہم بعد میں آنے والی قوموں کو جو ان ہی جیسے اعمال رکھتی ہیں، ان کے پیچھے بھیج دیتے ہیں" (ثم نتبعهم الآخرین)۔

کیونکہ یہ ایک مسلسل جاری رہنے والی سنت ہے اور اس میں استثناء اور تبعیض نہیں ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ ایک گروہ کو ایک جرم کی وجہ سے سزا دے اور اسی جرم کو دوسروں کے لیے پسند کرے۔

اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "ہم گنہگاروں کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں" (کذالک نفعل بالمجرمین)۔

یہ آیت حقیقت میں "اقوام اولین" کی ہلاکت، اور ان کے بعد آنے والی اقوام کی ہلاکت کی دلیل کے طور پر بیان ہوئی ہے، کیونکہ خدائی عذاب میں، نہ تو انتقام جوئی کا پہلو ہوتا ہے، اور نہ ہی شخصی حساب کا تصفیہ، بلکہ وہ اصل استحقاق اور مقتضائے حکمت کے تابع ہوتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اوّلین سے مراد وہ قومیں ہیں جو ماضی بعید میں تھیں، مثلاً قوم نوح و عاد و ثمود، اور آخرین سے مراد وہ قومیں ہیں جو ان کے بعد آئیں، مثلاً قوم لوط، و قوم فرعون۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "نتبعھم" فعل مضارع کی صورت میں آیا ہے، جبکہ "الم نھلک" ماضی کا معنی رکھتا ہے، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ "اولین" ان تمام گزری ہوئی قوموں کے لیے آیا ہے، جو عذاب الٰہی کے ساتھ ہلاک ہوئیں، اور "آخرین" ان تمام کفار کو شامل ہے، جو پیغمبرؐ کے زمانے میں تھے یا جو اس کے بعد عرصۂ وجود میں قدم رکھیں گے اور جرم و گناہ اور ظلم و فساد میں آلودہ ہوں گے۔

اور انجام کار نتیجہ نکالتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے"۔ (ویل یومئذ للمکذبین)۔

"یومئذ" یہاں روز قیامت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان کی اصلی اور اہم سزا اسی روز کے ساتھ مربوط ہے، اور یہ تکرار تاکید مطلب کے لیے ہے، اور یہ جو بعض نے احتمال دیا ہے۔ کہ یہ آیت عذاب دنیا کو بیان کرتی، اور اس کی مشابہ آیت جو اس سے پہلے آئی ہے عذاب آخرت کو بیان کرتی ہے۔ بہت ہی بعید نظر آتا ہے۔

پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر عالم جنین کی طرف لے جاتا ہے اور خدا کی عظمت و قدرت، اور اس اسرار آمیز دنیا میں، اس کی نعمتوں کی کثرت دکھاتا ہے، تاکہ ایک طرف تو مسئلہ معاد و قیامت پر خدا کی قدرت سے آگاہ ہو جائیں اور دوسری طرف خود کو اس کی بے شمار نعمتوں کا مرہون سمجھیں، اور اس کے آستانے پر سر تعظیم جھکائیں۔

فرماتا ہے: "کیا ہم نے تمہیں پست اور ناچیز پانی سے پیدا نہیں کیا ہے"؟ (الم نخلقکم من ماء مھین)۔

"پھر ہم نے اسے مناسب، محفوظ، تیار و آمادہ قرارگاہ میں ٹھہرایا"۔ (فجعلناہ فی قرار مکین)۔[1]

---

[1] "قرار" "محل استقرار" کے معنی میں ہے اور "مکین" "محفوظ" کے معنی میں ہے، اور اصل میں "مکانت" سے بنے، جو تمکن کے معنی میں آیا ہے البتہ "مکانت" بعض اوقات "منزلت" کے معنی میں بھی آیا ہے۔

ایسی قرارگاہ، جس میں ہر لحاظ سے، حیات و زندگی اور انسانی نطفہ کی پرورش اور شدید محافظت کے لیے، تمام ضروریات موجود ہیں، اور وہ اس قدر عجیب و غریب، عمدہ اور موزوں ہیں کہ ہر انسان کو تعجب میں ڈالتے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "نطفہ کا اس محفوظ جگہ میں ٹھہرنا، ایک معین مدت تک جاری رہتا ہے" (الیٰ قدر معلوم)۔
وہ مدت جس کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا، ایسی مدت جو بہت سے تغیرات، دگرگونیوں اور تحولات سے پُر ہے، جس میں نطفہ کو ہر روز حیات و زندگی کا ایک نیا لباس پہنایا جاتا ہے، اور اس کو اس مخفی جگہ میں تکامل و ارتقاء کے راستہ پر آگے بڑھاتا ہے۔
اس کے بعد نتیجہ نکالتا ہے: "ہم اس کام پر قدرت رکھتے تھے کہ ایک بے قدر و قیمت، حقیر و ناچیز نطفہ سے، ایسا شریف اور کامل انسان بنا ڈالیں، پس ہم کتنے اچھے قادر و توانا ہیں" (فقدرنا فنعم القادرون)۔[1][2]
یہ وہی دلیل ہے جس پر قرآن نے مسئلہ معاد کو ثابت کرنے کے لیے بارہا انحصار کیا ہے، منجملہ ان کے سورۂ حج کی ابتدائی آیات میں کہتا ہے "تم مردوں کے نئی زندگی کی طرف پلٹ آنے کی، کیسے تردید کرتے ہو، حالانکہ تم اس انسان کی، ایک بے قدر و قیمت نطفہ سے خلقت میں اس کی قدرت کا مشاہدہ کرتے ہو، جس کا ہر روز ایک معاد و قیامت ہے تو مٹی اور اس بے قدر و قیمت نطفہ میں کیا فرق ہے؟

آخر میں پھر اسی جملہ کا تکرار فرماتے ہوئے کہتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

وائے ہے ان کے لیے جو اس کی قدرت کے یہ سب آثار دیکھتے ہیں، اور پھر بھی اس کا انکار کرتے ہیں۔
امیرالمومنین علی علیہ السلام اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

ایھا المخلوق السوی والمنشأ المرعی فی ظلمات الارحام، و مضاعفات الاستار، بدئت من سلالۃ من طین، و وضعت فی قرار مکین، الیٰ قدر معلوم، واجل مقسوم، تمور فی بطن امک جنینا، لا تحیر دعاء، ولا تسمع نداء ثم اخرجت من مقرك الی دار لم تشهدها، ولم تعرف سبل منافعها فمن هداك

---

[1] اس آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں "فنعم القادرون نحن" ہے۔ (اصطلاح کے مطابق مخصوص بالمدح محذوف ہے)۔
[2] بعض مفسرین نے اس آیت کی اس طرح تفسیر کی ہے "ہم نے نطفہ کی ضروری اندازہ گیریاں، مختلف مقدرات، اور جسم و جان میں خصوصیات کے ساتھ، تقدیر کی ہے، اور ہم اچھی تقدیر کرنے والے ہیں، لیکن یہ تفسیر اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے ــــــ کہ متن قرآن اور مشہور قرأت تشدید کے بغیر ہے ــــــ بعید نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعض نے یہ کہا ہے کہ ثلاثی مجرد کا مادہ بھی اندازہ کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ لیکن عام استعمالات میں لفظ "قادر" اس معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ (غور کیجیے)

لاجترار الغذاء من ثدی امك، وعرفك عند الحاجة مواضع طلبك وإرادتك

تا اے وہ مخلوق! جسے مناسب جسم کے ساتھ محفوظ ماحول میں پیدا کیا گیا ہے۔ رحم کی تاریکیوں اور کئی کئی پردوں میں تیری خلقت کا آغاز گیلی مٹی کے جوہر سے ہوا ہے، اور ایک محفوظ قرارگاہ میں ایک وقت معلوم اور معین مدت تک تجھے ٹھہرایا گیا ہے۔

وہ دن جس میں تو اس طرح تھا، اور رحم مادر میں حرکت کرتا تھا، نہ تو تجھ میں جواب دینے کی قدرت تھی، اور نہ ہی کسی کی آواز سننے کی توانائی تھی، اس کے بعد تو اس قرارگاہ سے ایسے گھر کی طرف آیا جسے تو نے ہرگز مشاہدہ نہیں کیا تھا، اور اس کے منافع کے راستے کو تو پہچانتا نہیں تھا۔

اب تو یہ بتا کہ تجھے تیری ماں کے پستان سے دودھ پینے کی ہدایت کس نے کی تھی؟ اور تجھے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے طریقے کس نے بتائے تھے؟[1]

ان آیات کے دوسرے حصہ میں خدا کی آفاقی آیات اور نشانیوں اور عظیم جہان ہستی اس کی نعمتوں اور مواہب کے ایک حصہ کو بیان کیا گیا ہے جو اس کی وسیع قدرت اور رحمت کی بھی ایک دلیل ہیں اور معاد کے امکان کی بھی ایک دلیل ہیں، جبکہ گزشتہ آیات میں خدا کی آیات انفسی اور خود انسان کی خلقت میں جو نعمتیں تھیں، ان کے بارے میں گفتگو تھی۔

فرماتا ہے: "کیا ہم نے زمین کو انسانوں کے اجتماع کا مرکز نہیں بنایا" (الم نجعل الارض کفاتاً)۔[2]

"ان کی زندگی میں بھی اور ان کی موت کی صورت میں بھی" (احیاء و امواتاً)۔[3]

"کفات" (بروزن کتاب) اور "کفت" (بروزن کشف) جمع کرنے اور کسی چیز کو ایک دوسری کے ساتھ ملانے کے معنی میں ہے، اور پرندوں کی سریع اور تیز پرواز کو بھی "کفات" کہا جاتا ہے، کیونکہ تیز پرواز کے وقت وہ اپنے پروں کو اکٹھے کر لیتے ہیں، تاکہ زیادہ تیزی کے ساتھ ہوا کو چیر کر آگے نکل جائیں۔

اس سے مراد یہ ہے کہ زمین تمام انسانوں کے لیے ایک قرارگاہ ہے، زندوں کو تو اپنے اوپر جمع کرتی ہے، اور ان کی تمام حاجتوں اور ضروریات کو پورا کرتی ہے، اور ان کے مردوں کو بھی اپنے اندر جگہ دیتی ہے، کیونکہ اگر زمین مردوں کو دفن کرنے کے لیے آمادہ نہ ہوتی، تو ان سے پیدا ہونے والی عفونت اور بیماریاں تمام زندوں کے لیے ایک مصیبت کھڑی کر دیتیں۔

ہاں! زمین ایک ماں کی طرح، جو اپنی اولاد کو اپنے گرد جمع کرتی ہے، اور اپنے پروبال کے نیچے قرار دیتی ہے، انسانوں کو اپنے اوپر جگہ دیتی ہے، ان پر نوازش کرتی ہے، انہیں غذا کھلاتی ہے، لباس پہناتی ہے، گھر اور مسکن دیتی ہے اور اس کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۶۳

[2] "کفاتاً" "جعلنا" کا دوسرا مفعول ہے اور احیاء مصدر ہے جو اسم فاعل کے معنی میں آیا ہے۔

[3] "احیاءً و امواتاً" ایک محذوف مفعول کی ضمیر کا حال ہے اور تقدیر میں "کفاتاً لکم احیاءً و امواتاً" تھا۔

اوران کے مردوں کو بھی اپنے اندر محفوظ رکھتی ہے اور جذب کر لیتی ہے، اور ان کے بڑے آثار کو ختم کر دیتی ہے۔

بعض نے "کفات" کی یہاں "پرواز سریع" کے ساتھ تفسیر کی ہے اور وہ اس آیت کو سورج کے گرد زمین کی حرکت اور دوسری حرکات کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں، جو نزولِ قرآن کے موقع پر قطعاً کشف نہیں ہوئی تھی۔

لیکن اس کے بعد والی آیت یعنی "احیاءً و امواتًا" کی طرف توجہ کرنے سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

خصوصاً ایک روایت میں آیا ہے کہ امیر المومنین علیؑ جب میدان صفین سے واپس لوٹ رہے تھے اور کوفہ کے قریب پہنچے تو جب آپ کی نظر مبارک کوفہ کے دروازے سے باہر قبرستان پر پڑی تو فرمایا:

هٰذه كفات الاموات ای مساكنهم

"یہ مردوں کے کفات یعنی ان کے مسکن اور گھر ہیں"

پھر آپ نے کوفہ کے گھروں پر نظر کی اور فرمایا:

هٰذه كفات الاحياء

"یہ زندوں کے گھر ہیں"

اس کے بعد آپ نے اوپر والی آیات کی تلاوت فرمائی: الم نجعل الارض كفاتًا احياءً وامواتًا [1]

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زندوں اور مردوں کے گھروں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔

اس کے بعد کرۂ زمین میں خدا کی ایک عظیم نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ہم نے اس میں ثابت استوار اور بلند پہاڑ قرار دیئے ہیں" (وجعلنا فيها رواسي شامخات)۔[2]

یہ پہاڑ جن کی چوٹیاں آسمان کی طرف سر نکالے ہوئے ہیں، اور ان کی جڑیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں، ایک طرف تو زمین کو زرہ کی مانند گھیرے ہوئے ہیں، اور داخلی دباؤ اور خارجی مدوجزر سے پیدا ہونے والے دباؤ سے محفوظ رکھتے ہیں، اور دوسری طرف ہوا کے تشر کے زمین سے ٹکراؤ کو روکتے ہیں، اور ہوا میں پنجہ ڈال کر اس کو اپنے ساتھ گردش میں لاتے ہیں اور تیسری طرف عظیم طوفانوں اور آندھیوں کو کنٹرول کرتے ہیں اور اس طرح کئی مختلف جہات سے اہلِ زمین کو سکون و آرام پہنچاتے ہیں۔

اسی آیت کے ذیل میں پہاڑوں کی برکات میں سے ایک اور برکت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اور ہم نے تمہیں خوشگوار پانی پلایا" (واسقيناكم ماءً فراتًا)۔

ایسا پانی جو تمہارے لیے بھی خوش گوار اور باعثِ حیات ہے اور تمہارے جانوروں، کھیتوں اور باغات کے لیے بھی۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۴۱۴ (نقل از تفسیر علی بن ابراہیم)

[2] رواسی "راسیہ" کی جمع ہے، جو ثابت و پابرجا کے معنی میں ہے اور "شامخات" "شامخ" کی جمع ہے جو بلند کے معنی میں ہے اور بعض عبارتوں میں جیسے "شمخ بانفه" تکبر سے کنایہ ہے (مفردات راغب)

یہ ٹھیک ہے کہ تمام خوشگوار پانی بارش سے ہیں، لیکن پہاڑوں کا بھی اس میں اہم ترین نقش و اثر ہے، بہت سے چشمے اور ندی نالے پہاڑوں سے پھوٹتے ہیں اور بہت سے بڑے بڑے دریاؤں اور نہروں کا سرچشمہ برف کے وہ تہ بہ تہ تودے ہیں جو پہاڑوں کی چوٹی پر اکرم جاتے ہیں اور انسانوں کے پانی کے اہم ترین ذخائر بناتے ہیں۔

پہاڑوں کی چوٹیاں سطح زمین سے دور ہونے کی وجہ سے ہمیشہ سرد ہوتی ہیں، اور سالہا سال تک برف کے ذخائر کو اپنے اندر جگہ دے سکتی ہیں، تاکہ وہ تدریجاً اور آہستہ آہستہ سورج کی حرارت سے پانی بن بن کر نہروں اور دریاؤں کی صورت میں جاری ہوتے رہیں۔

اس حصہ کے آخر میں پھر فرماتا ہے: "وائے ہو اس دن تکذیب کرنے والوں پر" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

وہی لوگ جو حق تعالیٰ کی قدرت کی ان تمام آیات اور نشانیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو جن میں وہ غرق ہیں، مشاہدہ کرتے ہیں، پھر بھی وہ قیامت اور دادگاہ و قیامت کا، جو اس کے عدل و حکمت کی مظہر ہے، انکار کرتے ہیں۔

۲۹۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی مَا كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝

۳۰۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ۝

۳۱۔ لَّا ظَلِیْلٍ وَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ ۝

۳۲۔ اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝

۳۳۔ كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ۝

۳۴۔ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝

۳۵۔ هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ۝

۳۶۔ وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ ۝

۳۷۔ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝

۳۸۔ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ ۚ جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ ۝

۳۹۔ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَیْدٌ فَكِیْدُوْنِ ۝

۴۰۔ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝

ترجمہ

۲۹۔ (اور اس دن انھیں کہا جائے گا) بلا توقف اس چیز کی طرف چل پڑو، جس کا تم ہمیشہ انکار کیا کرتے تھے۔

۳۰۔ تین شاخوں والے (خفقان بار آگ کے دھوئیں کے) سایہ کی طرف چلو۔

۳۱۔ ایسا سایہ جو نہ تو آرام بخش ہے، اور نہ ہی آگ کے شعلوں سے روکتا ہے۔

۳۲۔ وہ اپنے شعلوں کو اس طرح سے پھینکتا ہے جیسا کہ کوئی محل ہو۔

۳۳۔ گویا وہ (سرعت اور کثرت میں) ایسے زرد اونٹوں کے مانند ہیں (جو ہر طرف بکھر جاتے ہیں)۔

۳۴۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۳۵۔ آج کا دن ایسا ہے جس میں وہ کوئی بات نہیں کریں گے (اور ان میں اپنے آپ سے دفاع کرنے کی قدرت نہیں ہوگی)۔

۳۶۔ اور انھیں عذر کرنے کی بھی اجازت نہیں ملے گی۔

۳۷۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۳۸۔ آج وہی (حق سے باطل کی) جدائی کا دن ہے، جس میں ہم نے تمھیں اور گزشتہ لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔

۳۹۔ اگر میرے مقابلہ میں (عذاب اور سزا کے چنگل سے فرار کرنے کی) کوئی تدبیر تمھارے پاس ہے تو اسے انجام دو۔

۴۰۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

تفسیر

نہ دفاع کرنے کی قدرت ہے نہ فرار کی راہ

ان آیات میں قیامت کی تکذیب کرنے والوں اور اس عدلِ الٰہی کی دادگاہ کا انکار کرنے والوں کی اصلی اور آخری سرنوشت بیان ہوئی ہے، ایسا بیان جو انسان کو پیچ بیچ ایک گہری دہشت میں ڈبو دیتا ہے، اور مصیبت کے پہلوؤں کو واضح کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "ان سے کہا جائے گا، بلا تامل اس چیز کی طرف چل پڑو، جس کا تم ہمیشہ انکار کیا کرتے تھے" (انطلقوا الیٰ ما کنتم بہ تکذبون)۔

چلو اس جلانے والی جہنم کی طرف جس کا تم ہمیشہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔

چلو ان انواع و اقسام کے عذابوں کی طرف، جنھیں تم نے اپنے اعمال کے ذریعہ پہلے سے فراہم کر رکھا ہے۔

"انطلقوا" "انطلاق" کے مادہ سے، توقف کے بغیر چلنے کے معنی میں ہے، اور قید و بند سے ایک قسم کی آزادی بھی کا اس میں چھپی ہوئی ہے، اور حقیقت میں عرصۂ محشر میں ان کی حالت کی وضاحت ہے کہ انھیں ایک طولانی مدت تک حساب کے لیے روک لیا جائے گا، پھر ان کو چھوڑ دیں گے اور کہیں گے کہ توقف کیے بغیر دوزخ کی طرف چل پڑو۔

یہ گفتگو کرنے والا ممکن ہے خداوند تعالیٰ ہو، جو براہِ راست ان سے خطاب کرے گا، یا عذاب کے فرشتے، بہر حال یہ ایک ایسا لب ولہجہ ہے

جس میں گہری سرزنش ہے، جو خود ایک دردناک اور جانکاہ عذاب ہے۔

اس کے بعد اس عذاب کے بارے میں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے: "تین شاخوں والے (آگ کے گھٹے ہوئے دھوئیں کے) سایہ کی طرف چلو"۔ (انطلقوا الی ظل ذی ثلاث شعب)۔

ایک شاخ سر کے اوپر، ایک شاخ دائیں طرف اور ایک شاخ بائیں طرف، اور اس طرح سے یہ گہرا اور گھبار دھواں انھیں گھیر لے گا اور انھیں نگل جائے گا۔

لیکن وہ آرام بخش سایہ نہیں ہوگا، اور دوزخیوں کو جہنم کی آگ کے شعلوں سے ہرگز نہیں بچائے گا" (لا ظلیل ولا یغنی من اللھب)۔

چونکہ وہ خود آگ ہی سے اٹھا ہے۔

ممکن ہے "ظل" (سایہ) کی تعبیر سے یہ تصور پیدا ہو کہ وہاں کوئی سایہ بھی ہوگا، جو آگ کے شعلوں کے جلانے میں کچھ کمی کر دے لیکن یہ آیت اس غلط خیال کو باطل کرتے ہوئے کہتی ہے: یہ سایہ ہرگز وہ سایہ نہیں جس کا تم تصور کرتے ہو، یہ ایک ایسا سایہ ہے جو جلانے اور گھٹنے والا ہے، جو آگ کے گاڑھے دھوئیں سے اٹھتا ہے، اور شعلوں کی گرمی کو مکمل طور پر منعکس کر سکتا ہے۔[1]

اس گفتگو کی شاہد سورۂ واقعہ کی آیات ہیں، جن میں اصحاب شمال کے بارے میں فرماتا ہے: فی سموم و حمیم و ظل من یحموم لا بارد و لا کریم "وہ جلا کر دینے والی ہواؤں اور جلانے والے پانی میں ہوں گے، اور تہ بتہ دھوئیں کے گھٹن زا سایہ میں، ایسا سایہ جو نہ تو ٹھنڈا ہوگا اور نہ ہی آرام بخش۔ (سورۂ واقعہ ۴۲ ـــــ ۴۴)

بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ تین شاخیں ان کے تینوں اصولِ دین یعنی توحید و نبوت اور معاد کو جھٹلانے کا ردِ عمل ہیں، کیونکہ معاد کی تکذیب، توحید و نبوت کی تکذیب سے جدا نہیں ہے۔

اور بعض نے یہ کہا ہے کہ یہ گناہ کے تینوں اسباب "قوت غضبیہ" "قوت شہویہ" اور "قوت وہمیہ" کی طرف اشارہ ہے، ہاں! وہ تاریک دھواں شہوات کی تاریکیوں کا تجسم ہے۔

ز تاریکی خشم و شہوت حذر کن
کہ از دود آن چشم دل تیرہ گردد!
غضب چوں در آید رود عقل بیروں
ہوی چوں شود چیرہ جان تیرہ گردد!

ترجمہ: غضب اور شہوت کی تاریکی سے بچ!

---

[1] "لا ظلیل" "ظل" کی صفت ہے اور اسی بنا پر مجرور ذکر ہوا ہے۔

جس کے دھوئیں سے دل کی آنکھ اندھی ہو جاتی ہے
جب غصہ آتا ہے، تو عقل خارج ہو جاتی ہے
اور جب خواہش نفسانی غلبہ کرتی ہے، تو جان چھن جاتی ہے

اس کے بعد اس جلانے والی آگ کی ایک اور خصوصیت کے سلسلہ میں مزید کہتا ہے: "وہ اپنے اندر سے ایسے شعلے باہر پھینکتی ہے، جو ایک بہت بڑے قصر کی مانند ہوتے ہیں"۔ (انها ترمی بشرر کالقصر)[1]

وہ اس دنیا کی آگ کے شعلوں کی طرح نہیں ہوتے، جو بعض اوقات تو سوئی کے سرے کے برابر بھی نہیں ہوتے۔

"قصر" (محل) کی تشبیہ یہاں ایک پر معنی تشبیہ ہے، شاید یہ تصور کیا جائے کہ زیادہ مناسب یہ تھا کہ یہ کہا جاتا کہ وہ شعلے پہاڑ کی طرح ہیں، لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ پہاڑ —— جیسا کہ گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا ہے —— انواع و اقسام کی برکات کا منبع ہیں اور میٹھے، خوش مزہ اور خوش گوار پانی کا سرچشمہ ہیں، یہ ستم گروں کے قصر اور محلات ہیں، جو جلانے والے شعلوں اور شرربار آگ کا سبب بنتے ہیں[2]

بعد میں آیت میں اس جلانے والی آگ کے شعلوں اور چنگاریوں کی ایک دوسری صفت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ زرد رنگ کے اونٹوں کے مانند ہیں"۔ (کانه جمالت صفر)[3]

"جمالة" "جمل" کی جمع ہے، جو اونٹ کے معنی میں ہے (جیسے حجر و حجارہ) اور "صفر" (بروزن قفل) "اصفر" کی جمع ہے جو زرد رنگ کی چیز کے معنی میں ہے، اور بعض اوقات تاریک اور سیاہی مائل رنگوں پر بھی بولا جاتا ہے، لیکن یہاں وہی پہلا معنی ہی مناسب ہے کیونکہ آگ کے شعلے زرد اور سرخی مائل ہوتے ہیں۔

گزشتہ آیت میں ان شعلوں کو حجم کے لحاظ سے بہت بڑے قصر سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اس آیت میں کثرت، رنگ، سرعت حرکت اور ہر طرف پراگندہ اور بکھر جانے کے لحاظ سے زرد رنگ کے اونٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے، جو ہر طرف رواں دواں ہیں۔

---

[1] "شرر" (بروزن ضرر) "شرارہ" کی جمع ہے، جو ان چھوٹے چھوٹے اجزاء کے معنی میں ہے، جو آگ سے نکل کر ہوا میں اچھلتے ہیں، اور "شر" کے مادہ سے لیا گیا ہے۔

[2] بعض مفسرین مثلاً فخر رازی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے "قصر" کی تفسیر میں یہ کہا ہے کہ اس سے مراد وہ لکڑیاں ہیں، جنھیں سردیوں کے لیے بیابان سے کاٹ کر اکٹھا کیا کرتے تھے، اور ایک دوسرے کے اوپر جوڑ دیتے تھے۔ (البتہ بعید نہیں ہے کہ یہ تفسیر بھی اسی بناء پر ہو کہ ایک دوسرے پر جڑی ہوئی لکڑیوں کے انبوہ کو ایک بلند قصر سے تشبیہ دیتے تھے)۔

[3] "کانه" کی ضمیر ممکن ہے "قصر" کی طرف لوٹے یا "شرر" کی طرف، لیکن چونکہ "شرر" جمع ہے، لہٰذا تاویل کے بغیر ممکن نہیں ہے، مگر یہ کہ ہم "شرر" کو اسم جمع سمجھ لیں۔

جہاں شعلے اس قسم کے ہوں تو یہ بات واضح ہے کہ خود وہ جلانے والی آگ کیسی ہوگی؟ اور اس کے ساتھ دوسرے کیسے کیسے دردناک عذاب ہوں گے؟ (خدا ہم سب کو اپنی رحمت اور لطف و کرم سے اس سے محفوظ رکھے)

آیات کے اس حصے کے آخر میں دوبارہ اسی تنبیہ کا تکرار کرتا ہے، اور فرماتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے"۔ (ویل یومئذ للمکذبین)۔

اس کے بعد اس ہولناک دن کے مشخصات اور امتیازات کی ایک اور فصل کو شروع کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "آج ایسا دن ہے کہ وہ کوئی بات نہیں کریں گے" (ھٰذا یوم لا ینطقون)۔[1]

ہاں! اس دن خدا مجرموں اور گنہگاروں کے منہ پر سکوت اور خاموشی کی مہر لگا دے گا، جیسا کہ سورۂ یٰس کی آیہ ۶۵ میں آیا ہے: "الیوم نختم علیٰ افواھھم" "آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے"۔ اور پھر جیسا کہ اسی آیت کے ذیل میں آیا ہے "ان کے ہاتھ اور پاؤں کلام کرنے لگیں گے"۔ یہاں تک کہ قرآن کی دوسری آیات کے مطابق ان کی جلدیں بھی کلام کرنے لگیں گی، اور تمام باتیں بیان کر دیں گی"۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور انھیں عذر خواہی کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی": (ولا یؤذن لھم فیعتذرون)۔[2]

(تو انھیں بات کرنے کی اجازت ہوگی اور نہ ہی عذر خواہی اور اپنے آپ سے دفاع کرنے کی، کیونکہ وہاں تو تمام حقائق واضح و روشن ہیں، اور کہنے کی کوئی بات باقی نہیں ہے۔ ہاں! یہ پس پشت ڈالنے والی زبان، جس نے دنیا میں اپنی آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا، انبیاء کی تکذیب کی، اولیاء کا استہزا کیا اور مذاق اڑایا، حق کو باطل اور باطل کو حق کر کے پیش کرتی رہی، وہاں ان اعمال کی سزا کے طور پر اس پر قفل لگ جانا چاہیے، اور اسے بیکار ہو جانا چاہیے، اور یہ بات خود ایک عذاب اور دردناک شکنجہ ہے کہ انسان میں اس قسم کے منظر میں اپنے آپ سے دفاع کرنے یا عذر خواہی کرنے کی قدرت نہ ہو۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے کہ:

"خدا اس سے برتر و عادل تر و بزرگ تر ہے کہ اس کا بندہ کوئی مناسب اور مدلل عذر رکھتا ہو، لیکن وہ اس کو

---

[1] توجہ رکھیں کہ یہاں "یوم" تنوین کے بغیر ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی "لا ینطقون" کے جملے کے مفہوم کی طرف اضافت ہوئی ہے۔

[2] اس بارے میں کہ "فیعتذرون" کا جملہ رفع کی صورت میں کیوں آیا ہے، جبکہ قاعدہ کی رُو سے اسے منصوب ہونا چاہیے تھا، اور اس کی نون حذف ہونی چاہیے تھی۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے عذر خواہی کو ترک کرنے کا سبب یہ ہے کہ ان کے پاس کوئی عذر ہی نہ ہوگا، اذنِ الٰہی کے نہ ہونے کے سبب سے نہ ہوگا۔

عذر خواہی کی اجازت نہ دے، بلکہ درحقیقت ان کے پاس کسی قسم کا مناسب، مدلل اور قابل قبول عذر ہوتا ہی نہیں، جسے وہ پیش کر سکیں۔ [1]

البتہ بعض قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں مجرمین بعض اوقات بات کریں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ـــــ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے ـــــ قیامت میں بہت سے مواقف ہوں گے، جن میں سے بعض میں زبان بیکار ہو جائے گی، اور اعضاء و جوارح کی گواہی کی نوبت آئے گی، اور بعض دوسرے مواقف میں زبان کھل جائے گی، اور وہ کچھ مطالب کو بیان کرے گی، جو ان کی شدید حسرت و اندوہ، سرگردانی اور بدبختی کی نشانی ہے۔

اور پھر اس مقطع کے آخر میں کہتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

ایک دوسرے حصے میں روئے سخن مجرمین کی طرف کرتے ہوئے اس روز کے منظر کی حکایت کے عنوان سے کہتا ہے: "آج وہی جدائی کا دن ہے، جس میں ہم نے تمہیں اور گزشتہ لوگوں کو جمع کر دیا ہے" (ھذا یوم الفصل جمعناکم والاولین)۔

آج ہم نے تمام لوگوں کو بغیر کسی استثناء کے، اولین سے لے کر آخرین تک، سب کو حساب دینے اور فصل خصومت کے لیے اس میدان اور عظیم دادگاہ میں اکٹھا کر دیا ہے۔

"اب اگر میرے مقابلہ میں عذاب اور سزا کے چنگل سے، فرار کرنے کی کوئی تدبیر تمہارے پاس ہے تو اسے انجام دو" (فان کان لکم کید فکیدون)۔ [2]

کیا تم میری حکومت کی حدود سے فرار کر سکتے ہو؟

یا میری قدرت پر غلبہ حاصل کر سکتے ہو؟

یا فدیہ دے کر آزاد ہو جانے کی طاقت رکھتے ہو؟

یا حساب لینے والے مامورین کو دھوکہ دینے کی قدرت رکھتے ہو؟

جو کام بھی تم سے ہو سکتا ہے اسے انجام دو، لیکن جان لو کہ تم سے کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا۔

---

[1] "نور الثقلین" جلد ۵، ص ۴۹

[2] "فکیدون" میں "نون" مکسور ہے (نون کے نیچے زیر ہے) اور اس کی یہ زیر یاء متکلم کی جگہ ہے اور اصل میں "فکیدونی" تھا، یاء حذف ہو گئی اور کسرہ جو اس کی نشانی ہے باقی رہ گئی، اور ضمیر متکلم ظاہر آیات کے مطابق خدا کی پاک ذات کی طرف لوٹتی ہے، اور یہ احتمال کہ یہ پیغمبر کی ذات کی طرف لوٹے، بہت بعید نظر آتا ہے۔

حقیقت میں یہ امر اصطلاح کے مطابق (ایک عاجزی کا اظہار کرنے والا امر ہے) جو مقابل کے عجز و ناتوانی کو واضح کرنے کے لیے بیان کیا جاتا ہے، یہ اسی چیز کے مشابہ ہے جو قرآن مجید کے بارے میں آئی ہے کہ فرماتا ہے: "اگر اس چیز میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تمہیں شک ہے تو اس جیسی لے آؤ۔"

"کید" — (بروزن صید) جیسا کہ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے: ایک قسم کی تدبیر اور چارہ جوئی کے معنی میں ہے جو بعض اوقات قابلِ مذمت ہوتی ہے اور کبھی قابلِ تعریف و مدح، اگرچہ اس کا زیادہ تر استعمال مذموم موارد میں ہی ہوتا ہے (جیسا کہ زیرِ بحث آیت میں بھی اسی طرح ہے)۔

یقیناً اس دن ان سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ دن ایک ایسا دن ہوگا کہ اس میں انسان کا ہاتھ ہر قسم کے وسائل و اسباب سے خالی ہوگا، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۶۶ میں آیا ہے: "وتقطعت بهم الاسباب" "ان سے سب اسباب منقطع ہو جائیں گے۔"

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک طرف تو فرماتا ہے: "یوم الفصل" یعنی جدائیوں کا دن، اور دوسری طرف سے فرماتا ہے وہ دن "یوم الجمع" یعنی اکٹھا ہونے کا دن ہے اور ان دونوں میں سے ہر ایک، ایک ہی جگہ پر انجام پائیں گے، پہلے ان سب کو اس عظیم دادگاہ میں جمع کریں گے، اور پھر وہ اپنے عقائد و اعمال کی بناء پر مختلف صفوں میں الگ الگ ہو جائیں گے، یہاں تک کہ وہ بھی جنت کی طرف روانہ ہوں گے، گوناگوں صفوں اور مختلف درجات میں ہوں گے، اور دوزخ کی طرف جانے والے بھی مختلف صفوں اور الگ الگ درجوں میں ہوں گے۔

ہاں: وہ دن حق کی باطل سے اور ظالم کی مظلوم سے جدائی کا دن ہے۔

پھر اسی تہدید آمیز اور بیدار کرنے والے جملہ کا تکرار کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کیلئے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

۴۱۔ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّ عُیُوْنٍ ۝

۴۲۔ وَّ فَوَاكِهَ مِمَّا یَشْتَهُوْنَ ۝

۴۳۔ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِیْٓـٴًـۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

۴۴۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝

۴۵۔ وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝

۴۶۔ كُلُوْا وَ تَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ۝

۴۷۔ وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝

۴۸۔ وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا یَرْكَعُوْنَ ۝

۴۹۔ وَیْلٌ یَّوْمَىٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ ۝

۵۰۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۱۔ تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ (جنّت کے درختوں کے) سایہ میں اور چشموں کے درمیان ہوں گے۔

۴۲۔ اور پھلوں میں سے جنھیں وہ چاہیں گے

۴۳۔ کھاؤ اور مزے مزے سے پیو، یہ ان اعمال کے مقابلہ میں ہے جنھیں تم انجام دیتے تھے۔

۴۴۔ ہم نیکو کار لوگوں کو اسی طرح سے جزا دیں گے۔

۴۵۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۴۶۔ (اس کے مقابلہ میں مجرموں سے کہا جائے گا) کھالو اور اس تھوڑی سی مدت میں فائدہ اٹھالو (لیکن جان لو کہ خدا کا عذاب تمھارے انتظار میں ہے) کیونکہ تم مجرم ہو۔

۴۷۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔

۴۸۔ اور جب ان سے رکوع کرنے کے لیے کہا جاتا ہے تو رکوع نہیں کرتے۔
۴۹۔ وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے۔
۵۰۔ (اگر وہ اس قرآن پر ایمان نہیں لاتے) تو پھر اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

تفسیر

اگر وہ قرآن پر ایمان نہیں لاتے تو پھر کس بات پر ایمان لائیں گے؟!

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کا پروگرام انذار کو بشارت کے ساتھ اور تہدید کو تشویق کے ساتھ ملاتا ہے، اور اسی طرح مومنین کی سرنوشت کو مجرموں کی سرنوشت کے مقابلہ میں بیان کیا جاتا ہے، تاکہ مقابلہ کے قرینہ سے مسائل کا بہتر طریقہ پر ادراک ہو سکے۔

اسی سنت کی بنیاد پر اوپر والی آیات میں، قیامت میں مجرموں کی گوناگوں سزاؤں کو بیان کرنے کے بعد، اس دن پرہیزگاروں کی کیفیت کے بارے میں ایک پُر معنی اور مختصر سا اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تقویٰ اختیار کرنے والے لوگ درختوں کے سایہ اور چشموں کے درمیان ہوں گے" (ان المتقین فی ظلال وعیون)۔

یہ اس حالت میں ہے جبکہ مجرمین ——— جیسا کہ گزشتہ آیات میں معلوم ہو چکا ہے ——— گھوٹنے والے شرر بار اور جلانے والے دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے۔

"ظلال"، "ظل" کی جمع ہے جو سایہ کے معنی میں ہے، چاہے وہ سایہ دن میں درختوں کے سایہ کی طرح کا ہو، یا وہ سایہ ہو، جو رات کی تاریکی میں حاصل ہوتا ہے جبکہ "فیئ" اس سایہ کو کہا جاتا ہے جو صرف ایک نورانی مبدء کے مقابلے میں وجود میں آتا ہے، جیسا کہ سورج کے مقابلہ میں درختوں کا سایہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ ان انواع و اقسام کے پھلوں کے درمیان ہوں گے، جن کی انھیں خواہش ہوگی" (وفواکه مما یشتهون)۔

یہ بات واضح ہے کہ پھلوں سایوں اور چشموں کا ذکر، ان پر خدا کی عظیم نعمتوں کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ ہے، ایسا گوشہ جو اہل دنیا کی زبان میں بیان کرنے اور تصویر کشی کے قابل ہے، لیکن وہ نعمتیں جو بیان میں نہیں آسکتیں، اور دنیا میں رہنے والوں کے دل و دماغ میں نہیں سما سکتیں، وہ اس سے کئی درجہ بلند و برتر ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ خدا کی اس مہمان سرا میں ان کی اعلیٰ ترین طریقہ پر پذیرائی کی جائے گی، جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے کہ انھیں کہا جائے گا "کھاؤ اور مزے لے لے کر پیو، یہ سب کچھ ان اعمال کے مقابلہ میں ہے جنھیں تم انجام دیا کرتے تھے (کلوا واشربوا هنیئا بما کنتم تعملون)۔

یہ جملہ چاہے بلاواسطہ خدا کی طرف سے ان کو خطاب کرنے کے عنوان سے ہو یا فرشتوں کے ذریعہ سے، ایک ایسے واضح لطف و محبت سے توام ہے، جو ان کی روح اور جان کی ایک غذا ہے۔

"بما کنتم تعملون" (ان اعمال کے مقابلہ میں جنھیں تم انجام دیا کرتے تھے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نعمتیں کسی کو بغیر کسی حساب و کتاب کے نہیں دیتے، اور یہ صرف دعوے، خیال اور تصور سے حاصل نہیں ہوتیں، یہ تو صرف اعمال صالح کے ذریعہ ہی ملتی ہیں۔

"ھنیئ" (بروزن ملیح) "مفردات" میں "راغب" کے قول کے مطابق ہر وہ چیز ہے جس کے لیے مشقت نہ کرنی پڑے، اور اس سے کوئی تکلیف اور پریشانی پیدا نہ ہو، اسی لیے گوارا اور خوش مزہ غذا اور پانی کو "ھنیئ" کہا جاتا ہے، اور بعض اوقات خوشگوار زندگی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جنت کے پھل، کھانے اور مشروبات دنیا کے کھانے پانی کی طرح نہیں ہیں، جو بعض اوقات انسان کے بدن میں برے آثار چھوڑ دیتے ہیں، یا ان سے غیر مطلوب عوارض پیدا ہو جاتے ہیں۔

مفسرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ کھانے اور پینے کا حکم کیا ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اباحت کو بیان کرتا ہے یا واقعاً امر و فرمان و حکم ہے۔

لیکن اس بات پر توجہ کرنا چاہیے کہ اس قسم کے اوامر، جو پذیرائی کے موقع پر دیئے جاتے ہیں، سننے والے کی ایک قسم کی طلب و خواہش ہوتی ہے، جسے مہمان کی عظمت و احترام کے لیے بیان کیا جاتا ہے اور میزبان یہ چاہتا ہے کہ مہمان زیادہ سے زیادہ کھائے، تاکہ اس کا زیادہ احترام و اکرام ہو۔

بعد والی آیت میں دوبارہ اسی مطلب پر تکیہ کرتا ہے کہ یہ نعمتیں کسی حساب و کتاب کے بغیر نہیں ملتیں، لہٰذا مزید کہتا ہے: "یقیناً ہم نیکوکاروں کو اسی طرح سے جزا دیتے ہیں" (انا کذالک نجزی المحسنین)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پہلی آیت میں "تقویٰ" کے مسئلہ پر تکیہ ہوا ہے اور اس کے بعد والی آیت میں "عمل" پر اور اس آیت میں احسان و نیکوکاری پر۔

"تقویٰ" گناہ و فساد و شرک و کفر سے ہر قسم کا پرہیز، اور "احسان" ہر اچھے کام کو انجام دینا ہے اور "عمل" بھی اعمالِ صالح کے بیان کے لیے ہے، تاکہ واضح ہو جائے کہ خدا کی نعمتوں کا پروگرام صرف اسی گروہ کے ساتھ مخصوص ہے نہ کہ ایمان کے جھوٹے دعویداروں کے ساتھ، اور ہر قسم کے فساد سے آلودہ افراد کے ساتھ، اگرچہ وہ ظاہراً اہلِ ایمان کی سلک میں داخل ہیں۔

آخر میں پھر تکرار کرتا ہے، "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے": (ویل یومئذ للمکذبین)۔

وائے ہے ان کے لیے جو ان تمام نعمتوں اور محبتوں سے محروم ہو جائیں گے، کیونکہ اس محرومیت کی حسرت کا دکھ، دوزخ کی آگ سے

والی آگ سے کم نہیں ہوگا۔

اور چونکہ معاد کے انکار کا ایک عامل، دنیا کی جلدی گزر جانے والی لذات، اور ان لذتوں سے فائدہ اٹھانے کی بے قید و بند آزادی کی طرف میلان ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں روئے سخن مجرمین کی طرف کرتے ہوئے تہدید آمیز لب و لہجہ میں فرماتا ہے: "ان مختصر سے چند دنوں میں کھالو اور فائدہ اٹھالو، لیکن یہ جان لو کہ خدا کا عذاب تمہارے انتظار میں ہے، کیونکہ تم مجرم اور گنہگار ہو"۔ (کلوا و تمتعوا قلیلا انکم مجرمون)۔

"قلیلا" کی تعبیر ممکن ہے کہ دنیا میں انسان کی عمر کی مختصر مدت کی طرف اشارہ ہے، اور اس جہان کی نعمتوں کے آخرت کی بے حساب نعمتوں کے مقابلہ میں ناچیز ہونے کی طرف بھی۔

اگرچہ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ خطاب آخرت میں مجرمین سے کہا جائے گا، لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آخرت میں مجرموں کے لیے، زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی، کسی قسم کا تصور نہیں ہے، لہٰذا اس بات کو قبول کرنا چاہیے کہ یہ گفتگو دنیا میں ان سے خطاب ہے۔

حقیقت میں "متقین" اور پرہیزگار لوگوں کی آخرت میں انتہائی احترام کے ساتھ پذیرائی ہوگی اور "کلوا واشربوا هنيئا" کے پر لطف جملہ کے ساتھ ان سے خطاب ہوگا، لیکن دنیا پرست اسی دنیا میں "کلوا و تمتعوا قلیلا" کے تہدید آمیز جملہ کے ساتھ مخاطب ہوتے ہیں۔

پرہیزگاروں سے فرماتا ہے: بما کنتم تعملون: (یہ سب کچھ ان اعمالِ صالحہ کے مقابلے میں ہے جنہیں تم انجام دیا کرتے تھے) اور ان سے بھی کہتا ہے: انکم مجرمون "یہ تہدید اس بناء پر ہے کہ تم مجرم ہو"۔[1]

اور بہرحال یہ بیانات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہے کہ عذابِ الٰہی کا سرچشمہ انسان کا جرم و گناہ ہی ہے، جو بے ایمانی یا شہوتوں کے چنگل میں گرفتار ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس تہدید کی ایک مرتبہ پھر "وائے ہو اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔ کے جملہ سے تکمیل کرتا ہے۔

وہی لوگ جو دنیا کے زرق و برق اور اس کی لذتوں اور شہوتوں پر فریفتہ ہو گئے، اور انھوں نے عذابِ الٰہی کو اپنے لیے خرید لیا۔

بعد والی آیت میں ان کے انحراف، بدبختی اور آلودگی کے ایک اور عامل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ بارگاہِ خدا سے

---

[1] حقیقت میں اس آیت میں کچھ محذوف ہے، اور مجمع البیان کے قول کے مطابق تقدیر یوں اس طرح ہے: کلوا و تمتعوا قلیلا فان الموت کائن لامحالة، لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ تقدیر یوں ہو: کلوا و تمتعوا قلیلا وانتظروا العذاب فانکم مجرمون

ایسے سرمست ہیں، کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ پروردگار کے سامنے رکوع کرو، تو وہ رکوع نہیں کرتے" (و اذا قیل لھم ارکعوا لا یرکعون)۔

بہت سے مفسرین نے یہ کہا ہے کہ یہ آیت قبیلہ "ثقیف" کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جن سے پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ "تم نماز پڑھا کرو" اس پر انہوں نے یہ کہا تھا: ہم ہرگز کسی کے سامنے خم نہیں ہوں گے، اور یہ ہمارے لیے عیب ہے، تو پیغمبرؐ نے فرمایا:

لا خیر فی دین لیس فیہ رکوع و لا سجود

"وہ دین جس میں رکوع و سجود نہ ہو کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا"[1]

وہ نہ صرف رکوع اور سجدے کا انکار کرتے تھے، بلکہ یہ روح غرور و نخوت ان کے تمام افکار اور زندگی میں نمایاں تھی، نہ تو وہ خدا کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے، اور نہ ہی پیغمبرؐ کے احکام مانتے تھے۔ نہ لوگوں کے حقوق کا رسمی طور پر اقرار کرتے تھے، نہ خالق کے سامنے تواضع تھی۔ اور نہ ہی مخلوق کے سامنے فروتنی و انکسار، حقیقت میں یہ دونوں حال (غرور و شہوت پرستی) جرم و گناہ اور کفر و ظلم و طغیان کے اہم ترین عوامل میں سے ہیں۔

بعض نے یہ احتمال دیا ہے یہ ارکعوا (رکوع کرو) کا خطاب انہیں قیامت کے دن ہوگا، لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے خصوصاً قبل و بعد کی آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

اور اس کے بعد دسویں اور آخری بار اس سورہ میں فرماتا ہے: "وائے ہے اس دن تکذیب کرنے والوں کے لیے" (ویل یومئذ للمکذبین)۔

اور آخری زیر بحث آیت میں، جو سورۂ "مرسلات" کی آخری آیت ہے، ایک عتاب آمیز لب و لہجے کے ساتھ جو سرزنش سے پر ہے ایک تعجب آمیز استفہام کی صورت میں فرماتا ہے: "اگر وہ اس قرآن کے ساتھ، جس کی صداقت کے دلائل، اس کی تمام آیات سے نمایاں ہیں، اور اس کی حقانیت اس کی تمام تعبیروں میں منعکس ہے، ایمان نہیں لاتے، تو پھر اس کے بعد اور کس بات پر ایمان لائیں گے"؟ (فبای حدیث بعدہ یؤمنون)۔

جو شخص اس قرآن پر ایمان نہ لائے، جو اگر پہاڑوں پر نازل ہو جاتا، تو وہ لرزنے لگتے اور خشوع کرتے ہوئے پھٹ جاتے، تو وہ کسی آسمانی کتاب اور کسی عقلی دلیل کو تسلیم نہیں کرے گا اور یہ روح عناد اور ہٹ دھرمی کی نشانی ہے۔

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۱۰ ص ۴۱۹، اور اسی معنی کو "آلوسی" نے "روح المعانی" میں اور "قرطبی" نے اپنی تفسیر میں، اور "زمخشری" نے "کشاف" میں، اور "روح البیان" نے زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

ایک نکتہ

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے آغاز میں اشارہ کیا تھا کہ اس میں " ویل یومئذ للمکذبین " کے جملہ کا دس مرتبہ تکرار ہوا ہے اور یہ ایک اہم اور جا دینے والی واقعیت پر تاکید کے لیے ہے، اور فصحاء و بلغاء کے کلام میں اس کے مشابہ جملے کثرت سے ملتے ہیں، جن کے بعض حصوں کی، جن پر خاص عنایت اور تاکید مطلوب ہوتی ہے، شعر و نثر میں تکرار کرتے ہیں۔

لیکن بعض مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ ان دس آیات میں سے ہر ایک کسی نئے نکتہ کی طرف اشارہ ہے، جو اپنے سے قبل کے مطالب کی تکذیب سے مربوط ہے، اس بناء پر کوئی تکرار نہیں ہوئی ہے۔

ہم اس سورہ کو تفسیر " روح البیان " کے ایک جملہ کے ساتھ ختم کرتے ہیں، وہ کہتا ہے: یہ سورہ پیغمبر پر، " مسجد خیف " کے نزدیک ایک غار میں، سرزمین " منیٰ " میں نازل ہوا، اور میں نے خود اس غار کی زیارت کی ہے۔

خداوندا! ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم ہرگز تیری آیات کی تکذیب سے آلودہ نہ ہوں۔

پروردگارا! ہمیں غرور و نخوت اور ہوا و ہوس سے، جو جرائم کے اصلی سرچشمے ہیں، محفوظ رکھ!

بارِ الٰہا! جس دن پرہیزگاروں کی تیرے جوارِ قرب میں پورے احترام کے ساتھ پذیرائی ہو رہی ہوگی، ہمیں ان کی صف میں قرار دینا۔

آمین یا رب العالمین

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۰۷

۲۲ — ۹ — ۱۳۶۵

تفسیر نمونہ جلد ۲۵ کا اختتام

یہ سورہ مکی ہے اور اس کی چالیس آیتیں ہیں۔

تاریخ ابتداء

۱۲ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ

سورہ نبأ کے مضامین اور اس کا دائرہ کار

قرآن مجید کے آخری پارہ کی سورتوں کی اکثریت، اصولی طور پر مفسرین کے اتفاق رائے کے مطابق مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ ان سورتوں میں مسئلہ مبداء و معاد اور بشارت و انذار ہی کی گفتگو ہے اس لیے کہ مکی سورتوں کا یہی مزاج ہے۔ یہ آیتیں عام طور پر دل ہلا دینے والی ہیں اور پر سرکوبی کرنے والا لب و لہجہ رکھتی ہیں۔ ان کا انداز ایسا ہے جو خفتہ دلوں کو بیدار کر دے۔ ان تمام سورتوں کی آیتیں، سوائے چند مختصر موارد کے، اشاروں سے پُر ہیں۔ اسی وجہ سے ہر قلب آگاہ پر بڑا گہرا اثر ڈالتی ہیں حتیٰ کہ جو ناواقف ہیں انہیں بھی متاثر کرتی ہیں۔ یہ بے روح ڈھانچوں میں جان ڈالتی دیتی ہیں اور غیر متوجہ افراد کو عہد کے پورا کرنے کا اور ذمہ داری و جوابدہی کا احساس بخشتی ہیں۔ یہ اپنا ایک علیحدہ جہانِ معانی رکھتی ہیں۔ سورہ نبأ کے مزاج کی کیفیت بھی، یہی وجاہت کے اعتبار سے پورے پارے کی طرح ہے۔

یہ سورہ بیدار کرنے والے سوال سے شروع ہوتا ہے اور عبرتناک جملے پر ختم ہوتا ہے۔

اس سورہ کے مضامین کو چند حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

۱۔ سوال جو سورہ کی ابتداء میں ایک عظیم حادثہ (نبأ عظیم) یعنی روزِ قیامت کے بارے میں کیا گیا ہے۔

۲۔ اس کے بعد چند نمونے خدا کی قدرت کے مظاہر کے، آسمان و زمین کے اور انسانوں کی زندگی کے پیش کرتا ہے اور اس کے ساتھ اپنے لطف و کرم کو معاد و قیامت کے امکان کی دلیل کے عنوان سے بیان کرتا ہے۔

۳۔ تیسرے حصہ میں قیامت کے آغاز کی کچھ نشانیاں بتاتا ہے۔
۴۔ اس حصہ میں سرکشی کرنے والوں پر نازل ہونے والے عذاب کا ایک رُخ پیش کرتا ہے۔
۵۔ اس حصہ میں جنت کی تشویق دلانے والی نعمتوں کی تشریح کرتا ہے۔
۶۔ آخر میں عذاب قریب کے سلسلہ میں شدید خوف پر اور کافروں کی المناک سرنوشت کے ذکر پر سورہ ختم ہوتا ہے۔

اس سورہ کا نام رکھنے کی وجہ وہ تعبیر ہے جو اس کی دوسری آیت میں آئی ہے بعض اوقات اسے "سورۂ عم" کا نام بھی دیا جاتا ہے اور یہ اس کی پہلی آیت کی مناسبت سے ہے۔

سورۂ نبأ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر اسلام کی ایک حدیث ہے (من قرأ سورة عم يتساءلون سقاه الله برد الشراب يوم القيامة) "جو شخص سورۂ عم یتساءلون پڑھے اسے خداوند عالم قیامت میں جنت کے ٹھنڈے اور خوشگوار مشروب سے سیراب کرے گا[1] ایک اور حدیث حضرت امام جعفر صادق کی ہے (من قرأ عمّ يتساءلون لم يخرج سنته اذا كان يد منها فى كل يوم حتى يزور البيت الحرام) "جو شخص روزانہ سورہ عمّ یتساءلون کی تلاوت کرتا رہے اس کا ایک سال مکمل نہیں ہوگا کہ وہ خانۂ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہوگا[2] ایک اور حدیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ (من قرأها وحفظها كان حسابه يوم القيامة بمقدار صلوة واحد) "جو شخص اسے پڑھے اور یاد کرے تو قیامت میں اس کا حساب اتنی جلدی مکمل ہوگا جتنی دیر میں ایک نماز پڑھی جاتی ہے[3]

---

[1] و [3] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۲۰۔

[2] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۱۹۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ ۝

(۲) عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ ۝

(۳) الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ۝

(۴) كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝

(۵) ثُمَّ كَلَّا سَيَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

اُس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

۱۔ وہ ایک دوسرے سے کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

۲۔ عظیم اور اہم خبر (قیامت) کے بارے میں:

۳۔ وہی خبر جس کے بارے میں وہ ہمیشہ اختلاف رکھتے ہیں۔

۴۔ ایسا نہیں ہے جیسا وہ سوچتے ہیں۔ انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

۵۔ پھر بھی ویسا نہیں ہے جو وہ خیال کرتے ہیں انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

تفسیر

اہم خبر

سورہ کی پہلی آیت میں تعجب آمیز استفہام کے عنوان سے فرماتا ہے: "وہ ایک دوسرے سے کس چیز کے متعلق سوال کرتے ہیں": (عم یتساءلون)[1] اس کے بعد بغیر اس کے کہ جواب کا انتظار کرتا خود اس کے جواب میں مزید فرماتا ہے: "وہ ایک عظیم اور اہم خبر کے بارے میں سوال کرتے ہیں" (عن النبأ العظیم)۔

---

[1] مفردات راغب، مادہ نبأ۔

"وہی خبر جس میں ہمیشہ اختلاف رکھتے ہیں" (الذی ھم فیہ مختلفون)۔ اس خبر عظیم سے مراد کیا ہے مفسرین نے اس سوال کے کئی جواب دیتے ہیں۔ ایک گروہ نے اسے قیامت کے دن کی طرف، بعض نے قرآن مجید کے نزول کی طرف اور بعض نے توحید سے لے کر قیامت تک کے تمام اصول دین کی طرف اشارہ سمجھا ہے اور چند روایات میں اس کی تفسیر مسئلہ امامت و ولایت کے ساتھ ہوئی ہے جس کی طرف آئندہ نکات کی بحث میں اشارہ ہوگا۔ اس سورہ کی تمام آیات میں غور و فکر کرنے سے اور ان تعبیروں کو پیش نظر رکھنے سے جو بعد والی آیات میں آئی ہیں مثلاً (ان یوم الفصل کان میقاتا) کا جملہ جو زمین و آسمان میں خدا کی قدرت کی نشانیوں کے ذکر کے بعد آیا ہے، اور اس حقیقت کی طرف توجہ کہ مشرکین کی شدید ترین مخالفت مسئلہ معاد میں تھی، یہ سب امور پہلی تفسیر یعنی معاد و قیامت کی تائید کرتے ہیں۔ "نبأ" بقول راغب مفردات میں اس خبر کے معنی میں ہے جو اہمیت رکھتی ہو اور فائدہ کی حامل ہو اور انسان اس کی نسبت علم یا ظن غالب رکھے۔ یہ تینوں باتیں نبأ کے معنی کی شرائط ہیں۔[1]

اس بنا پر عظیم کا لفظ بہت زیادہ تاکید کا اظہار کرتا ہے اور بحیثیت مجموعی اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ یہ خبر جس میں ایک گروہ شک کرتا تھا ایک جانی پہچانی اہم اور باعظمت حقیقت تھی اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے اس سے مراد قیامت تھی۔ (یتساءلون) "ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں" کا جملہ ہو سکتا ہے کہ صرف کفار ہی کی طرف اشارہ ہو کہ وہ ہمیشہ قیامت کے بارے میں ایک دوسرے سے سوال کرتے تھے۔ لیکن یہ سوال تحقیق اور ادراک کی غرض سے نہیں ہوتا تھا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد مومنین سے سوال کرنا ہو یا خود پیغمبر سے سوال کرنا ہو۔[2] یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر "نباء عظیم" سے مراد قیامت ہے تو اس سے تو بظاہر سب کافر انکار کرتے تھے، تو پھر یہ کیوں فرماتا ہے کہ وہ اس میں اختلاف کرتے ہیں تو جواب میں ہم کہتے ہیں کہ معاد کا انکار مطلق طور پر قطعی و یقینی نہیں ہے اس لیے کہ کافروں میں سے بہت سے فنائے جسم کے بعد روح کی بقاء کے قائل تھے دوسرے لفظوں میں معاد روحانی کو اجمالاً تسلیم کرتے تھے۔ جہاں تک معاد جسمانی کا تعلق ہے تو بعض اس میں شک کا اظہار کرتے تھے۔ اس بات کو آیات قرآنی کا لب و لہجہ واضح کرتا ہے (نمل / ۶۶) کافروں میں سے بعض افراد شدت سے انکار کرتے تھے یہاں تک کہ پیغمبر اسلامؐ کو معاد جسمانی کا دعویٰ کرنے کی بنا پر معاذ اللہ دیوانہ یا خدا سے جھوٹ منسوب

---

[1] مفردات راغب، مادۂ نباء۔

[2] توجہ کرنی چاہیئے کہ باب تفاعل اگرچہ عام طور پر ایسے کام کے معنی میں آتا ہے جو بصورت متقابل انجام پائے لیکن بعض موارد میں ثلاثی مجرد کے معنی رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے معانی بھی رکھتا ہے (بعض اہل لغت نے تفاعل کے پانچ معانی بیان کیے ہیں۔ ۱۔ کسی کام کے انجام دینے میں دو یا دو سے زیادہ افراد کی مشارکت۔ ۲۔ مطاوعت مثلاً تباعد۔ ۳۔ واقعیت کے بغیر کسی چیز کا اظہار مثلاً تمارض (اپنے آپ کو مریض ظاہر کرنا)۔ ۴۔ کسی چیز کا بتدریج وقوع مثلاً تواردر۔ ۵۔ ثلاثی مجرد کے معنی میں مثلاً "تعالیٰ" جو "علا" "بلند ہوا" کے معنی میں ہے۔

کرنے والا سمجھتے تھے۔ "اور عنقریب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ (کلا سیعلمون)۔ پھر بھی ایسا نہیں ہے جیسا وہ گمان کرتے ہیں اور عنقریب وہ آگاہ ہو جائیں گے؛ (ثم کلا سیعلمون) اس دن باخبر ہوں گے جس دن ان کی واحسرتا کی فریاد بلند ہو گی، وہ اپنی کوتاہی اور کمی سے سخت پشیمان ہوں گے۔ (ان تقول نفس یا حسرتیٰ علیٰ ما فرطت فی جنب اللّٰہ) (زمر/۵۶)۔ وہ دن جس میں عذاب کی لہریں ان کو چاروں طرف سے گھیر لیں گی اور وہ دنیا کی طرف واپس لوٹنے کا تقاضا کریں گے۔ (ھل الیٰ مرد من سبیل) کیا واپس لوٹنے کی کوئی راہ ہے؟ (شوریٰ/۴۴) یہاں تک کہ موت کے وقت جب انسان کی آنکھوں سے پردے اٹھ جائیں گے اور دوسری دنیا کے حقائق اس کے سامنے ظاہر ہوں گے اور اُسے برزخ و معاد کا یقین ہو جائے گا تو اس وقت اُس کی فریاد بلند ہو گی کہ مجھے واپس لوٹاؤ تاکہ میں عمل صالح انجام دوں (رب ارجعون لعلی اعمل صالحاً فیما ترکت) (مؤمنون/۹۹-۱۰۰) سیعلمون کی تعبیر (اس لیے کہ عام طور پر مستقبل قریب کے لیے آتی ہے) اس طرف اشارہ ہے کہ قیامت کا مرحلہ نزدیک ہے اور دنیا کی ساری زندگی اس کے مقابلہ میں ایک لمحے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

یہ کہ اوپر کی دو آیتیں، جو بصورت تکرار آئی ہیں، ان سے ایک واقعیت کی (ان کی مستقبل قریب میں قیامت کے بارے میں آگاہی) تاکید مراد ہے یا دو الگ مطالب کا بیان ہے (پہلا اشارہ اس طرف ہے کہ مستقبل قریب میں دنیاوی عذاب کو دیکھیں گے اور دوسرا اشارہ اس طرف ہے کہ اس کے بعد آخرت کے عذاب کو دیکھیں گے) اس سلسلہ میں مفسرین نے دو احتمال پیش کیے ہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ یہ احتمال بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے علم و دانش کی ترقی کے ساتھ ساتھ قیامت کے وجود کے دلائل و شواہد اس قدر زیادہ ہو جائیں گے کہ اس کا انکار کرنے والے بھی اقرار کیے بغیر نہ رہ سکیں گے لیکن اس تفسیر میں مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی آگاہی نوعِ بشر کے آئندہ کے لوگوں کے لیے ہو گی نہ کہ اس گروہ کے لیے جو زمانۂ پیغمبر میں موجود تھا اور قیامت کے معاملہ میں اختلاف رکھتا تھا جبکہ آیت اُسی گروہ کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے۔

چند نکات

مسئلہ ولایت اور نبأ عظیم

جیسا کہ ہم نے کہا ہے، نبأ عظیم کی کئی تفسیریں ہوئی ہیں۔ قیامت، قرآن اور تمام اصولِ عقائدِ دینی جن

لہ علمائے ادب عربی اور مفسرین کے درمیان مشہور یہ ہے کہ "کلا" حرف ردع ہے اور اس کے معنی گزشتہ مطالب کی نفی یا نہی ہوتا ہے لیکن بعض نے کہا ہے کہ نادر طور پر دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے جن میں سے انہوں نے تین معانی کا نام لیا ہے۔ تاکید اور الا استفتاحیہ اور حرف جواب جو نعم کی منزلت رکھتا ہو۔ ان میں سے بعض نے ہر ایک کو منتخب کیا ہے۔ مجمع البحرین اور دوسری کتب۔

ہیں مبداء و معاد عام طور پر شامل ہیں لیکن اس سورہ کے مجموعۂ آیات میں جو قرائن موجود ہیں وہ یہی بتلاتے ہیں کہ نباء عظیم کی تفسیر معاد سے کرنا سب سے بہتر ہے۔

بہت سی اہل بیت سے اور بعض اہل سنت کے طرق سے نقل شدہ روایات میں " نبأ عظیم " (بہت بڑی خبر) کی تفسیر امیر المومنین حضرت علیؑ کی ولایت و امامت سے ہوئی ہے جس سے ایک جماعت کو اختلاف ہے۔ اس کی تفسیر ولایت عمومی سے بھی ہوئی ہے۔ یہ روایات بعض اوقات خود حضرت علیؑ سے اور بعض اوقات دوسرے آئمہ سے منقول ہیں۔ ہم یہاں تین روایتیں بطور نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اوّل: وہ روایت ہے جسے حافظ محمد بن مومن شیرازی نے نقل کیا ہے جو علمائے اہل سنت میں سے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے " عم یتساءلون عن النبأ العظیم " کی تفسیر کے سلسلے میں فرمایا کہ اس سے مراد علیؑ کی ولایت ہے۔ اس کے بارے میں قبر میں سوال ہوگا اور کوئی شخص مشرق و مغرب میں اور بحر و بر میں نہیں مرتا مگر یہ کہ فرشتے اس سے موت کے بعد امیر المومنینؑ کی ولایت کے بارے میں سوال کرتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں تیرا دین کیا ہے؟ تیرا پیغمبر کون ہے؟ اور تیرا امام کون ہے؟[1]

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ جنگ صفین کے دوران لشکر شام میں سے ایک شخص جو بدن پر ہتھیار لگائے ہوئے تھا اور اس کے گلے میں قرآن حمائل تھا میدان میں وارد ہوا وہ سورہ عم یتساءلون عن النبأ العظیم کی تلاوت کر رہا تھا۔ حضرت علیؑ خود میدان میں آئے اور اس سے فرمایا: (اتعرف النبأ العظیم الذی ھم فیہ مختلفون) کیا تو اس نبأ عظیم کو جانتا ہے جس میں وہ اختلاف رکھتے ہیں؟ وہ کیا ہے؟ اس شخص نے جواب میں کہا کہ میں نہیں جانتا۔ تو آپ نے فرمایا: (انا واللہ النبأ العظیم الذی فیہ اختلفتم و علی ولایتہ تنازعتم و عن ولایتی رجعتم بعد ما قبلتم .... و یوم القیامۃ تعلمون ما علمتم) "میں ہوں وہ نبأ عظیم جس کے بارے میں تم اختلاف رکھتے ہو اور اس کی ولایت کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو۔ تم میری ولایت سے پھر گئے ہو بعد اس کے کہ تم نے اسے قبول کر لیا تھا اور قیامت میں دوبارہ اس چیز کو جسے اس سلسلہ میں جان چکے ہو جان لوگے"۔[2]

۳۔ ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: (النبأ العظیم الولایۃ) نبأ عظیم سے مراد ولایت ہے[3]

ان روایتوں کے مضامین میں اور آیت کی تفسیر کے بارے میں ہم نے قیامت کا جو ذکر کیا ہے ان دونوں

---

[1] رسالہ " الاعتقاد " ابوبکر محمد بن مومن شیرازی (طبق نقل احقاق الحق جلد ۳ ص ۴۸۴)۔

[2] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۲۰ حدیث ۹۔

[3] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۱۹ حدیث ۳۔

کا اجتماع دو صورتوں میں ممکن ہے۔ایک تو یہ کہ نبا عظیم کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ان سب مفاہیم پر حاوی ہے اگرچہ ان آیتوں کے نزول کے وقت قرآن مجید سب سے زیادہ اس جملہ کے بیان کرنے کے سلسلہ میں مسئلہ معاد کی طرف واضح اشارے کر رہا تھا لیکن یہ اس میں مانع نہیں ہے کہ اس آیت کے اور بھی مصداق ہوں۔دوسرے یہ کہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اور بارہا ہم نے کہا بھی ہے۔ قرآن کے مختلف باطن ہیں یعنی اس بات کا امکان ہے کہ آیت کے کئی معانی ہوں جن میں سے ایک معنی ظاہر ہوں اور دوسرے بطون قرآن سے تعلق رکھتے ہوں، جن سے مختلف قرائن کے ذریعہ استفادہ کیا جا سکتا ہو۔

باالفاظ دیگر یہ ایک قسم کی التزامی دلالت ہے جو ہر فرد پر واضح نہیں ہوتی۔صرف یہی آیت نہیں جو ظاہر و باطن کی حامل ہے بلکہ قرآن مجید میں ایسی بہت آیتیں ہیں جن کے بارے میں روایات میں مختلف تفاسیر تجویز ہوتی ہیں جن میں سے بعض ظاہر کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور بعض باطن قرآن کی ترجمان ہیں۔

لیکن اس نکتہ پر زور دینے کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی یاد دلاتے ہیں اور ذہن نشین کراتے ہیں کہ واضح قرائن کے بغیر یا ایسی تفاسیر کے بغیر جو پیغمبر اکرمؐ یا ائمہ معصومین سے منقول نہ ہوں بطون قرآن کا سمجھنا جائز نہیں ہے اور وہ قرآن کے بطون اس لیے نہیں ہیں کہ معاد پرست اور منحرف قسم کے افراد آیات قرآنی کی جس طرح چاہیں تاویل و تفسیر کریں۔

۲۔معاد و قیامت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے

ہم کہہ چکے ہیں کہ اہم ترین مسئلہ جس پر قرآن کے تیسویں پارہ کی بیشتر آیات میں، باتفاق مفسرین زور دیا گیا ہے وہ مسئلہ معاد و قیامت ہے اور مذکورہ سب آیتیں مکی ہیں۔ان آیتوں میں قیامت کے دن سے متعلق انسان کے حالات کی تشریح و تفصیل ہے۔

یہ اس بنا پر ہے کہ یہ انسان کی اصلاح کے سلسلہ کا پہلا قدم ہے تاکہ اسے معلوم ہو کہ حساب کا سامنا کرنا ہے، ایسی عدالت میں پیش ہونا ہے جس کے حاکم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔یہ ایک ایسی صورت ہے جس میں نہ ظلم و جور کی کوئی گنجائش ہے نہ وہاں خطا و اشتباہ کا کوئی امکان ہے، نہ اس میں سفارش و رشوت کام آسکتی ہے نہ جھوٹ بولنے سے کام چل سکتا ہے اور نہ انکار کرنے کی گنجائش ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ وہاں عذاب و سزا کے چنگل سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے صرف ایک ہی راستہ ہے کہ یہاں دنیا میں رہتے ہوئے گناہ کو ترک کر دیا جائے تو اس قسم کے محکمے اور عدالت کے وجود پر ایمان رکھنا انسان کے دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور سوئی ہوئی روحوں کو بیدار کرتا ہے۔

تقویٰ کی روح، عہد کی پاسداری، جوابدہی اور ذمہ داری کا احساس انسان میں پیدا کرتا ہے اور اسے فرض شناسی کے عرفان کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

جس ماحول میں فساد ہو اور وہاں تخریبی عناصر رخنہ اندازی کریں، اصولی طور پر دو اسباب میں سے ایک اس کا سبب ضرور ہوتا ہے۔ ایک تو نگرانی و نگہبانی کی قوت کی کمزوری دوسرے نظام عدالت کا ضعف۔ اگر تیز نگاہ رکھنے والے نگران انسانوں کے اعمال پر نظر رکھیں اور عدالتیں گہری نظر کے ساتھ جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کی سزا پر عملدرآمد کریں اور کوئی مجرم سزا سے نہ بچے تو اس قسم کے ماحول میں یقیناً فساد، گناہ، تجاوز عن الحدود، ظلم اور سرکشی کا تقریباً خاتمہ ہو جائے گا۔

چنانچہ جہاں مادی زندگی نگہبانوں اور عدالتوں کے اس طرح زیر سایہ ہو وہاں معنوی زندگی جو انسان کے لیے ہو اس کا معاملہ واضح ہے۔ لہٰذا ایسے مبداء پر ایمان رکھنا جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہو (لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ) "ایک ذرہ کی مقدار کا بوجھ بھی اس کے علم سے مخفی نہیں ہے" (سبا / ۳)۔

اور قیامت کے وجود پر ایمان جو (فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ ○ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرًّا یرہ ○) (زلزال / ۷ - ۸)۔ "اچھے اور بُرے کام کا ایک ذرہ بھی فراموشی کے سپرد نہیں ہوگا" اور وہاں اس کے سامنے موجود ہوگا، انسان میں ایسا تقویٰ پیدا کرتا ہے جو زندگی بھر راہِ خیر میں اس کا راہنما ہو سکتا ہے۔

۶ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ

۷ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا ۙ

۸ وَّخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا ۙ

۹ وَّجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا ۙ

۱۰ وَّجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا ۙ

۱۱ وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۙ

۱۲ وَّبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا ۙ

۱۳ وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا ۙ

۱۴ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ۙ

۱۵ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ۙ

۱۶ وَّجَنّٰتٍ اَلْفَافًا ۗ

ترجمہ

۶ کیا ہم نے زمین کو (تمہارے) آرام وسکون کی جگہ قرار نہیں دیا۔

۷ اور پہاڑوں کو زمین کی میخیں (نہیں بنایا)۔

۸ اور تمہیں زوج زوج کی شکل میں پیدا (نہیں کیا)۔

۹ اور تمہاری نیند کو ہم نے تمہارے سکون کا باعث قرار دیا۔

۱۰ اور رات کو (تمہارے لیے) لباس (بنایا)۔

(۱۱) اور دن کو معاش کا ذریعہ (قرار دیا)۔

(۱۲) اور تم پر ہم نے سات مستحکم آسمان بنائے۔

(۱۳) اور روشن اور حرارت بخش چراغ ہم نے پیدا کیا۔

(۱۴) اور برسنے والے بادلوں سے بہت زیادہ پانی ہم نے نازل کیا۔

(۱۵) تاکہ اس کے ذریعہ ہم بہت سی فصلیں اور نباتات اگائیں۔

(۱۶) اور درختوں سے پُر باغات۔

تفسیر

یہ آیتیں حقیقت میں منکرین معاد اور نباء عظیم میں اختلاف کرنے والوں کے سوالوں کا جواب ہیں، اس لیے کہ ان آیات میں اس عالم ہستی کے حکیمانہ نظام اور حساب شدہ نعمتوں کا ایک ایسا گوشہ بیان ہوا ہے جو انسانوں کی زندگی پر بہت ہی اثر انداز ہے جو ایک طرف تو ہر چیز پر، علی الخصوص مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے پر قدرت خدا کی واضح دلیل ہے، دوسری طرف اس سمت اشارہ ہے کہ یہ حکیمانہ نظام فضول اور عبث نہیں۔

حالانکہ اگر دنیا کی اس مادی زندگی کے ختم ہونے کے ساتھ ہی تمام معاملات ختم ہو جاتے تو یقیناً یہ منصوبہ عبث اور فضول ہوتا۔ اس طرح یہ آیات دو جہتوں سے مسئلہ معاد کے لیے استدلال فراہم کرتی ہیں "برہان قدرت" کے ذریعہ بھی اور "برہان حکمت" کے طریق سے بھی۔

ان گیارہ آیتوں میں بارہ اہم نعمتوں کی طرف لطف و محبت سے لبریز استدلال اور کرم و مہربانی کی تشویق سے ہم آغوش تعبیروں کے ساتھ اشارہ ہوا ہے۔ اور وہ اس لیے کہ اگر عقلی دلائل کے ساتھ روحانی مسرت کا سامان نہ ہو تو پھر استدلال عقلی کی تاثیر کم ہو جاتی ہے۔

ابتدا زمین سے کی ہے فرماتا ہے: "کیا ہم نے زمین کو گہوارہ اور تمہارے لیے سکون کی جگہ قرار نہیں دیا ہے"؟ (الم نجعل الارض مهادا)۔

"مهاد" جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا ہے، صاف ستھری اور مرتب جگہ کے معنی میں ہے اور اصل میں مهد سے لیا گیا ہے۔ یہ اس جگہ کے معنوں میں ہے جو بچے کے آرام کے لیے تیار کی گئی ہو۔ (وہ خواہ بستر ہو یا گہوارہ)۔

ارباب لغت اور مفسرین کی ایک جماعت نے اس کی تفسیر فرش یعنی بستر سے کی ہے جو صاف و نرم بھی

ہو اور آرام دہ بھی۔ زمین کے لیے اس تعبیر کا انتخاب بہت ہی پُر معنی ہے اس لیے کہ ایک تو زمین کے بہت سے حصے اس طرح نرم و صاف اور مرتب ہیں کہ انسان ان پر اچھی طرح سے گھر بنا سکتا ہے، زراعت کر سکتا ہے اور باغ لگا سکتا ہے۔ دوسرے اس کی تمام ضرورتیں سطح زمین پر یا زمین کی گہرائیوں میں مواد اولیہ اور قیمتی معدنیات کی شکل میں موجود ہیں۔ تیسرے یہ کہ انسان کے زائد مواد کو زمین اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ مُردوں کے جسم اس کے اندر دفن کرنے سے بہت جلد ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں اور اس طرح انواع و اقسام کے جراثیم ان پوشیدہ اثرات کے ماتحت ختم ہو جاتے ہیں جو دست قدرت نے زمین کو ودیعت کیے ہیں۔

چوتھے یہ کہ زمین سورج کے گرد نیز خود اپنے گرد نرم اور تیز قسم کی گردش کرتی ہے جس سے رات اور دن بنتے ہیں اور وہ چار فصلیں حاصل ہوتی ہیں جو انسانی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ پانچویں بات یہ کہ یہ پانی کے بہت زیادہ حصہ کو جو اس کی سطح پر برستا ہے، اپنے اندر ذخیرہ کر لیتی ہے اور چشموں اور ندی نالوں کی شکل میں باہر بھیجتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اس آرام دہ بستر میں اس زمین کی اولاد کے لیے آسائش کے تمام وسائل موجود ہیں۔ اس نعمت کی اہمیت اس وقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب معمولی سا زلزلہ اور الٹ پلٹ کر دینے والا تزلزل اس میں پیدا ہوتا ہے۔ اور چونکہ ممکن ہے کہ سطح زمینوں کی نرمی کے مقابلہ میں پہاڑوں کی اہمیت اور انسانی زندگی میں ان کے اثرات فراموش ہو جائیں اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

"کیا ہم نے پہاڑوں کو زمین کی میخیں قرار نہیں دیا" (والجبال اوتاداً)۔ پہاڑ اس کے علاوہ کہ بہت عظیم اور بڑی بڑی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں رکھتے ہیں اور وہاں یہ ایک دوسرے سے پیوست ہیں اور یہ زمین کی کھال کو زرہ کی طرح اندرونی طور پر پگھلنے والے مواد کے دباؤ سے اور چاند سے پیدا ہونے والے مدوجزر کے جاذبہ کی تاثیر سے محفوظ رکھتے ہیں اور شدید اور زبردست طوفانوں کے مقابلہ میں دیوار ثابت ہوتے ہیں اور اس طرح انسان کی آسائش کے گہوارے کی ایک قابلِ اطمینان پناہ گاہ تیار کرتے ہیں۔

حقیقتاً اگر یہ نہ ہوتے تو انسانی زندگی ہمیشہ طوفانوں کی سر پٹکنے والی ضربوں کے زیر اثر بے سکون ہو کر رہ جاتی۔ مزید یہ کہ یہ پانی اور قیمتی معدنیات کا مرکز ہیں۔ ان سب باتوں کے علاوہ کرۂ زمین کے اطراف میں ہوا کا ایک عظیم خطہ موجود ہے جس میں پہاڑ، سائیکل کے دندانے دار چکر کی شکل میں پنجے گاڑے ہوئے ہیں اور زمین کے ہمراہ حرکت کرتے ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر سطح زمین صاف ہوتی تو ہوا کا طبقہ زمین کی حرکت کے وقت اس کے اوپر ہلتا رہتا اور بڑے بڑے طوفان پیدا کرتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ دائمی ٹکراؤ زمین کو زیادہ گرم جلن پیدا کرنے والی اور ناقابل سکونت بنا دیتا۔

آفاقی نعمتوں کے دو نمونے بیان کرنے کے بعد وجود انسان کی اندرونی اور انفسی آیات کو موضوع گفتگو

بناتے ہوئے فرماتا ہے : "ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا" (و خلقناکم ازواجاً)[1]

"ازواج" "زوج" کی جمع ہے جو مذکر و مؤنث کی جنس کے معنوں میں ہے۔ انسان کی خلقت ان دو صنفوں سے، علاوہ اس کے کہ اُس کی نسل کی بقاء کی ضامن ہے، اُس کے جسم و جان کے سکون کا سبب بھی ہے، جیسا کہ سورہ روم کی آیت ۲۱ میں ہم پڑھتے ہیں :

(ومن اٰیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ و رحمۃ) "(عظمت) خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری نوع میں سے تمہاری ازواج کو پیدا کیا ہے تاکہ ان کے ذریعہ تمہیں سکون نصیب ہو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت قرار دی ہے"

دوسرے لفظوں میں مذکر و مؤنث کی نوع میں سے ہر ایک دوسرے کے وجود کی تکمیل کرتی ہے اور اپنے مقابل کے نقائص کو ختم کرتی ہے۔ اور چونکہ ازواج کا لفظ لغت میں اصناف و انواع کے معانی میں بھی آیا ہے اس لیے کچھ افراد نے اس آیت کو انسانوں کی مختلف اصناف کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ اور رنگ و نسل و جذبات و استعداد کا جو فرق انسانوں کے درمیان ہے وہ حق تعالیٰ کی عظمت کی دلیل اور انسانی معاشرے کے تکامل و ارتقاء کا سبب ہے۔

اس کے بعد نیند جو انسان کے لیے خدا کی ایک عظیم نعمت ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے : "ہم نے تمہاری نیند کو تمہارے لیے آرام و سکون کا باعث قرار دیا ہے" (وجعلنا نومکم سباتاً)۔

"سبات" "سبت" (بروزن وقت) کے مادہ سے اصل میں کاٹنے کے معنی میں ہے اس کے علاوہ آرام کی خاطر کام چھوڑنے کے معنی میں بھی آیا ہے اور یہ جو عربی زبان میں ہفتہ کا دن "یوم السبت" کے نام سے موسوم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نام یہودیوں سے متاثر ہونے کے نتیجے میں ہوا اس لیے کہ وہ ہفتہ کے دن کو چھٹی کا دن سمجھتے ہیں۔

سبات کی تعبیر ایک لطیف اشارہ ہے اور یہ اشارہ نیند کی حالت میں انسان کی قابل توجہ جسمانی اور روحانی فعالیتوں کے کئی حصّوں کے معطل ہونے کی طرف ہے اور یہی وقتی تعطیل تھکے ماندے اعضاء و جوارح کے آرام، روح و جسم کی تقویت، نشاطِ انسانی کی تجدید اور ہر قسم کی تھکن اور بے آرامی کے دور ہونے کا سبب ہے اور بالآخر تجدید فعالیت کے لیے آمادگی کا باعث ہے۔

باوجودیکہ انسانی زندگی کے ایک تہائی حصّے کو نیند گھیرے ہوئے ہے اور یہ صورت حال ہمیشہ انسان کو

---

[1] (و خلقناکم ازواجاً) کا جملہ اور اس طرح اس سے مشابہ جملے جو بعد والی آیتوں میں آئے ہیں مستقل اور مثبت جملوں کی شکل میں ہیں اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال تجویز کیا ہے کہ منفی شکل میں ہیں اور "الم نجعل" جو گزشتہ آیت میں تھا اس کے مفہوم پر عطف ہیں، بعید نظر آتا ہے اور وہ تقدیر و حذف کا محتاج ہے۔

پیش آتی ہے لیکن نیند کے اسرار ابھی تک اچھی طرح نہیں کھلے حتیٰ کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ وہ کونسا عامل ہے جو اس چیز کا سبب بنتا ہے کہ ایک معین وقت میں دماغ کی فعالیتوں کا ایک حصّہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اس کے بعد آنکھوں کی پلکیں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں اور تمام اعضائے بدن سکون سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

یہ حقیقت ابھی تک صحیح طریقہ سے واضح نہیں ہوئی۔ لیکن یہ چیز بالکل واضح ہے کہ نیند انسان کی صحت و سلامتی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اسی بناء پر نفسیات و روح کے معالج اس کوشش میں لگے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بیماروں کی نیند کو عام اور عادی شکل میں لے آئیں اس لیے کہ اس کے بغیر نفسیاتی اعتدال ممکن ہی نہیں ہے۔

وہ افراد جو طبعی اور فطری شکل میں نہیں سو سکتے وہ پژمردہ، غصیل، افسردہ، غمگین اور پریشان قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس جو افراد معتدل نیند کا لطف اٹھاتے ہیں جب وہ بیدار ہوتے ہیں تو حد سے زیادہ خوشی اور قوت اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔ ایک آرام بخش نیند کے بعد جو مطالعہ کیا جاتا ہے وہ بہت جلد اثر کرتا ہے اور فکری و جسمانی کام اس قسم کی نیند کے بعد ہمیشہ بہت ہی خوشگوار محسوس ہوتے ہیں اور یہ سب چیزیں نیند کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔

کسی انسان کے لیے بے چین کر دینے والی بے خوابی سے بڑھ کر کوئی شے تکلیف دہ نہیں، یہ اسے مجبور محض بنا کر رکھ دیتی ہے، اور تجربہ بتاتا ہے کہ بے خوابی کے مقابلہ میں انسان کی قوت برداشت بہت ہی کم ہوتی ہے۔ ایسا انسان بہت کم عرصہ میں شدید امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔

اب تک نیند کی اہمیت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے مراد وہ نیند ہے جو اعتدال کی حالت میں ہو ورنہ زیادہ سونا اتنا ہی بُرا ہے جتنا زیادہ خوراک کھانا۔ یہ دونوں چیزیں مختلف امراض کی پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ فطری اور طبعی نیند کی مقدار تمام انسانوں میں یکساں نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی معین حد مقرر نہیں کی جا سکتی لہٰذا یہ ہر شخص کا اپنا فرض ہے کہ وہ اپنی جسمانی اور روحانی فعالیتوں کو جانچ تول کر یہ فیصلہ کرے کہ اس کے لیے کتنی نیند مفید ہے۔

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ سخت قسم کے حادثات رونما ہونے کے وقت، جس وقت انسان لاچار محض ہوتا ہے وہ بہت دیر تک بیدار رہتا ہے۔ بے خوابی کے مقابلہ میں انسان کی قوت برداشت وقتی طور پر بہت بڑھ جاتی ہے۔ نیند کا احساس بالکل ختم ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو بہت حد تک نیند کم ہو جاتی ہے۔ ایک یا دو گھنٹے کی نیند رہ جاتی ہے۔ لیکن بہت دفعہ دیکھا گیا ہے کہ اس کمی کا حالات کے معمول پر پہنچنے کے بعد فقدان ہو جاتا ہے اور انسان کے جسم و روح نیند کی مطلوبہ مقدار کو چاہنے لگتے ہیں۔

البتہ ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جو کئی مہینے مسلسل جاگتے رہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی نیند ان کی آنکھوں میں نہ آئے۔ اس کے برعکس کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو کوچہ و بازار میں چلتے پھرتے، بلکہ اس وقت جس وقت وہ آپ سے باتیں کر رہے ہوں، انہیں نیند آجاتی ہے۔ وہ اگر تنہا ہوں تو معاملہ خطرناک ہوتا ہے۔ اس قسم کے افراد یقیناً صحت مند نہیں ہوتے اور وہ بالآخر جسمانی و روحانی امراض کا شکار ہو جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ وہ چیز جسے نیند کہتے ہیں ایک بہت ہی عجیب قسم کی تبدیلی ہوتی ہے جو انسان میں نمودار ہوتی ہے اور یہ بہت زیادہ عجائبات کی حامل ہوتی ہے اور انسان کی زندگی میں ایک قسم کے معجزہ کی حیثیت رکھتی ہے۔[1]

اگرچہ مندرجہ بالا آیت نیند کو خدا کی عطا کی ہوئی ایک نعمت قرار دیتی ہے لیکن چونکہ نیند موت سے مشابہت رکھتی ہے اور بیداری قیامت اور مُردوں کے قبروں سے اُٹھنے سے مشابہ ہے لہٰذا اس طرف بھی اشارہ ممکن نظر آتا ہے۔ اس کے بعد نیند ہی کے حوالے سے رات کی بات نکل آئی ہے جو بجائے خود اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ پروردگارِ عالم فرماتا ہے:

"ہم نے رات کو لباس قرار دیا ہے" (وجعلنا اللیل لباسًا)۔ پھر بلا فاصلہ مزید فرماتا ہے: "اور دن کو زندگی کے لیے ہم نے وسیلہ قرار دیا ہے" (وجعلنا النھار معاشًا)[2]

ثنویین (دو خداؤں کے ماننے والے) اسرار خلقت سے بے خبر ہونے کی وجہ سے خیال کرتے ہیں کہ نور اور دن کی روشنی نعمت ہے اور رات اور اس کی تاریکی شر ہے اور عذاب ہے۔ وہ ہر ایک کے لیے الگ الگ خدا کے قائل ہیں۔ ایک کو یزداں کہتے ہیں اور دوسرے کو اہرمن کے نام سے پکارتے ہیں۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے۔ دن، رات دونوں اپنی جگہ نعمت پروردگار ہیں اور بہت سی دوسری نعمتوں کے لیے سرچشمے کا کام دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت کے مطابق پردۂ شب زمین کی پوشش اور لباس کا کام دیتا ہے اور تمام زندہ موجودات جو

---

[1] نیند کے عجائبات کے سلسلہ میں ہم ایک دوسری بحث جلد ۱۶ صفحہ ۳۱۳ سے آگے سورہ روم کی آیت ۲۳ کے ذیل میں درج کر چکے ہیں۔ اسی طرح ان مناظر کے سلسلہ میں جو انسان خواب میں دیکھتا ہے اور اس کی عجیب و غریب چیزوں کے متعلق تفصیلی بحث جلد ۹ صفحہ ۳۱۱ تا ۳۱۸ (سورہ یوسف کی آیت ۴ کے ذیل میں) ہم بیان کر چکے ہیں۔

[2] "معاش" ہو سکتا ہے کہ اسم زمان یا اسم مکان زندگی کے زمانہ یا مکان کے معنی میں ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر میمی ہو اور اس صورت میں اس میں محذوف ہو اور تقدیر عبارت میں "سببًا لمعاشکم" ہو اور ضمنی طور پر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاش "عیش" مادہ سے زندگی کے معنی میں ہو۔ اس کا فرق حیات سے یہ ہے کہ حیات کا اطلاق خدا اور فرشتوں پر بھی ہوتا ہے لیکن "عیش" کا اطلاق انسان اور حیوان کی زندگی سے مخصوص ہے۔

زمین پر زندگی بسر کرتے ہیں وہ زندگی کی تھکا دینے والی مصروفیتوں کو مجبوراً معطل کر دیتے ہیں اور انہیں چھوڑ دیتے ہیں اور تاریکی جو سکون و آرام اور استراحت کا سبب ہے، ہر چیز پر تسلط اختیار کر لیتی ہے تاکہ تھکے ماندے جسم تروتازہ ہو جائیں اور خستہ و کوبیدہ انسان دوبارہ نشاط روح کو حاصل کرے اس لیے کہ سکون و آرام کی نیند تاریکی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

قطع نظر ان سب باتوں سے پردۂ شب کے حائل ہو جانے سے سورج کی روشنی ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ اگر مسلسل پڑتی رہے تو تمام نباتات وجمادات کو جلا کر رکھ دے اور کام کے قابل نہ رہے۔ اس بناء پر قرآن مجید نے بارہا اس مسئلہ پر گفتگو کی ہے۔ پروردگار عالم ایک مقام پر فرماتا ہے:

(قل ارءیتم ان جعل الله علیکم النهار سرمدًا الی یوم القیامة من اله غیر الله یأتیکم بلیل تسکنون فیه) "کہ دے مجھے بتاؤ کہ اگر خدا دن کو قیامت تک جاری رکھے تو خدا کے علاوہ کون ہے جو رات کو تمہارے لیے لے آئے گا تاکہ تم اس میں سکون و اطمینان حاصل کرو" (قصص/۷۲)۔

اس کے بعد فرماتا ہے: (ومن رحمته جعل لکم اللیل والنهار لتسکنوا فیه ولتبتغوا من فضله) "یہ اس کی رحمت میں سے ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن قرار دیئے تاکہ اس میں تم سکون و اطمینان حاصل کرو اور اس میں فضل خدا سے فائدہ اٹھانے کے لیے سعی و کوشش کرو" (قصص/۷۳)۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے اہم موضوعات کی ایک دفعہ قسم کھائی گئی ہے جبکہ رات کی سات مرتبہ قسم کھائی گئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قسم اہم امور کی کھائی جاتی ہے اور یہ بجائے خود پردۂ ظلمت شب کی اہمیت کی دلیل ہے۔ وہ لوگ جو رات کو مصنوعی روشنی سے منور کرتے ہیں اور ساری رات جاگتے رہتے ہیں اور اس کی بجائے دن کو سوتے ہیں، وہ رنجیدہ، غیر صحت مند اور محروم مسرت رہتے ہیں۔

دیہات جہاں شہر کے برعکس رات کو جلدی سو جاتے ہیں اور صبح کو جلدی اٹھتے ہیں وہاں زندگی زیادہ صحت و سلامتی کے ساتھ بسر ہوتی ہے۔ رات کے کچھ اپنے اور ضمنی منافع بھی ہیں۔ اس کے آخری لمحات بارگاہ خدا میں راز و نیاز، عبادت، تعمیر ذات اور تربیت نفوس کے لیے بہترین ہوتے ہیں، جیسا کہ قرآن مجید پرہیزگاروں کی تعریف میں کہتا ہے: (وبالاسحار هم یستغفرون) "وہ اوقات سحر میں استغفار کرتے ہیں" (ذاریات/۱۸)[1]

دن کی روشنی بھی بجائے خود ایک نعمت ہے۔ یہ انسان میں جوش و حرکت پیدا کرتی ہے اور اسے کام اور تلاش معاش کی تحریک دیتی ہے اور نباتات کو اپنی روشنی کے سائے میں اگاتی ہے اور حیوانات کو اپنے

---

[1] رات اور دن کے اسرار اور نور و ظلمت کے نظام کے بارے میں جلد ۹ صفحہ ۱۴۳ کے بعد سے (سورہ قصص کی آیت ۷۱ تا ۷۲، کے ذیل میں) اور جلد ۸ صفحہ ۴۰۸ تا ۴۱۰ (سورہ فرقان کی آیت ۴۷ کے ذیل میں) اور جلد ۱۲ صفحہ ۲۰ (سورہ ذاریات کی آیت ۱۸ کے ذیل میں) ہم نے اور بحثیں بھی کی ہیں۔

زیر سایہ منزلِ رشد تک پہنچاتی ہے، انہیں نشوو نما بخشتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تعبیر جس میں فرماتا ہے:

"ہم نے دن کو تمہاری معاش اور زندگی کا وسیلہ و ذریعہ قرار دیا ہے" ہر لحاظ سے عمدہ اور پُر معنی تعبیر ہے جو کسی شرح و توصیف کی محتاج نہیں ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ دن اور رات کی آمد و رفت اور ان کے نظام دقیق کے تدریجی تغیرات عمل تخلیق کی ایک آیت اور خدا کی ایک نشانی ہیں۔ اس کے علاوہ انسانوں کی زندگی کی زمانی نظام بندی کے لیے ایک طبعی اور فطری تقویم کے پیدا ہونے کا سرچشمہ شمار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد زمین سے آسمان کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہم نے تمہارے سر کے اوپر سات مستحکم آسمان بنائے ہیں" (و بنینا فوقکم سبعا شدادا) یہاں سات کا عدد ہو سکتا ہے کہ عدد تکثیر ہو اور آسمان کے متعدد کُرّوں، کہکشاؤں اور نظام ہائے شمسی کے مجموعہ کی طرف اشارہ ہو جو مستحکم خلقت اور عظیم و قوی تعبیر کے حامل ہیں۔ یا یہ عدد "تعداد" ہو، اس طرح کہ جتنے ستارے ہم دیکھتے ہیں — سورہ صافات کی آیت ۶ کے حکم کے مطابق (انا زینا السماء الدنیا بزینة الکواکب) "ہم نے نچلے آسمان کو ستاروں سے زینت بخشی"، پہلے آسمان سے متعلق ہوں اور ان کے علاوہ چھ دوسرے عوالم اور آسمان وجود رکھتے ہوں جو علم بشر کی دسترس سے خارج ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد زمین کے اطراف میں ہَوا کے متعدد طبقات ہوں جو ظاہری طور پر رقیق ہونے کے باوجود اس طرح مستحکم ہیں کہ اس کرہ خاکی کو آسمانی پتھروں کے مسلسل حملوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور جس وقت بھی ان میں سے کوئی کُرہ زمین میں جذب ہوتا ہے خلۂ ہَوا سے شدید تصادم کی بناء پر اس طرح گرم ہو جاتا ہے کہ اس میں آگ لگ جاتی ہے اور وہ جل کر خاک ہو جاتا ہے اور اس کی خاکستر نرم و ملائم ہو کر زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔ اگر یہ خلۂ ہَوا نہ ہوتا تو ہمارے شہر اور آبادیاں شب و روز ان پتھروں کے گرنے کی زد پر ہوتیں۔

بعض ماہرین نے حساب لگایا ہے کہ اطراف زمین میں پائے جانے والے خلۂ ہَوا کی استقامت جو ایک سو کلو میٹر کی ضخامت سے زیادہ ہے، ایک پولاد کی چھت کی دس میٹر کی ضخامت کے برابر ہے اور "سبع شداد" کی یہ ایک تفسیر ہے۔[1]

آسمانوں کی خلقت کی طرف ایک اجمالی اشارہ کرنے کے بعد آفتاب عالمتاب جیسی عظیم نعمت کی طرف رُخ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ہم نے نورانی اور حرارت بخش چراغ پیدا کیا ہے" (وجعلنا سراجا وهاجا)[2]

"وھاج" "وھج" (بروزن کرج) کے مادہ سے اس نور و حرارت کے معنی میں ہے جو آگ

۱۔ سات آسمانوں اور ان کی تفسیر کے سلسلہ میں (سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ کے ذیل میں) ہم تفصیل بحث کر چکے ہیں۔

۲۔ "جعلنا" یہاں خلقنا کے معنی میں ہے اس نے ایک مفعول لیا ہے۔

سے برآمد ہوتے ہیں[1]

اس بنا پر اس پُرفروغ چراغِ آسمانی کی اس صفت کا ذکر دو عظیم نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو اس جہان کی عام مادی نعمتوں کا سرچشمہ ہیں یعنی "نور و حرارت"۔ سورج کی روشنی نہ صرف یہ کہ انسان کی زندگی کے تمام نظامِ شمسی کے صحن کو روشن کرتی ہے بلکہ زندہ موجودات کی پرورش میں بڑا گہرا دخل رکھتی ہے۔ سورج کی حرارت علاوہ اس کے کہ انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی میں براہِ راست اثر انداز ہوتی ہے، بادلوں کے بننے، ہواؤں کے چلنے، بارشوں کے برسنے اور خشک زمینوں کی آبیاری کا اصل منبع و سرچشمہ ہے۔

سورج مخصوص شعاعوں کی وجہ سے (آبی اور سرخ شعاؤں کے علاوہ) جراثیم کشی میں بہت زیادہ کارآمد ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کرۂ ارض ایک بڑے ہسپتال میں تبدیل ہو جاتا اور یہ ممکن تھا کہ مختصر سی مدت میں تمام زندہ موجودات کی نسل مردہ ہو جاتی۔ سورج صحیح و سالم صفت اور واقعی مناسب فاصلے سے نہ زیادہ گرم اور جلانے والی نہ سرد اور بے روح روشنی ہم سب کو عطا کرتا ہے۔

اگر سورج سے نکلنے والی قوت کی قیمت کا قوت کے دوسرے منابع کی قیمت کے ساتھ ہم حساب لگائیں تو وہ بہت بڑے عدد کو تشکیل دے۔ اگر فرض کریں کہ ہم ایک سیب کے درخت کی مصنوعی روشنی اور قوت کو پرورش کریں تو سیب کے ہر دانہ کی قیمت ہم کو پریشان کرکے رکھ دے۔ جی ہاں! یہ عالمِ ہستی کا "سراج وہاج" تمام قوت ہم سب کو مفت عطا کرتا ہے[2]

ماہرین کے اندازے کے مطابق سورج کا دائرہ کرۂ زمین سے تقریباً ایک ملین اور تین لاکھ گنا بڑا ہے اور اس کا فاصلہ تقریباً ایک سو پچاس ملین کلو میٹر ہے اور سطحِ خورشید کی بیرونی حرارت قریب قریب بیس ملین درجہ ہے۔ یہ سب کچھ اس قدر جچا تلا حساب شدہ ہے کہ اگر تھوڑا سا کم یا زیادہ ہو جاتا تو اہلِ زمین کے لیے عرصہ حیات

---

[1] مفرداتِ راغب، مادہ "وہج"۔ لسان العرب۔ اس لفظ کے معنی میں کہتی ہے "دور کے فاصلہ سے سورج اور آگ کی حرارت"

[2] کتاب "دنیائے سیارگان" تالیف "انتری دایت" میں اس نور و حرارت کا حساب لگایا گیا ہے جو سورج اہلِ زمین کو دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر فرض کریں اس نور و حرارت کے بدلے جو ہم سورج سے مفت لیتے ہیں بجلی کی عام قیمت کے مطابق پیسہ خرچ کریں تو روئے زمین کے لوگوں کو چاہیئے کہ وہ ہر گھنٹہ ایک ارب اور سات سو ملین ڈالر ادا کریں۔ اور ایک سال میں یہ رقم لرزہ براندام کرکے رکھ دے گی۔ وہ یہ بتاتا ہے کہ کتنی عظیم دولت اس وسیلہ سے ہمیں مفت مل رہی ہے۔ "از جہا نہائے دور" کے مصنف کے بقول اگر زمین کے لوگ اس روشنی کو جو سورج سے لیتے ہیں بلبوں سے حاصل کریں جو اسی جگہ نصیب ہوں جہاں سورج ہے تو ہر ایک شخص کے بدلے سو شمع والے پانچ ملین ارب بلب روشن ہونے چاہئیں۔

تنگ ہو جاتا اور زندگی کا امکان ختم ہو جاتا۔ اس کی تفصیل مختصراً بیان میں نہیں آسکتی۔ نور و حرارت کی نعمت کے بعد ایک اور حیاتی مادہ جو سورج کے چمکنے سے تعلق رکھتا ہے اس کی بات درمیان میں لاتا ہے اور مزید فرماتا ہے:

"اور ہم نے بارش برسانے والے بادلوں سے بہت سا پانی نازل فرمایا"۔ (و انزلنا من المعصرات ماء ثجاجا)۔

"معصرات" "معصر" کی جمع ہے یہ عصر کے مادہ سے ہے اس کے معنی دبانے اور نچوڑنے کے ہیں، جن سے بارش برسانے والے بادلوں کی طرف اشارہ ہے، گویا وہ اپنے آپ کو دباتے اور نچوڑتے ہیں تاکہ پانی ان کے اندر سے باہر نکلے[1]۔

توجہ فرمائیں کہ (معصرات اسم فاعل ہے یعنی نچوڑنے اور دبانے والے) بعض مفسرین نے اس کی تفسیر برسنے کے لیے آمادہ بادلوں سے کی ہے اس لیے کہ اسم فاعل کبھی کبھی کسی چیز کے لیے آمادگی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ کچھ نے یہ بھی کہا ہے کہ معصرات بادلوں کی صفت نہیں ہے بلکہ یہ ہواؤں کی صفت ہے جو بادلوں پر ہر طرف سے دباؤ ڈالتی ہیں اور بارش برسانے کے لیے انہیں دباتی ہیں۔

اور "ثجاج" "ثج" (بروزن حج) کے مادہ سے پانی کے مسلسل اور فراوانی کے ساتھ نیچے گرنے کے معنی میں ہے اور یہ بات پیش نظر رکھتے ہوئے کہ "ثجاج" مبالغہ کا صیغہ ہے یہ کثرت پر دلالت کرتا ہے۔ اب مجموعی اعتبار سے آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے بارش برسانے والے بادلوں سے بہت زیادہ اور مسلسل طور پر پانی نازل کیا۔

اوّل تو بارش کا ہونا بجائے خود خیر و برکت کا باعث ہوتا ہے۔ یہ ہوا کو لطیف کرتا ہے، آلودگیوں کو دھو ڈالتا ہے وکثافتوں کو ختم کر دیتا ہے، ہوا کی گرمی میں کمی پیدا کرتا ہے، یہاں تک کہ سردی کو معتدل بنا دیتا ہے۔ اس سے بیماری کے عوامل میں کمی ہو جاتی ہے اور انسان کو روح نشاط حاصل ہوتی ہے، لیکن ان سب چیزوں کے باوجود اس سے اگلی آیت میں، اس کے تین اہم فوائد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"بارش کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ ہم غذائی فصلوں اور سبزہ کو اس کے ذریعہ زمین سے باہر نکالیں۔ (لنخرج بہ حبا و نباتا)۔ "اور درختوں سے پُر باغات" (و جنات الفافا)۔

"الفاف" راغب نے مفردات میں کہا ہے کہ اس سے باغوں کے ان درختوں کی طرف اشارہ ہے

---

[1] بعض ماہرین کے بقول بادلوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی وجہ سے ان پر ایک ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دباتے اور نچوڑتے ہیں جس کے نتیجے میں بارش ہوتی ہے۔ یہ تعبیر حقیقت میں قرآن مجید کے علمی معجزات میں شمار ہوتی ہے۔

(کتاب باد و باراں ص ۱۲۹ سے رجوع کیا جائے)۔

جو بہت زیادہ ہوں اور ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہوں [1]

درحقیقت ان دو آیتوں میں اس تمام مواد غذا کی طرف اشارہ ہے جس سے انسان اور حیوان فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ مواد زمین سے اُگتا ہے۔ اس مواد غذائی کے اہم حصّہ کو غذائی دانے تشکیل دیتے ہیں (حبًّا)

دوسرا حصّہ سبزیوں اور جڑی بوٹیوں کا ہے۔ (و نباتًا) ایک اور حصہ میووں اور پھلوں کا ہے" (وجنات)

یہ ٹھیک ہے کہ ان دو آیتوں میں بارش کے نزول کے صرف یہی تین عظیم منابع بیان ہوئے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ بارش کے فوائد یہی نہیں ہیں۔ بدنِ انسانی کے سو میں سے ستر حصوں کو اصل طور پر پانی ہی تشکیل دیتا ہے اور تمام زندہ موجودات کی پیدائش کا سرچشمہ قرآن کے مطابق صریحی طور پر پانی ہے۔ (وجعلنا من الماء کل شیء حی) (انبیاء/۳۰)۔

اس بناء پر پانی کا زندہ موجودات، بالخصوص انسانوں پر اصلی و بنیادی اثر ہے۔ نہ صرف انسانی جان بلکہ زیادہ تر کارخانے بھی پانی کے بغیر مفلوج ہو کر رہ جاتے ہیں اور صنعتی کارخانوں کا نظام بھی معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ انسانی چہرہ کی زیبائی اور خوبصورتی اور اس کی مسرت پانی ہی سے تعلق رکھتی ہے اور دنیا کے بہت سے تجارتی اور اقتصادی طریقوں کو پانی کے راستے ہی تشکیل دیتے ہیں۔

ایک نکتہ

ان آیات کا مسئلہ معاد سے تعلق

مندرجہ بالا گیارہ آیتوں میں اہم ترین نعمات الٰہی اور انسانی زندگی کے بنیادی ارکان یعنی نور و حرارت، پانی، مٹی اور گیاہ و نباتات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اس دقیق نظام کا بیان، ایک تو پروردگار کی قدرت کو واضح کرتا ہے جس کے بعد اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ کوئی یہ کہے کہ خدا مُردوں کو دوبارہ کس طرح زندہ کرے گا جیسا کہ منکرین معاد کے جواب میں سورہ یٰسین کی آخری آیتوں میں کمال وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے جہاں پروردگار عالم فرماتا ہے:

"کیا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اس امر پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسوں کو پیدا

---

[1] "الفاف" بہت سے ارباب لغت وتفسیر کے بقول "لفیف" کی جمع ہے جو ایک دوسرے سے الجھے ہونے کے معنی میں ہے بعض نے اسے "لُف" (لام کے پیش کے ساتھ) کی جمع سمجھا ہے اور بعض نے "لِف" (لام کے زیر کے ساتھ) کی جمع خیال کیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ ان جملوں میں سے ہے جن کا مفرد نہیں ہے۔ مشہور وہی اوّل ہے۔

کرے ۔ (یٰسین / ۸۱) ۔

دوسرے ان عظیم تشکیلات کا یقیناً کوئی مقصد ہے اور یہ مقصد دنیا کی چند روزہ زندگی نہیں ہو سکتا جس میں صرف کھانے پینے، سونے اور جاگنے پر اکتفا ہو ۔ بلکہ حکمت خداوندی کا یہ تقاضا ہے کہ اس کا کوئی بلند مقصد ہے بالفاظ دیگر نشاۃ اولیٰ نشاۃ آخری کے لیے یاد دہانی ہے اور یہ بشر کی طولانی سیرگاہ کے لیے منزل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ جیسا کہ سورہ مومنون کی آیت ۱۱۵ میں فرماتا ہے :

(افحسبتم انما خلقناکم عبثاً و انکم الینا لا ترجعون) "کیا تم نے گمان کیا ہے کہ ہم نے تمہیں فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے ؟"

تیسرے نیند اور بیداری کا مسئلہ جو خود موت اور نئی زندگی کا ایک نمونہ ہے اور مردہ زمینوں کا بارش کے نزول کے نتیجے میں زندہ ہونا جو منظرِ معاد کو ہر سال انسانوں کی آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے قیامت اور موت کے بعد کی زندگی کی طرف پُرمعنی اشارہ ہے جیسا کہ سورہ فاطر کی آیت ۹ میں بارش کی وجہ سے مُردہ زمینوں کی تجدید حیات کے بیان کے بعد فرماتا ہے :

(کذالک النشور) قیامت میں قبروں سے اٹھنا بھی اسی طرح ہے ۔

(۱۷) إِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ كَانَ مِيقَاتًا ۝

(۱۸) يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا ۝

(۱۹) وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝

(۲۰) وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝

ترجمہ

(۱۷) جدائی کا دن سب کی میعاد ہے۔

(۱۸) وہ دن جس میں صور پھونکا جائے گا اور تم فوج فوج ہو کر میدان محشر میں وارد ہو گے۔

(۱۹) اور آسمان کھول دیا جائے گا اور وہ متعدد دروازوں کی صورت میں ہو جائے گا۔

(۲۰) اور پہاڑ چلنے لگیں گے اور سراب کی شکل میں ہو جائیں گے۔

تفسیر

آخر کار روزِ موعود آکر رہے گا

گزشتہ آیتوں میں معاد کے مختلف دلائل آئے تھے۔ پہلی زیر بحث آیت میں ایک نتیجہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "جدائی کا دن سب کے وعدہ کا دن ہے" (ان یوم الفصل کان میقاتا)[1]

"یوم الفصل" کی تعبیر بہت ہی پُر معنی ہے جو اس عظیم دن میں ہونے والی جدائیوں کو بیان کرتی ہے

---

[1] عام طور پر "کان" جو فعل ماضی ہے اس کی تعبیر اس دن کے بارے میں جو آئندہ تحقق پذیر ہوگا اس دن کے قطعی اور یقینی ہونے کے بیان کے لیے ہے۔

حق کی باطل سے علیحدگی، نیک مومنین کی بدکار مجرموں سے علیحدگی، ماں باپ کی اولاد سے جدائی اور بھائی کی بھائی سے جدائی۔

"میقات" وقت کے مادہ سے "میعاد" اور "وعدہ" کی طرح متعین و مقرر وقت کے معنی میں ہے۔ اور یہ جو ان معین مقامات کو "میقات" کہا جاتا ہے جہاں سے خانہ کعبہ کے زائرین احرام باندھتے ہیں اس وجہ سے ہے کہ وہ معین وقت میں وہاں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد اس عظیم دن کی بعض خصوصیات اور حوادث کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے:

"وہی دن جس میں صور پھونکا جائے گا اور تم فوج در فوج میدان محشر میں وارد ہوگے"۔ (یوم ینفخ فی الصور فتأتون افواجًا)۔ آیات قرآنی سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ نفخ صور کے عنوان سے دو عظیم حادثے برپا ہوں گے، جن میں سے پہلے حادثہ سے عالم ہستی کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا اور دوسرے حادثہ کے نتیجہ میں عالم دوبارہ وجود میں آجائے گا اور مردے نئی زندگی کی طرف لوٹ آئیں گے اور بڑی قیامت برپا ہوگی۔

"نفخ" کے معنی ہیں پھونکنا اور "صور" کے معنی ہیں بگل، نفیری اور سائرن، جو عام طور پر لشکر کو ٹھہرانے یا روانہ کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے اور اہل قافلہ اور لشکر والے اس کی صدا سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کو توقف کرنا چاہیئے یا روانہ ہو جانا چاہیئے۔ یہ تعبیر ان دو حادثوں کا ایک لطیف کنایہ ہے، جو مندرجہ بالا آیت میں بیان ہوتے ہیں، اور دوسرے "نفخ" صور کی طرف اشارہ ہے جو حیات تازہ کا سبب ہے اور صور قیامت ہے۔ (نفخ صور اور اس سے متعلق نکات کے بارے میں ہم تفصیل کے ساتھ جلد ۱۱ سورہ زمر کی آیت ۶۸ کے ذیل میں صفحہ ۱۵۶ تا ۱۶۴ پر بحث کر چکے ہیں)۔

زیر بحث آیت کہتی ہے "تم فوج در فوج میدان محشر میں وارد ہوگے"۔ جبکہ سورہ مریم کی آیت ۹۵ کہتی ہے: "ہر شخص اس دن تنہا ہوگا"۔ (وکلھم اٰتیہ یوم القیامۃ فردًا) اور سورۂ اسراء کی آیت ۷۱ کہتی ہے: "عرصہ محشر میں ہر گروہ اپنے امام کے ہمراہ وارد ہوگا"۔ (یوم ندعوا کل اناس بامامھم)

ان آیات کے مفہوم اس طرح جمع ہو سکتے ہیں کہ لوگوں کا فوج فوج ہونا اس سے تضاد نہیں رکھتا کہ ہر فوج اپنے امام کے ساتھ محشر میں وارد ہوگی۔ باقی رہا اکیلا ہونا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کے کئی مواقف ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے موقف میں لوگ گروہ در گروہ ہدایت و ضلالت کے رہبروں کے ساتھ محشر میں وارد ہوں لیکن خدا کے محکمۂ عدالت میں آجانے کے بعد فرد فرد ہوں۔

سورہ ق کی آیت ۲۱ میں قرآن کی تعبیر کے مطابق ہر شخص ایک مامور اور ایک گواہ کے ساتھ وہاں حاضر ہوگا۔ (وجاءت کل نفس معھا سائق وشھید) یہ احتمال بھی ہے کہ اکیلے ہونے سے مراد دوستوں ساتھیوں اور یار و انصار سے جدا ہونا ہے، اس لیے وہاں انسان خود ہوگا یا اس کا عمل۔ اس کے بعد

مزید کہتا ہے :

"آسمان کھول دیا جائے گا اور وہ متعدد دروازوں کی شکل میں ہو جائے گا" (و فتحت السماء فکانت ابوابا) ۔ ان دروازوں سے کیا مراد ہے اور ان کے کھلنے کا کیا مفہوم ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ عالم غیب کے دروازے عالم شہود میں کھل جائیں گے، پردے ہٹ جائیں گے اور فرشتوں کا جہان دنیائے انسانیت میں اپنا راستہ نکال لے گا۔[1]

یہاں ایک جماعت نے اس آیت کو ایک ایسی چیز کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو دوسری آیت میں آئی ہے جس کے بارے میں فرماتا ہے : "جب آسمان پھٹ جائے گا" (اذا السماء انشقت) (انشقاق/۱) دوسری جگہ اس معنی کو ایک دوسری تعبیر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ (اذا السماء انفطرت) (انفطار/۱) درحقیقت آسمانی کروں میں اتنے شگاف پڑ جائیں گے، گویا وہ سب دروازوں کی طرح ہوں گے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ انسان دنیا میں موجودہ حالات میں آسمانوں کی طرف جانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اگر اس کے لیے ممکن ہو بھی تو وہ بہت محدود حد تک ہے۔ گویا موجودہ حالات نے اس پر آسمان کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں لیکن قیامت میں انسان کرۂ خاکی سے آزاد ہو جائے گا، اور آسمانوں کی طرف سفر کرنے کے دروازے اس کے سامنے کھل جائیں گے اور اس چیز کے اسباب و حالات فراہم ہو جائیں گے۔

دوسرے لفظوں میں پہلے تو آسمان ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں گے اور اس کے بعد سورہ ابراہیم کی آیت ۴۸ کے مطابق نئے آسمان اور نئی زمین ان کی جگہ لے لے گی (یوم تبدل الارض غیر الارض والسماوات) اور اس صورت میں اہل زمین کے لیے آسمانوں کے دروازے کھل جائیں گے اور آسمانوں کے راستے زمین والوں پر ظاہر ہو جائیں گے۔

جنت والے جنت کی طرف چلے جائیں گے اور بہشت کے دروازے ان کے سامنے کھلے ہوں گے۔ (حتی اذا جاءوھا و فتحت ابوابھا و قال لھم خزنتھا سلام علیکم) "یہاں تک کہ جنت والے جنت کی طرف آئیں گے اور اس کے دروازے کھلے پائیں گے اور جنت کے خازن ان سے کہیں گے کہ تم پر سلام ہو" (زمر/۷۳)۔ اور یہی وہ مقام ہے کہ فرشتے دروازے سے ان کے پاس آئیں گے اور ان کی خدمت میں تبریک پیش کریں گے (و الملائکۃ یدخلون علیھم من کل باب) (رعد/۲۳)۔

"اور کافروں کے سامنے دوزخ کے دروازے کھل جائیں گے" (و سیق الذین کفروا الی جھنم زمرا حتی اذا جاءوھا فتحت ابوابھا) (زمر/۷۱)۔ اور اس طرح انسان ایک ایسے میدان میں قدم رکھے گا جس کی وسعت موجودہ زمین و آسمان جتنی ہو گی۔ (و جنۃ عرضھا السماوات والارض) (آل عمران/۱۳۳)۔

---

[1] المیزان، جلد ۲۰ صفحہ ۲۶۵ ۔

آخر میں زیر بحث آیت میں قیامت میں پہاڑوں کی کیفیت کو واضح کرتے ہوئے فرماتا ہے "پہاڑوں کو چلایا جائے گا اور وہ آخرکار سراب ہو جائیں گے" (وسیرت الجبال فکانت سرابا)۔

قرآن کی مختلف آیتوں کے اجتماع سے قیامت میں پہاڑوں کی سرنوشت کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ پہاڑ کئی مرحلے طے کریں گے۔ "پہلے تو پہاڑ حرکت میں آ جائیں گے" (چلنے لگیں گے)۔ (وتسیر الجبال سیرا) (طور/۱۰)۔ "پھر وہ اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے" (وحملت الارض والجبال فدکتا دکۃ واحدۃ) (حاقہ/۱۴)۔ "اور اس کے بعد ایک دوسرے پر پڑے ہوئے ریت کے تودوں کی طرح ہو جائیں گے" (وکانت الجبال کثیبا مہیلا) (مزمل/۱۴)۔ "اس کے بعد دھنکی ہوئی اُون کی شکل کے ہو جائیں گے جو تیز ہوا کے ساتھ اُڑ رہی ہو" (وتکون الجبال کالعھن المنفوش) (قارعہ/۵)۔ "پھر اس گرد و غبار کی طرح ہو جائیں گے جو فضا میں بکھر جاتا ہے" (وبست الجبال بسا فکانت ھباء منبثا) (واقعہ/۵-۶)۔

آخر میں جیسا کہ زیر بحث آیت میں آیا ہے صرف ان کے اثرات باقی رہ جائیں گے اور وہ دور سے سراب نظر آئیں گے اور اس طرح پہاڑ زمین پر سے ختم ہو جائیں گے اور زمین ہموار ہو جائے گی۔ (ویسئلونک عن الجبال فقل ینسفھا ربی نسفا فیذرھا قاعا صفصفا)۔ "تجھ سے پہاڑوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دے کہ میرا پروردگار انہیں تباہ و برباد کر دے گا اور زمین کو صاف ہموار کر دے گا" (طٰہٰ/ ۱۰۵-۱۰۶)۔

"سراب" "سرب" (بروزن طرف) کے مادہ سے ڈھلان کی طرف چلنے کے معنی میں ہے اور چونکہ بیابانوں میں گرمی کے دنوں میں جس وقت انسان ڈھلان کی طرف چلے تو دور سے اسے ایک چمک سی نظر آتی ہے۔ وہ گمان کرتا ہے کہ یہ پانی ہے حالانکہ سوائے روشنی (نور کے ذرات) کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی اس کے بعد ہر اس چیز کو، جس کا ظاہر ہو لیکن اس کی کوئی حقیقت نہ ہو، سراب کہا جاتا ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا آیت اس حرکت کی ابتداء و انتہا کو بیان کرتی ہے۔ دوسرے مرحلے دوسری آیتوں میں آتے ہیں۔

حقیقت میں پہاڑ غبار کی شکل میں فضا میں سراب کی شکل میں ہو جائیں گے۔ وہ مقام جہاں پہاڑ اس قسم کی سختی کے ہوتے ہوئے ایسی صورت اختیار کر لیں گے تو ظاہر ہے کہ عالم میں اس کے سامنے کس قسم کے تغیرات رونما ہوں گے۔ لہٰذا وہ افراد اور قومیں جو اس دنیا میں پہاڑ جیسا مضبوط جسم رکھتی تھیں ان کی سراب سے زیادہ حیثیت نہیں ہوگی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حوادث نفخ اولیٰ میں صورت پذیر ہوں گے جو اس عالم کے اختتام سے تعلق رکھتے ہیں یا نفخ ثانیہ میں جس سے قیامت کی ابتداء ہے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت (یوم ینفخ فی الصور فتأتون افواجا) بتا رہی ہے کہ یہ حوادث نفخ ثانیہ سے تعلق رکھتے ہیں جس میں زندہ

ہو جانے والے انسان فوج در فوج عرصۂ محشر میں وارد ہوں گے لہٰذا اس امر آیت کو بھی قاعدتاً اسی نفخ سے متعلق ہونا چاہیئے. البتہ ممکن ہے کہ پہاڑوں کی اس حرکت کا آغاز پہلے نفخ میں صورت پذیر ہو اور ان کا سراب میں تبدیل ہونا دوسرے نفخ میں ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے تمام مرحلے نفخ اول سے تعلق رکھتے ہوں البتہ چونکہ ان دونوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہے لہٰذا ان کا ذکر ایک ساتھ ہوا ہے جیسا کہ قرآن کی کچھ اور آیات میں بھی نفخ اول وثانیہ کے حوادث کا ذکر ایک جگہ ہوا ہے (اس کا نمونہ سورہ تکویر و انفطار) میں نظر آتا ہے۔ (غور کیجئے)۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں پہاڑوں کا میخوں کے عنوان سے اور زمین کا گہوارے کے عنوان سے تعارف ہوا ہے اور زیر بحث آیات میں آیا ہے کہ وہ دن جس میں عالم کے فنا ہونے کا فرمان صادر ہوگا تو یہ گہوارہ درہم برہم ہو جائے گا اور یہ عظیم میخیں اپنی جگہ سے اکھڑ جائیں گی۔ واضح ہے کہ جس وقت کسی چیز کی میخوں کو کھینچا جائے تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے۔

(۲۱) اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۙ

(۲۲) لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ۙ

(۲۳) لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ۚ

(۲۴) لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ۙ

(۲۵) اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ۙ

(۲۶) جَزَآءً وِّفَاقًا ۭ

(۲۷) اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۙ

(۲۸) وَّكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ۭ

(۲۹) وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ كِتٰبًا ۙ

(۳۰) فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا ۧ

ترجمہ

(۲۱) جہنم ایک بہت بڑی کمین گاہ ہے۔

(۲۲) اور سرکشی کرنے والوں کے لیے بازگشت کی جگہ۔

(۲۳) وہ اس میں طویل مدت تک رہیں گے۔

(۲۴) وہاں نہ کوئی ٹھنڈی چیز چکھیں گے اور نہ کوئی خوشگوار مشروب۔

(۲۵) سوائے جلتے ہوئے پانی، پیپ اور لہو کے۔

(۲۶) یہ سزا ان کے اعمال کے موافق و مطابق ہے۔

(۲۷) اس لیے کہ انہیں حساب کی اُمید نہیں تھی۔

(۲۸) اور انہوں نے ہماری آیتوں کی مکمل طور پر تکذیب کی۔

(۲۹) اور ہم نے ہر چیز کا احصا کیا ہے اور اسے ثبت کیا ہے۔

(۳۰) پس چکھو، عذاب کے علاوہ ہم تم پر کسی اور چیز کا اضافہ نہیں کریں گے۔

تفسیر

جہنم ایک عظیم کمین گاہ۔

معاد کے متعلق دلائل اور قیامت کے بعض حوادث کو بیان کرنے کے بعد قرآن دوزخیوں اور جنتیوں کی سرنوشت کی طرف رُخ کرتا ہے۔ بات پہلے دوزخیوں سے شروع ہوتی ہے۔ فرماتا ہے، "جہنم کمین گاہ ہے" (ان جھنم کانت مرصادا)۔ "اور سرکشوں کی بازگشت کا مقام ہے" (للطاغین مآبا)[1] "وہ اس میں طویل مدت تک رہیں گے" (لابثین فیھا احقابا)۔

"مرصاد" اسم مکان ہے یہ اس جگہ کے معنی میں ہے جہاں کمین گاہ بناتے ہیں۔ "راغب" "مفردات" میں کہتا ہے "مرصد" (بروزن مرقد) اور "مرصاد" دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے اس فرق کے ساتھ کہ "مرصاد" اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو کمین گاہ کے لیے مخصوص ہو۔ بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس شخص کے معنی میں ہے جو کمین گاہ سے زیادہ کام لیتا ہو، معمار کی طرح جو اس شخص کے معنی میں ہے جو بہت زیادہ تعمیر کا کام کرتا ہو۔ البتہ پہلے معنی زیادہ معروف ہیں اور مناسب بھی ہیں۔

اب یہ کہ دوزخ میں کون شخص دوزخیوں کی تاک میں ہے، بعض علماء نے کہا ہے کہ، اس سے مراد عذاب کے فرشتے ہیں اس لیے کہ سورہ مریم کی آیت ۷۱ کے مطابق تمام انسان، عام اس سے کہ نیک ہوں یا بد، دوزخ کے قریب سے گزریں گے یا اس کے اوپر سے عبور کریں گے (وان منکم الا واردھا کان علی ربک حتما مقضیا) اس عمومی گزرگاہ میں عذاب کے فرشتے کمین گاہ میں ہیں اور وہ دوزخیوں کو اُچک لیں گے۔

اگر ہم اس کی صیغہ مبالغہ کے اعتبار سے تفسیر کریں تو پھر خود دوزخ ان کی تاک میں قرار پائے گا اور سرکشوں میں سے جو کوئی اس کے قریب ہوگا وہ اسے اپنی طرف کھینچ لے گا اور اسے نگل لے گا۔ بہرحال اس عمومی گزرگاہ پر سے سرکشوں میں سے کوئی نہیں گزر سکے گا مگر یہ کہ یا عذاب کے فرشتے اسے اُچک لیں گے یا جہنم کی شدید

---

[1] آیت محذوف رکھتی ہے۔ تقدیر اس طرح ہے (کانت للطاغین مآبا)

کشش اسے کھینچ لے گی۔

"مآب" کے معنی مرجع یا محلِ بازگشت کے ہیں، لوٹنے کی جگہ۔ یہ کبھی منزل اور قرار گاہ کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں اسی معنی میں ہے۔ باقی رہا "احقاب" جو "حقب" (بروزن قفل) کی جمع ہے۔ یہ زمانے کی غیر محدود مدت کے معنی میں ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی اسّی سال، بعض نے ستر سال اور بعض نے چالیس سال تفسیر کی ہے۔ چونکہ اس تفسیر سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوزخی طویل مدت تک دوزخ میں رہیں گے، اور آخر کار ختم ہو جائیں گے۔ یہ چیز ہمیشہ رہنے والے عذاب سے متضاد ہے، اس لیے ہر ایک مفسر نے اس تفسیر میں کوئی نہ کوئی راہ اختیار کی ہے۔ مفسرین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ احقاب سے مراد یہاں یہ ہے کہ طولانی مدتیں اور سال ہائے دراز پے در پے آئیں گے اور گزر جائیں گے بغیر اس کے کہ وہ ختم ہوں۔ جو زمانہ گزرے گا دوسرا اس کا جانشین بن جائے گا۔

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ یہ آیت ان گنہگاروں کے بارے میں ہے جو آخر کار پاک ہو جائیں گے اور دوزخ سے آزاد ہو جائیں گے، نہ کہ ان کافروں کے بارے میں جو جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔[1]

اس کے بعد جہنم کے شدید عذابوں کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ وہاں نہ کوئی ٹھنڈی چیز چکھیں گے جو جہنم کی وحشتناک گرمی کو کم کر سکے اور نہ انہیں کوئی خوشگوار مشروب ملے گا جو ان کی شدید پیاس کو تسکین بخشے۔ (لا یذوقون فیھا بردًا ولا شرابًا)۔ "سوائے جلتے ہوئے پانی، پیپ اور لہو کے: (الا حمیمًا وغساقًا)۔ "اور سوائے آگ کے گاڑھے، گرم، خفقان میں مبتلا کر دینے والے اور گھٹن پیدا کرنے والے دھوئیں کے سائے کے، جیسا کہ سورہ واقعہ کی آیت ۴۳ میں آیا ہے، (وظل من یحموم)۔

"حمیم" نہایت گرم پانی کے معنی میں ہے اور غساق پیپ اور لہو کے معنی میں ہے جو زخم سے نکلتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی تفسیر بدبودار بہنے والی چیزوں سے کی ہے۔ یہ اس صورت میں ہوگا جبکہ جنت والے اپنے پروردگار کی طرف سے شراب طہور کے خوشگوار چشموں سے سیراب ہوں گے۔ (وسقاھم ربھم شرابًا طھورًا)۔ (دھر۔ ۲۱) اور ایسے مشروبات سے سیراب ہوں گے جو جنت کے خوبصورت ظروف میں ہوں گے اور جن پر مُہر لگی ہوئی ہوگی۔ ایسی مُہر جو مشک سے ہوگی۔ (ختامہ مسک)۔ (مطففین / ۲۶)۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

چونکہ ممکن ہے کہ ان سخت اور شدید عذابوں کا وجود بعض افراد کو عجیب نظر آئے لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ صفحہ ۴۹۴ حدیث ۲۳۔ اور۔ حدیث ۲۹ صفحہ ۴۹۵۔

"یہ سزا ان کے اعمال کے موافق و مناسب ہے" (جزاء وفاقا)[1] ایسا کیوں نہ ہو اس لیے کہ انہوں نے اس دنیا میں مظلوموں کے دل جلائے ہیں اور ان کے قلب و جان میں آگ لگائی ہے اور اپنے ظلم وستم اور سرکشی کی وجہ سے کسی پر رحم نہیں کھایا۔ لہٰذا یہی مناسب ہے کہ ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے اور ان کے مشروبات ایسے ہی ہوں، اصولی طور پر جیسا کہ ہم نے بار بار تاکید بھی کی ہے۔

آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت میں گنہگاروں پر ہونے والے عذاب اور ان کو ملنے والی بہت سی سزائیں ان کے اعمال کی تجسیم ہیں جیسا کہ سورہ تحریم کی آیت ۷ میں ہم پڑھتے ہیں (یا ایھا الذین کفروا لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون)۔ "اے کافرو! آج معذرت نہ کرو اس لیے کہ تمہاری سزا صرف وہی اعمال ہیں جنہیں تم انجام دیتے تھے" (جو اب مجسم ہو گئے ہیں اور تمہارے سامنے آگئے ہیں)۔ اس کے بعد اس سزا کی علت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"یہ اس بناء پر ہے کہ وہ حساب کتاب کی امید اور خدا کا خوف نہیں رکھتے تھے" (انھم کانوا لا یرجون حسابا)۔ حساب اور روز جزاء سے یہی بے اعتنائی ان کی سرکشی اور ظلم وستم کا باعث بنی تھی اور اسی ظلم و فساد نے ان کے لیے اس قسم کی دردناک سرنوشت فراہم کی حقیقت میں حساب کے متعلق عدم اطمینان سرکشی کا سبب ہے اور وہ ان سخت قسم کے عذابوں کا عامل و سبب ہے۔

توجہ رہے کہ "لا یرجون" "رجاء" کے مادہ سے امید کے معنی میں بھی ہے اور عدم خوف و وحشت کے معنی میں بھی۔ اصولی طور پر جب کوئی انسان سزا و عذاب کا امکان محسوس کرتا ہو تو وہ فطرتاً خوف کھاتا ہے اور اگر یہ چیز محسوس نہ کرتا ہو تو پھر وہ نہیں ڈرتا۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے وہ لوگ جو حساب و کتاب پر یقین نہ رکھتے ہوں خوف و ہراس محسوس نہیں کر سکتے۔

"ان" کی تعبیر جو تاکید کے لیے ہے اور "کانوا" کا لفظ جو ماضی میں استمرار کو بیان کرتا ہے اور "حسابا" جو نفی کے بعد نکرہ کی شکل میں آیا ہے اور عمومیت کے معنی دیتا ہے، یہ سب اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ وہ مطلقاً کسی قسم کے حساب و کتاب کا خوف نہیں رکھتے تھے۔ با الفاظ دیگر وہ قیامت میں ہونے والے حساب و کتاب کو بالکل فراموش کر چکے تھے اور اسے اپنی زندگی کے لائحہ عمل میں سے مکمل طور پر حذف کر چکے تھے۔ اور یہ ایک فطری امر ہے کہ ایسے افراد اس طرح کے بڑے بڑے گناہوں میں آلودہ ہوں اور آخرکار دردناک عذاب میں گرفتار ہوں۔

اسی لیے بلا فاصلہ مزید کہتا ہے: "انہوں نے ہماری آیات کی مکمل طور پر تکذیب کی"

---

[1] جزاء منصوب ہے فعل محذوف کے مفعول مطلق کے عنوان سے جو کلام کے قرینہ سے واضح ہوتا ہے اور وفاق بھی مصدر کے معنی رکھتا ہے اور اس کی صفت ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے یجازیھم جزاء ذا وفاق۔

(وکذبوا بآیاتنا کذاباً) [1]

ان پر ہوائے نفس اس طرح غالب آئی کہ انہوں نے خواب غفلت سے جگانے والی تمام الٰہی آیات کا شدت سے انکار کیا تاکہ وہ اپنی سرکشی کو اور ہوا و ہوس کے مشغلہ کو جاری رکھ سکیں اور اپنی غیر شرعی خواہشات کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

ظاہر ہے کہ لفظ آیات کے یہاں ایک وسیع معانی ہیں جس میں تمام آیاتِ توحید و نبوت و تشریع و تکوین و معجزاتِ انبیاء و احکام و سنن سب شامل ہیں اور ان سب آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جن سے عالمِ تکوین و تشریع چھلک رہا ہے ہمیں تصدیق کرنی چاہیئے۔ وہ سزائیں ایسے ایسے منکر افراد کے لیے مناسب ہیں۔

اس کے بعد ان سرکشوں کو تنبیہ کرتے ہوئے اور جرم و حاکمیت و سزائے مناسب کے درمیان موازنہ کے موجود ہونے کے مسئلہ پر تاکید کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ہم نے ہر چیز کا قطعی اور یقینی طور پر احصاء کیا ہے"۔ (وکل شیء احصیناہ کتاباً) [2]

تاکہ تم یہ گمان نہ کرو کہ کوئی چیز تمہارے اعمال میں سے بے حساب اور بغیر سزا کے رہ جائے گی اور یہ خیال بھی تمہیں نہ ہو کہ یہ شدید قسم کی سزائیں غیر منصفانہ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کے تمام اعمال، قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، پوشیدہ ہوں یا ظاہر، یہ سب ثبت ہوتے ہیں حتیٰ کہ نیتیں اور عقائد بھی لکھے جاتے ہیں۔ یہ حقیقت بہت سی قرآنی آیات سے ثابت ہوتی ہے۔

ایک جگہ فرماتا ہے: (وکل شیء فعلوہ فی الزبر وکل صغیر وکبیر مستطر) "جس کام کو انہوں نے انجام دیا وہ ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے اور ہر چھوٹا بڑا کام لکھا جاتا ہے"۔ (قمر / ۵۲، ۵۳)۔

دوسری جگہ فرماتا ہے: (ان رسلنا یکتبون ما تمکرون) "جو کچھ تم کرتے ہو ہمارے رسول اُسے لکھتے ہیں"۔ (یونس / ۲۱)۔

علاوہ ازیں ہم پڑھتے ہیں (ونکتب ما قدموا وآثارھم) "اور ہم ان تمام چیزوں کو جنہیں تم نے آگے بھیجا ہے اور اسی طرح ہم ان کے آثار کو لکھتے ہیں"۔ (یٰسین / ۱۲)۔

---

[1] "کِذّاب" (کاف کے زیر کے ساتھ) باب تفعیل کے مصدر کا ایک صیغہ ہے جو تکذیب کے معنی میں ہے بعض ارباب لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ ثلاثی مجرد کا مصدر اور کذب کا معادل ہے بہرحال "کذبوا" کا مفعول مطلق ہے اور تاکید کے لیے ہے۔

[2] اس آیت میں "کل" فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے جس پر فعل مذکور یعنی "احصیناہ" دلالت کرتا ہے اور "کتاباً" مفعول مطلق کے عنوان سے منصوب ہے اس لیے کہ "احصینا" "کتبناہ" کے معنی میں ہے اور بعض نے اسے حال سمجھا ہے۔

اسی لیے جب مجرموں کے نامۂ اعمال ان کے ہاتھوں میں دیں گے تو ان کی فریاد بلند ہوگی اور وہ کہیں گے: (یا ویلتنا مال ھٰذا الکتاب لا یغادر صغیرة ولا کبیرة الّا احصاھا)۔ "وائے ہو ہم پر اس کتاب کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چھوٹا بڑا کام ایسا نہیں ہے جسے ثبت نہ کیا گیا ہو اور وہ شمار نہ ہوا ہو" (کہف/۴۹)۔

اس میں شک نہیں کہ جو شخص اس حقیقت کو اپنے دل سے باور کرے تو وہ اعمال کے انجام دینے میں بہت ہی باریک بین اور حساب کرنے والا ہوگا، اور یہی اعتقاد انسان اور گناہ کے درمیان بہت بڑی رکاوٹ ڈال دے گا اور وہ تربیت ذات کے اہم عوامل میں شمار ہوگا۔

آخری زیر بحث آیت میں گفتگو کے لب و لہجہ کو تبدیل کرتے ہوئے انہیں غائب سے مخاطب بنا کر تہدید آمیز غصہ سے بھرے ہوئے اور دل ہلا دینے والے جملے فرماتا ہے: "پس چکھو، ہم تم پر سوائے عذاب کے اور کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتے" (فذوقوا فلن نزیدکم الّا عذابا)۔ جس قدر فریاد کرو "یا ویلتنا" کہو، دنیا کی طرف بازگشت اور گناہوں کی تلافی کا مطالبہ کرو تمہاری بات نہیں سنی جائیگی اور تم پر سوائے عذاب کے اور کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوگا۔ یہ سزا ہے ان لوگوں کی جو انبیائے خدا کی محبت آمیز دعوت و فکر کے مقابلے میں یہ کہتے تھے: (سواء علینا اوعظت ام لم تکن من الواعظین)۔ "ہمارے لیے یکساں ہے کہ ہمیں تو نصیحت کرے یا نہ کرے" (شعراء/۱۳۶)۔ اور یہ اس شخص کی سزا ہے کہ جب اس کے سامنے خدائی آیات پڑھی جاتیں تو اس میں نفرت کے علاوہ کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا تھا۔ (ما یزیدھم الّا نفورا)۔ (اسراء/۴۱) اور بالآخر یہ سزا اس شخص کی جو کہ گناہ سے روگرداں نہیں تھا اور جو ہر کار خیر سے بے تعلق تھا۔

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ: (ھذہ الآیة اشد ما فی القرآن علی اھل النار)۔ یہ آیت قرآن کریم کی شدید ترین آیت ہے جو دوزخیوں کے بارے میں آئی ہے[1]

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ خداوند غفور و رحیم اُن پر غضبناک ہوا ہے اور انہیں ایسے جملے سے مخاطب کیا ہے جس نے ان کے سامنے امیدوں کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں اور سوائے اضافۂ عذاب کے وعدہ کے انہیں اور کوئی چیز نہیں دیتا۔

---

[1] "تفسیر کشاف" جلد ۴ صفحہ ۶۹۰۔ یہی حدیث تفسیر صافی میں بھی زیر بحث آیت کے ذیل میں آئی ہے اور اسی طرح تفسیر روح البیان میں جلد ۱۰ صفحہ ۳۰۰ پر۔

(۳۱) اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ۙ

(۳۲) حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ۙ

(۳۳) وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ۙ

(۳۴) وَّكَاْسًا دِهَاقًا ؕ

(۳۵) لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ۚ

(۳۶) جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًا ۙ

(۳۷) رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الرَّحْمٰنِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ۚ

ترجمہ

(۳۱) پرہیزگاروں کے لیے یقیناً عظیم کامیابی ہے۔

(۳۲) سرسبز باغات اور انواع و اقسام کے انگور ہیں۔

(۳۳) اور بھرپور اور جوان ہم سن حوریں ہیں۔

(۳۴) اور لبریز و لگاتار و مسلسل جام ہیں۔ (شرابِ طہور کے)۔

(۳۵) وہاں نہ کوئی لغو و بیہودہ بات سُنیں گے اور نہ جھوٹ۔

(۳۶) یہ جزاء ہے تیرے پروردگار کی طرف سے اور کافی عطیہ ہے۔

(۳۷) وہی آسمانوں اور زمین کا پروردگار اور ان کا رحمٰن و پروردگار ہے جو ان دونوں کے درمیان ہے اور کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ اس کی اجازت کے بغیر بات کرے۔ (یا شفاعت کرے)۔

تفسیر

پرہیزگاروں کی عظیم جزا کا ایک حصّہ

گزشتہ آیات میں گفتگو سرکشی کرنے والوں کی سرنوشت اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کے ایک حصّہ اور اس کی بدبختی کے سبب کے بارے میں تھی اور زیر بحث آیات میں اس کے نقطۂ مقابل کی تشریح ہو رہی ہے۔ سچے مومنین اور پرہیزگاروں کے لیے قیامت میں جو نعمتیں ہیں ان کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تاکہ تقابل کی وجہ سے حقائق زیادہ واضح ہوں۔

قرآن مجید کا یہی طریقہ دوسری صورتوں میں بھی ہے کہ وہ اضداد کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں لاکر ان کی حقیقت و کیفیت کو مقابلہ اور موازنہ کے ذریعہ واضح کرتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: "پرہیزگاروں کے لیے عظیم کامیابی اور نجات ہے" (انّ للمتقین مفازًا)۔

"مفاز" اسم مکان یا مصدر میمی ہے یہ فوز کے مادہ سے ہے اور خیر و خوبی تک سلامتی کے ساتھ پہنچنے کے معنی میں بھی آیا ہے جو اس معنی کا لازمی حصّہ ہے۔ اور اس طرف توجہ کرتے ہوتے کہ مفاز نکرہ کی شکل میں بیان ہوا ہے عظیم کامیابی اور بہت بڑی سعادت تک پہنچنے کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد اس سعادت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"سرسبز و پُرمسرت و محفوظ باغات انواع و اقسام کے انگوروں اور پھلوں کے ساتھ" (حدائق و اعنابًا)[1]

"حدائق" حدیقہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایسا پُرمسرت، سرسبز اور پُر درخت باغ، جس کے گرد دیوار کھنچی ہوئی ہو اور وہ ہر لحاظ سے محفوظ ہو۔ راغب مفردات میں کہتا ہے حدقہ دراصل اس زمین کو کہتے ہیں جس میں آنکھ کے ڈھیلے کی طرح ہمیشہ پانی موجود رہے۔

قابل توجہ یہ امر ہے کہ یہاں تمام پھلوں میں سے انگور کا ذکر ہوا ہے، ان حد سے زیادہ خوبیوں اور مزے کی وجہ سے جو اس پھل میں ہے۔ اس لیے کہ بقول ماہرینِ غذا انگور، علاوہ اس کے کہ اپنے خواص کے اعتبار سے ایک مکمل غذا شمار ہوتا ہے اور اس کے اجزائے غذائی شیر مادر سے بہت مشابہ ہیں، یہ بدن میں گوشت سے دگنی حرارت پیدا کرتا ہے اس کے علاوہ اس میں اس قدر مفید اجزائے غذائی ہیں کہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک فطری دوا خانہ ہے۔

اس کی زہر سے متضاد خاصیت ہے، یہ تصفیۂ خون کے لیے بہت مفید ہے۔ جوڑوں کے درد، ورم،

---

[1] "حدائق"، "مفازًا" کا بدل ہے یا اس کا عطف بیان ہے۔

انگلیوں کے جوڑ بند خصوصاً انگوٹھے کے درد کے لیے فائدہ مند ہے اور خون کے اس بے رنگ مادہ کے اضافہ کو روکتا ہے جس کا ذائقہ شور و تلخ ہے۔ اس کے علاوہ انگور اعصاب کو تقویت دیتا ہے اور جسم میں احساس نشاط پیدا کرتا ہے اور انواع و اقسام کے وٹامن اپنے اندر رکھنے کی وجہ سے انسان کو قوت و طاقت بخشتا ہے یہ انگور کے آثار و خواص کا ایک گوشہ ہے۔

اسی لیے پیغمبرِ اسلام کی ایک حدیث میں ہمیں ملتا ہے (خیر فواکھکم العنب)" تمہارے میووں اور پھلوں میں سے انگور سب سے بہتر ہے"۔

اس کے بعد جنت کی بیویوں کی طرف، جو پرہیزگاروں کو ملنے والی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہیں، اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ان کے لیے بہت ہی نوجوان حوریں ہیں جن کے سینوں کا ابھار نیا نیا ظاہر ہوا ہے اور جو ہم سن ہیں" (و کواعب اترابا)۔

" کواعب " " کاعب " کی جمع ہے۔ یہ اس دوشیزہ کے معنوں میں ہے جس کے سینے کا ابھار نیا نیا ظاہر ہوا ہو جو جوانی کے آغاز کی طرف اشارہ ہے۔

" اتراب " " ترب " (بروزن حزب) کی جمع ہے جس کے معنی ہم سن کے ہیں۔ یہ زیادہ تر مؤنث کی صفت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بعض مفسرین کے بقول اصل میں " ترائب " سے لیا گیا ہے جس کے معنی سینے کی پسلیاں ہیں جو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں اور ہم سن ہونا ممکن ہے جنت کی خواتین کے لیے ہو یعنی وہ سب نوجوان ہوں گی۔ وہ حسن و جمال کی زیبائی اور قد و قامت کے اعتدال میں ایک جیسی ہوں گی۔ یا ہم سن ہونا ان کے اور ان کے شوہروں کے درمیان ہوگا اس لیے کہ شوہر اور زوجہ کے درمیان سن کا برابر ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو سمجھ سکیں۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد جنت کی چوتھی نعمت جو پرہیزگاروں کے انتظار میں ہے اس کی اس طرح تشریح کرتا ہے " اور لبریز و مسلسل شرابِ طہور کے جام " (و کأسا دھاقا)۔ یہ دنیاوی شراب کی طرح نجس شراب نہیں ہوگی جو عقل کو بیکار کر دیتی ہے اور انسان کو جانور کی حد تک گرا دیتی ہے بلکہ ایسی شراب ہوگی جو عقل میں اضافہ کرے گی۔ وہ نشاط آفریں، جاں پرور اور روح افزا ہوگی۔

" کأس " (بروزن راس) مشروب سے لبریز جام کے معنوں میں ہے اور کبھی کبھی خود جام یا جو کچھ اس میں ہے اس کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

" دھاق " کی تفسیر بہت سے مفسرین نے لبریز کی ہے لیکن " ابن منظور " نے " لسان العرب " میں اس کے لیے دو اور معانی بھی تجویز کیے ہیں۔ ایک پے در پے اور دوسرے صاف و شفاف۔ اس بنا پر اگر ان معانی کے مجموعہ کو ہم ذہن میں رکھیں تو آیت کا مفہوم اس طرح ہے کہ جنتیوں کے لیے شفاف، لبریز اور پے بہ پے

شراب طہور کے جام ہوں گے۔

دنیا میں جام و شراب کی گفتگو اس کے غیر مطلوب معانی کا تقاضا کرتی ہے جبکہ جنت کی شراب دنیا کی شیطانی شرابوں سے بالکل متضاد ہے لہٰذا بلا فاصلہ مزید کہتا ہے: "جنت والے وہاں نہ لغو و بیہودہ بات سنیں گے اور نہ جھوٹ سنیں گے" (لا یسمعون فیھا لغوًا ولا کذّابا)۔

دنیا کی شراب عقل کو تباہ کر دیتی ہے اور ہوش و حواس کو ختم کر دیتی ہے اور انسان کو بیہودہ گوئی اور غیر مناسب باتوں کے کہنے پر آمادہ کرتی ہے لیکن جنت کی شراب طہور انسان کو روح و عقل اور نور و صفائے باطن بخشتی ہے۔

یہ کہ فیھا کی ضمیر کا مرجع کیا ہے اس میں علماء نے دو احتمال تجویز کیے ہیں۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ یہ جنت کی طرف لوٹتی ہے اور دوسرا یہ کہ (کأس) جام کی طرف لوٹتی ہے۔

پہلی تفسیر کی بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا۔ جنت میں لغو اور جھوٹی بات نہیں سنیں گے جیسا کہ سورہ غاشیہ کی آیت ۱۰ اور ۱۱ میں آیا ہے: (فی جنۃ عالیۃ لا تسمع فیھا لاغیۃ) جن کی جنت عالی میں جگہ ہوگی جس میں تو لغو اور بیہودہ بات نہیں سنے گا"۔

دوسری تفسیر کی بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا "اس شراب کے جام کے پینے سے لغو اور جھوٹ حاصل نہیں ہوگا" جیسا کہ سورہ طور کی آیت ۲۳ میں آیا ہے: (یتنازعون فیھا کأسًا لا لغو فیھا ولا تأثیم) "جنت میں شراب طہور سے لبریز جام ایک دوسرے سے لیں گے جس میں نہ بے ہودہ گوئی ہے اور نہ گناہ"۔

بہرحال اہل جنت کو ملنے والی عظیم معنوی نعمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہاں دروغ گوئی، بے ہودگی، تہمت، حق کی تکذیب، باطل کی توجیہ اور ان نامعقول باتوں کا نام و نشان تک نہ ہوگا جو پرہیزگاروں کے دلوں کو اس دنیا میں تکلیف پہنچاتی ہیں۔ اور واقعی کیا ہی خوبصورت اور اچھا ہوگا وہ ماحول جس میں ان غیر موزوں تکلیف دہ اور رنج پہنچانے والی باتوں کا نشان تک نہ ہوگا اور سورہ مریم کی آیت ۶۲ کے مطابق "وہ سوائے سلام اور صلح آمیز باتوں کے وہاں کوئی اور بات نہیں سنیں گے" (لا یسمعون فیھا لغوًا الّا سلامًا)

ان نعمتوں کے بیان کے آخر میں ایک اور معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ جزا ہے تیرے پروردگار کی جانب سے اور کافی عطیہ ہے" (جزاءً من ربک عطاءً حسابًا)[1]

اس سے کونسی نعمت اور بشارت بالا ہے کہ ضعیف و کمزور بندہ اپنے مولائے کریم کی نوازش، کرم اور

---

[1] جزاءً اس آیت میں ان نعمتوں کا حال ہے جو گزشتہ آیات میں آئی ہیں اور معنوی طور پر اس طرح ہے (اعطاھم جمیع ذالک حالکونہ جزاءً من ربک) (یہ سب کچھ خدا نے انہیں دیا در آں حالیکہ یہ جزا ہے تیرے رب کی طرف سے) بعض نے یہ احتمال بھی بتایا ہے کہ یہ ایک فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے اور بعض نے اسے مفعول لاجلہ جانا ہے لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

لطف وکرم کا مورد قرار پائے۔ وہ اس کا اکرام کرے، اسے بزرگی عطا کرے اور خلعت بخشے۔ یہ توجہ وعنایت اور یہ لطف ومحبت مومنین کو اس قسم کا لطف دے گی جس کا کوئی نعمت مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بقول شاعر:

من کہ باشم کہ براں خاطر عاطر گزرم لطفہا می کنی اے خاک درت تاج سرم

مَیں کون ہوں جس کا اس کے پاک اور معطر دل میں گزر ہو۔ یہ تو اے وہ شخص، جس کے در کی خاک میرے سر کا تاج ہے، تیرا لطف وکرم ہے۔

"رب" کی تعبیر ضمیر مخاطب کے ساتھ اور عطا کے لفظ کو لیے ہوئے یہ سب حد سے زیادہ لطف وکرم کو بیان کرتے ہیں جو ان نعمتوں میں پوشیدہ ہے۔

لفظ "حساباً" بہت سے مفسرین کے نظریہ کے مطابق یہاں "کافیا" کے معنی میں ہے جیساکہ بعض اوقات کہا جاتا ہے "احسبت" یعنی مَیں نے اس پر اتنا لطف وکرم کیا کہ اس نے "حسبی" کہا "کافی ہے"۔ [1]

ایک حدیث میں امیرالمومنین امام علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ قیامت میں خدا مومنین کی حسنات کا حساب کرے گا اور ہر نیکی کا دس گنا اور ستر گنا اجر عطا فرمائے گا، جیساکہ خدا قرآن میں فرماتا ہے (جزاء من ربك عطاء حسابا) [2]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے عطیات باوجود اس کے تفضل کا پہلو لیے ہوئے ہوتے ہیں، اعمال کے حساب کی بناء پر ہیں یعنی اس کے تفضلات وعطیات انسانوں کے اعمالِ صالح کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں اور اس طرح مندرجہ بالا آیت میں "حساباً" کی مشہور معنی محاسبہ سے تفسیر کی جا سکتی ہے اور اس معنی اور گزشتہ معنی کا جمع ہونا بھی کوئی قباحت نہیں رکھتا۔ (غور کیجئے)۔

اس کے بعد آخری آیت میں مزید کہتا ہے "یہ عظیم عطیات وہی بخشتا ہے جو آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے، ان کا پروردگار ہے۔ وہی خدا جو رحمٰن اور بخشنے والا ہے۔ (رب السماوات والارض وما بینھما الرحمٰن) جی ہاں! وہ جو اس باعظمت جہان کا مالک مدبر اور مربی ہے اور اس کی رحمت نے ہر شے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ وہی قیامت میں نیکو کار مومنین اور پاک لوگوں کو یہ سب عطیات بخشنے والا ہے۔ حقیقت میں مندرجہ بالا آیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا اس قسم کا وعدہ کرتا ہے تو اس نے اِس دنیا میں اُس کے ایک گوشہ کی اپنی رحمت عامہ کی شکل میں اہلِ آسمان وزمین کو نشاندہی کرائی ہے۔

آیت کے آخر میں فرماتا ہے، "کوئی اور شخص حق نہیں رکھتا کہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی بارگاہ میں بات کرے یا شفاعت کرے" (لا یملکون منہ خطاباً)۔

---

[1] تفسیر بیضاوی در ذیل آیہ زیر بحث۔

[2] نور الثقلین، جلد ۵ صفحہ ۴۹۵ حدیث ۲۹۔

" لا یملکون " میں جو ضمیر ہے ہو سکتا ہے کہ تمام اہل آسمان اور زمین کی طرف لوٹے یا ان تمام متقین اور سرکشوں کی طرف لوٹے جو حساب کتاب اور جزا ، و سزا کی غرض سے عرصۂ محشر میں جمع ہوں گے ۔ بہرحال یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اس دن کسی شخص کو اعتراض اور چون و چرا کا حق نہیں ہوگا اس لیے کہ خدائی حساب اس قدر باریک بین پر مبنی اور عادلانہ ہے کہ کسی قسم کے چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔ علاوہ ازیں کوئی شخص بھی شفاعت کا حق نہیں رکھتا مگر اس کے اذن سے (من ذاالذی یشفع عندہ الا باذنہ) (بقرہ / ۲۵۵) ۔

چند نکات

۱۔ متقین کے لیے عطیات اور سرکشوں کے لیے عذاب

مندرجہ بالا آیات جو پرہیزگاروں کو ملنے والے عطیات کی بات کرتی ہیں ان سے گزشتہ آیات کا موازنہ ہے جو سرکشوں کو ملنے والی سزاؤں کی بات کرتی ہیں ۔ اس میں ایک پرکشش مقابلہ نظر آتا ہے ۔

یہاں گفتگو " مفاز " (محل نجات) سے ہے اور وہاں " مرصاد " (کمین گاہ) سے ہے ۔ یہاں بات پھلوں سے بھرے ہوتے باغات کی ہے اور وہاں غیر محدود مدت تک آگ میں غرق ہونے کی " احقاب "۔ یہاں گفتگو پے بہ پے جاموں کی ہے جو شراب طہور سے لبریز ہوں گے ، وہاں جلتے ہوتے اور ابلتے ہوئے پانی اور " حمیم و غساق " کی ہے ۔ یہاں گفتگو خداوند رحمٰن کے وسیع و عریض عطیات کی ہے اور وہاں منصفانہ سزاؤں اور جزا ، وفاق کی ہے ۔ یہاں بات ہے نعمت الٰہی کی فراوانی کی اور وہاں عذاب کی فراوانی کی ۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ ہر لحاظ سے دو مخالف قطب میں قرار پاتے ہیں کیونکہ وہ اس دنیا میں ایمان و عمل کے لحاظ سے دو مخالف قطب رہتے ۔

۲۔ جنت کے مشروب

قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں جنت کی شرابوں کی بہت زیادہ تعریف و توصیف ہوئی ہے جن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کو پینے والے اس قسم کی روحانی لذت میں ڈوبے ہوئے ہوں گے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہو سکتا ۔ ایک جگہ اس کی تعریف شراب طہور کے عنوان سے کرتا ہے (وسقاھم ربھم شرابًا طھورًا) ۔ (سورہ دہر / ۲۱) ۔

دوسری جگہ تاکید کرتا ہے کہ صاف و شفاف خالص اور لذت بخش شراب نہ تو درد سر پیدا کرتی ہے اور نہ مستی لاتی ہے نہ فساد عقل پیدا کرتی ہے (یطاف علیھم بکاس من معین بیضاء لذۃ للشاربین لا فیھا غول ولا ھم عنھا ینزفون) (صافات / ۴۵ تا ۴۷) ۔

ایک جگہ فرماتا ہے : " ایسے جام (مشروب) پئیں گے جو کافور کی آمیزش رکھتے ہیں (ٹھنڈے اور سکون بخش ہیں) (یشربون من کأس کان مزاجھا کافوراً) (دھر/۵)۔

دوسری جگہ مزید فرماتا ہے : " ایسے جام انہیں پلائیں گے جس کے مشروب میں زنجبیل کی آمیزش ہے (گرم کرنے والا اور نشاط آفریں مشروب)۔ (ویسقون فیھا کأساً کان مزاجھا زنجبیلاً) (دھر/۱۷)۔

زیر بحث آیات میں بھی ہم نے پڑھا ہے : " وہ لبالب زلال اور پے بہ پے جام رکھتے ہیں " (و کأساً دھاقاً) اور ان سب چیزوں سے اہم بات یہ ہے کہ اس بزم روحانی کا ساقی خدا ہے وہ اس کے دست قدرت سے اور اس کی بساط رحمت سے جام حاصل کریں گے اور پئیں گے اور اس کے عشق و معرفت کے جذبہ سے سرشار ہوں گے " وسقاھم ربھم ... (دھر: ۲۱)

خداوندا ! ہمیں بھی وہ شراب طہور عطا فرما۔

(۳۸) يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ۙۗ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝

(۳۹) ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ۝

(۴۰) اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ عَذَابًا قَرِيْبًا ۚۖ يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۝

ترجمہ

(۳۸) یہ سب کچھ اس دن ہوگا جب روح اور ملائکہ ایک ہی صف میں قیام کریں گے اور کوئی بھی خدائے رحمٰن کے اذن کے بغیر بات نہیں کرے گا اور اس وقت سب درست بات کریں گے۔

(۳۹) وہ دن حق ہے جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف جانے والی راہ کا انتخاب کر سکتا ہے۔

(۴۰) اور ہم تمہیں قریبی عذاب سے ڈراتے ہیں۔ یہ عذاب اس دن نازل ہوگا جب انسان جو کچھ پہلے بھیج چکا ہے اُسے دیکھے گا اور کافر کہے گا کاش میں مٹی ہوتا۔

تفسیر

کافر کہیں گے کاش ہم مٹی ہوتے

گزشتہ آیتوں میں قیامت کے دن سرکشوں پر نازل ہونے والے عذاب اور پرہیزگاروں کو حاصل ہونے والی نعمتوں کا قابل ملاحظہ بیان تھا۔ زیر بحث آیات میں اس عظیم دن کا تعارف کرانے کے لیے اس کے بعض اوصاف اور حوادث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ سب کچھ اس دن ہوگا جب روح

اور تمام ملائکہ ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے اور خداوند رحمٰن کے اذن کے بغیر کوئی بھی بات نہ کر سکے گا، اور جو بات کرے گا بھی تو حق کے علاوہ اور کچھ نہیں کہے گا۔ (یوم یقوم الروح والملائکۃ صفاً لایتکلمون الا من اذن لہ الرحمٰن وقال صوابا) [1]

اس میں شک نہیں کہ روح اور فرشتوں کا اس دن ایک ہی صف میں قیام اور خداوند رحمٰن کے اذن کے بغیر بات نہ کر سکنا صرف فرمانِ خدا کے اجراء کے لیے ہے۔ وہ اس جہان میں بھی "مدبرات امر" یعنی اس کے فرمان جاری کرنے والے ہیں اور عالم آخرت میں یہ امر زیادہ آشکار، زیادہ واضح اور وسیع صورت میں ہوگا۔

یہ کہ یہاں روح سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے اس کی بہت سی تفسیریں کی ہیں، بعض تفاسیر میں تو آٹھ احتمال تک بیان کیے گئے ہیں [2] جن میں سے زیادہ اہم درج ذیل تفاسیر و احتمالات ہیں۔

۱۔ فرشتوں کے علاوہ ان سے افضل و برتر مخلوق مراد ہے۔

۲۔ حضرت جبرائیل امین مراد ہیں جو امین وحیِ خدا ہیں اور خدا اور تمام انبیاء و رسل کے درمیان واسطہ ہیں۔ سارے فرشتوں کے سردار ہیں اور سب سے بڑے فرشتے ہیں۔

۳۔ انسانوں کی ارواح مراد ہیں جو فرشتوں کے ہمراہ قیام کریں گی۔

۴۔ ایک فرشتہ مراد ہے جو تمام فرشتوں سے برتر ہے جبرائیل امین سے بھی افضل و برتر ہے۔ یہ وہی ہے جو انبیاء و معصومین کے ہمراہ تھا اور ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ روح کا لفظ قرآن مجید میں کبھی مطلق صورت میں اور بغیر کسی قید و شرط کے بیان ہوا ہے اور اس حالت میں زیادہ تر مقابلہ کے لیے قرار پایا ہے مثلاً: (تعرج الملائکۃ والروح الیہ) فرشتے اور روح اس کی طرف اوپر جاتے ہیں۔ (معارج/۴)۔ (تنزل الملائکۃ والروح فیھا باذن ربھم من کل امر) شب قدر میں ملائکہ اور روح اپنے پروردگار کے فرمان سے ہر چیز کے ساتھ نازل ہوں گے۔ (قدر/۴)۔

ان دو آیات میں ملائکہ کے بعد روح کا ذکر ہوا ہے اور زیر بحث آیت میں ملائکہ سے پہلے ہوا ہے۔ البتہ ممکن ہے کہ یہ اس کا الگ ہونا ایک بزرگ فرد کے عنوان کے ماتحت ہو اور اصطلاح کے مطابق خاص کے بعد عام کا ذکر یا عام کے بعد خاص کا ذکر ہو لیکن بہت سی آیتوں میں روح ایک صفت کی طرف اضافہ کے

---

[1] بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ یوم اس آیت میں ظرف ہے اور گزشتہ آیات میں لا یملکون کے فعل سے متعلق ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ ان تمام چیزوں سے متعلق ہو جو گزشتہ آیتوں میں آئی ہیں اور تقدیر عبارت اس طرح ہو (کل ذالک یکون یوم یقوم الروح) یہ سب کچھ اس دن ہوگا جب روح و ملائکہ ایک صف میں کھڑے ہوں گے۔

[2] تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۶۹۷۰۔

ساتھ آیا ہے مثلاً۔ روح القدس ، (قل نزّله روح القدس من ربك بالحق) کہہ دے روح القدس نے اس قرآن کو تیرے پروردگار کی جانب سے حق کے ساتھ نازل کیا ، (نحل / ۱۰۲)۔ یا آیۂ (نزل به الروح الامین) قرآن کو روح الامین نے نازل کیا ہے ۔" (شعراء / ۱۹۳)۔

بعض آیات میں خدا نے روح کو اپنی طرف سے اضافت دی ہے ۔ فرماتا ہے : (و نفخت فیه من روحی) "آدم میں میں نے اپنی روح پھونکی " ایک شریف روح جو اپنی شرافت کی وجہ سے اس کی ذات مقدس کی طرف مضاف ہوئی ہے ۔ (حجر / ۲۹)۔

دوسری جگہ فرماتا ہے : (فارسلنا الیها روحنا) "ہم نے مریم کی طرف اپنی روح بھیجی " (مریم / ۱۷)۔ ایسا نظر آتا ہے کہ لفظ روح ان آیات میں چونکہ مختلف شکلوں میں بیان ہوا ہے لہٰذا اس کے مختلف معانی ہیں جن کی تشریح انہی آیات کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے ۔ لیکن ، جو مختلف تفاسیر سے ، زیر بحث آیات کے بارے میں زیادہ مناسب نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں روح سے مراد خدا کا ایک بہت بڑا فرشتہ ہے جو بعض روایات کے مطابق جبرئیل امین سے بھی افضل و برتر ہے جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے :

امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ (هو ملك اعظم من جبرائیل و میکائیل) وہ ایک فرشتہ ہے جو جبرائیل و میکائیل سے بھی بڑا ہے ۔[۱]

اور تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی آیا ہے (الروح ملك اعظم من جبرائیل و میکائیل وکان مع رسول الله و هو مع الائمة) روح ایک فرشتہ ہے جو جبرئیل و میکائیل سے افضل و برتر ہے ۔ وہ رسول اللہؐ کے ساتھ تھا اور آئمہ کے ساتھ بھی ہے ۔[۲]

اگرچہ بعض روایات میں اہل سنت کی تفاسیر میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ : (الروح جند من جنود الله لیسوا بملائکة لهم رؤس و ایدی و ارجل ثم قرأ یوم یقوم الروح والملائکة صفاً قال هؤلاء جند و هؤلاء جند) روح خدا کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے جو ملائکہ نہیں ہیں ۔ ان کے سر ، ہاتھ اور پاؤں ہیں ۔ اس کے بعد پیغمبر نے اس آیت کی تلاوت فرمائی (یوم یقوم الروح والملائکة صفاً) پھر مزید فرمایا یہ ایک الگ لشکر ہے اور ملائکہ الگ لشکر ہیں ۔[۳]

انسان کی روح اور اس کے تجرد و استقلال کے بارے میں شرح اور مفصل بحثیں ہم جلد ۶ ص ۶۹۲ سے لے کر ص ۶۹۷ تک (سورہ اسریٰ کی آیت ۸۵ کے ذیل میں) پیش کر چکے ہیں ۔

---

[۱] مجمع البیان ، جلد ۱۰ ص ۴۲۳ ۔

[۲] تفسیر علی بن ابراہیم ، جلد ۲ ص ۴۰۲ ۔

[۳] تفسیر درالمنثور ، جلد ۶ ص ۳۰۹ ۔

بہرحال جیسا کہ اشارہ ہو چکا ہے یہ عظیم خدائی مخلوق چاہے فرشتوں میں سے ہو یا اور کوئی خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق ہو، خدا کے فرمان کی اطاعت کے لیے ملائکہ کے ساتھ اطاعت کو آمادہ ہے اور اس طرح قیامت کی ہولناکی اور محشر کے اضطراب نے سب کو گھیر رکھا ہوگا کہ کسی کو بھی بات کرنے کی طاقت نہیں ہوگی اور جہاں کوئی بات کرے گا یا شفاعت کرے گا وہ صرف پروردگار کی اجازت سے ہوگا۔ وہ خدا کی حمد و ثنا کریں گے اور جو لائق شفاعت ہیں ان کی شفاعت کریں گے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ سے اس آیت کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: (نحن واللہ المأذون لھم یوم القیامۃ والقائلون) خدا کی قسم! قیامت کے دن ہمیں اجازت ہوگی اور ہم ہی گفتگو کریں گے۔

راوی سوال کرتا ہے اس روز آپ کون سی بات کریں گے۔ تو آپ نے فرمایا: (نمجد ربنا ونصلی علی نبینا ونشفع لشیعتنا فلا یردنا ربنا) ہم اپنے پروردگار کی تمجید و تعریف کریں گے۔ اور اپنے پیغمبرؐ پر درود و سلام بھیجیں گے اور اپنے پیروکاروں کی شفاعت کریں گے اور خدا ہماری شفاعت کو رد نہیں کرے گا[1]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء و ائمہ معصومین بھی ملائکہ اور روح کی صف میں قیام کریں گے اور انہیں بات کرنے، خدا کی حمد و ثنا کرنے اور شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی[2]

"صواباً" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ملائکہ و روح یا انبیاء و اولیاء کسی کے لیے شفاعت کریں تو بھی کسی حساب و کتاب کی بنیاد پر ہوگا اور بغیر وجہ و سبب کے نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس عظیم دن کی طرف جو انسانوں اور فرشتوں کے قیام کا دن بھی ہے، وہ یوم الفصل ہے، سرکشوں پر نزول عذاب کا دن ہے اور متقیوں کے اجر پانے کا دن۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ دن حق ہے" (ذالک الیوم الحق)۔

حق اس چیز کے معنی میں ہے جو ثابت ہے اور واقعیت رکھتی ہے اور تحقق پاتی ہے اور یہ معنی قیامت کے بارے میں مکمل طور پر ثابت ہیں۔ اس کے علاوہ ایسا دن ہے جس دن ہر شخص کا حق دیا جائے گا۔ مظلوموں کا حق ظالموں سے لیا جائے گا۔ اس دن اسرار ظاہر ہوں گے۔ اس لیے وہ ایسا دن ہے جو پورے طور پر حق ہے۔ چونکہ اس واقعیت کی طرف توجہ انسان کے خدا کی طرف رجوع اور اس کے فرمان کی اطاعت کے لیے

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۶۔

[2] شفاعت اس کے شرائط و خصوصیات اور اس کے فلسفہ کے بارے میں اسی طرح اس کے مربوط اعتراضات و مشکلات کے سلسلہ میں تفصیلی بحثیں جلد ۱ سورہ بقرہ کی آیت ۴۸ کے ذیل میں ہم کر چکے ہیں۔

مؤثر ترین محرک اور سبب بن سکتی ہے، اس لیے بلا فاصلہ مزید کہتا ہے :

پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہے اور لوٹتا ہے (اس کی طرف) راستہ۔ (فمن شاء اتخذ الی ربہ مآبا)۔

یعنی اس محرک کے تمام اسباب فراہم ہیں جو خدا کی طرف رجوع کے لیے ہے اور راستے اور کنویں کھدائے جا چکے ہیں۔ انبیاء نے کافی حد تک فرمان حق کی تبلیغ کی ہے اور عقل انسانی نے بھی جو اس کے اندر کا پیغمبر ہے۔ سرکشوں اور پرہیزگاروں کی سرنوشت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے۔ عدالت، مظلوم اور قاضی بھی معین ہو چکے ہیں۔ ایک چیز جو باقی رہ گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان دو ٹوک فیصلہ کرے اور اس اختیار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جو خدا نے اسے دیا ہے راستے کا انتخاب کرے اور آگے بڑھے۔

"مآب" کے معنی محل بازگشت ہیں۔ یہ راستے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ اس کے بعد مجرمین کی سزا کے مسئلہ پر تاکید کے عنوان سے اور اس عظیم دن کے ان لوگوں سے نزدیک ہونے کو بیان کرتے ہوئے جو اسے دور سمجھتے ہیں یا اس کے وجود کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔

مزید فرماتا ہے: "ہم تمہیں قریب کے عذاب سے ڈراتے ہیں (انا انذرناکم عذابا قریبا)۔ دنیا کی عمر جتنی بھی ہے آخرت کی عمر کے مقابلے میں ایک لمحے کے برابر بھی نہیں ہے نیز عربوں کی مشہور ضرب المثل کے مطابق "جو یقیناً آئے گی وہ نزدیک ہے" (کل ما ھو آت قریب)

اسی لیے سورہ معارج کی آیت پانچ سے لے کر سات تک خدا اپنے پیغمبر سے فرماتا ہے: (فاصبر صبرا جمیلا انھم یرونہ بعیدا ونراہ قریبا) صبر کر، صبر جمیل جو ہر قسم کے جزع و فزع سے خالی ہو۔ وہ اس دن کو دور سمجھتے ہیں اور ہم اسے نزدیک دیکھتے ہیں۔

امیر المومنین علیؑ بھی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: (کل آت قریب دان) ہر وہ چیز جو آنے والی ہے قریب ہے[1]

کیوں نزدیک نہ ہو جبکہ عذاب الٰہی کا اصل سبب خود انسانوں کے اعمال ہیں جو ہمیشہ ان کے ساتھ ہیں اور جہنم نے ابھی سے ان کا احاطہ کیا ہوا ہے (وان جھنم لمحیطۃ بالکافرین) (عنکبوت/۵۴)۔ اور چونکہ اس دن ایک گروہ عظیم حسرت و اندوہ میں غرق ہوتے ہوئے نادم و پشیمان ہوگا اور جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

اس تنبیہ کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ عذاب اس دن واقع ہوگا جس دن انسان جو کچھ اپنے ہاتھ سے آگے بھیج چکا ہے وہ سب دیکھے گا اور کافر کہے گا (اے کاش میں مٹی ہوتا)۔ (یوم ینظر المرء ما قدمت یداہ

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۰۳۔

و یقول الکافر یالیتنی کنت ترابا)۔

مفسرین کی ایک جماعت "ینظر" کے لفظ کی اس آیت میں "ینتظر" کے معنی میں تفسیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ مراد یہ ہے کہ انسان اس دن اپنے اعمال کی جزاء کے انتظار میں ہے۔ بعض اسے نامہ اعمال کے مشاہدہ اور نیکیوں اور برائیوں کے دیکھنے کے معنی میں سمجھتے ہیں۔ اور پھر یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مراد اعمال کی جزاء و سزا کا مشاہدہ ہے۔

یہ سب تفسیریں یہاں سے پیدا ہوتی ہیں کہ انہوں نے مسئلہ حضور یعنی اعمالِ انسان کی اس دن تجسیم کی طرف بہت کم توجہ دی ہے ورنہ اس واقعیت کی طرف توجہ کی صورت میں آیت کا مفہوم واضح ہے اور کسی قسم کی تقدیر و تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ قرآن کی مختلف آیات اور اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اعمال اس دن مناسب صورتوں میں مجسم ہو کر اس کے سامنے ظاہر ہوں گے۔ وہ حقیقتاً اپنے اعمال کو دیکھے گا اور اپنے بُرے اعمال کے منظر کے مشاہدہ سے وحشت و ندامت محسوس کرے گا اور حسرت میں ڈوب جائے گا اور اپنے حسنات کو دیکھنے سے شاد و مسرور ہوگا اور اصولی طور پر نیکوکاروں کا بہترین اجر اور بدکاروں کی مناسب ترین سزا ان کے مجسم اعمال ہیں جو ان کے ساتھ ساتھ ہوں گے۔

سورہ کہف کی آیت ۴۹ میں ہم پڑھتے ہیں: (ووجدوا ما عملوا حاضرًا) "جو کچھ وہ انجام دیتے تھے اسے حاضر پائیں گے"۔ اور سورہ زلزال کی آخری آیات میں آیا ہے (فمن یعمل مثقال ذرة خیرًا یرہ ومن یعمل مثقال ذرة شرًا یرہ) جس شخص نے ذرہ برابر بھی نیک کام کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی بُرا کام کیا ہوگا وہ اسے دیکھے گا۔

اور روزِ قیامت کے عجائبات میں سے ہے کہ وہاں انسان کے اعمال مجسم ہوں گے اور قوتیں مادہ میں تبدیل ہو کر جاندار ہو جائیں گی (قدمت یداہ)۔ "اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے" کی تعبیر اس لیے ہے کہ انسان زیادہ تر کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتا ہے۔ لیکن مسلّم ہے کہ صرف ہاتھ کے اعمال پر منحصر نہیں ہے بلکہ جو کچھ وہ زبان، آنکھ اور کان سے بھی انجام دیتا ہے وہ سب اس قانون کے ذیل میں ہے۔

قرآن اس دن کے آنے سے پہلے ہمیں خبردار کرتا ہے اور کہتا ہے ہر شخص کو دیکھنا چاہیئے کہ اس دن کے لیے اس نے آگے کیا بھیجا ہے (ولتنظر نفس ما قدمت لغد) (حشر/۱۸)۔

بہرحال بعد اس کے کہ کفار اپنی عمر کے تمام اعمال کو اپنے سامنے موجود پائیں گے اسی غم و اندوہ و حسرت میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور کہیں گے کاش ہم خاک ہوتے۔ کاش ابتدا میں ہم خاک کے مرحلہ سے اوپر نہ جاتے۔ جماد سے نامی (نشوونما کرنے والے نباتات) اور نامی سے حیوان اور حیوان سے انسان نہ بنتے اور کاش بعد اس کے کہ ہم انسان ہو گئے اور مر گئے تو مرنے اور خاک ہونے کے بعد قیامت میں نئی زندگی حاصل نہ کرتے۔

البتہ وہ جانتے ہیں کہ مٹی بھی ان سے بہتر ہے کیونکہ مٹی ایک دانہ لیتی ہے اور کبھی کبھی سو دانے واپس کرتی ہے۔ انواع و اقسام کے غذائی مواد، معدنیات اور بہت سی برکتوں کا منبع و سرچشمہ ہے۔ مٹی انسان کا بستر اور اس کی زندگی کا گہوارہ ہے اور بغیر اس کے کہ اس میں کوئی ضرر ہو وہ یہ سب فوائد لیے ہوئے ہے لیکن وہ مٹی کے فوائد میں سے ایک بھی نہیں رکھتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ بہت سی خرابیوں کی کان ہیں۔

جی ہاں! اس انسان کا کام جو اشرف المخلوقات ہے بعض اوقات کفر و گناہ کی بنیاد بنتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ آرزو کرتے ہیں کہ وہ کسی بے روح اور پست مخلوق کی صف میں کھڑے ہوتے۔ آیات قرآنی میں ہم پڑھتے ہیں کہ کفار اور مجرم جب قیامت میں پروردگار کی دادرسی کا منظر اور اعمال کی جزا کا مشاہدہ کریں گے تو وہ کئی عکس العمل دکھائیں گے جو ان کی شدت تاثر و تاسف کی ترجمانی کریں گے۔

کبھی کہیں گے وائے ہو ہم پر اور ہماری اس حسرت پر کہ ہم نے فرمان خداوندی کی اطاعت میں کوتاہی کی (یا حسرتی علی ما فرطت فی جنب اللّٰہ) (زمر/۵۶)۔ اور کہیں گے "خداوندا! ہمیں دنیا کی طرف پلٹا تاکہ ہم عمل صالح کر سکیں۔ (فارجعنا نعمل صالحًا) (الم سجدہ/۱۲)۔ اور کبھی کہیں گے کاش ہم خاک ہوتے اور کبھی زندہ نہ ہوتے، جیسا کہ زیر بحث آیات میں آیا ہے۔

ایک نکتہ

مسئلہ جبر و اختیار کے حل ہونے کا واضح راستہ

یہ مسئلہ قدیم ترین مسائل میں سے ہے جو علماء کو درپیش ہے کہ ایک گروہ ارادۂ انسانی کا قائل ہے۔ دوسرا گروہ جبر کا طرفدار ہے اور ہر ایک گروہ نے اپنے مقصد کو ثابت کرنے کے لیے کچھ دلائل پیش کیے ہیں۔ لیکن جاذب توجہ یہ ہے کہ "جبریین" اور اختیار کے طرف دونوں ہی عمل میں اصل اختیار اور ارادہ کی آزادی کو قانونی طور پر قبول کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ساری بحثیں مباحث علمی کے دائرہ میں مقید ہیں نہ کہ مقام عمل میں۔ اور یہ چیز اچھی طرح سے بتاتی ہے کہ اصل ارادہ کی آزادی اور اختیار تمام انسانوں کا فطری ہے۔

اگر درمیان میں مختلف وسوسے نہ ہوں تو تمام لوگ آزادئ ارادہ کے معترف ہوں۔ یہ عمومی وجدان اور فطرت جو اختیار کے دلائل میں سب سے زیادہ واضح ہے انسان کی زندگی میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اگر انسان خود کو اپنے اعمال کے بارے میں مجبور سمجھتا اور اپنے لیے اختیار کا قائل نہ ہوتا تو ایسا کیوں ہے کہ:

۱۔ ان اعمال کی بنا پر جنہیں انجام دیا یا ان اعمال کی بنا پر جنہیں انجام نہیں دیا پشیمان ہوتا ہے اور پختہ ارادہ کرتا ہے کہ آئندہ زمانہ میں تجربہ سے فائدہ اٹھائے۔ یہ حالت ندامت عقیدۂ جبر کے قائلوں میں زیادہ ہے اگر اختیار نہیں ہے تو ندامت کیوں؟

۲۔ بدکاروں کو سب لوگ ملامت و سرزنش کرتے ہیں اگر جبر ہے تو یہ سرزنش کیسی؟

۳۔ نیکوکاروں کی مدح وتعریف وستائش کرتے ہیں۔ کیوں؟

۴۔ اولاد کی تعلیم وتربیت میں کوشش کرتے ہیں کہ وہ سعادت مند ہوں۔ اگر سب مجبور ہیں تو پھر تعلیم کیا مفہوم رکھتی ہے؟

۵۔ معاشرہ کے اخلاق کو بلند کرنے کے لیے سب علماء بغیر استثناء کوشش کرتے ہیں۔

۶۔ انسان اپنی خطاؤں اور غلطیوں سے توبہ کرتا ہے۔ اصل جبر کو قبول کر لینے کی صورت میں توبہ کیا معنی رکھتی ہے؟

۷۔ انسان اپنی کوتاہیوں پر حسرت کرتا ہے آخر کیوں؟

۸۔ ساری دنیا بدکاروں اور مجرموں کا محاسبہ کرتی ہے اور ان سے شدید طور پر بازپرس ہوتی ہے وہ کام جو اختیار سے باہر ہے اس کی بازپرس اور محاکمہ کیسا؟

۹۔ ساری دنیا اور تمام اقوام عالم کے درمیان عام اس سے کہ وہ خداپرست ہوں یا مادیین یہ طے ہے کہ وہ مجرموں کے لیے سزا کے قائل ہیں۔ اس کام کی سزا کیسی جس پر وہ مجبور تھا۔

۱۰۔ یہاں تک کہ جبر کے حامی، جب کوئی شخص اُن کو گھسیٹے اور ان کی برائی کرے اور حیثیت کو مجروح کرے تو فریاد کرتے ہیں اور اس کو قصوروار ٹھہراتے ہیں اور اسے عدالت میں لے جاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ اگر واقعی انسان کوئی اختیار نہیں رکھتا تو پھر پشیمانی کے کیا معنی ہیں اور ملامت وسرزنش کس لیے ہے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں رعشہ ہو اس کو ملامت کی جائے۔ نیکوکاروں کی تعریف کیوں کی جاتی ہے اور انہیں نیکی پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ کیا وہ اختیار رکھتے ہیں کہ شوق دلانے سے نیک کام کرنے لگیں گے؟ اصولی طور پر تعلیم وتربیت کی تاثیر کو قبول کر لینے کی صورت میں جبر اپنا مفہوم کھو بیٹھتا ہے؟

اس سے قطع نظر ارادہ کی آزادی کے بغیر اخلاقی مسائل کا بھی کوئی مفہوم نہیں ہے۔ اگر ہم اپنے کاموں میں مجبور ہیں تو توبہ کی کیا ضرورت ہے۔ حسرت وندامت کس لیے ہے۔ شخص مجبور کا محاکمہ کرنا اور اسے عدالت میں لے جانا سب سے زیادہ ظالمانہ کام ہے اور اس کو سزا دینا اس محاکمہ سے زیادہ نامناسب ہے۔

یہ سب چیزیں بتاتی ہیں کہ ارادہ کی آزادی والی حقیقت سب انسانوں میں فطری ہے اور تمام نوع بشر کے وجدان کے موافق ہے۔ نہ صرف عوام بلکہ سارے خواص اور سب فلاسفہ عمل کی دنیا میں اسی طرح ہیں یہاں تک کہ جبری بھی عمل میں اختیاری ہیں (الجبریون اختیاریون من حیث لا یعلمون)

قابلِ توجہ یہ کہ قرآن مجید نے بارہا اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ نہ صرف زیرِ بحث آیات میں فرماتا ہے: (فمن شاء اتخذ الی ربہ مآبا) جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستے کا انتخاب کر سکتا ہے۔ بلکہ دوسری آیات میں بھی انسان کے ارادہ پر بہت سے مقامات پر خصوصی روشنی ڈالی ہے جن سب کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔

ہم صرف ذیل کی تین آیات پر اکتفا کرتے ہیں : (انا ھدیناہ السبیل اما شاکرًا و اما کفورًا) ہم نے انسان کو راستہ دکھا دیا ہے چاہے وہ قبول کرکے شکر گزار بنے یا مخالفت کرکے کفران کرے۔ (دہر/۳)۔ اور سورہ کہف کی آیت ۲۹ میں فرماتا ہے: (فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر) جو شخص چاہتا ہے ایمان لے آئے اور جو نہیں چاہتا وہ کفر کی راہ اختیار کرے۔ نیز سورہ دہر کی آیت ۲۹ میں ہم پڑھتے ہیں (ان ھذہ تذکرۃ فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا) یہ تذکرہ ہے جو شخص چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستے کا انتخاب کرے۔

مسئلہ جبر و تفویض کے بارے میں گفتگو بہت طولانی ہے اور اس سلسلہ میں کئی کتابیں اور مقالے لکھے گئے ہیں اور جو کچھ اوپر کہا گیا ہے وہ صرف اس مسئلہ کی طرف قرآن و وجدان کے زاویہ سے نگاہ ڈالی ہے۔ اس گفتگو کو ہم ایک اہم نکتہ پیش کرکے ختم کرتے ہیں۔ ایک گروہ کا مسئلہ جبر کا قائل ہونا چند فلسفیانہ اور استدلال سے تعلق رکھنے والی مشکلات کی بنا پر ہے۔ اس کے علاوہ کچھ دوسرے نفسیاتی، اجتماعی اور معاشرتی اہم عوامل بھی بلاشک و شبہ اس عقیدہ کے پیدا ہونے اور باقی رہنے میں دخل رکھتے ہیں۔

بہت سے افراد نے جبر کے عقیدہ کو، یا جبری سرنوشت کو، یا اس قضا و قدر کو جس کے معنی میں جبر داخل ہے، اور جن سب کی ایک ہی بنیاد ہے، ذمہ داری اور جوابدہی سے بچنے کے لیے قبول کیا ہے یا پھر اس عقیدہ کو اپنی ان ناکامیوں کے لیے ایک حجاب کے طور پر اپنایا ہے جو ذاتی کوتاہیوں اور سہل انگاری کی بنا پر سامنے آئی ہیں۔ یا پھر سرکش ہوا و ہوس پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے اختیار کیا ہے اور یہ نظریہ اپنا لیا ہے کہ ہمارے شراب پینے کو وہ ازل سے جانتا ہے اور ہم اسی لیے شراب پیتے ہیں تاکہ خدا کا علم جہالت میں نہ بدل جائے۔

بعض اوقات استعمار اور سامراج کی فضا میں پرورش پانے والے افراد کی قوت مقابلہ کو شکست دینے کے لیے اور مختلف اقوام و ملل کے قہر و غضب کی آگ کو بجھانے کے لیے بہت سے لوگ اس عقیدہ سے متوسل ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو دوسروں کی گردنوں پر سوار کرتے ہیں کہ تمہاری تقدیر میں یہی تھا اور ظاہر ہے تسلیم و رضا کے علاوہ کوئی چارہ کار ہے ہی نہیں۔

اس طرز فکر کو قبول کر لینے سے تمام ظالموں کے اعمال کی توجیہ ہو جاتی ہے اور تمام گنہگاروں کے گناہ منطقی توجیہ پا لیتے ہیں اور مطیع و مجرم کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

خداوندا! ہمیں ان انحرافی عقائد اور ان کے نتائج سے محفوظ فرما۔ پروردگارا! ہمیں معلوم ہے کہ جہنم سرکشوں کے لیے مرصاد اور جنت متقیوں کے لیے کامیابی کی جگہ ہے۔ ہم سب کی چشم امید تیرے لطف و کرم پر لگی ہوئی ہے۔

بارالٰہا! وہ دن جس میں ہم اپنے تمام اعمال اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو ہمیں اس روز شرمندگی و شرمساری سے بچا لیجو۔ آمین یا رب العالمین۔

سورہ نبا کا اختتام

سورۃ نازعات

یہ سورہ مکی ہے

اس میں ۴۶ آیتیں ہیں۔

سورۂ نازعات کے مضامین اور اس کا دائرۂ فکر

یہ سورہ مثل سورہ نبا کے معاد کے مسائل کے محور کے گرد گردش کرتا ہے اور مجموعۃً اس کا چھ حصّوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ سب سے پہلے ایسی قسموں کے ساتھ تاکید جو مسئلہ معاد سے تعلق رکھتی ہیں، قیامت کے عظیم دن کے تحقق پر تاکید کی گئی ہے۔

۲۔ اس سے بعد کے مرحلہ میں اس دن کے ہولناک اور وحشت ناک بعض مناظر کی طرف اشارہ ہے۔

۳۔ ایک اور حصّہ میں مختصر سا اشارہ حضرت موسیٰؑ کے قضیہ اور سرکش فرعون کی سرنوشت کی طرف ہے جو پیغمبر اور مومنین کی تسلی کا باعث بھی ہے اور سرکش مشرکین کے لیے تنبیہ بھی اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ معاد و قیامت کا انکار انسان کو کن گناہوں میں گرفتار کرتا ہے۔

۴۔ بعد والے حصّہ میں آسمان و زمین قدرتِ خدا کے مظاہر کے کچھ نمونے ہیں جنہیں خود امکانِ معاد اور حیات بعد الممات کے لیے دلیل شمار کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ ایک مرتبہ پھر اس عظیم دن کے وحشت ناک حوادث اور سرکشوں کے انجام اور نیکوکاروں کے اجر کی تشریح کرتا ہے۔

۶۔ سورہ کے آخر میں اس حقیقت کی تاکید ہے کہ کوئی شخص بھی اس دن کی تاریخ سے باخبر نہیں ہے لیکن اس قدر مسلّم ہے کہ وہ نزدیک ہے۔

اس سورہ کے لیے نازعات کے نام کا انتخاب اس کی پہلی آیت کی وجہ سے ہے۔

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے: (من قرأ سورة "والنازعات" لم يكن حبسه وحسابه يوم القيامة الا كقدر صلوٰة مكتوبة حتّٰى يدخل الجنة)۔ "جو شخص سورہ نازعات کو پڑھے تو قیامت کے دن اس کا توقف وحساب روزانہ کی ایک نماز پڑھنے کی مقدار کے برابر ہوگا، اس کے بعد وہ جنت میں داخل ہو جائے گا"[1]

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۰۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں :

(من قرأھا لم یمت الّا ریّان ولم یبعثہ اللہ الّا ریّان ولم یدخلہ الجنة الّا ریّان)۔ "جو شخص اس سورہ کو پڑھے تو وہ اس دنیا سے سیراب ہو جائے گا اور خدا اسے سیراب ہی محشور کرے گا اور سیراب ہی جنت میں داخل کرے گا"۔ (حق تعالیٰ کی رحمت بے پایاں سے سیراب)۔[1]

مسلّم ہے کہ جو شخص اس سورہ کے مضمون کو جس کی دل ہلا دینے والی آیتیں سوئی ہوئی ارواح کو بیدار کرتی ہیں اور انہیں ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں، اپنے دل میں جگہ دے اور اس پر خلوص دل سے عمل کرے تو وہ مذکورہ اجر پائے گا۔ یقیناً وہ افراد اس اجر کو نہیں پا سکیں گے جو صرف الفاظ کے پڑھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ صفحہ ۴۲۳۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱ وَالنّٰزِعٰتِ غَرۡقًا ۙ

۲ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا ۙ

۳ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبۡحًا ۙ

۴ فَالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًا ۙ

۵ فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۘ

ترجمہ

خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

۱ قسم ہے ان فرشتوں کی جو مجرموں کی ارواح ان کے جسموں سے شدت کے ساتھ کھینچتے ہیں۔

۲ اور وہ فرشتے جو مومنین کی ارواح نرمی و مدارات ونشاط کے ساتھ نکالتے ہیں۔

۳ اور قسم ہے ان فرشتوں کی جو حکم الٰہی کے اجرا میں تیزی سے چلتے ہیں۔

۴ اور پھر ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں۔

۵ اور وہ جو امور کی تدبیر کرتے ہیں۔

تفسیر

اُن انتھک فرشتوں کی قسم

ان آیات میں پانچ موضوعات کی قسم کھائی گئی ہے اور ان قسموں کا مقصد مسئلہ معاد وقیامت کی حقانیت اور اس کے تحقق کو بیان کرنا ہے۔ فرماتا ہے: "ان کی قسم جو سختی سے کھینچتے اور اکھاڑتے ہیں"

(والنازعات غرقًا) ۔

اور ان کی قسم جو راحت و آرام کے ساتھ جدا کرتے ہیں ۔ (والناشطات نشطًا) ۔

اور ان کی قسم جو سرعت و تیزی سے چلتے ہیں ۔ (والسابحات سبحًا) ۔

اور وہ جو اچھی طرح سبقت لے جاتے ہیں ۔ (فالسابقات سبقًا) ۔

اور وہ جو امور کی تدبیر کرتے ہیں ۔ (فالمدبرات امرًا) ۔

اس سے پہلے کہ ہم ان آیات کی تفسیر پیش کریں جو الفاظ ان میں استعمال ہوئے ہیں مناسب ہے کہ باریک بینی کے ساتھ ان کی وضاحت کی جائے ۔

" نازعات " " نزع " کے مادہ سے ہے ۔ اس کے معنی کسی چیز کو اس جگہ سے اکھاڑنا یا کھینچنا ہیں ۔ مثلاً کمان کو تیر پھینکتے وقت کھینچنا ۔ کبھی کبھی یہ لفظ معنوی امور میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ دل سے عداوت اور محبت کا نزع اس کے اکھاڑ پھینکنے کے معنی میں ہے [1]

" غرق " (ر کے زبر کے ساتھ) (بروزن شفق) بہت سے ارباب لغت کے بقول پانی میں ڈوب جانے کے معنی دیتا ہے کبھی کبھی کسی شدید حادثہ میں مبتلا ہونے کے معنی میں بھی آتا ہے اور غرق بروزن فرق بقول ابن منظور (در لسان العرب) ایک اسم ہے جو مصدر کا جانشین ہوتا ہے اور اغراق کے معنی میں ہے اغراق کے معنی اصل میں آخری ممکن نقطہ تک کمان کو کھینچنے کے ہیں اس کے بعد مبالغہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ یہاں سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اوپر والی آیت میں آیا ہے وہ غرق ہونے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ کسی کام کو اس کی ممکن حد تک انجام دینے کے معنوں میں ہے [2]

" ناشطات " " نشط " (بروزن بہشت) کے مادہ سے اصل میں گرہ کھولنے کے معنی میں ہے جو آسانی سے کھل جاتی ہے ۔ اور وہ کنویں جن کی گہرائی کم ہے اور ان میں سے ڈول آسانی سے ایک ہی دفعہ میں باہر آ جاتا ہے انہیں انشاط کہا جاتا ہے اور بطور کلی یہ لفظ ہر قسم کی اس حرکت کے لیے استعمال ہوتا ہے جو سہولت کے ساتھ انجام پا جائے ۔

" سابحات " " سبح " (بروزن سطح) کے مادہ سے پانی یا ہوا میں سریع و تیز حرکت کے معنوں میں ہے ۔ اس لیے پانی میں نہانے یا گھوڑے کے تیز چلنے یا تیزی سے کسی کام کے پیچھے جانے کو کہا جاتا ہے ۔ تسبیح جو خدا کو ہر عیب و نقص سے پاک شمار کرنے کے معنی میں ہے وہ بھی اسی سے لی گئی ہے ۔ گویا جو شخص تسبیح کرتا ہے وہ پروردگار کی عبادت کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھتا ہے ۔

---

[1] مفردات راغب مادہ " نزع " ۔

[2] کتاب لسان العرب تفسیر مجمع البیان ، تفسیر کشاف اور مجمع البحرین سے رجوع کیا جائے ۔

" سابقات " سبقت کے مادہ سے ، آگے نکل جانے کے معنی میں ہے ، چونکہ گوئے سبقت لے جانا عام طور پر تیز چلنے کے بغیر ممکن نہیں ہے اس لیے کبھی کبھی اس مادہ سے سرعت اور تیزی کے مفہوم کا فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے ۔

" مدبرات " تدبیر کے مادہ سے کسی چیز کی عاقبت اور انجام کے بارے میں غور و فکر کرنا اور سوچنا ہے ۔ چونکہ عاقبت اندیشی اور آئندہ کے بارے میں سوچنا کام کے احسن طریقہ پر انجام پانے کا سبب ہوتا ہے لہٰذا لفظ تدبیر اس معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔

اب اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جو کچھ ان آیات کے الفاظ کے معنی کے بارے میں کہا گیا ہے ہم تفسیر کی طرف رُخ کرتے ہیں ۔ یہ پانچ قسمیں جو ابتدا میں ابہام کے ہالے میں گھری ہوئی ہیں اور ابہام بھی ایسا جو بہت زیادہ غور و فکر کا متقاضی ہے ، ذہن و فکر کو نئی جولانی عطا کرتا ہے اور باریک بینی و مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے ، وہ یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ یہ افراد یا چیزوں کی طرف اشارہ ہیں ۔

مفسرین نے اس سلسلہ میں بہت کچھ گفتگو کی ہے اور بہت سی تفسیریں کی ہیں جن میں سے عمدہ تفسیریں تین محوروں کے گرد گھومتی ہیں ۔

۱۔ ان قسموں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار و مجرمین کی ارواح کو قبض کرنے پر مامور ہیں جو ان روحوں کو بڑی شدت سے کفار و مجرمین کے جسموں سے نکالیں گے ۔ وہ ارواح و نفوس جو حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر بالکل آمادہ نہ تھے اور وہ فرشتے جو مومنین کی روحیں قبض کرنے پر مامور تھے جو مدارات، نرمی اور نشاط کے ساتھ انہیں جدا کرتے ہیں ، وہ فرشتے جو فرمان الٰہی کے اجرا میں سرعت کے ساتھ حرکت کرتے ہیں اور پھر ایک دوسرے پر سبقت لے جاتے ہیں ، خلاصہ یہ کہ جو امورِ عالم کی اس کے فرمان کے ماتحت تدبیر کرتے ہیں ۔

۲۔ یہ قسمیں اشارہ ہیں آسمان کے ستاروں کی طرف جو ہمیشہ ایک افق سے اکھاڑے جاتے ہیں اور دوسرے افق کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں ۔ ایک گروہ آہستہ آہستہ چلتا ہے اور دوسرا گروہ تیزی سے راستہ طے کرتا ہے ۔ یہ سب عالم بالا کے سمندر میں تیر رہے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں اور آخر کار ان تاثیروں کی بنا پر جو ان ستاروں میں ہے (جیسے سورج اور چاند کے نور کی تاثیر کرہ زمین میں) وہ خدا کے فرمان سے امورِ جہان کی تدبیر کرتے ہیں ۔

۳۔ مراد جنگجو ، غازی یا مجاہدین راہ خدا کے گھوڑے ہیں جو اپنے گھروں اور وطنوں سے اکھڑ جاتے ہیں اور جدا ہو جاتے ہیں اس کے بعد نشاط ، نرمی اور آرام کے ساتھ میدان جنگ کا رخ کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرتے ہیں اور جنگی امور کی تدبیر کرتے ہیں ۔

بعض اوقات کچھ مفسرین نے ان تفاسیر کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے ۔ پانچ قسموں میں سے کچھ کو ایک تفسیر سے اور دوسرے حصہ کو دوسری تفسیر سے لیا ہے لیکن کلام کی بنیاد وہی مذکورہ

بالا تین تفسیریں ہیں [1] جن کے درمیان کوئی تضاد موجود نہیں ہے۔

لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اوپر والی آیات سے ان سب کی طرف اشارہ ہو لیکن ان سب میں سے پہلی تفسیر، ان نکات کی طرف توجہ کرتے ہوئے، جو ذیل میں درج کیے جائیں گے، زیادہ مناسب ہے پہلے یہ کہ یہ تفسیر روز قیامت سے مناسبت رکھتی ہے جیسا کہ سورہ کی تمام آیات اس مفہوم کو لیے ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ سورہ مرسلات کی ان ہی جیسی آیات سے مناسبت رکھتی ہیں جو آغاز میں ہیں۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ (فالمدبرات امرًا) کا جملہ زیادہ تر فرشتوں سے مناسبت رکھتا ہے جو امر خدا سے کاروبار جہاں کی تدبیر کرتے ہیں اور ایک لمحے کے لیے بھی اس کے اوامر کی انجام دہی سے روگردانی نہیں کرتے (لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون) (انبیاء/ ۲۷)۔ خصوصاً یہ کہ تدبیر امور کا مسئلہ یہاں بصورت مطلق بیان ہوا ہے اور اس میں کوئی قید و شرط نہیں لگائی گئی ہے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر ائمہ معصومین سے کچھ روایات ان آیات کی تفسیر میں مروی ہیں جو انہی معانی سے مناسبت رکھتی ہیں۔ منجملہ دیگر روایات کے ایک روایت میں حضرت علیؑ کی طرف سے ہے کہ آپ نے (والنازعات غرقًا) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا: "اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو کفار کی روحیں نہایت شدت کے ساتھ ان کے جسموں سے نکالیں گے جس طرح تیر انداز کمان کو آخری مرحلہ تک کھینچتا ہے" [2]

ایسے ہی معانی انہی جناب سے والناشطات، والسابحات اور فالمدبرات کی تفسیر میں نقل ہوئے ہیں [3]

البتہ اسی تفسیر کو زیادہ کلی اور زیادہ عمومی شکل میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ مومنین اور کفار کی روحوں کا قبض ہونا ممکن ہے کہ اس کا ایک مصداق ہو لیکن اس کے تمام مضامین کو صرف اسی عنوان میں محدود کر دینا مناسب نہیں جیسا کہ اس طرح کہا جائے کہ ان قسموں سے مراد تمام تر وہ فرشتے ہیں جو خدا کے تمام اوامر کا اجرا

---

[1] بعض نے چوتھا احتمال پیش کیا ہے۔ موجودات کی طبیعی ارادی اور صنعتی حرکتوں کی قسم مراد لیا ہے، مثلاً ایک نطفہ اپنی اصلی جگہ جو باپ کا صلب ہے وہاں سے اکھڑ کر رحم مادر میں داخل ہو کر قرار پاتا ہے تو اپنی رفتار کو آہستہ آہستہ جاری رکھتا ہے پھر تیز ہو جاتا ہے اور نطفے کے مواد حیاتی ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں اور آخر کار مکمل انسان بنا دیتے ہیں اور اس کی تدبیر کرتے ہیں۔ حرکات ارادی میں بھی انسان پہلے ارادہ کرتا ہے پھر آہستہ سے چل پڑتا ہے پھر تیز ہو جاتا ہے پھر کوشش کرتا ہے کہ وہ دوسروں سے سبقت حاصل کرے۔ آخر میں اپنے امر اور اجتماعی زندگی کی تدبیر کرتا ہے۔ اسی طرح صنعتی وسائل مثلاً ہوائی جہاز اپنی حرکت میں ان تمام مراحل کو طے کرتا ہے۔ (لیکن اس تفسیر کی کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے)

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۹۹ حدیث ۴۔

[3] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۴۹۹ حدیث ۷، ۸، ۱۲۔

کرتے ہیں اور یہ اجرا پانچ مرحلوں میں تحقق پاتا ہے۔
پہلا مرحلہ پہل شدید حرکت اور دو ٹوک ارادہ اور فیصلہ اس کے بعد آہستہ آہستہ چل پڑنا پھر اس میں سرعت اور تیزی اور ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنا اور آخر میں امور کی تدبیر اور کاموں کو ترتیب دینا۔ لیکن بہرحال فرشتوں کا پروگرام کفار و مومنین کی ارواح کو قبض کرنے کے سلسلہ میں اس مفہوم کلی کا ایک مصداق ہے اور سورہ کے آئندہ مباحث کے لیے ایک تمہید شمار ہوتا ہے جو معاد کے بارے میں ہیں۔

دو سوالوں کا جواب

یہاں دو سوال باقی رہ جاتے ہیں۔ پہلا یہ کہ نازعات اور ناشطات جمع مؤنث ہیں تو کس مناسبت سے یہاں استعمال ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ پہلی قسم واؤ قسم کے ساتھ شروع ہوئی ہے لیکن چوتھی اور پانچویں قسم میں اس کی جگہ "ف" ہے جو عطف یا تفریع کے لیے آتی ہے۔
پہلے سوال کے جواب میں اس نکتہ کی طرف توجہ کرنی چاہیئے کہ نازعات نازعۃ کی جمع ہے جس کے معنی فرشتوں کے ایک طائفہ کے ہیں جو اس پروگرام کو انجام دیتا ہے۔ اسی طرح "ناشطات" اور باقی جمع کے صیغے اور چونکہ طائفہ ایک مؤنث لفظی ہے لہٰذا اس کی جمع اسی شکل میں آئی ہے۔
دوسرے سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ سبقت لے جانا حرکتِ سریع کا نتیجہ ہے جو سابحات سے معلوم ہوتی ہے اور تدبیر امور بھی اسی مجموعِ حرکت کا نتیجہ ہے۔
آخری بات جو یہاں کہنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ یہ تمام قسمیں ایک مطلب کو بیان کرنے کے لیے ہیں جو صراحت کے ساتھ آیت میں بیان نہیں ہوا لیکن قرینۂ کلام سے بعد والی آیات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ کہے "ان امور کی قسم تم سب آخرکار مبعوث و محشور ہوگے اور قیامت و معاد حق ہے"۔[1]

---

[1] تقدیر میں اس طرح ہے "لتبعثن یوم القیامۃ ولتحشرن و لتحاسبن"۔

(۶) يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۙ

(۷) تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۗ

(۸) قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ ۙ

(۹) اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ۘ

(۱۰) يَقُوْلُوْنَ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۗ

(۱۱) ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۗ

(۱۲) قَالُوْا تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۘ

(۱۳) فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ

(۱۴) فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ ۗ

ترجمہ

(۶) جس دن وحشتناک زلزلے ہر چیز کو لرزا دیں گے۔

(۷) اور اس کے پیچھے دوسرا حادثہ (صیحہ عظیم) رونما ہوگا۔

(۸) دل اس روز سخت مضطرب ہوں گے۔

(۹) اور ان کی آنکھیں خوف کی شدت کی وجہ سے دھنسی ہوئی ہوں گی۔

(۱۰) (لیکن آج)، وہ کہتے ہیں کیا ہم نئی زندگی کی طرف پلٹ جائیں گے؟

(۱۱) کیا جب ہم بوسیدہ ہڈیاں ہو جائیں گے (ممکن ہے کہ ہم زندہ ہوں)؟

(۱۲) وہ کہتے ہیں اگر قیامت ہے تو نقصان دہ بازگشت ہے۔

(۱۳) لیکن یہ بازگشت صرف ایک عظیم صیحہ سے واقع ہو گی۔

(۱۴) اچانک سب کے سب زمین پر ظاہر ہو جائیں گے۔

تفسیر

معاد صرف ایک عظیم صیحہ سے رو نما ہوگا

بعد اس کے کہ قیامت کا وقوع گزشتہ آیات میں تاکیدی قسموں کے ساتھ ایک امر حتمی و یقینی کی صورت میں بیان ہوا، زیر بحث آیات میں اس عظیم دن کی بعض نشانیوں اور حوادث کی تشریح کرکے فرماتا ہے:

"یہ قبروں سے اٹھنا ایسے دن ہوگا جس میں وحشتناک زلزلے ہر چیز کو لرزہ براندام کر دیں گے" (یوم ترجف الراجفة)۔ پھر دوسرا عظیم حادثہ رونما ہوگا (تتبعها الرادفة)۔

"راجفہ" "رجف" (بروزن کشف) کے مادہ سے اضطراب اور شدید لرزے کے معنوں میں ہے[1] اور چونکہ فتنہ انگیز خبریں معاشرہ کے اضطراب کا سبب ہوتی ہیں لہٰذا انہیں اراجیف کہتے ہیں۔

"رادفہ" "ردف" (بروزن حرف) کے مادہ سے ایسے شخص یا چیز کے معنوں میں ہے جو دوسری چیز یا شخص کے پیچھے ہو اسی لیے اس شخص کو جو مرکب پر دوسرے کے پیچھے بیٹھے اسے ردیف کہتے ہیں۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ راجفہ سے مراد وہی پہلا صیحہ ہے یا پہلے صور کا پھونکا جانا ہے جو عالم کو فنا کرنے والا ناقوس ہے اور ایسا زلزلہ ہے جو دنیا کو فنا کرکے رکھ دے گا اور رادفہ دوسرا صیحہ یا دوسرے صور کا پھونکا جانا ہے جس سے قیامت کا برپا ہونا اور نئی زندگی کی طرف بازگشت متعلق ہے۔

اس بنا پر آیت اس چیز کے مشابہ ہے جو سورہ زمر کی آیت ۶۸ میں آئی ہے۔ (و نفخ فی الصور فصعق من فی السماوات و من فی الارض الّا من شاء اللّٰہ ثم نفخ فیہ اخرٰی فاذا ھم قیام ینظرون) صور پھونکا جائے گا اور وہ تمام لوگ جو زمین اور آسمانوں میں ہیں مدہوش ہو جائیں گے اور مر جائیں گے سوائے اس کے جسے خدا چاہے گا۔

اس کے بعد دوبارہ صور پھونکا جائے گا اچانک سب کھڑے ہو کر حساب کے انتظار میں ہوں گے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ راجفہ اس زلزلے کی طرف اشارہ ہے جو زمین کو لرزہ براندام کر دے گا اور رادفہ وہ زلزلہ ہے

---

[1] توجہ کرنی چاہیئے کہ رجف کا مادہ فعل متعدی کی شکل میں بھی آتا ہے اور فعل لازم کی شکل میں بھی۔ پہلی شکل میں راجفہ اس عظیم زلزلے کے معنی میں ہے جس میں زمین اور تمام موجودات لرزنے لگیں گے۔ دوسری صورت میں راجفہ خود زمین کے معنوں میں ہے جو لرزنے لگے گی۔ (غور کیجئے)۔

جو آسمانوں کو درہم برہم کر دے گا لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : "اس دن وہ دل سخت مضطرب ہوں گے" (قلوب یومئذ واجفة)۔ مجرموں، گنہگاروں اور سرکشی کرنے والوں کے دل شدید طور پر لرز رہے ہوں گے اور وہ حساب وکتاب اور جزا وسزا کے منتظر ہوں گے۔

"واجفہ" "وجف" (بروزن حذف) کے مادہ سے اصل میں سرعت سیر کے معنی میں ہے اور "اوجف البعیر" اس مقام پر کہا جاتا ہے جہاں انسان اونٹ کو بہت تیز چلانے لگے اور چونکہ تیز چلنا اضطراب کا باعث ہے اس لیے یہ لفظ شدت اضطراب کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہ اندرونی اضطراب اس قدر شدید ہوگا کہ اس کے آثار گنہگاروں کے سارے وجود میں ظاہر ہوں گے۔ اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : "ان کی آنکھیں شدت خوف وہراس سے نیچے کی طرف جھکی ہوتی ہوں گی" (ابصارھا خاشعة)[1]

"اس دن آنکھیں دھنسی ہوئی ہوں گے اور حرکت نہیں کر سکیں گی اور خیرہ ہوں گی گویا وہ لوگ شدت خوف سے اپنی نگاہ گم کر دیں گے۔ اب گفتگو کو قیامت سے دنیا کی طرف لے آیا ہے اور فرماتا ہے :

"ان سب چیزوں کے باوجود وہ اس دنیا میں کہتے ہیں کیا ہم دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آئیں گے" (یقولون ءانا لمردودون فی الحافرة)۔

"حافرہ" "حفر" کے مادہ سے زمین کے کھودنے کے معنی میں ہے اور جو اس کھودنے کا اثر باقی رہ جاتا ہے اسے حفر کہتے ہیں۔ گھوڑے کے سُم کو حافر کہتے ہیں اس لیے کہ وہ زمین کو کھودتا ہے۔ اس کے بعد حافرہ کنایہ کے طور پر پہلی حالت میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ انسان جس راستے سے جاتا ہے زمین کو اپنے پاؤں سے کھودتا ہوا جاتا ہے اور اس طرح اس کے پاؤں کے نشان باقی رہ جاتے ہیں اور جب واپس لوٹتا ہے تو انہیں پہلے نشانات پر قدم رکھتا ہے اس لیے یہ لفظ پہلی حالت کے معنی میں آیا ہے[2]

بعد والی آیت ان کی باتوں کو نقل کرتے ہوئے کہتی ہے کیا جس وقت ہم بوسیدہ اور پراگندہ ہڈیوں کی شکل میں ہو گئے تو دوبارہ زندگی کی طرف لوٹیں گے" (ءاذا کنا عظاما نخرة)[3]

---

[1] ابصارھا کی ضمیر قلوب کی طرف لوٹتی ہے جو یہاں نفوس وارواح کے معنی میں ہیں اور یہ اضافت اس بناء پر ہے کہ انسانی حواس کے تاثرات سب اس کی روح اور جان سے متعلق ہیں اور اضطراب ووحشت کا منبع جو آنکھوں میں ہے وہی وحشت ہے جو روح پر سایہ فگن ہے۔

[2] توجہ کرنی چاہیئے کہ اسم فاعل یہاں اسم مفعول کے معنی میں ہے اور حافرہ محفور کے معنی میں ہے۔

[3] اس جملہ میں کچھ محذوف ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ (ءاذا کنا عظاما نخرة نرد احیاء) یا (ءانا لمبعوثون)۔

یہ وہی چیز ہے جس پر منکرین معاد و قیامت ہمیشہ انحصار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ بات باور نہیں کی جا سکتی کہ ریزہ ریزہ ہو جانے والی بوسیدہ ہڈی دوبارہ بدن میں لباس حیات پہنے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ اس صورت حال اور ایک زندہ وجود کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ دیکھتے تھے۔ وہ گویا فراموش کر چکے تھے کہ ابتداء میں بھی اسی خاک سے پیدا ہوتے تھے۔

"نخرہ" صفت شبہ ہے (نخر بر وزن نخل) کے مادہ سے اور اسی طرح (بروزن شجر) اصل میں بوسیدہ اور کھوکھلے درخت کے معنوں میں ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو وہ آواز دیتا ہے۔ وہ آواز جو ناک میں گردش کرتی ہے اُسے نخیر کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ لفظ ہر بوسیدہ اور ٹوٹے پھوٹے وجود کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔

منکرین معاد صرف اسی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ معاد کا مذاق اڑاتے ہیں اور تمسخر کے انداز میں کہتے ہیں "اگر قیامت ہونی ہے تو نقصان دہ بازگشت کا سبب ہے ہماری حالت اس روز سخت اور دردناک ہوگی" (قالوا تلك اذا كرة خاسرة)۔

دوسرا احتمال جو اس آیت کی تفسیر میں ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات مذاق کے طور پر نہیں بلکہ سنجیدگی سے کہتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اگر دوبارہ زندگی کی طرف واپس لوٹنا ہے تو ایک فضول اور بے ہودہ قسم کا لوٹنا ہے اور یہ نقصان دہ ہے۔ اگر زندگی اچھی چیز ہے تو کیا ہی بہتر ہو کہ خدا اس زندگی کو باقی رکھے اور اگر بُری ہے تو پھر بازگشت کس لیے ہے۔ (ءانا لمردودون فى الحافرة)

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "حافرہ" گڑھے کے معنوں میں ہے وہ بھی تفسیر کے لیے قرینہ بن سکتا ہے لیکن مفسرین کے درمیان جو مشہور ہے وہ پہلی تفسیر ہے۔

قابل توجہ یہ بات ہے کہ گزشتہ آیات میں "یقولون" کی تعبیر آئی ہے جو ان کی جانب سے اس بات کی تکرار اور استمرار کی نشانی ہے لیکن "قالوا" (انہوں نے کہا) کی تعبیر زیر بحث آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ اس بات کی وہ ہمیشہ تکرار نہیں کرتے تھے۔ یہ بات ان سے کبھی کبھار سرزد ہوتی تھی اور یہ نکتہ ہے اس تعبیر کے مختلف ہونے کا۔

ان آیات کے آخر میں ایک مرتبہ پھر قیام قیامت اور حشر کے برپا ہونے کے مسئلہ کی طرف رُخ کرتے ہوتے دو ٹوک اور سرکوبی کرنے والے انداز میں فرماتا ہے:

"یہ بازگشت صرف ایک صیحہ اور عظیم فریاد سے واقع ہوگی" (فانما هى زجرة واحدة)۔ اچانک سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے (فاذا هم بالساهرة)۔ یہ کام پیچیدہ اور مشکل نہیں ہے جب بھی بحکم خدا دوسرا نفخہ پھونکا جائے گا اور زندگی کی اذان دی جائے گی تو تمام مٹی اور بوسیدہ ہڈیاں ایک ہی مرتبہ جمع ہو جائیں گی اور ان میں جان پڑ جائے گی اور سب قبروں سے نکل کر باہر آ جائیں گے۔

"زجرة" اصل میں اس فریاد اور بلند آواز کے معنی میں ہے جو کسی کے ہانکنے کے لیے نکالی جاتی ہے اور

یہاں دوسرے نفخہ کے معنوں میں ہے۔

"زجرۃ واحدۃ" کی تعبیر کا انتخاب ان دونوں الفاظ کے مفہوم کی طرف توجہ کرتے ہوئے قیامت کے تیزی سے اور ناگہانی طور پر برپا ہونے اور خدا کی قدرت کے سامنے اس کے نہایت آسان ہونے کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ قیامت کے فرشتے یا صور اسرافیل کی ایک تحکمانہ آواز مُردوں کے بدن کو زندگی کا لباس پہنادے گی اور وہ عرصۂ حشر میں حساب کتاب کے لیے حاضر ہو جائیں گے۔

"ساھرۃ" "سھر" (بروزن سحر) کے مادہ سے شب بیداری کے معنوں میں ہے اور چونکہ وحشت ناک حوادث رات کی نیند اڑا دیتے ہیں، پھر قیامت کی زمین نہایت دہشت انگیز ہے اس لیے عرصۂ حشر کے لیے لفظ "ساھرہ" صرف کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ "ساھرہ" ہر بیابان کو کہتے ہیں چونکہ اصولی طور پر تمام بیابان وحشت ناک ہوتے ہیں گویا وحشت کی بنا پر رات کی نیند اڑا دیتے ہیں [1]

---

[1] لسان العرب مادہ سھر اور مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۲۹، تفسیر قرطبی، جلد ۱۰ ص ۶۹۹۔

(۱۵) هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝
(۱۶) اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝
(۱۷) اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝
(۱۸) فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝
(۱۹) وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۝
(۲۰) فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ۝
(۲۱) فَكَذَّبَ وَعَصٰى ۝
(۲۲) ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ۝
(۲۳) فَحَشَرَ فَنَادٰى ۝
(۲۴) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝
(۲۵) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ۝
(۲۶) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝

ترجمہ

(۱۵) کیا تجھ تک موسٰی کی داستان پہنچی ہے؟

(۱۶) جس وقت اس کے پروردگار نے سرزمین مقدس طوی میں اس کو پکارا اور کہا۔

(۱۷) فرعون کی طرف جا کہ وہ سرکش و طاغی ہو گیا ہے۔

۲۔ فرعون کو دعوتِ فکر دینے کے لیے نہایت نرم اور خیر خواہانہ تعبیر کے ساتھ حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے: "اس سے کہہ کیا تو میل اور رغبت رکھتا ہے کہ تو پاک و پاکیزہ ہو جائے (مطلق پاکیزگی جو شرک و کفر سے پاکیزگی بھی ہے اور ظلم و فساد کی ناپاکی سے بھی) اس تعبیر کے مشابہ جو سورہ طٰہٰ کی آیت ۴۴ میں آئی ہے (فقولا له قولًا لينًا) "اس کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرو"۔

۳۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ انبیاء کی رسالت کا مقصد انسانوں کا پاک کرنا ہے اور ان کی طرف پہلی فطری طہارت کو لوٹانا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ میں تجھے پاک کروں بلکہ کہتا ہے کہ تو پاکیزگی کو قبول کرے یہ جملہ بتاتا ہے کہ پاک ہونا اپنی خواہش کے نتیجے میں ہو نہ یہ کہ باہر سے اس پر یہ بات لادی جائے۔

۴۔ پاک ہونے کے بعد ہدایت کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے خود کو پاک و صاف کیا جائے پھر کوئے دوست میں قدم رکھا جائے۔

۵۔ ربک (تیرا پروردگار) کی تعبیر حقیقت میں اس نکتہ کی تاکید ہے کہ میں تجھے ایسی ذات کی طرف لے جاؤں گا جو تیرا مالک، مربی اور پرورش کرنے والا ہے تو پھر کیوں راہِ سعادت سے گریز کرتا ہے۔

۶۔ خدا ترسی خدا کی طرف سے ہدایت کا نتیجہ ہے۔ جی ہاں شجرِ توحید و ہدایت کا ثمر یہی ہے کہ انسان جان لے کہ اسے خدا کے سامنے حاضر ہو کر جوابدہ ہونا ہے اس لیے کہ خوفِ خدا کبھی معرفتِ خدا کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، اسی لیے تو سورہ فاطر کی آیت ۲۸ میں ہم پڑھتے ہیں (انما یخشی الله من عباده العلماء) صرف علماء اور صاحبانِ معرفت ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔

۷۔ حضرت موسیٰؑ سب سے پہلے اس کی شفقت آمیز ہدایت کی طرف جاتے ہیں اس کے بعد عقلی و منطقی ہدایت کرتے ہیں بذریعہ آیتِ کبریٰ یعنی بہت بڑا معجزہ دکھا کر اور یہ مؤثر ترین راہِ تبلیغ ہے۔ پہلے خیر خواہی اور محبت کے انداز سے مقابل کو متاثر کرے اور پھر استدلال و حجت کے ساتھ اسے قائل کرے۔

اب دیکھیں کہ فرعون نے اس لطف و محبت اور اس منطق و بیانِ زیبا اور آیتِ کبریٰ کے دکھانے کے مقابلہ میں کیا رویہ اختیار کیا۔ یہ سرکش خیرہ سر اپنے مرکبِ غرور سے بالکل نیچے نہیں اترا۔ اور جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے اس نے موسیٰؑ کی دعوتِ فکر کی تکذیب کی اور پروردگار کی نافرمانی کی (فکذب و عصٰی)۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ تکذیب عصیان و نافرمانی کی تمہید ہوتی ہے جس طرح تصدیق ایمان و اطاعت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس پر بھی قناعت نہیں کی اور موسیٰؑ کی دعوتِ فکر کے مقابلہ میں وہ صرف الگ ہی نہیں رہا بلکہ اس نے پشت پھیری اور بلا تامل موسیٰؑ سے لڑنے اور ان کے دین کو برباد کرنے کی کوشش کرنے لگا (ثم ادبر یسعٰی)[1]

---

[1] ثم کی تعبیر عام طور پر دو حادثوں کے درمیان فاصلہ کے لیے آتی ہے ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ فرعون نے ایک مدت کا فاصلہ دیا ہو تاکہ اس کے موسیٰؑ سے مبارزہ کرنے کا نقشہ مکمل طور پر مضبوط اور تیار ہو جائے۔

اور چونکہ موسیٰ کا معجزہ اس کی ساری سرکشی کی طاقت کو خطرہ میں ڈالتا تھا اس لیے اس نے اپنے مامورین ہر شہر میں بھیجے تاکہ وہ جادوگروں کو جمع کریں اور لوگوں میں منادی کریں کہ وہ موسیٰ اور جادوگروں کا مقابلہ دیکھیں (فحشر فنادیٰ)۔

اگرچہ قرآن نے یہاں لفظ حشر کو مطلق بیان کیا ہے لیکن سورہ اعراف کی آیت ۱۱۱، ۱۱۲ (وارسل فی المدائن حاشرین یأتوک بکل ساحر علیم) کے قرینہ سے اور نادیٰ کی تعبیر سے جو اگرچہ مطلق ہے ظاہراً فرعون کے لوگوں کو جمع کرنے اور اس مقابلے کے منظر کو دیکھنے کی دعوت دینے کی طرف اشارہ ہے اور سورہ شعراء کی آیت ۳۹ (و قیل للناس هل انتم مجتمعون) "اور لوگوں سے کہا گیا تم جمع ہو گئے ہو" کے قرینے سے بھی۔

پھر بھی ان سازشوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بدترین تعبیروں کے ساتھ عظیم ترین دعویٰ کرتے ہوئے کہا: میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں (فقال انا ربکم الاعلیٰ)۔

واقعی عجیب سی بات ہے کہ یہ خیرہ سر طاغی و سرکش جب مرکب غرور و تکبر و خود پرستی پر سوار ہوتے ہیں تو پھر کسی مقام پر رُکنے کا نام نہیں لیتے حتیٰ کہ دعویٰ خدائی پر بھی قناعت نہیں کرتے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ خداؤں کے خدا ہو جائیں۔

یہ بات ضمنی طور پر اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم بتوں کی پوجا کرتے ہو تو وہ اپنی جگہ پر محترم سہی لیکن میں افضل ترین ہوں اور تمہارا معبود ہوں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ فرعون سورہ اعراف کی آیت ۱۲۷ کی شہادت سے (اتذر موسٰی و قومه لیفسدوا فی الارض و یذرک و اٰلهتک) کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو اجازت دیتا ہے کہ وہ زمین میں فساد کریں اور تجھے اور تیرے معبودوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں۔

فرعون جو ایک بت پرست تھا لیکن یہاں دعویٰ کرتا ہے میں تمہارا سب سے بڑا پروردگار ہوں یعنی وہ اپنے آپ کو اپنے معبود سے بھی بالاتر خیال کرتا ہے۔ یہ ہیں سرکشوں کی بیہودہ گوئیاں۔

اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک جگہ صرف الوہیت کا دعویٰ کرتا ہے (ما علمت لکم من اله غیری)۔ میں اپنے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں جانتا۔ (قصص/ ۳۸)۔

لیکن زیر بحث آیت میں ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے میں تمہارا پروردگار ہوں۔ یہ ہے لائحہ عمل ان ہلکے دماغ والے مغروروں کا۔

بہرحال فرعون نے اپنی سرکشی کو آخری مرحلہ تک پہنچایا اور بہت زیادہ دردناک عذاب کا مستحق ہوا۔ فرمان الٰہی آن پہنچا اور وہ اور اس کی ظلم و فساد کی قوت درہم برہم ہو گئی۔ اسی لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

خدا نے اسے دنیا اور آخرت کے عذاب میں گرفتار کیا (فاخذہ اللہ نکال الآخرۃ والاولیٰ) [1]

"نکال" (بروزن ضلال) کے معنی اصل میں ضعف و ناتوانی اور عجز کے ہیں۔ اسی لیے اس شخص کے بارے میں جو رقم کی ادائیگی کا حکم نہ دے، کہتے ہیں کہ اس نے نکول کیا۔ "نکل" (بروزن فکر) اس بھاری زنجیر کو کہتے ہیں جو انسان کو کمزور کر دے اور چلنے سے روک دے۔ چونکہ عذاب الٰہی بھی ناتوانی کا باعث ہے اور دوسرے افراد کو ارتکاب گناہ سے روکتا ہے اسی لیے اسے "نکال" کہا گیا ہے۔

"نکال الآخرۃ" کی تعبیر سے قیامت کے اس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو فرعون اور اس بکھیڑ کار ٹولے پر نازل ہوگا اور چونکہ وہ اہم ترین ہے لہٰذا اُسے مقدم سمجھا گیا ہے۔ اولیٰ سے مراد دنیاوی عذاب ہے جو فرعون پر نازل ہوا اور اس نے فرعون کے سب یار و انصار کو دریائے نیل میں غرق کر دیا۔

یہاں اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان ہوئی ہے اور وہ یہ کہ الاولیٰ سے مراد وہ پہلا کلمہ اور لفظ ہے جو فرعون نے اپنی سرکشی کے راستے میں کہا اور الوہیت کا دعویٰ کیا۔ (قصص/۳۸) اور "الآخرۃ" آخری کلمہ اور لفظ کی طرف اشارہ ہے جو اس نے کہا اور ربوبیت اعلیٰ کا دعویٰ کیا۔ خدا نے اسے ان دونوں کفر آمیز دعووں کی سزا اس دنیا میں دی۔

یہ معنی ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہیں۔ امام نے مزید فرمایا ہے کہ ان دونوں جملوں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ تھا اور خدا نے انتہائی اتمام حجت کے لیے اس مدت میں اس پر عذاب نازل نہیں کیا۔ یہ تفسیر اخذ کے لفظ کے ساتھ، جو فعل ماضی ہے اور بتاتا ہے کہ یہ سزا مکمل طور پر دنیا میں واقع ہوئی اور اس کے بعد کی آیت جو اس واقعہ کو درس عبرت شمار کرتی ہے زیادہ موافق ہے۔

انجام کار آخری زیر بحث آیت میں اس واقعہ کی تکمیل سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اس موسیٰ اور فرعون کی داستان اور اس کے انجام کو پہنچنے میں، ان کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں ایک عظیم درس عبرت ہے۔ (ان فی ذالک لعبرۃ لمن یخشٰی)۔

یہ آیت اچھی طرح بتاتی ہے کہ اس قسم کے واقعات سے عبرت حاصل کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو خوف خدا اور احساس ذمہ داری کو دل میں جگہ دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عبرت حاصل کرنے والی نظر رکھتے ہیں اور اچھائی اور برائی سے درس عبرت لینا جن کا اصول ہے۔

---

[1] نکال منصوب ہے "بنزع الخافض" اور تقدیر میں "فاخذہ اللہ بنکال الآخرۃ" تھا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اخذ کا مفعول مطلق ہو جو "نکّل" کے معنی میں ہے (باب تفعیل کا فعل ماضی ہے) اور معنی کے لحاظ سے "نکّل اللہ بہ نکال الآخرۃ" ہے۔

(۱۵) هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰىۘ
(۱۶) اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًىۚ
(۱۷) اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰىۖ
(۱۸) فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰىۙ
(۱۹) وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰىۚ
(۲۰) فَاَرٰىهُ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰىۖ
(۲۱) فَكَذَّبَ وَعَصٰىۖ
(۲۲) ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰىۖ
(۲۳) فَحَشَرَ فَنَادٰىۖ
(۲۴) فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰىۖ
(۲۵) فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰىؕ
(۲۶) اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰىؕ

ترجمہ

(۱۵) کیا تجھ تک موسٰی کی داستان پہنچی ہے؟
(۱۶) جس وقت اس کے پروردگار نے سرزمین مقدس طوٰی میں اس کو پکارا اور کہا۔
(۱۷) فرعون کی طرف جا کہ وہ سرکش و طاغی ہو گیا ہے۔

(۱۸) اور اس سے کہہ کیا تُو چاہتا ہے کہ پاک ہو جائے۔

(۱۹) اور مَیں تجھے تیرے پروردگار کی طرف ہدایت کروں تاکہ تو اس سے ڈرے۔

(۲۰) اس کے بعد موسٰی نے اسے عظیم معجزہ دکھایا۔

(۲۱) لیکن اس نے تکذیب اور نافرمانی کی۔

(۲۲) پھر پشت پھیری اور اس نے (دینِ موسٰی کے مٹانے کی) مسلسل کوشش کی۔

(۲۳) اور جادوگروں کو جمع کیا اور لوگوں کو دعوت دی۔

(۲۴) اور کہا مَیں تمہارا بہت بڑا پروردگار ہوں۔

(۲۵) اس لیے خدا نے اسے آخرت کے اور دنیا کے عذاب میں گرفتار کیا۔

(۲۶) اس میں عبرت اُن لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں۔

تفسیر

فرعون کہتا تھا کہ مَیں تمہارا بہت بڑا خدا ہوں

نسبتاً تفصیلی بیانات کے بعد جو گزشتہ آیات میں مسئلہ معاد اور مشرکین کے انکار و مخالفت کے بارے میں آئے تھے زیرِ بحث آیات میں تاریخ کے ایک بہت بڑے سرکش یعنی فرعون اور اس کی دردناک سرنوشت کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ مشرکین عرب بھی جان لیں کہ ان سے زیادہ طاقتور افراد بھی خدا کے غضب اور عذاب کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہ لا سکے، اور وہ مومنین کو بھی جوش دلائے کہ وہ دشمن کی ظاہری طاقت کی برتری سے دل میں خائف نہ ہوں اس لیے کہ ان کو درہم برہم کرنا اور ان کی سرکوبی کرنا خدا کے لیے بہت ہی آسان ہے۔ پہلے یہاں سے شروع کرتا ہے:

"کیا تجھ تک موسٰی کی داستان پہنچی ہے؟ (ھل اتاک حدیث موسٰی)۔ قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے مقصدِ کلام کو استفہام کے ساتھ شروع کرتا ہے تاکہ سننے والے کے شوق کو بیدار کرے اور وہ اس عبرتناک داستان کو سننے کے لیے آمادہ ہو۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"جس وقت اس کے پروردگار نے اسے سرزمینِ مقدس طوٰی میں پکارا۔ (اذ ناداہ ربہ

بالواد المقدس طوی) [1]

"طوی" ہو سکتا ہے کہ مقدس سرزمین کا نام ہو جو شام میں مدین و مصر کے درمیان واقع تھی اور وحی کا پہلا شعلہ اسی بیابان میں موسیٰؑ کے دل پر نازل ہوا۔ یہی تعبیر سورہ طٰہٰ میں بھی آئی ہے جہاں موسیٰؑ ایک ندا سنتے ہیں جو کہتی ہے: (انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طوی) "میں تیرا پروردگار ہوں اپنے جوتے اتار دے کہ تُو وادی مقدس طویٰ میں ہے" (طٰہٰ/۱۲)۔

یا طویٰ طی کے مادہ سے ہے اور وصفی معنی رکھتی ہے جو لپیٹنے کے معنی میں ہے تو گویا وہ زمین پاکیزگی و برکت میں لپٹی ہوئی ہے۔ یا راغب کے بقول ضروری تھا کہ حضرت موسیٰؑ ایک طولانی راستہ طے کریں یہاں تک کہ وحی کے لیے آمادہ ہوں لیکن خدا نے اس راستے کو ان کے لیے لپیٹ دیا تھا اور اس کو مقصد کے قریب کر دیا تھا۔

اس کے بعد وہ پیغام جو خدا نے موسیٰؑ کو اس سرزمین مقدس میں دیا تھا اس کی طرف دو مختصر اور پُر معنی جملوں میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"فرعون کی طرف جا کہ اس نے سرکشی کی ہے" (اذھب الیٰ فرعون انہ طغٰی)۔ "اور اس سے کہہ کیا تُو چاہتا ہے کہ پاک و پاکیزہ ہو جائے" (فقل ھل لک الیٰ ان تزکّٰی)۔ "اور پاک ہونے اور محبوب کی ملاقات کے قابل ہونے کے بعد میں اپنے پروردگار کی طرف تجھے ہدایت کروں تاکہ تُو اس سے ڈرے اور غلط دعویٰ سے الگ ہو جائے۔ (و اھدیک الیٰ ربک فتخشٰی)۔

چونکہ ضروری ہے کہ ہر دعوت فکر و دلیل کے ہمراہ لائے اس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "موسیٰ نے اس گفتگو کے بعد اس کو عظیم معجزہ دکھایا"۔ (فاراہ الأیۃ الکبرٰی) [2]

یہ معجزہ چاہے عصا کا عظیم اژدہے میں تبدیل ہونا ہو یا ید بیضا ہو یا دونوں ہوں (اس بنا پر الف لام (الأیۃ الکبرٰی) میں جنس کی طرف اشارہ ہو) جو کچھ بھی تھا موسیٰؑ کے عظیم معجزات میں سے تھا کہ جس پر آغاز تبلیغ میں انحصار کیا ہے۔ ان چار آیات میں جاذب نظر نکات یہ ہیں جن کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے۔

۱۔ فرعون کی طرف جانے کی علت فرعون کی سرکشی ہے اور یہ چیز بتاتی ہے کہ انبیاء کے مبعوث ہونے کا ایک عظیم مقصد سرکشی کرنے والوں کی ہدایت یا ان کے ساتھ دو ٹوک مبارزہ تھا۔

---

[1] بہت سے مفسرین نے اذ کو حدیث کے لیے ظرف زمان سمجھا ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں صحیح ہے کہ جب حدیث خود حادثہ کے معنی میں ہو نہ کہ حادثہ کی حکایت کے معنی میں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اذ فعل محذوف کے لیے ظرف ہو اور تقدیر میں (اذکر اذ ناداہ ....) ہو۔ (غور کیجئے)۔

[2] مسلّم ہے کہ اس وادی مقدس میں اس خطاب الٰہی اور اس عظیم معجزے کے دکھانے کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا قرآن نے اختصار کے پیش نظر دوسرے مطالب یہاں حذف کر دیئے ہیں اور وہ سب تقدیر میں ہیں۔

۲۔ فرعون کو دعوت فکر دینے کے لیے نہایت نرم اور خیر خواہانہ تعبیر کے ساتھ حکم دیتا ہے اور فرماتا ہے: "اس سے کہہ کیا تو میل اور رغبت رکھتا ہے کہ تو پاک و پاکیزہ ہو جائے (مطلق پاکیزگی جو شرک و کفر سے پاکیزگی بھی ہے اور ظلم و فساد کی ناپاکی سے بھی) اس تعبیر کے مشابہ جو سورہ طٰہٰ کی آیت ۴۴ میں آئی ہے (فقولا لہ قولًا لیّنًا) "اس کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرو"۔

۳۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ انبیاء کی رسالت کا مقصد انسانوں کا پاک کرنا ہے اور ان کی طرف پہلی فطری طہارت کو لوٹانا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ میں تجھے پاک کردوں بلکہ کہتا ہے کہ تو پاکیزگی کو قبول کرے۔ یہ جملہ بتاتا ہے کہ پاک ہونا اپنی خواہش کے نتیجے میں ہو نہ یہ کہ باہر سے اس پر یہ بات لادی جائے۔

۴۔ پاک ہونے کے بعد ہدایت کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے خود کو پاک و صاف کیا جائے پھر کوئے دوست میں قدم رکھا جائے۔

۵۔ ربک (تیرا پروردگار) کی تعبیر حقیقت میں اس نکتہ کی تاکید ہے کہ میں تجھے ایسی ذات کی طرف لے جاؤں گا جو تیرا مالک، مربی اور پرورش کرنے والا ہے تو پھر کیوں راہ سعادت سے گریز کرتا ہے۔

۶۔ خدا ترسی خدا کی طرف سے ہدایت کا نتیجہ ہے۔ جی ہاں شجر توحید و ہدایت کا ثمر یہی ہے کہ انسان جان لے کہ اسے خدا کے سامنے حاضر ہو کر جوابدہ ہونا ہے اس لیے کہ خوف خدا بھی معرفت خدا کے بغیر حاصل نہیں ہوتا، اسی لیے تو سورہ فاطر کی آیت ۲۸ میں ہم پڑھتے ہیں (انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء) صرف علماء اور صاحبان معرفت ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔

۔ حضرت موسیٰ سب سے پہلے اس کی شفقت آمیز ہدایت کی طرف جاتے ہیں اس کے بعد عقلی و منطقی ہدایت کرتے ہیں یعنی آیت کبریٰ یعنی بہت بڑا معجزہ دکھا کر اور یہ مؤثر ترین راہ تبلیغ ہے۔ پہلے خیر خواہی اور محبت کے انداز سے مقابل کو متاثر کرے اور پھر استدلال و حجت کے ساتھ اسے قائل کرے۔

اب دیکھیں کہ فرعون نے اس لطف و محبت اور اس منطق و بیان زیبا اور آیت کبریٰ کے دکھانے کے مقابلہ میں کیا رویہ اختیار کیا۔ یہ سرکش خیرہ سر مرکب غرور سے بالکل نیچے نہیں اترا۔ اور جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے اس نے موسیٰ کی دعوت فکر کی تکذیب کی اور پروردگار کی نافرمانی کی (فکذب و عصٰی)۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ تکذیب عصیان و نافرمانی کی تمہید ہوتی ہے جس طرح تصدیق ایمان و اطاعت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس پر بھی قناعت نہیں کی اور موسیٰ کی دعوت فکر کے مقابلہ میں وہ صرف الگ ہی نہیں رہا بلکہ اس نے پشت پھیری اور بلا تامل موسیٰ سے لڑنے اور ان کے دین کو برباد کرنے کی کوشش کرنے لگا (ثم ادبر یسعٰی) [1]

---

[1] ثم کی تعبیر جو عام طور پر دو حادثوں کے درمیان فاصلہ کے لیے آتی ہے ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ فرعون نے ایک مدت کا فاصلہ دیا ہو تاکہ اس کے موسیٰ سے مبارزہ کرنے کا نقشہ مکمل طور پر منضبط اور تیار ہو جائے۔

اور چونکہ موسیٰ کا معجزہ اس کی ساری سرکشی کی طاقت کو خطرہ میں ڈالتا تھا اس لیے اس نے اپنے مامورین ہر شہر میں بھیجے تاکہ وہ جادوگروں کو جمع کریں اور لوگوں میں منادی کریں کہ وہ موسیٰ اور جادوگروں کا مقابلہ دیکھیں (فحشر فنادٰی)۔

اگرچہ قرآن نے یہاں لفظ حشر کو مطلق بیان کیا ہے لیکن سورہ اعراف کی آیت ۱۱۱، ۱۱۲ (وارسل فی المدائن حاشرین یأتوک بکل ساحر علیم) کے قرینہ سے اور نادٰی کی تعبیر سے جو اگرچہ مطلق ہے ظاہراً فرعون کے لوگوں کو جمع کرنے اور اس مقابلے کے منظر کو دیکھنے کی دعوت دینے کی طرف اشارہ ہے اور سورہ شعراء کی آیت ۳۹ (وقیل للناس هل انتم مجتمعون) "اور لوگوں سے کہا گیا تم جمع ہو گئے ہو" کے قرینے سے بھی۔

پھر بھی ان سازشوں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بدترین تعبیروں کے ساتھ عظیم ترین دعویٰ کرتے ہوئے کہا: میں تمہارا بہت بڑا پروردگار ہوں (فقال انا ربکم الاعلٰی)۔

واقعی عجیب سی بات ہے کہ یہ خیرہ سر طاغی و سرکش جب مرکب غرور و تکبر و خود پرستی پر سوار ہوتے ہیں تو پھر کسی مقام پر رُکنے کا نام نہیں لیتے حتیٰ کہ دعویٰ خدائی پر بھی قناعت نہیں کرتے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ خداؤں کے خدا ہو جائیں۔

یہ بات ضمنی طور پر اس طرف اشارہ ہے کہ اگر تم بتوں کی پوجا کرتے ہو تو وہ اپنی جگہ پر محترم سہی لیکن میں افضل ترین ہوں اور تمہارا معبود ہوں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ فرعون سورہ اعراف کی آیت ۱۲۷ کی شہادت سے (اتذر موسٰی و قومه لیفسدوا فی الارض ویذرک و اٰلهتک) کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو اجازت دیتا ہے کہ وہ زمین میں فساد کریں اور تجھے اور تیرے معبودوں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں۔

فرعون جو ایک بت پرست تھا لیکن یہاں دعویٰ کرتا ہے میں تمہارا بہت بڑا پروردگار ہوں یعنی وہ اپنے آپ کو اپنے معبود سے بھی بالاتر خیال کرتا ہے۔ یہ ہیں سرکشوں کی بیہودہ گوئیاں۔

اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک جگہ صرف الوہیت کا دعویٰ کرتا ہے (ما علمت لکم من اله غیری)۔ میں اپنے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں جانتا۔ (قصص / ۳۸)۔

لیکن زیر بحث آیت میں ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے میں تمہارا پروردگار ہوں۔ یہ ہے لائحہ عمل ان ہلکے دماغ والے مغروروں کا۔

بہرحال فرعون نے اپنی سرکشی کو آخری مرحلہ تک پہنچایا اور بہت زیادہ دردناک عذاب کا مستحق ہوا۔ فرمان الٰہی آن پہنچا اور وہ اور اس کی ظلم و فساد کی قوت درہم برہم ہو گئی۔ اسی لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

خدا نے اسے دنیا اور آخرت کے عذاب میں گرفتار کیا (فاخذہ اللہ نکال الاٰخرۃ والاولیٰ) [1]

"نکال" (بروزن ضلال) کے معنی اصل میں ضعف و ناتوانی اور عجز کے ہیں۔ اسی لیے اس شخص کے بارے میں جو رقم کی ادائیگی کا حکم نہ دے، کہتے ہیں کہ اس نے نکول کیا۔ "نکل" (بروزن فکر) اس بھاری زنجیر کو کہتے ہیں جو انسان کو کمزور کر دے اور چلنے سے روک دے۔ چونکہ عذاب الٰہی بھی ناتوانی کا باعث ہے اور دوسرے افراد کو ارتکاب گناہ سے روکتا ہے اس لیے اسے "نکال" کہا گیا ہے۔

"نکال الاٰخرۃ" کی تعبیر سے قیامت کے اس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو فرعون اور اس کے پیروکاروں پر نازل ہوگا اور چونکہ وہ اہم ترین ہے لہٰذا اُسے مقدم رکھا گیا ہے۔ اولیٰ سے مراد دنیاوی عذاب ہے جو فرعون پر نازل ہوا اور اس نے فرعون کے سب یار و انصار کو دریائے نیل میں غرق کر دیا۔

یہاں اس آیت کی ایک اور تفسیر بھی بیان ہوئی ہے اور وہ یہ کہ الاولیٰ سے مراد وہ پہلا کلمہ اور لفظ ہے جو فرعون نے اپنی سرکشی کے راستے میں کہا اور الوہیت کا دعویٰ کیا۔ (قصص / ۳۸) اور "الاٰخرۃ" آخری کلمہ اور لفظ کی طرف اشارہ ہے جو اس نے کہا اور ربوبیت اعلیٰ کا دعویٰ کیا۔ خدا نے اسے ان دونوں کفر آمیز دعووں کی سزا اس دنیا میں دی۔

یہ معنی ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہیں۔ امام نے مزید فرمایا ہے کہ ان دونوں جملوں کے درمیان چالیس سال کا فاصلہ تھا اور خدا نے انتہائی اتمام حجت کے لیے اس مدت میں اس پر عذاب نازل نہیں کیا۔ یہ تفسیر اخذ کے لفظ کے ساتھ، جو فعل ماضی ہے اور بتاتا ہے کہ یہ سزا مکمل طور پر دنیا میں واقع ہوئی اور اس کے بعد کی آیت جو اس واقعہ کو درس عبرت شمار کرتی ہے زیادہ موافق ہے۔

انجام کار آخری زیر بحث آیت میں اس واقعہ کی تکمیل سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اس موسیٰ اور فرعون کی داستان اور اس کے انجام کو پہنچنے میں، ان کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں ایک عظیم درس عبرت ہے۔ (ان فی ذالک لعبرۃ لمن یخشیٰ)۔

یہ آیت اچھی طرح بتاتی ہے کہ اس قسم کے واقعات سے عبرت حاصل کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے جو خوف خدا اور احساس ذمہ داری کو دل میں جگہ دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عبرت حاصل کرنے والی نظر رکھتے ہیں اور اچھائی اور برائی سے درس عبرت لینا جن کا اصول ہے۔

---

[1] نکال منصوب ہے "بنزع الخافض" اور تقدیر میں "فاخذہ اللہ بنکال الاٰخرۃ" تھا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اخذ کا مفعول مطلق ہو جو "نکّل" کے معنی میں ہے (باب تفعیل کا فعل ماضی ہے) اور معنی کے لحاظ سے "نکّل اللہ بہ نکال الاٰخرۃ" ہے۔

جی ہاں! یہ تھی فرعون جیسے سرکش کی سرنوشت تاکہ روسائے مشرکین عرب میں جو فرعون تھے اور وہ دوسرے لوگ جو ہر زمانے میں فرعون کا راستہ اختیار کرنے والے ہیں اپنا حساب و کتاب دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ یہ تاریخ کا قطعی فرمان اور خدا کی نہ بدلنے والی سنت ہے۔

ایک نکتہ

قرآن کی فصاحت کا ایک گوشہ

مندرجہ بالا آیات میں غور و فکر کرنے سے قرآن کی انتہائی فصاحت و بلاغت نظر آتی ہے۔ ان چند مختصر سطروں میں موسیٰ و فرعون کے تمام واقعہ کا خلاصہ، محرک رسالت، مقصد رسالت، تزکیہ کا وسیلہ، دعوتِ فکر کی کیفیت، ردعمل کی کیفیت، فرعون کی سازشش کی کیفیت، اس کے فضول اور بے بنیاد دعووں کا نمونہ اور آخر کار اس مستِ بادۂ غرور کو ملنے والی دردناک سزا اور آخر میں وہ درس عبرت جس کا فائدہ تمام بیدار مغز انسانوں کو پہنچا ہے، یہ سب موجود ہے۔

(۲۷) ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ۝

(۲۸) رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ۝

(۲۹) وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ۝

(۳۰) وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝

(۳۱) اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ۝

(۳۲) وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ۝

(۳۳) مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

ترجمہ

(۲۷) کیا موت کے بعد تمہاری تخلیق مشکل ہے یا آسمان کی تخلیق جس کی خدا نے بنیاد رکھی؟

(۲۸) اس کی چھت کو بلند کیا اور اسے منظم کیا۔

(۲۹) اور اس کی رات کو تاریک اور دن کو آشکار کیا۔

(۳۰) اور اس کے بعد زمین کو بچھایا۔

(۳۱) اُس میں سے اس کا پانی نکالا اور اس کی چراگاہ کو تیار کیا۔

(۳۲) اور پہاڑوں کو ثابت و محکم کیا۔

(۳۳) یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے لیے ہے۔

تفسیر

تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمانوں کی؟ (معاد پر ایک دوسری دلیل)

حضرت موسیٰ اور فرعون کی سرگزشت تمام سرکشوں اور تکذیب کرنے والوں کے لیے ایک درس عبرت کے طور پر پیش کرنے کے بعد دوبارہ معاد اور قیامت کے مسئلہ کی طرف لوٹتا ہے اور عالم ہستی میں اپنی غیر متناہی قدرت کے نمونے امکان معاد کے لیے ایک دلیل کے طور پر بیان کرتا ہے اور انسانوں کو جو لا محدود نعمتیں اس نے دی ہیں ان کے کچھ حصوں کی تشریح کرتا ہے تاکہ شکر گزاری کے اس احساس کو جو خدا کی معرفت کا سرچشمہ ہے انسانوں کے دل میں بیدار کرے۔

پہلے منکرین معاد کو مخاطب کرتے ہوئے ایک ایسے استفہام کے طور پر جو تنبیہ کا پہلو لیے ہوئے ہے فرماتا ہے:

"کیا تمہاری تخلیق (موت کے بعد زندگی کی طرف بازگشت) زیادہ مشکل ہے یا اُس باعظمت آسمان کی تخلیق جس کی خدا نے بنیاد رکھی ہے؟" (ءانتم اشد خلقا ام السماء بناها)[1]

یہ گفتگو حقیقت میں ان لوگوں کی بات کا جواب ہے جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔ وہ کہتے تھے:

(ءانا لمردودون فی الحافرۃ) "کیا ہم پہلی حالت کی طرف پلٹ جائیں گے"

یہ آیت کہتی ہے کہ ہر انسان ادراک و شعور کے کسی مرحلہ میں بھی ہو وہ جانتا ہے کہ اس بلند آسمان کی تخلیق، یہ تمام عظیم کرّے اور لاتعداد کہکشائیں ان کی تخلیق صاف طور پر بتاتی ہے کہ انسان کی تخلیق ان کے مقابلہ میں کوئی شے نہیں ہے۔ لہٰذا جو یہ قدرت رکھتا ہو وہ تمہیں دوبارہ زندہ کرنے سے کس طرح عاجز ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد اس عظیم آفرینش کے بارے میں تشریح کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے: "آسمان کی چھت کو اس نے بلند کیا اور اُسے منظم و مرتب و موزوں کیا" (رفع سمکها فسواها)۔

"سمک" (بروزن سقف) کے معنی اصل میں بلندی کے ہیں۔ یہ چھت کے معنی میں بھی آیا ہے۔ فخر رازی کی تفسیر کبیر میں ہے کہ کسی چیز کی بلندی کا جب اوپر والی سمت سے نیچے کی طرف اندازہ لگائیں تو اُسے عمق کہتے ہیں اور اگر نیچے کی طرف سے اوپر کا اندازہ لگائیں تو اسے سمک کا نام دیا جاتا ہے[2]

---

[1] یہ آیت حقیقت میں محذوف رکھتی ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (ام السماء اشد خلقًا) اور "بناها" ایک جملہ مستانفہ ہے اور بعد میں آنے والی آیت کا مقدمہ ہے۔

[2] تفسیر فخر رازی / جلد ۳۱ صفحہ ۴۶

"سواها" تسویہ کے مادہ سے ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کی تنظیم اور اُسے موزوں بنانے کے ہیں، یہ اشارہ ہے اس عظیم و دقیق نظم و ضبط کی طرف جو تمام آسمانی کرات میں کارفرما ہے۔ اگر سمک سے مراد چھت ہو تو پھر ہوا کے عظیم خطہ کی طرف اشارہ ہے جس نے محفوظ و محکم چھت کی طرح اطراف زمین کو گھیر رکھا ہے اور اُسے آسمان کی طرف سے آنے والے منتشر پتھروں کے حملے سے، اور ایسی شعاعوں سے، جو موت کا سبب بن سکتی ہیں، محفوظ کر رکھا ہے۔

بعض مفسرین مندرجہ بالا تعبیر کو آسمان کے کروی ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جس کی وجہ سے اس نے اطراف زمین کو گھیر رکھا ہے اور وہ اس لیے کہ تسویہ اس سقف کے مرکز اصلی یعنی اجزائے زمین سے مساوی فاصلہ کی طرف اشارہ ہے جو کرویت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ آیت آسمان کے بلند ہونے اور ہم سے آسمانی کُرّوں کے بہت زیادہ طویل اور آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنے والے فاصلہ کی طرف اشارہ ہے اور اطراف زمین کی محفوظ سقف کی طرف بھی اشارہ ہے۔

بہرحال یہ آیت اس چیز کے مشابہ ہے جو سورۂ مؤمن کی آیت ۵۷ میں آئی ہے (لخلق السماوات والارض اکبر من خلق الناس ولکن اکثر الناس لا یعلمون) آسمانوں اور زمین کی تخلیق انسانوں کی تخلیق سے زیادہ اہم ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کے بعد اس عظیم عالم کے ایک اہم ترین نظام کی یعنی نور و ظلمت کے نظام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اس کی رات کو تاریک اور دن کو روشن بنایا" (و اغطش لیلها و اخرج ضحاها)۔ جن میں سے ہر ایک، انسان اور دوسرے زندہ موجودات کی زندگی میں، عام اس سے کہ وہ حیوان ہوں یا نباتات، بہت گہرا اثر رکھتا ہے۔ نہ تو انسان نور و روشنی کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے کیونکہ تمام برکتیں اور رزق کی نعمتیں اس کی حس و حرکت کے ساتھ وابستہ ہیں نہ ظلمت کے بغیر اس کی زندگی ممکن ہے جو اس کے سکون و آرام کی رمز ہے۔[1]

"اغطش" "غطش" (بروزن عرش) کے مادہ سے تاریکی کے معنی دیتا ہے لیکن راغب مفردات میں کہتا ہے کہ اس کی اصل "اغطش" سے لی گئی ہے جو اس شخص کے معنی میں ہے جو اپنی آنکھ میں نور کم رکھتا ہو۔ اور ضحیٰ اس موقعہ کے معنوں میں ہے جب سورج کی روشنی آسمان و زمین میں پھیلتی ہے۔[2]

---

[1] زندہ موجودات کی زندگی میں نور و ظلمت کے اہم آثار کے سلسلہ میں جلد ۸ ص ۳۴۳ و جلد ۱۲ ص ۱۴ و جلد ۱۶ ص ۱۴۶ پر ہم تفصیلی بحثیں کر چکے ہیں۔

[2] قابل توجہ یہ ہے کہ "لیلها" کی ضمیر اور "ضحاها" کی ضمیر آسمان کی طرف لوٹتی ہے اور نور و ظلمت کی نسبت آسمان کی طرف اس بنا پر ہے کہ اس کا آسمانی ہے۔

اس کے بعد آسمان سے زمین کا رُخ کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"زمین کو اس کے بعد پھیلایا (اور بچھایا)۔ (والارض بعد ذالك دحاها)۔

"دحا" "دحو" (بروزن محو) کے مادہ سے ہے اس کے معنی ہیں پھیلانا۔ بعض مفسرین نے اسے کسی چیز کو اس کی اصل سے ہلانے کے معنی میں لیا ہے اور چونکہ یہ دونوں معانی ایک دوسرے کے ساتھ لازم ملزوم ہیں لہٰذا ایک ہی روح کلام رکھتے ہیں۔

بہرحال "دحو الارض" سے مراد یہ ہے کہ ابتداء میں تمام سطح زمین کو اس پانی نے گھیر رکھا تھا جو پہلی سیلابی بارش سے حاصل ہوا تھا۔ پانی آہستہ آہستہ زمین کے گڑھوں میں جگہ لیتا گیا۔ خشکیوں نے پانی کے نیچے سے سر نکالا اور روز بروز ان میں وسعت پیدا ہوتی گئی یہاں تک کہ موجودہ حالت میں نمودار ہو گئی (یہ مسئلہ زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد پیدا ہوا) [1]

زمین کو بچھانے اور زندگی کے لیے اس کے آمادہ ہو جانے کے بعد پانی اور نباتات کی بات درمیان میں لایا ہے اور فرماتا ہے :

"خدا نے زمین سے اس کے پانی کو نکالا اور اسی طرح اس کی چراگاہوں کو" (اخرج منها ماءها ومرعاها)۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ پانی زمین کی نفوذ پذیر کھال کے درمیان چھپا ہوا تھا اس کے بعد چشموں اور نہروں کی شکل میں جاری ہوا۔ یہاں تک کہ دریاؤں اور سمندروں کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ "مرعیٰ" اسم مکان ہے اس کے معنی چراگاہ ہیں [2]

اصل میں "رعی" سے حیوان کی حفاظت و نگہبانی کے معنی لیے جاتے ہیں چاہے غذا کے لحاظ سے ہو یا دیگر جہات سے۔ اسی لیے مراعات محافظت و نگہبانی اور تدبیر امور کے معنی میں آیا ہے اور مشہور حدیث (کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ) بھی یہی بتاتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی حفاظت کو خود پر لازم سمجھیں [3]

لیکن چونکہ مختلف عوامل زمین کے آرام و سکون کو درہم برہم کر سکتے تھے، علاوہ دوسرے عوامل کے مثلاً بڑے بڑے مستقل طوفان اور مد و جزر جو زمین کی سطح پر چاند سورج کی کشش سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح زلزلے جو زمین کے اندر پگھلنے والے مواد کے دباؤ سے معرض وجود میں آتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] بعض مفسرین نے بعد ذالك کی تعبیر جو مندرجہ بالا آیت میں آئی ہے اس کی تفسیر "اس کے علاوہ" کی ہے۔ اب آیت کے معنی یہ بنتے ہیں کہ جو گزشتہ آیات میں آیا ہے علاوہ زمین کو بچھایا اور پھیلایا۔

[2] بعض نے اسے مصدر میمی کے طور پر لیا ہے جس کے معنی چرنے کے ہیں لیکن مناسب وہی مذکورہ بالا معانی ہیں۔

[3] مفردات راغب مادہ "رعی"۔

ان سب کو خدا نے پہاڑوں کے اس طاقتور جال کے ذریعہ جس نے تمام روئے زمین کو گھیر رکھا ہے، کنٹرول میں رکھا اور زمین کو سکون و آرام دیا۔ اسی لیے فرمایا ہے: "اور پہاڑوں کو زمین میں ثابت و محکم کیا" (والجبال ارساھا)[1]

انسانوں کی زندگی اور سکون و آرام میں پہاڑوں کے گہرے اثرات کے بارے میں تفصیلی بحث ہم سورۂ رعد کی آیت ۳ کے ذیل میں (جلد ۵ ص ۴۲۲) کرچکے ہیں۔ آخر میں فرماتا ہے:

"ان سب چیزوں کو اس نے اس لیے انجام دیا تاکہ تمہارے فائدہ اٹھانے کا سبب ہو اور تمہارے چوپایوں کے لیے وسیلہ و ذریعہ ہو" (متاعا لکم ولانعامکم)۔

جی ہاں! آسمان کو بلند کیا، نور و ظلمت کا نظام قائم کیا، زمین کو بچھایا اور پھیلایا اور اس سے پانی اور نباتات کو نکالا، پہاڑوں کو زمین کی حفاظت کا نگہبان قرار دیا اور انسان کی زندگی کے تمام وسائل فراہم کیے اور سب کو انسان کا فرمانبردار قرار دیا تاکہ انسان زندگی کی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے اور غافل نہ رہے اور ان تمام فرمانبرداروں کا پاس کرتے ہوئے جو اللہ نے اس کے لیے پیدا کیے ہیں فرمانِ الٰہی کا فرمانبردار ہو۔ یہ سب ایک طرف مسئلہ معاد کے اثبات کے لیے اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں اور دوسری طرف معرفتِ توحید کی راہ میں اس کی حکمت کی دلیلیں ہیں۔

---

[1] "ارسیٰ" از مادہ "رسو" (بروزن رسم) ثابت ہونے کے معنی میں ہے اور "ارسیٰ" اس کے متعدد معانی کو بتاتا ہے یعنی پہاڑوں کو ثابت قدم رکھا۔

(۳۴) فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ۝

(۳۵) يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ۝

(۳۶) وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝

(۳۷) فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝

(۳۸) وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝

(۳۹) فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِىَ

(۴۰) وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝

(۴۱) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ۝

ترجمہ

(۳۴) جس وقت وہ عظیم حادثہ رونما ہوگا۔

(۳۵) تو اس دن انسان ان کو

(۳۶) اور جہنم ہر دیکھنے والے کے لیے آشکار ہو جائے گا۔

(۳۷) لیکن جس شخص نے سرکشی کی ہے۔

(۳۸) اور اس نے دنیا کی زندگی کو مقدم رکھا۔

(۳۹) یقیناً جہنم اس کا ٹھکانہ ہے۔

(۴۰) اور جو شخص اپنے پروردگار کے مرتبہ سے واقف تھا اور اس نے اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے روکا۔

(۴۱) جنت اس کی جگہ ہے ۔

تفسیر

وہ جو اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے باز رکھیں

اس اشارہ کے بعد جو گزشتہ آیات میں معاد کے بعض دلائل کے بارے میں گزرا زیر بحث آیات میں قیامت ، اس میں خدا سے ڈرنے والوں اور ہوائے نفس کے پرستاروں کی سرنوشت کی طرف رجوع کرتے ہوئے فرماتا ہے :

" جس وقت وہ عظیم حادثہ رونما ہوگا تو نیکوکاروں اور بدکاروں میں سے ہر ایک اپنے اعمال کی جزا کو پہنچے گا " (فاذا جاءت الطامۃ الکبرٰی) [1]

" طامۃ " " طم " (بروزن فن) کے مادہ سے پُر کرنے کے معنوں میں آتا ہے اور وہ چیز جو اعلیٰ ہو اسے " طامۃ " کہتے ہیں اسی لیے سخت حوادث اور عظیم مصائب جو مشکلات سے پُر ہوں ان پر بھی طامۃ کا اطلاق ہوتا ہے ۔

یہاں قیامت کی طرف اشارہ ہے جو ہولناک حوادث سے پُر ہے اس کی انتہائی توصیف کے ساتھ اس بے مثال حادثہ کی اہمیت وعظمت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے :

یہ عظیم حادثہ جس وقت وقوع پذیر ہوگا سب کے سب خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں گے اور انسان اپنی کوشش اور اپنے اعمال کو خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے یاد کرے گا (یوم یتذکر الانسان ما سعٰی) لیکن اعمال کا یہ یاد کرنا انہیں فائدہ نہ دے گا ۔

اگر انسان دنیا کی طرف واپس لوٹنے اور گزشتہ اعمال کی تلافی کرنے کے لیے مہلت طلب کرے گا تو اسے اجازت نہیں ملے گی اور اس مطالبہ کے جواب میں کلا کہیں گے ۔ اگر توبہ کرے گا اور اپنے اعمال بد کی معافی مانگے گا تو کوئی فائدہ نہ پہنچے گا ، کیونکہ توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے لہٰذا سوائے آہ بھرنے کے اور افسوس کرنے کے کوئی اور چارہ کار نہ ہوگا اور بقول قرآن اگر وہ دونوں ہاتھوں کو دانتوں سے بھی

---

[1] " اذا " شرطیہ ہے اور اس کی جزا بعض مفسرین کے بقول بعد والی آیات میں (فاما من طغٰی .... و اما من خاف مقام ربہ) آئی ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کی جزا کو اس طرح محذوف کیا جائے جو بعد والی آیات سے معلوم ہوتی ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے " فاذا جاءت الطامۃ الکبرٰی یجزٰی کل انسان بما عمل " بعض نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ اس کی جزا یوم یتذکر الانسان سے معلوم ہوتی ہے لیکن یہ احتمال بعید ہے ۔

کائیں گے اور کوئی فائدہ نہ ہوگا "ویوم یعض الظالم علی یدیہ" (فرقان - ۲۷)۔

توجہ کرنی چاہیئے کہ یتذکر فعل مضارع ہے اور عام طور پر استمرار پر دلالت کرتا ہے یعنی اس روز انسان اپنے اعمال کو مسلسل یاد کرے گا یہ اس بنا پر کہ اس روز انسان کی روح اور اس کے قلب کے آگے سے پردے اٹھ جائیں گے اور تمام پوشیدہ حقائق اس پر آشکار ہو جائیں گے۔ اس کے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے:

"اس دن جہنم ہر دیکھنے والے کے لیے آشکار ہوگا"۔ (وبرزت الجحیم لمن یریٰ)۔ جہنم اس وقت بھی موجود ہے بلکہ سورہ عنکبوت کی آیت ۵۴ (وان جهنم لمحیطة بالکافرین)۔ کے مطابق کافروں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے لیکن عالم دنیا کے پردے اس کی رویت سے مانع ہیں۔ وہ دن جو ہر چیز کے آشکار ہونے کا دن ہوگا، اس روز جہنم ہر چیز سے زیادہ آشکار ہوگا۔

"لمن یریٰ" کا جملہ اس طرف اشارہ ہے کہ جہنم اس دن اس قدر آشکار ہوگا کہ ہر شخص بلا استثناء اسے دیکھے گا۔ وہ کسی سے مخفی نہ ہوگا۔ نہ اچھے لوگوں سے نہ برے لوگوں سے کہ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ یہ جملہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو اس دن چشم بینا رکھتے ہوں گے کیونکہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴ کے مطابق بعض لوگ اس دن نابینا محشور ہوں گے (ونحشرہ یوم القیامة اعمیٰ)، لیکن پہلے معنی جنہیں تمام مفسرین نے قبول کیا ہے زیادہ مناسب نظر آتے ہیں، اس لیے کہ جہنم بدکاروں کے لیے خود عذاب ہے کئی گنی سزا ہے اور ایک گروہ کا محشر میں نابینا ہونا ممکن ہے بعض مواقف میں ہو نہ کہ تمام مواقف میں۔[1]

باقی رہا وہ شخص جو سرکشی کرے (فاما من طغیٰ)۔ اور دنیاوی زندگی کو ہر چیز پر مقدم رکھے۔ (وآثر الحیاة الدنیا)۔ تو یقیناً جہنم اس کی جگہ اور ٹھکانا ہے (فان الجحیم ھی المأویٰ)۔[2]

پہلے جملے میں ان کے عقیدہ کے خراب ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے اس لیے کہ طغیانی و سرکشی اپنے آپ کو بڑا سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے اور اپنے آپ کو بڑا سمجھنا خدا کی معرفت نہ ہونے کی بنا پر ہوتا ہے۔ جو شخص خدا کو اس کی عظمت کے ساتھ پہچان لے تو وہ اپنے آپ کو بہت ضعیف اور چھوٹا دیکھے گا اور کبھی بھی جادۂ عبودیت سے انحراف نہیں کرے گا۔

دوسرا جملہ ان کے عمل فساد کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ طغیان و سرکشی سبب بنتے ہیں کہ انسان دنیا کی جلد ختم ہو جانے والی لذتوں اور اس کی چمک دمک کو زیادہ قیمتی سمجھے اور ہر چیز پر انہیں ترجیح دے۔

---

[1] اس سلسلہ میں مزید وضاحت جلد ۷ سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۴ کے ذیل میں ہو چکی ہے۔

[2] آیت میں محذوف ہے اور تقدیر میں ھی المأویٰ لہ یا ھی مأواہ ہے اور ضمیر وضاحت کی بنا پر حذف ہوئی ہے۔

یہ دونوں درحقیقت ایک دوسرے کے علت و معلول ہیں۔ طغیان اور عقیدہ کا خراب ہونا فسادِ عمل اور دنیا کی ناپائیدار زندگی کو ہر چیز پر ترجیح دینے کا سرچشمہ ہے۔ آخرکار یہ دونوں جہنم کی جلا دینے والی آگ ہیں۔

حضرت علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں (ومن طغیٰ ضل علیٰ عمل بلا حجة) جو شخص سرکشی کرے وہ گمراہ ہو جاتے گا اور ایسے اعمال کرے گا جن کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوگی [1]

یہ چیز خود کو بڑا سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے کہ انسان اس طرح اپنی تمام خواہشات کو بغیر کسی منطقی دلیل کے قبول کر لیتا ہے اور اس کے لیے ادرج کا قائل ہوتا ہے۔

اس کے بعد جنتیوں کے اوصاف کو مختصر اور بہت ہی پُرمعنی جملوں میں پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور باقی رہا وہ شخص جو اپنے پروردگار کے مرتبہ سے ڈرے اور نفس کو ہوا و ہوس سے روکے ..." (واما من خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوٰی)۔ "تو اس کا ٹھکانہ جنت ہے" (فان الجنة هی المأوٰی)۔ ہی ہاں جنتی ہونے کی پہلی شرط خوف ہے جو معرفت سے پیدا ہو۔ پروردگار کے مقام کو پہچاننا اور اس کے فرمان کی مخالفت سے ڈرنا۔

دوسری شرط جو حقیقت میں پہلی شرط کا نتیجہ اور معرفت و خوف کے درخت کا ثمر ہے وہ یہ ہے کہ ہوائے نفس کو زیرِ تسلط رکھا جائے اور اسے سرکشی نہ کرنے دی جائے، اس لیے کہ ہوائے نفس تمام گناہوں مفاسد اور بدبختیوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ بدترین اور قابلِ نفرت بُت ہے جسے معبود بنا لیا گیا ہے۔ (ابغض اله عبد علی وجه الارض الهوٰی) یہاں تک کہ وجود انسان میں شیطان کے نفوذ کا ذریعہ بھی ہوائے نفس ہے۔

اگر یہ اندرونی شیطان اور بیرونی شیطان ہم آہنگ نہ ہوں اور اندرونی شیطان اس پر دروازہ نہ کھولیں تو اس کا وارد ہونا ممکن نہیں ہوتا جیسا کہ قرآن کہتا ہے (ان عبادی لیس لك علیهم سلطان الا من اتبعك من الغاوین) "تجھے کبھی بھی میرے بندوں پر تسلط حاصل نہ ہوگا مگر وہ گمراہ جو تیری پیروی کرتے ہیں" (حجر/۴۲)۔

چند نکات

۱۔ مقامِ رب کیا ہے

قابلِ توجہ یہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں فرماتا ہے: "جو شخص اپنے پروردگار کے مقام سے ڈرے" یہ نہیں فرماتا: "جو اپنے پروردگار سے ڈرے" یہ کہ مقام سے کیا مراد ہے اس سلسلہ میں متعدد تفاسیر ہیں۔

۱۔ پہلی تفسیر یہ ہے کہ اس مقام سے مراد مختلف مواقف قیامت ہیں جن میں انسان بارگاہ خداوندی

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۰۹ حدیث ۳۴۔

میں حساب کتاب کے لیے ٹھہرے گا۔ اس تفسیر کی بنا پر "مقام ربه" کے معنی (مقامه عند ربه) انسان کا بارگاہ خدا میں کھڑا ہونا ہیں۔

۲۔ مراد خدا کا علم اور تمام بندوں کے بارے میں اس کا مقام مراقبت ونگہبانی ہے جیسا کہ سورہ رعد کی آیت ۳۳ میں آیا ہے (افمن هو قائم علیٰ کل نفس بما کسبت) کیا وہ جو سب کے سروں پر کھڑا ہے اور سب کے اعمال کا نگہبان ہے اس شخص کی طرح ہے جو یہ صفت نہیں رکھتا۔

اس تفسیر کی دوسری شاہد وہ حدیث ہے جو امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے (من علم ان الله یراه و یسمع ما یقول ویعلم ما یعلمه من خیراوشر فیحجزه ذالك عن القبیح من الاعمال فذالك الذی خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهوٰی) جو شخص جانتا ہے کہ خدا اسے دیکھتا ہے اور جو کچھ یہ کہتا ہے اُسے وہ سنتا ہے اور جو خیر و شر یہ انجام دیتا ہے اس سے وہ آگاہ ہے اور یہ توجہ اسے قبیح اعمال سے روکتی ہے وہ ایسا شخص ہے جو اپنے پروردگار کے مقام سے خائف ہے اور اس نے اپنے آپ کو ہوائے نفس سے باز رکھا ہے۔

۳۔ مراد اس کا مقام عدالت ہے اس لیے کہ اس کی ذات مقدس خوف کا سبب نہیں ہے خوف اس کی عدالت کا ہے اور حقیقت میں یہ خوف اس کے عدل کے ساتھ اپنے اعمال کے موازنہ سے محسوس ہوتا ہے جیسا کہ مجرم لوگ ایک عادل قاضی کو دیکھ کر لرزنے لگتے ہیں اور محکمہ عدالت کا نام سن کر ان کو دحشت ہونے لگتی ہے جبکہ بے گناہ شخص نہ اس سے خوف کھاتا ہے اور نہ اسے وحشت ہوتی ہے۔

ان تینوں تفسیروں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے لہٰذا ممکن ہے کہ یہ سب معانی آیت میں موجود ہوں۔

۲۔ طغیان اور دنیا پرستی کے درمیان ربط

حقیقت میں مندرجہ بالا مختصر قسم کی آیات انسان کے اصول سعادت وشقاوت کی خوب صورت اور شائستہ طریقہ سے تصویر کشی کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ انسان کی شقاوت اس کی سرکشی اور دنیا پرستی میں ہے اور سعادت خوف خدا اور ترک ہوا و ہوس میں ہے۔ انبیاء واولیاء کی تمام تعلیمات کا نچوڑ بھی یہی چیز ہے۔ ایک حدیث امیر المؤمنین علیؑ سے منقول ہے:

(ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان اتباع الهوٰی وطول الامل فاما اتباع الهوی فیصد عن الحق و اما طول الامل فینسی الأخرة)۔ زیادہ ہولناک چیزیں جن کا مجھے تمہارے بارے میں خوف ہے وہ دو ہیں، ہوائے نفس کی پیروی اور طویل آرزوئیں۔ ہوا و ہوس کی پیروی تو تمہیں حق سے روک دے گی اور طویل آرزوئیں آخرت کو فراموشی کے سپرد کر دیں گی[1]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲۔

خواہش کی پرستش انسانی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ اس کے بُرے اعمال کو اس کی نظر میں مزین کر کے پیش کرتی ہے اور تیز کی حس، جو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور انسان و حیوان میں وجہ امتیاز ہے، اس سے چھین لیتی ہے اور اس کو اپنی ذات میں مشغول رکھتی ہے۔

یہ وہی بات ہے جو حضرت یعقوبؑ جیسے روشن ضمیر پیغمبر نے اپنے نالائق بیٹوں سے کہی تھی (بل سولت لکم انفسکم امرًا) (یوسف/۱۸)۔

یہاں باتیں بہت سی ہیں بہتر ہے کہ اہلبیت علیہم السلام کی احادیث میں سے دو حدیثوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جن میں سب کہنے کی باتیں کہی گئی ہیں، ہم اس بحث کو ختم کریں۔

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں: الجنة محفوفة بالمکارہ والصبر فمن صبر علی المکارہ فی الدنیا دخل الجنة، وجھنم محفوفة باللذات والشهوات فمن اعطی نفسه لذتھا وشھوتھا دخل النار: جنت پریشانیوں، صبر و شکیبائی اور استقامت میں گھری ہوئی ہے جو شخص پریشانیوں کے مقابلے میں (اور خواہشات کو ترک کرنے میں) دنیا میں صبر و شکیبائی سے کام لے وہ جنت میں داخل ہوگا اور جہنم غیر شرعی لذتوں اور سرکش خواہشات میں گھری ہوئی ہے جو شخص اپنے نفس کو ان لذتوں اور خواہشوں کے مقابلہ میں آزاد چھوڑ دے وہ جہنم میں داخل ہوگا[1]

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: لا تدع النفس وھواھا فان ھواھا فی رداھا وترك النفس وما تھوی داءھا وکف النفس عما تھوی دواؤھا: نفس کو ہوا و ہوس کے ساتھ نہ چھوڑ اس لیے کہ ہوائے نفس نفس کی موت کا سبب ہے اور نفس کو اس کی ہوا کے مقابلہ میں آزاد چھوڑ دینا اس کی بیماری ہے اور اس کو ہوا و ہوس سے روکنا اس کی دوا ہے[2]

نہ صرف جہنم خواہش کی پرستش کا نتیجہ ہے بلکہ دنیا کے جلانے والے جہنم مثلاً بدامنی، بدنظمی، جنگیں، خونریزیاں لڑائیاں وغیرہ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔

۳۔ صرف دو گروہ

مندرجہ بالا آیات میں دو گروہوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ دنیا پرست طغیان و سرکشی کرنے والے اور صاحب تقویٰ خدا کا خوف کرنے والے۔ پہلے گروہ کی دائمی جگہ جہنم اور دوسرے گروہ کی جاودانی جائے سکونت جنت بتائی گئی ہے۔

البتہ یہاں ایک تیسرا گروہ بھی ہے۔ وہ مومنین جو عمل کے لحاظ سے کچھ کوتاہیوں کا شکار ہیں، اگر خدا انہیں معاف کردے تو وہ جنت والے گروہ سے ملحق ہو جائیں گے اور اگر معافی نہ ملے تو دوزخ میں جائیں گے لیکن ان کا ٹھکانہ وہاں نہیں ہوگا۔ مندرجہ بالا آیات میں ان کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں ہے۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۰۷ حدیث ۴۶۔

[2] نور الثقلین، جلد ۵ ص ۵۰۷ حدیث ۴۵۔

(۴۲) يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ۝

(۴۳) فِيمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا ۝

(۴۴) اِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰىهَا ۝

(۴۵) اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰىهَا ۝

(۴۶) كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا ۝

ترجمہ

(۴۲) تجھ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ کس زمانہ میں واقع ہوگی؟

(۴۳) تجھے اس بات کی یاد آوری سے کیا کام؟

(۴۴) اس کی انتہا تیرے پروردگار کی طرف ہے۔

(۴۵) تیرا کام صرف ان لوگوں کو ڈرانا ہے جو اس سے ڈرتے ہیں۔

(۴۶) وہ اس دن جب قیامت کو دیکھیں گے تو اس طرح محسوس کریں گے گویا ان کا توقف (دنیا اور برزخ میں) سوائے عصر کے وقت یا صبح کے وقت سے زیادہ نہیں تھا۔

تفسیر

قیامت کی تاریخ صرف خدا جانتا ہے

ان مطالب کے بعد جو قیامت کے بارے میں اور اس روز جو نیکوں اور بدکاروں کا حال ہوگا اس کے سلسلہ میں گزشتہ آیات میں آئے، ان آیات میں معاد کے بارے میں مشرکین اور منکرین کے ہمیشہ سوال کرنے کو موضوع بناتے ہوئے فرماتا ہے:

"تجھ سے قیامت سے متعلق سوال کرتے ہیں کہ کب برپا ہوگی" (یسئلونک عن الساعۃ ایان مرساہا)۔[1]

---

[1] "مرساہ" مصدری معنی میں ہے اور اسم زمان، اسم مکان اور اسم مفعول کے معنی میں آتا ہے۔ مادہ "ارساء" ہے، البتہ یہاں مصدری معنی (باقی اگلے صفحہ پر)

قرآن اس سوال کے جواب میں، انہیں سمجھانے کے لیے کہ کوئی شخص بھی قیامت کے وقوع سے واقف نہیں ہے اور نہ ہوگا، پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے:

"تجھے اس بات کی یاد آوری سے کیا سروکار" (فیم انت من ذکراھا)۔ یعنی وقوع قیامت کی تاریخ تجھ سے بھی پنہاں ہے چہ جائیکہ دوسرے۔ یہ اس علم غیب میں سے ہے جو ذات پروردگار کے مختصات میں سے ہے اور اس حقیقت کی اور کسی کو خبر نہیں ہے۔

بارہا ہم نے کہا ہے کہ منجملہ ان مطالب کے جو سب سے پوشیدہ ہیں قیام قیامت کا وقت بھی ہے، اس لیے کہ اس کا تربیتی اثر اس کے پوشیدہ ہوتے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر یہ بات معلوم ہو اور اس کا زمانہ دُور کا ہو، تو سب غفلت کا شکار ہو جائیں گے اور اگر نزدیک ہو تو برائیوں سے پرہیز، آزادی و اختیار کی طرف سے باہر ہوگا اور ان دونوں صورتوں میں تربیت کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے اور احتمال بھی پیش کیے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ تو زمانہ قیامت بیان کرنے کے لیے مبعوث نہیں ہوا، تو اس لیے مبعوث ہوا ہے کہ اصل وجود کی اطلاع دے نہ کہ لحظہ وقوع کی۔ دوسرے یہ کہ تیرا کام قیامت کے نزدیک ہونے کو بیان کرنا ہے۔

جیسا کہ ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے اپنی دو انگلیوں کو اکٹھا کر کے فرمایا:

(بعثت انا والساعة کھاتین) "میرا قیام اور قیامت کا قیام ان دو کی طرح ہے"[1]

پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"قیامت کی انتہا تیرے پروردگار کی طرف ہے" (الی ربک منتھاھا)۔ صرف وہی جانتا ہے کہ قیامت کب برپا ہوگی۔ کوئی دوسرا فرد اس سے آگاہ نہیں ہے اور قیام قیامت کی آگاہی کے لیے ہر طرح کی سعی و کوشش بے فائدہ ہے۔

یہ وہی مفہوم ہے جو سورہ لقمان کی آیت ۳۴ میں بھی آیا ہے۔ (ان اللہ عندہ علم الساعة) "قیامت کے وقوع کے زمانے اور وقت کا علم صرف خدا کو ہے"۔

سورہ اعراف کی آیت ۱۸۷ میں فرماتا ہے: (قل انما علمھا عند ربی) "کہہ دے اس کا علم صرف میرے پروردگار کو ہے"۔ بعض نے کہا ہے کہ اوپر والے جملے سے یہ مراد ہے کہ قیامت کا تحقق اور انجام پانا

پچھلے صفحہ کا بقیہ: گزشتہ صفحہ کی رکھتا ہے اور وقوع و ثبوت اور پابرجا ہونے کے معنوں میں ہے، یا تعبیر کشتی کے لنگر انداز ہونے اور اسی طرح پہاڑوں کے رکے رہنے کی حالت ثبات میں ہونے کے بارے میں بھی آئی ہے مثلاً (وقال ارکبوا فیھا بسم اللہ مجریھا و مرساھا) (ہود)۔

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۵۰۔ یہ بات تفسیر مجمع البیان، قرطبی، فی ظلال اور دوسری تفسیروں میں بھی سورہ محمد کی آیت ۱۸ کے ذیل میں بھی مذکور ہے۔

خدا کے اختیار میں ہے۔

اور حقیقت میں اس چیز کے لیے جو گزشتہ آیت میں آئی ہے بیان علت کے برابر ہے۔ ان دونوں تفسیروں کے جمع کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لیے فرماتا ہے: "تیرا کام صرف ان لوگوں کو ڈرانا ہے جو خدا سے ڈرتے ہیں"۔ (انما انت منذر من یخشٰھا)۔ تیری ذمہ داری ڈرانا اور خبردار کرنا ہے اور بس، باقی رہا وقت کا تعین کرنا تو وہ تیرے فرائض میں داخل نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ڈرانے کو کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ مخصوص کرتا ہے جو اس عظیم دن کا خوف و ہراس رکھتے ہیں۔ اور یہ اس مفہوم کے مشابہ ہے جو سورہ بقرہ کی دوسری آیت میں آیا ہے (ذالک الکتاب لا ریب فیہ ھدی للمتقین) اس آسمانی کتاب میں کوئی شک و تردد نہیں ہے، یہ پرہیزگاروں کیلیے ہدایت کا سبب ہے۔

اس قسم کی تعبیریں اس طرف اشارہ ہیں کہ جب تک حق جوئی، حق طلبی اور پیش خدا احساس ذمہ داری کی روح انسان میں موجود نہ ہو تو وہ نہ تو کتب آسمانی کی تحقیق کرتا ہے اور نہ معاد و قیامت کی اور نہ وہ انبیاء و اولیاء کی طرف سے کی جانے والی تخویف پر توجہ کرتا ہے۔

اس سورہ کی آخری آیت میں اس حقیقت کو پیش کرنے کے لیے کہ قیامت کے آنے میں زیادہ وقت باقی نہیں ہے ارشاد فرماتا ہے: "جب قیامت کا دن دیکھیں گے تو اس طرح محسوس کریں گے گویا ان کا توقف اس جہاں میں عصر کے وقت یا صبح کے وقت سے زیادہ نہیں تھا"۔ (کانھم یوم یرونھا لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاھا)۔ دنیا کی مختصر سی عمر اس تیزی سے گزر رہی ہے اور برزخ اور بھی اس تیزی سے گزر جائے گا کہ وہ قیامت میں خیال کریں گے کہ یہ سارا زمانہ چند گھڑیوں سے زیادہ نہیں تھا۔

یہ امر بھی ذاتی طور پر صحیح ہے کہ عمر دنیا بہت ہی مختصر اور جلد گزر جانے والی ہے اور قیامت کے ساتھ موازنہ کرتے ہوئے بھی تمام جہان کی عمر اس کے مقابلہ میں ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہے۔

"عشیۃ" عصر کے معنوں میں اور "ضحیٰ" اس موقعہ پر بولا جاتا ہے جب سورج اوپر آجائے اور اس کی شعائیں پھیل جائیں۔ بعض آیات قرآنی میں آیا ہے کہ قیامت میں جب مجرمین عالم برزخ یا دنیا میں توقف کی مقدار کے بارے میں گفتگو کریں گے تو بعض دوسروں سے کہیں گے کہ تم نے صرف دس دن رات عالم برزخ میں توقف کیا ہے (یتخافتون بینھم ان لبثتم الا عشرا) (طٰہٰ/۱۰۳)۔ لیکن جو بہتر غور و فکر کریں گے وہ کہیں گے تم نے صرف ایک ہی دن کے برابر برزخ میں توقف کیا ہے (یقول امثلھم طریقۃ ان لبثتم الا یوما)

ایک دوسری جگہ مجرمین سے نقل کرتا ہے کہ جب قیامت بپا ہوگی تو مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ ایک

ساعت سے زیادہ توقف نہیں کیا (ویوم تقوم الساعۃ یقسم المجرمون مالبثوا غیر ساعۃ) (روم ۵۵)
ان تعبیروں کا اختلاف اس بنا پر ہے کہ جو چاہتے ہیں اس مدت کے مختصر ہونے کو ایک خاص انداز کے ساتھ ظاہر کریں ان میں سے ہر ایک اپنے احساسات کو ایک الگ تعبیر کے ذریعہ بیان کرتا ہے۔ ان سب کا ایک بات میں اشتراک ہے اور وہ اس جہان کی عمر کا قیامت کی عمر کے مقابلہ میں مختصر ہونا ہے۔ یہ ایسا مفہوم ہے جو انسان کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرتا ہے۔

پروردگار! ہم سب کو عالم برزخ میں، اس دنیا میں اور اس عظیم دن امن و امان اور سکون و اطمینان عطا فرما۔

پروردگار! کوئی شخص بھی اس عظیم دن کی سختیوں سے رہائی حاصل نہیں کر سکتا سوائے اس طرح کہ تیرا لطف و کرم ہو جائے۔ ہم پر اپنا خاص لطف و کرم فرما۔

بار الٰہا! ہمیں ایسے افراد میں سے قرار دے جو تیرے مقام سے خائف ہیں اور جو اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے روکتے ہیں اور بہشت بریں جن کا ملجا و ماویٰ ہے[1]

آمین یارب العالمین

(سورۂ نازعات کا اختتام)

---

[1] یہ سطور ان ساعات و لمحات میں ضبط تحریر میں آئیں جب ہر لمحے عراق کی بعثی حکومت کی طرف سے بمباری کا اور بے خانماں لوگوں کے دفن ہو جانے کا احتمال تھا۔ اس تاریخ سے ایک یا دو دن پہلے ایک بمباری میں اس شہر مقدس قم میں تقریباً ایک سو پچاس مسلمان خصوصاً بے گناہ بچے شہید ہوئے تھے لیکن مسلّم ہے کہ ظلم و ظالم کی عمر کوتاہ ہوتی ہے۔

سورۃ عبس

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا

اس میں ۴۲ آیتیں ہیں

سورۂ عبس کے مضامین

سورہ عبس مختصر ہونے کے باوجود مختلف اور اہم مسائل پر بحث کرتی ہے اور مسئلہ معاد کو خاص اہمیت دیتی ہے۔ اس کے مضامین کا پانچ موضوعات کے ماتحت خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ خدا کا شدید عتاب اس شخص پر جس نے ایک حقیقت کے متلاشی نابینا سے مناسب رویہ اختیار نہیں کیا۔

۲۔ قرآن مجید کی قدر و قیمت اور اہمیت۔

۳۔ خدا کی نعمتوں کے سلسلہ میں انسان کی ناشکر گزاری۔

۴۔ انسان اور حیوانات کی غذا کے سلسلہ میں انسان کے احساس شکر گزاری کو بیدار کرنے کے لیے خدا کی نعمتوں کے ایک حصّہ کا بیان۔

۵۔ حوادث قیامت کے کچھ لرزہ براندام کر دینے والے حصوں کی طرف اشارہ اور اس عظیم دن مومنین و کفار کا احوال۔

اس سورہ کا نام اس کی مناسبت سے

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے: من قرأ سورة عبس جاء یوم القیامة و وجهه ضاحك مستبشر: جو شخص سورہ عبس کی تلاوت کرے وہ بروزِ محشر اس حالت میں وارد ہوگا کہ اس کا چہرہ خنداں اور وہ شخص ہشاش بشاش ہوگا۔[1]

---

[1] تفسیر مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۳۵۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

(۱) عَبَسَ وَتَوَلّٰیۙ

(۲) اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰیؕ

(۳) وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰیۙ

(۴) اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰیؕ

(۵) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰیۙ

(۶) فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰیؕ

(۷) وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰیؕ

(۸) وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰیۙ

(۹) وَهُوَ يَخْشٰیۙ

(۱۰) فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰیۚ

ترجمہ

اس خدا کے نام سے جو مہربان اور بخشنے والا ہے۔

(۱) چیں بہ جبیں ہوا اور منہ پھیر لیا۔

(۲) اس وجہ سے کہ نابینا اس کے پاس آیا تھا۔

(۳) تو کیا جانتا ہے شاید وہ پاکیزگی اور تقویٰ اختیار کرے؟

(۴) یا متذکر ہو اور یہ تذکر اس کے لیے مفید ہو۔

(۵) لیکن وہ شخص جو مستغنی ہے۔

۶) تو اس کی طرف رخ کرتا ہے۔

۷) حالانکہ وہ اگر اپنے آپ کو پاک نہ کرے تو تیری کوئی ذمہ داری نہیں۔

۸) لیکن جو تیرے پاس آیا ہے اور کوشش کرتا ہے۔

۹) اور خدا سے ڈرتا ہے۔

۱۰) تو اس سے غافل ہوتا ہے۔

شانِ نزول

یہ آیات اجمالی طور پر بتاتی ہیں کہ ان میں خدا نے کسی کو سرزنش کی ہے اور اس پر عتاب کیا ہے اس لیے کہ اس نے ایک یا کسی غنی افراد کو حق طلب نابینا پر ترجیح دی ہے۔

باقی رہا یہ کہ موردِ عتاب و سرزنش کون شخص ہے اس میں اختلاف ہے۔ عام اور خاص دونوں طرح کے مفسرین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ قریش کے سرداروں کا ایک گروہ جن میں عتبہ بن ربیعہ، ابوجہل، عباس ابن عبد المطلب وغیرہ اور ان کے علاوہ کچھ اور لوگ خدمتِ پیغمبرؐ میں حاضر تھے اور پیغمبرؐ انہیں دعوتِ اسلام دینے میں مصروف تھے اور اس بات کی امید کر رہے تھے کہ یہ باتیں ان کے دلوں پر اثرانداز ہوں گی (یقینی بات تھی کہ اگر اس قسم کے افراد اسلام قبول کر لیتے تو دوسری قسم کے لوگوں کو بھی اسلام کی طرف کھینچ لاتے اور ان کی مخالفانہ کاروائیاں بھی ختم ہو جاتیں لہٰذا دونوں حیثیتوں سے یہ صورتِ حال اسلام کے لیے مفید تھی)۔

اس دوران میں عبداللہ ابن مکتوم جو نابینا اور مفلس تھے مجلس میں وارد ہوئے اور انہوں نے پیغمبرؐ سے استدعا کی کہ وہ کچھ آیتیں قرآن کی انہیں سنائیں اور انہیں ان کی تعلیم دیں۔ وہ اس بات پر مسلسل اصرار کیے جا رہے تھے اور خاموش نہیں ہو رہے تھے اس لیے کہ انہیں صحیح طور پر معلوم ہی نہیں تھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کن لوگوں سے مصروفِ گفتگو ہیں۔

انہوں نے کلامِ پیغمبرؐ کو اس قدر قطع کیا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے چہرہ اقدس پر ناگواری کے آثار ظاہر ہو گئے۔ آپؐ نے اپنے دل میں کہا کہ یہ عرب کے سردار کیا سوچیں گے کہ محمدؐ کے پیروکار نابینا اور غلام ہیں لہٰذا آپؐ نے عبداللہ کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا اور گروہ قریش کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی تو اس موقع پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں۔ (اور اس سلسلہ میں پیغمبرؐ کو موردِ عتاب قرار دیا)۔

رسولِ کریمؐ اس واقعہ کے بعد عبداللہ کا ہمیشہ احترام کرتے اور جس وقت ان کو دیکھتے تو فرماتے: (مرحبا

بمن عاتبنی فیه ربی) "مرحبا اے وہ شخص جس کی وجہ سے میرے پروردگار نے مجھے مورد عتاب قرار دیا"
اس کے بعد ان سے کہتے "کیا تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے جسے میں بہم پہنچاؤں" اور پیغمبر اسلامؐ نے ان کو
دو مرتبہ غزوات اسلامی کے سلسلہ میں مدینہ میں اپنا جانشین قرار دیا۔[1]

دوسری شانِ نزول

جو کچھ مندرجہ آیات کے سلسلہ میں نقل ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یہ آیات بنی امیہ میں سے ایک شخص کے بارے میں نازل ہوئیں جو پیغمبرؐ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ عبداللہ ابن مکتوم وارد ہوئے۔ جب اُس کی نگاہ عبداللہ پر پڑی تو اس نے اپنا دامن سمیٹا اس خیال سے کہ وہ کہیں میلا نہ ہو اور اپنے چہرے پر ناگوار اثرات ظاہر کیے اور منہ پھیر لیا تو خدا نے مندرجہ بالا آیات میں اس کے عمل کو نقل کرکے اسے مورد عتاب قرار دیا۔ یہ شانِ نزول ایک حدیث میں امام جعفرؑ سے منقول ہے۔[2]

محقق بزرگ شیعہ مرحوم سید مرتضےٰ نے اسی شانِ نزول کو قبول کیا ہے۔ البتہ آیت میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو صراحت کے ساتھ دلالت کرے کہ اس سے مراد خود پیغمبرؐ ہیں جو چیز اس امر پر قرینہ بن سکتی ہے وہ صرف باتیں ہیں جو آیت ۸ سے لے کر آیت ۱۰ تک کہی گئی ہیں۔ مثلاً "جو شخص خدا کی آیتوں کو سننے کے لیے تیزی سے تیرے پیچھے آتا ہے اور خدا سے ڈرتا ہے تو اس سے غافل ہوتا ہے۔" یہ ایسی چیز ہے جو ہر شخص سے زیادہ پیغمبرؐ پر صادق آتی ہے لیکن مرحوم سید مرتضےٰ کے بقول ان آیات میں کئی قرائن بتاتے ہیں کہ اس سے مراد پیغمبرؐ نہیں ہیں۔

پھر یہ کہ عبوس "ترشروئی اختیار کرنا" صفاتِ انبیاء میں سے نہیں ہے۔ خصوصاً پیغمبر اسلامؐ تو آپ اپنے دشمنوں سے بھی کشادہ روئی سے بات کرتے تھے چہ جائیکہ ایک ایسے مومن سے ترشروئی اختیار کریں جو حقیقت کی تلاش میں رہتا ہو۔

دوسرے یہ کہ اغنیاء کی طرف متوجہ ہونا اور حق طلب مفلس سے غافل ہونا آنحضرتؐ کے ان اخلاق کے ساتھ جن کی طرف سورہ (قلم) کی آیت ۴ میں اشارہ ہوا ہے (وانک لعلیٰ خلق عظیم) "تو عظیم اخلاق پر فائز ہے" ہرگز مطابقت نہیں رکھتا خصوصاً جبکہ مشہور یہ ہے کہ سورہ (قلم) سورہ عبس سے پہلے نازل ہوا۔[3]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۳۷۔
[2] ایضاً " " " " "۔
[3] ایضاً " " " " "۔

تفسیر

حق طلب نابینا سے بے اعتنائی برتنے پر شدید عتاب

جو کچھ شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے اب ہم اس کی تفسیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پہلے فرماتا ہے :

"اس نے ترشروئی اختیار کی اور منہ پھیرا"۔ (عبس و تولّٰی)۔ "اس وجہ سے کہ نابینا اس کے پاس آیا تھا"۔ (ان جاءہ الاعمٰی)۔ "تو کیا جانتا ہے شاید وہ ایمان، پاکیزگی اور تقویٰ کی جستجو میں ہو"۔ (وما یدریک لعلہ یزکّٰی)۔ "یا حق کی باتیں سننے سے ذکر یافتہ ہو جاتے اور یہ تذکر اس کے لیے مفید ہو"۔ (او یذکر فتنفعہ الذکرٰی)۔ اور اگر سو فیصد پاک نہ بھی ہو اور تقویٰ اختیار نہ کرے تو اس ذکر سے کم از کم نصیحت حاصل کرے اور بیدار ہو اور یہ بیداری اجمالی طور پر اس پر اثر انداز ہو۔[1]

اس کے بعد اس عتاب کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "باقی رہا وہ جو اپنے آپ کو غنی اور بے نیاز سمجھتا ہے"۔ (اما من استغنٰی)۔ "تو اس کی طرف رُخ کرتا ہے اور توجہ کرتا ہے"۔ (فانت لہ تصدّٰی)۔ اور اس کی ہدایت پر اصرار کرتا ہے حالانکہ وہ مغرور، ثروت و خود خواہی میں مبتلا ہے۔ وہ غرور جو طغیان و سرکشی کا منشا ہے جیسا کہ سورہ علق کی آیت ۶، ۷ میں آیا ہے (ان الانسان لیطغٰی ان رّاٰہ استغنٰی) انسان طغیان و سرکشی کرتا ہے اس بنا پر کہ اپنے آپ کو غنی سمجھتا ہے۔[2]

حالانکہ وہ تقویٰ کی راہ اختیار نہ کرے اور ایمان نہ لائے تو تیری کوئی ذمہ داری نہیں۔ (وما علیک الّا یزکّٰی)۔ تیری ذمہ داری صرف تبلیغ رسالت ہے (خواہ اناں پندگیرند یا ملال) چاہے وہ نصیحت حاصل کریں چاہے انہیں ملال ہو۔ اس لیے ہر قسم کے افراد کے واسطے حق طلب نابینا سے لاپرواہی نہیں برتنی چاہیئے اور اسے آزردہ نہیں کرنا چاہیئے خواہ تیرا مقصد یہ بھی ہو کہ یہ اکڑنے والے لوگ ہدایت حاصل کرلیں۔ تاکید و

---

[1] اس وجہ سے اس آیت میں اور گزشتہ آیت میں فرق یہ ہے کہ وہاں گفتگو کامل پاکیزگی اور تقویٰ کے بارے میں ہے اور یہاں تذکر کی اجمالی تاثیر کے بارے میں بات ہو رہی ہے چاہے کامل تقویٰ کے مقام تک نہ پہنچے۔ نتیجۃً وہ حق طلب نابینا تذکر سے فائدہ اٹھائے گا چاہے کم فائدہ ہو چاہے مختصر۔ بعض مفسرین سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی آیت گناہوں سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری کسب اطاعات و پیروی فرمانِ خدا کی طرف۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔

[2] راغب مفردات میں کہتا ہے غنی، استغنٰی وتغنی اور تغانی کے ایک ہی معنی ہیں پھر اس کے بقول تصدّی "صدی" (بروزن فتی) اصل میں اس آواز کے معنی میں ہے جو پہاڑ سے ٹکرا کر واپس آتی ہے۔ اس کے بعد لفظ تصدّی کسی چیز کے روبرو قرار پانے کے معنی میں ہے اور مکمل طور پر اس کی طرف توجہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

عتاب کو نئے سرے سے شروع کرتا ہے اور خطاب کی صورت میں فرماتا ہے :

۔ باقی رہا وہ شخص جو تیرے پاس آتا ہے اور ہدایت و پاکیزگی کے لیے کوشش کرتا ہے" (واما من جاءك يسعٰى)۔" اور خدا سے ڈرتا ہے" (وهو يخشٰى) [1]

اسی خوفِ خدا نے اسے تیرے پیچھے بھیجا ہے تاکہ وہ زیادہ حقائق سنے اور ان پر کاربند ہو اور اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ کرے ۔ تو اس سے غفلت کرتا ہے اور دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے" (فانت عنه تلهّٰى) [2]

"انت" تو کی تعبیر حقیقت میں اس طرف اشارہ ہے کہ تجھ جیسے انسان کے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ اس قسم کے حق طلب انسان سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل ہو اور دوسرے کی طرف متوجہ ہو اور تیرے دوسروں کی طرف متوجہ ہونے کا مقصد بھی یہ ہو کہ ان کو ہدایت حاصل ہو۔ اس لیے ترجیح اس کمزور اور پاک دل گروہ ہی کو ہے۔

بہر حال یہ عتاب و خطاب اس اہم حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اسلام اور قرآن راہِ حق کو طے کرنے والے کمزور افراد کے لیے خاص قسم کی اہمیت و احترام کا قائل ہے اور اس کے برعکس حالت پر تیز اور سخت تنقید کرتا ہے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو نعمتِ الٰہی کی فراوانی کی وجہ سے مغرور ہو گئے ہیں، یہاں تک کہ خدا راضی نہیں ہوتا کہ تو ان کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اس حق طلب کمزور طبقہ میں کم سے کم رنجش بھی پیدا کرے۔

اس کی وجہ اس لیے بھی واضح ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اسلام کے مخلص سہارا بننے والے، مشکلات کے وقت دین کے عظیم پیشواؤں کی آواز پر لبیک کہنے والے ، میدانِ جنگ میں قربانی پیش کرنے والے اور شہید ہونے والے تھے۔ جیسا کہ امیر المومنین حضرت علیؑ اپنے مشہور مالک اشتر والے فرمان میں فرماتے ہیں: وانما عماد الدين و جماع المسلمين والعدة للاعداء العامة من الامة فليكن صغوك لهم و ميلك معهم ۔ دین کا ستون اور مسلمانوں کے اجتماع کا سرمایہ اور دشمنوں کے مقابلہ میں قوت و طاقت کا ذخیرہ امت کے صرف عامۃ الناس ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ ان کی بات کان دھر کے سننا اور ان کی طرف اپنی خاص توجہ رکھنا چاہیئے [3]

---

[1] اس میں شک نہیں کہ یہاں خشیت سے مراد خوفِ خدا ہے، ایسا خوف جو انسان کو زیادہ سے زیادہ تحقیق پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کے مشابہ جو متکلمین نے دفعِ ضررِ محتمل کا استشہاد کرتے ہوئے وجوبِ معرفتِ خدا کے سلسلہ میں کہا ہے اور یہ جو فخر رازی نے احتمال پیش کیا ہے کہ مراد کفار کا خوف ہے یا نابینا ہونے کی وجہ سے گر پڑنے کا خوف مقصود ہے بہت بعید ہے۔

[2] "تلهّٰی" لہو کے مادہ سے سرگرم کر دینے والے کام کے معنی میں ہے اور یہاں اس سے غفلت برتنے اور دوسرے کی طرف متوجہ ہونے کے معنی میں ہے اور حقیقت میں تصدی کا نقطۂ مقابل ہے۔

[3] نہج البلاغہ جز خطوط خط ۵۳۔

(۱۱) كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ

(۱۲) فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ

(۱۳) فِىْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ

(۱۴) مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ

(۱۵) بِاَيْدِىْ سَفَرَةٍ ۙ

(۱۶) كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ؕ

(۱۷) قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ؕ

(۱۸) مِنْ اَىِّ شَىْءٍ خَلَقَهٗ ؕ

(۱۹) مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ

(۲۰) ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ۙ

(۲۱) ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ۙ

(۲۲) ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ ؕ

(۲۳) كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ؕ

ترجمہ

(۱۱) کبھی ایسا نہ کر یہ (قرآن) ایک یاد آوری ہے۔

(۱۲) جو شخص چاہے اس سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔

(۱۳) قیمتی الواح میں ثبت ہے۔

(۱۴) بیش قدر اور پاکیزہ الواح میں ۔

(۱۵) ایسے سفیروں کے ہاتھ میں ۔

(۱۶) جو والا مقام فرمانبردار اور نیکوکار ہیں ۔

(۱۷) موت آجائے انسان کو، یہ کس قدر کافر اور ناشکر گزار ہے ؟

(۱۸) خدا نے اسے کس چیز سے پیدا کیا ہے ؟

(۱۹) اسے ناچیز نطفہ سے پیدا کیا پھر اس کا اندازہ لگایا او[illegible]سے موزوں بنایا۔

(۲۰) پھر اس کے لیے راستہ آسان کیا۔

(۲۱) اس کے بعد اسے مار دیا اور قبر میں دفن کیا۔

(۲۲) پھر جس وقت چاہے گا اسے زندہ کرے گا۔

(۲۳) اس طرح نہیں ہے جیسے وہ خیال کرتا ہے اس نے ابھی تک حکم خدا کی اطاعت نہیں کی ہے ۔

تفسیر

صرف پاک لوگوں کا ہاتھ قرآن کے دامن تک پہنچتا ہے

گزشتہ آیات کے بعد، جن میں گفتگو اس شخص کی سرزنش کے بارے میں تھی جس نے ایک حق طلب نابینا کی طرف توجہ کم کی تھی، ان آیات میں قرآن مجید کی اہمیت، اس کے پاک مبداء اور اس کی نفوس میں تاثیر کے مسئلہ کو پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"ہرگز اس کام کی تکرار نہ کر اور اس کو ہمیشہ کے لیے بھول جا" (کلا)۔ "یہ آیات چونکہ خلق خدا کے تذکرہ یاد آوری کا وسیلہ ہیں" (انھا تذکرۃ) [1]

---

[1] "انھا" کی ضمیر مؤنث ہے آیات قرآن کی طرف راجع ہے ۔

اس چیز کی ضرورت نہیں کہ پاک دل مستضعفین سے تُو غافل ہو کر اثر و رسوخ رکھنے والے مغرور افراد پر توجہ دے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ "کلا انھا تذکرۃ" کا جملہ مشرکین اور دشمنان اسلام کی ان تمام تہمتوں کا جواب ہو جو قرآن کے بارے میں تھیں کبھی اسے شعر کہتے تھے کبھی جادو، کبھی اس قسم کی کہانت۔ قرآن کہتا ہے ان تہمتوں میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے بلکہ یہ آیات بیداری، آگاہی، یاد آوری اور ایمان کا وسیلہ ہیں اور اس کی دلیل خود انہی میں پوشیدہ ہے اس لیے کہ جو شخص بھی اس کے نزدیک ہوتا ہے، سوائے معاندین، کج بحث اور ہٹ دھرم افراد کے، وہ یہ اثر اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

جو شخص چاہے اس سے پند و نصیحت حاصل کر سکتا ہے (فمن شاء ذکرہ)[1]

یہ تعبیر اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جبر و اکراہ درمیان میں نہیں ہے اور اس بات کی دلیل بھی ہے کہ انسان اپنے ارادے میں آزاد ہے جب تک وہ نہ چاہے اور قبول ہدایت کا مصمم ارادہ نہ کرے آیات قرآنی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

اس کے بعد مزید فرماتا ہے، "خدا کے یہ عظیم کلمات بیش قیمت صحائف میں ثبت ہیں (الواح و اوراق میں) (فی صحف مکرمۃ)۔

"صحف" صحیفہ کی جمع ہے جو لوح، تختی، ورق یا کوئی اور چیز ہے جس پر کسی مفہوم کو لکھتے ہیں۔ یہ تعبیر بتاتی ہے کہ آیات قرآن پیغمبر اکرمؐ پر نزول سے پہلے کچھ الواح پر لکھی ہوئی تھیں اور وحی کے فرشتے انہیں اپنے ساتھ لے کر آتے تھے۔ بہت ہی گراں قدر اور بیش قیمت الواح تھیں۔

یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ صحف سے مراد گزشتہ انبیاء کی کتب ہیں غالباً یہ قبل و بعد کی آیات سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اسی طرح یہ جو کہا گیا ہے کہ اس سے مراد لوح محفوظ ہے وہ بھی مناسب نظر نہیں آتا کیونکہ لفظ صحف صیغہ جمع کی شکل میں لوح محفوظ کے بارے میں استعمال نہیں ہوا۔ اس کے بعد فرماتا ہے،

"یہ صحائف و الواح بیش قیمت اور پاکیزہ ہیں" (مرفوعۃ مطھرۃ)۔ یہ اس سے بالاتر ہیں کہ ناابلوں کے ہاتھ ان کی طرف بڑھیں یا ان میں تحریف کرنے کی ان میں طاقت ہو۔ اور یہ اس سے زیادہ پاک ہیں کہ ناپاک لوگوں کے ہاتھ انہیں آلودہ کریں۔ نیز ہر قسم کے تناقض، تضاد اور شک و شبہ سے پاک ہیں۔ اس سے قطع نظر یہ آیات الٰہی سفیروں کے ہاتھ میں ہیں۔ (بایدی سفرۃ)۔ "بلند مقام مطیع و فرماں بردار اور نیکوکار سفیر" (کرام بررۃ)۔

"سفرۃ" (بروزن طلبہ) سفر کے مادہ سے سافر کی جمع ہے جس کے معنی اصل میں کسی چیز کے رُخ

---

[1] "ذکرہ" کی ضمیر اسی چیز کی طرف لوٹتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں مراد آیات ہیں لہٰذا ضمیر مؤنث ہے اور یہاں خود قرآن کی طرف اشارہ ہے جو مذکر لفظی ہے۔

سے پردہ اٹھانے سکے ہیں۔ اسی لیے وہ مختلف اقوام کے درمیان آمد ورفت رکھتے ہیں اور ان کی مشکلات دیکھتے ہیں اور مبہم باتوں سے پردہ اٹھاتے ہیں انہیں سفیر کہا جاتا ہے۔ لکھنے والے شخص کو بھی مسافر کہتے ہیں اس لیے کہ وہ کسی مطلب کے رخ سے پردہ اٹھاتا ہے۔ اس بنا پر یہاں سفرہ سے مراد الٰہی فرشتے ہیں جو وحی کے سفیر ہیں یا خدا کی آیات لکھتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ سفرہ سے مراد یہاں قرآن کے حافظ قاری اور کاتب ہیں اور علماء و دانشمند ہیں جو آیاتِ الٰہی کو ہر زمانے میں شیاطین کی دسترس سے محفوظ رکھتے ہیں لیکن یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے اس لیے کہ ان آیات میں گفتگو زمانۂ نزولِ وحی یعنی عصرِ پیغمبر سے ہے نہ کہ آئندہ سے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ کی طرف سے ہے آپ نے فرمایا: الحافظ للقراٰن العامل به مع السفرة الکرام البررة: - جو شخص قرآن کا حافظ ہو اور اس پر عمل کرے تو وہ خدا کے عظیم فرمانبرداروں کے ساتھ ہوگا۔

یہ تعبیر اچھی طرح بتاتی ہے کہ قرآن کے حافظ، مفسر اور اس پر عمل کرنے والے ان سفرہ کے ہمراہ ہیں نہ یہ کہ یہ خود وہ ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جس وقت یہ علماء اور حافظین قرآن فرشتوں سے ملتا جلتا کوئی کام انجام دیں تو ان کے برابر قرار پائیں گے۔

بہرحال اس ساری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام وہ لوگ جو حفظِ قرآن اور احیائے مطالبِ قرآن کی کوشش کرتے ہیں وہ (کرام بررہ) کی طرح بلند منزلت کے حامل ہیں۔ "کرام" کریم کی جمع ہے جو عزیز و عظیم کے معنی میں ہے اور بارگاہِ خدا میں وحی کے فرشتوں کی عظمت اور ان کے مقام کی رفعت کی طرف اشارہ ہے۔ کبھی کہا گیا ہے کہ یہ تعبیر ان کی ہر قسم کے گناہوں سے پاکیزگی کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ سورہ انبیاء کی آیت ۲۶، ۲۷ میں فرشتوں کی تعریف میں آیا ہے (بل عباد مکرمون لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون) وہ خدا کے باعزت گرامی قدر بندے ہیں جو بات کرنے میں کبھی اس سے سبقت نہیں کرتے اور ہمیشہ اس کے اوامر کا اجراء کرتے ہیں۔

"بررة" بار کی جمع ہے (مثل طالب وطلبہ) یہ "بر" کے مادہ سے ہے جس کے معنی وسعت کے ہیں۔ اسی لیے وسیع صحرا کو بر کہتے ہیں اور چونکہ نیکوکار افراد کا وجود وسیع ہے اور اس کی برکتیں دوسروں تک پہنچتی ہیں لہٰذا انہیں "بار" کہا گیا ہے۔

البتہ زیر بحث آیت میں نیکوکاری سے مراد امرِ الٰہی کی اطاعت اور گناہوں سے پاک ہونا ہے۔ اسی طرح خدا نے فرشتوں کی تین صفتوں کے حوالے سے توصیف کی ہے۔ پہلی یہ کہ وہ وحی کے سفیر اور حامل ہیں۔ دوسری یہ کہ ذاتی طور پر عزت دار اور گراں قدر ہیں۔ ان کی تیسری صفت اعمال کی پاکیزگی، عبادت گزاری،

۱؎ مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۴۳۸۔

تسلیم اور نیکوکاری ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

ہدایتِ الٰہی سے متعلق ان تمام اسباب کے باوجود جو صحف مکرمہ میں مقرب خدا فرشتوں کے ذریعہ انواع و اقسام کے تذکروں کے ساتھ نازل ہوتے ہیں پھر بھی یہ سرکش اور ناشکر گزار انسان پروردگار کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔ "قتل ہو جائے یہ انسان کس قدر کافر و ناشکرا ہے"۔ (قتل الانسان ما اکفرہ)[1]

کفر یہاں ممکن ہے کہ عدم ایمان کے معنی میں ہیا ناشکر گزاری اور کفرانِ نعمت کے معنوں میں یا حق پر قسم کا پردہ ڈالنے کے معنی میں ہو اور مناسب یہی جامع معنی ہیں کیونکہ گزشتہ آیات میں اسباب ایمان ہدایت کی گفتگو تھی۔

بعد والی آیت میں پروردگار کی انواع و اقسام کی نعمتوں کی بات ہے بہر حال "ان افراد پر موت" کی تعبیر سے مراد اس کے وہ معنی ہیں جو بطور کنایہ حاصل ہوتے ہیں یعنی یہ شدت غضب و تنفر کا اظہار ہے ان افراد کے بارے میں جو کافر اور ناشکر گزار ہیں۔ چونکہ عام طور پر سرکشی کا سرچشمہ غرور ہوتا ہے لہٰذا اس غرور کو ختم کرنے کے لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے:

خدا نے اس انسان کو کس چیز سے پیدا کیا ہے (من ای شیء خلقہ)۔ "اسے ناچیز و حقیر و بے قیمت نطفہ سے پیدا کیا ہے پھر اسے موزوں بنایا اور تمام مرحلوں میں اس کا حساب رکھا" (من نطفۃ خلقہ فقدرہ)۔ یہ انسان اپنی حقیقی خلقت کے بارے میں کیوں غور نہیں کرتا اور اپنے بنیادی سرچشمہ کی بے قیمتی کو فراموش کیوں کیے ہوتے ہے اور پھر اس نطفۂ ناچیز سے اس نادر وجود کی تخلیق کے سلسلہ میں خدا کی قدرت پر خود کیوں نہیں کرتا۔ اس لیے کہ نطفہ سے انسان کی تخلیق میں وقت اور اس کی تمام وجودی جہتوں کا حساب، اس کے پیکر کے اعضاء، اس کی استعدادیں اور اس کی ضرورتیں یہ سب معرفتِ خدا کے لیے بہترین دلیلیں ہیں۔

"قدرہ" کا جملہ تقدیر کے مادہ سے ناپ تول اور موزوں بنانے کے معنی میں ہے۔ اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ وجودِ انسانی کی ساخت میں بیس سے زیادہ دھاتیں اور دھات سے ملتی جلتی چیزیں استعمال ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک مقدار اور کیفیت کے لحاظ سے معین و مقرر اندازہ رکھتی ہے۔ اگر اس میں کمی و بیشی واقع ہو تو انسانی وجود کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس سے قطع نظر اعضائے بدن کی ساخت کی کیفیت اور ان کا ایک دوسرے سے تناسب و ارتباط دقیق اندازہ پر مشتمل ہے۔

---

[1] "قتل الانسان" کی تعبیر ایک قسم کی بددعا ہے اور زمخشری کے بقول (کشاف میں) یہ بدترین قسم کی نفرین ہے اور "ما اکفرہ" میں لفظ "ما" تعجب کے اظہار کے لیے ہے۔ اس پر تعجب ہے کہ تمام اسبابِ ہدایت رکھتا ہے اور خدا کی نعمتیں بھی اسے حاصل ہیں پھر بھی کفر کی راہ اختیار کرتا ہے۔

نیز وہ استعدادیں اور میلانات جو انسان میں انفرادی طور پر ہیں اور مجموعۂ جہانِ بشریت میں پچھپے ہوئے ہیں، ضروری ہے کہ خاص حساب کے مطابق ہوں تاکہ سعادت انسان کی تکمیل کریں۔

خدا وہ ہے جس نے یہ تمام حساب اس حقیر نطفہ میں انجام دیا۔ وہ نطفہ جو اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر تمام انسانی افراد کی تعداد کے مطابق زندگی کے اصلی سیل (ماہانا) جو نطفہ کے پانی میں تیر رہے ہیں ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو انگلی کی ایک پور کو پُر نہیں کر سکتے۔

جی ہاں! اس قسم کے چھوٹے سے وجود میں خدا نے ان سب بدائع اور نقوش کی تصویر کشی کی ہے اور انہیں اس میں ودیعت کیا ہے۔ بعض مفسرین نے تقدیر کے معنی آمادہ کرنا تجویز کیے ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ تقدیر سے مراد اس ناچیز نطفہ میں ایجاد قدرت ہے۔ وہ خدا کتنا عظیم ہے جس نے اس معمولی سے وجود کو یہ سب قدرت و توانائی بخشی ہے جو آسمان و زمین اور سمندروں کی گہرائیوں کو اپنی جولاں گاہ بنا سکتا ہے اور اپنے گرد و پیش کی تمام توانائیوں کو زیرِ تسلط لا سکتا ہے۔[1]

ان تینوں تفسیروں کے درمیان جمع ممکن ہے۔ اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"پھر راستے کو اس کے لیے آسان کر دیا" (ثم السبیل یسرہ)۔ شکم مادر میں جنین کی پرورش اس کے تکامل و ارتقاء اور اس کے بعد اس دنیا کی طرف اس کے منتقل ہونے کو سہل و آسان بنا دیا۔ انسان کی پیدائش کے عجائبات میں سے یہ ہے کہ پیدا ہونے کے لمحات سے پہلے وہ شکم مادر میں اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا سر اوپر کی طرف ہوتا ہے اور اس کا چہرہ ماں کی پشت کی جانب اور اس کے پاؤں رحم کے نچلے حصہ میں ہوتے ہیں لیکن جب تولد کا فرمان صادر ہوتا ہے تو وہ اچانک الٹا ہو جاتا ہے اس کا سر نیچے کی طرف ہو جاتا ہے اور یہی صورت حال اس کی پیدائش کو اس کے اور اس کی ماں کے لیے آسان بنا دیتی ہے۔ البتہ بعض اوقات ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جو سر کی بجائے پاؤں کی طرف سے متولد ہوتے ہیں اور ماں کے لیے مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔

پیدائش کے بعد بھی بچپن کے دور میں جسم کی نشو و نما پھر رشد و بلوغ و عزائز کی نشو و نما کو اس کے لیے آسان بنا دیا ہے۔ اس کے بعد ہدایتِ معنوی اور حصولِ ایمان کو عقل اور دعوتِ انبیاء کے ذریعہ سہل کر دیا۔ کیسا جامع اور جاذب توجہ جملہ ہے جو مختصر ہونے کے باوجود ان تمام معاملات کی طرف اشارہ کرتا ہے "ثم السبیل یسرہ"۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ فرماتا ہے:

"راہ کو انسان کے لیے آسان کیا" یہ نہیں فرماتا کہ اس کو اس راستے کے طے کرنے پر مجبور کیا۔ یہ انسان

---

[1] راغب نے مفردات میں کہا ہے "قدرہ بالتشدید: اعطاہ القدرۃ یقال قدرنی اللہ علی کذا وقوانی علیہ" اس بناء پر تقدیر کا مادہ عطائے قدرت و قوت کے معنی میں بھی آیا ہے۔

کے ارادہ کی آزادی اور اختیار کے بارے میں دوسری تاکید ہے۔ پھر اس طولانی راہ کو طے کرنے کے بعد انسان کی عمر کے اختتام کے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتا ہے:

"پھر اس کو مارتا ہے اور قبر میں پنہاں کرتا ہے" (ثم اماته فاقبره)۔ یقیناً (اماته) مارنا خدا کا کام ہے لیکن قبر میں پنہاں کرنے کا کام ظاہراً انسان سے متعلق ہے لیکن چونکہ اس کام کے لیے عقل و ہوش اور اسی طرح دوسرے وسائل کو خدا نے فراہم کیا ہے لہٰذا اس کام کی خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اس کام کے خدا کی طرف نسبت دینے سے مراد یہ ہے کہ اس نے انسان کے لیے قبر کو خلق کیا ہے اور وہ مٹی کے اندر کا حصّہ ہے اور بعض نے اس کو میتوں کے دفن کرنے کے سلسلہ میں حکم تشریعی اور دستورِ الٰہی کے معنی میں لیا ہے۔

بہرحال نوعِ بشر کے بارے میں الٰہی احترام میں سے ایک یہی چیز ہے یعنی ان کے اجسام کو دفن کرنا اس لیے کہ اگر دفن کرنے کا کوئی سلسلہ نہ ہوتا یا اس کے بارے میں کوئی حکم صادر نہ ہوا ہوتا اور بدنِ انسانی زمین پر رہ جاتا اور بدبودار ہو جاتا اور اس کے بعد درندہ و پرندکا لقمہ بنتا تو کیسی عجیب قسم کی ذلت و خواری تھی۔

اس بنا پر نہ صرف اس دنیا میں انسان کے حال پر اللہ کا کرم ہے بلکہ موت کے بعد بھی اس کا کرم اس کے شاملِ حال ہے۔ اس سے قطع نظر مُردوں کے دفن کرنے کا حکم (غسل و کفن و نماز کے بعد) ایک الہام بخش دستور ہے اس کی رو سے انسان کے مُردوں کو ہر طرح سے پاک و محترم ہونا چاہیئے۔ زندہ تو بہرحال ان سے بہتر ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں موت کو اللہ کی نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اگر دقّتِ نظر سے کام لیا جائے تو صورتِ حال اسی قسم کی ہے اس لیے کہ اوّل تو موت اس دنیا کی تکالیف سے رہائی کی تمہید ہے اس کے بعد انسان ایک دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے جو بہت زیادہ وسیع ہے۔ دوسرے یہ کہ موجودہ نسل کی موت آنے والی نسلوں کے لیے جگہ کے وسیع ہونے کا سبب بنتی ہے اور نوعِ انسانی کے تکامل حاصل کرنے کا سبب بھی بنتی ہے۔

اگر یہ صورتِ حال نہ ہو تو دنیا انسانوں کے لیے اس قدر تنگ ہو جاتی کہ روئے زمین پر زندگی گزارنا غیر ممکن ہو جاتا۔ جاذبِ توجہ یہ بات ہے کہ ایک لطیف اشارہ کے ضمن میں سورہ رحمٰن کی آیت ۲۶ سے لے کر ۲۸ تک فرماتا ہے:

(کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام فبای اٰلاء ربکما تکذبان) "تمام وہ لوگ جو روئے زمین پر زندگی بسر کرتے ہیں مر جائیں گے صرف تیرے پروردگار کی ذاتِ گرامی و پُر جلال باقی رہ جائے گی۔ پس تم اپنے پروردگار کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے"

ان تینوں آیتوں کے مطابق موت خدا کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ جی ہاں! دنیا اپنی تمام

نعمتوں کے باوجود مومن کے لیے ایک زندان ہے اور اس دنیا سے نکلنا اس زندان سے آزاد ہونا ہے۔ اس سے قطع نظر خدا کی عطا کی ہوئی بہت زیادہ نعمتیں بعض اوقات کسی گروہ کے لیے غفلت کا سبب بن جاتی ہیں اور موت کی یاد غفلت کے پردے ہٹا دیتی ہے۔ لہٰذا موت اس لحاظ سے بھی تنبیہ کرنے والی اور خبردار کرنے والی نعمت ہے۔ ان سب چیزوں سے قطع نظر دنیاوی زندگی اگر جاری رہے تو وہ یقیناً انسان کو تھکا دینے والی ہے۔ برخلاف زندگی اخروی کے کہ وہ سراپا نشاط و خوشدلی ہے۔[1]

اس کے بعد انسانوں کے قبر سے اٹھنے کے مرحلہ کو پیش کرتے ہوئے مزید فرماتا ہے:

"اس کے بعد جب چاہے گا اسے زندہ کر کے حساب اور جزا و سزا کے لیے محشور کرے گا"

(ثم اذا شاء انشرہ)۔

"انشرہ" انشار کے مادہ سے جمع کرنے کے بعد پھیلانے کے معنی میں ہے۔ یہ بڑی عمدہ تعبیر ہے جو یہ بتاتی ہے کہ موت کے بعد انسانوں کی زندگی کلی طور پر جمع ہو جائے گی اور قیامت میں زیادہ عظیم اور بہتر ماحول میں ہوگی۔

قابلِ توجہ یہ ہے کہ مرنے اور قبر میں پنہاں ہونے کے مسئلہ میں مشیتِ الٰہی کی تعبیر سے کام لیا گیا ہے لیکن یہاں کہتا ہے: "جس وقت خدا چاہے گا اُسے زندہ کرے گا" تعبیر کا یہ فرق ہو سکتا ہے کہ اس بنا پر ہو کہ کوئی فرد اس عظیم حادثہ (قیامت) کی تاریخ سے باخبر نہیں ہے۔ صرف خدا ہی جانتا ہے لیکن موت کے بارے میں اجمالی طور پر معلوم ہے کہ انسان عمرِ طبعی کا ایک حصہ طے کرنے کے بعد، خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے، اسے ضرور موت آئے گی۔

آخری زیرِ بحث آیت میں فرماتا ہے انسان نے ان تمام نعمتوں کے باوجود اس دن سے لے کر جس دن یہ بے قیمت نطفہ کی شکل میں تھا اس دن تک جب اس دنیا میں قدم رکھا اور اپنی راہِ کمال طے کی پھر اس دنیا سے وہ چلا گیا اور قبر میں پنہاں ہو گیا اور اس نے اپنی صحیح راہ اختیار نہیں کی۔ "اس طرح نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتا ہے اس نے ابھی تک فرمانِ الٰہی کو انجام نہیں دیا۔" (کلا لما یقض ما امرہ)[2]

---

[1] شاعر کہتا ہے: من از دو روزۂ عمر آمدم بجان اے خضر چہ می کنی تو کہ یک عمر جاوداں داری

اے خضر! میں دو دن کی زندگی سے تنگ آگیا ہوں، آپ کا کیا حال ہوگا جنہیں عمر جاودانی ملی ہے۔

[2] بعض نے یہاں "کلا" کی تفسیر حقا کی ہے لیکن ظاہر یہی ہے کہ یہ اپنے مشہور و معروف معنی لیے ہوئے ہے اور "ردع" کے معنی میں ہے اس لیے کہ بہت سے کوتاہ بین افراد یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا کے معاملہ میں انہوں نے اپنی ذمہ داریاں انجام دے دی ہیں۔ آیت کہتی ہے ایسا نہیں ہے جیسا وہ سوچتے ہیں انہوں نے ابھی تک اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔

"لمّا" کی تعبیر جو عام طور پر استمرار اور نفی کے پہلو کو لیے ہوتے ہوتی ہے اُس سے اِس طرف اشارہ ہے کہ تمام الٰہی نعمتوں کی موجودگی سے اور بیداری کے اُن تمام وسائل کے ہوتے ہوئے جو انسان کے اختیار میں ہیں یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ امر الٰہی کی اطاعت میں بہت زیادہ کوشاں ہو لیکن تعجب کی بات ہے کہ اس نے ابھی تک اس ذمہ داری کو پورا نہیں کیا۔

یہ بات کہ انسان سے مراد یہاں کون سے افراد ہیں اس کے بارے میں دو تفسیریں ہیں پہلی یہ کہ اس سے مراد وہ انسان ہیں جو کفر، نفاق، انکارِ حق اور ظلم وعصیاں کی راہ پر گامزن ہیں۔ سورہ ابراہیم کی آیت ۳۴ کے قرینہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے جس میں فرماتا ہے:

(ان الانسان لظلوم کفار) "انسان بہت ہی ظالم، کافر اور ناشکر گزار ہے۔" دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس میں بہت انسان شامل ہیں، اس لیے کہ کسی شخص نے بھی، عام اس سے کہ مومن ہو یا کافر حقِ عبودیت و بندگی کو اس طرح ادا نہیں کیا جس کی عظمت خدا مستحق ہے۔ جیسا کہ کہتے ہیں:

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش عذر بہ درگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوارِ خداوندیش کس نتواند کہ بجا آورد

وہی بندہ اچھا ہے جو بارگاہ خداوندی میں اپنی کوتاہی کا عذر پیش کرے ورنہ اس کی بارگاہ کے لائق کوئی شخص بھی بندگی کا فرض ادا نہیں کر سکتا۔

۲۴ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖۤ ۙ

۲۵ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۙ

۲۶ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۙ

۲۷ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۙ

۲۸ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ۙ

۲۹ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ۙ

۳۰ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ۙ

۳۱ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ۙ

۳۲ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ؕ

ترجمہ

۲۴ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنی غذا کو دیکھے۔

۲۵ ہم نے آسمان سے وافر تعداد میں پانی برسایا۔

۲۶ پھر زمین کو چیرا۔

۲۷ اور اس میں بہت سے دانے اگائے۔

۲۸ اور انگور اور بہت سی سبزیاں۔

۲۹ اور زیتون اور بہت سے کھجور کے درخت۔

۳۰ اور درختوں سے پُر باغات۔

(۳۱) اور پھل اور چراگاہیں۔

(۳۲) تاکہ تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بنیں۔

تفسیر

انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی غذا کی طرف دیکھے

چونکہ گزشتہ آیات کا موضوع مسئلہ معاد تھا اور یہ آیات بھی کافی زیادہ صراحت کے ساتھ اسی مسئلہ کی بات کرتی ہیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ زیر بحث آیات نظریۂ معاد کی دلیل کے طور پر ہیں۔

پروردگار عالم ان آیتوں میں ہر چیز پر خدا کی قدرت کو بیان کرکے، اور اسی طرح مُردہ زمینوں کی بارش کے نزول کے ذریعہ زندگی سے جو عالم گیاہ و نباتات میں ایک قسم کا معاد ہے، اس کا ذکر کرکے امکان قیامت کو ثابت کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ یہ آیات انواع و اقسام کی ان غذاؤں کے بارے میں ہیں جو خدا نے انسانوں اور چوپاؤں کے اختیار میں دی ہیں اور ان کی گفتگو کر رہی ہیں لہٰذا پروردگار عالم انسان کی حس شکرگزاری کو انگیخت دیتا ہے اور اس کو اپنے منعم کی معرفت کی دعوت دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے:

"انسان کو چاہیئے کہ اپنی غذا کی طرف دیکھے کس طرح خدا نے اُسے پیدا کیا ہے" (فلینظر الانسان الی طعامه) [1]

خارجی اشیاء میں انسان کے سب سے زیادہ قریب اس کی غذا ہے جو کچھ تبدیلی کے بعد انسان کے بدن کا جزو بن جاتی ہے۔ اگر اس تک وہ غذا نہ پہنچے تو یہ بہت جلد فنا ہو جائے۔ اسی لیے قرآن نے تمام موجودات میں سے صرف ایسے غذائی مواد پر انحصار کیا ہے جو گیاہ و نباتات و اشجار سے حاصل ہوتی ہے۔

واضح رہے کہ دیکھنے سے مراد محض ظاہری طور پر دیکھنا نہیں ہے بلکہ اس مواد غذائی کی ساخت اور بناوٹ کے بارے میں اور اس کے حیات بخش اجزاء کے بارے میں اور عجیب و غریب اثرات پر جو وہ وجود انسانی پر مرتب کرتی ہیں، غور و فکر کرنا ہے۔

اور یہ جو بعض مفسرین نے احتمال پیش کیا ہے کہ اس سے مراد ظاہری طور پر نگاہ کرنا ہی ہے، وہ نگاہ کرنا لعاب دہن کے غدودوں کی تحریک کا باعث ہوتا ہے، وہ غلط ہے کیونکہ اس لیے کہ قبل و بعد کی آیات کے قرینے سے اس قسم کا کوئی تصور نہیں ملتا۔

---

[1] ممکن ہے فلینظر کا جملہ شرط مقدر کی جزا ہو اور تقدیر میں اس طرح ہے ان کان الانسان فی شک من ربه و من البعث فلینظر الی طعامه۔

ہاں بعض غذا شناس جو قرآن کو صرف اپنے ذاتی اور محدود وسائل کے زاویہ سے دیکھتے ہیں ان کے لیے ممکن ہے کہ وہ مذکورہ آیات کے ذیل میں یہ خیال رکھتے ہوں۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ بھی ہے کہ موادِ غذائی کی طرف دیکھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان جب دسترخوان پر بیٹھتا ہے تو اس وقت نگاہ تدبر و تفکر سے دیکھے کہ اس میں موادِ غذائی کو اس نے کن ذرائع سے فراہم کیا ہے، حلال ذرائع سے یا حرام ذرائع سے، مشروع ذرائع سے یا غیر مشروع سے۔ اس طرح وہ اخلاقی اور تشریعی پہلوؤں کو موردِ توجہ قرار دے۔

بعض روایات میں، جو معصومین سے منقول ہیں، آیا ہے کہ یہاں طعام سے مراد علم و دانش ہے جو روحِ انسانی کی غذا ہے۔ اسے دیکھنا چاہیئے کہ اسے کس سے حاصل کیا ہے۔

منجملہ دیگر باتوں کے امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: (علمه الذی یأخذه عمن یأخذه) جو علم حاصل کر رہا ہے وہ کس سے حاصل کر رہا ہے[1]

اسی طرح کا ایک قول امام جعفر صادقؑ سے بھی منقول ہے[2]

اس میں شک نہیں کہ آیت کے ظاہری معنی جسمانی غذائیں ہی ہیں جو بعد والی آیات میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوتی ہیں لیکن غذائے روحانی کو بھی الویت کی بنا پر معلوم کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ انسان روح و جسم سے مرکب ہے اور جس طرح اس کا جسم مادی غذا کی احتیاج رکھتا ہے اسی طرح اس کی روح روحانی غذا کی محتاج ہے۔

انسان کو چاہیئے کہ جہاں اپنی جسمانی غذا کے بارے میں تفکر کرے وہاں بعد والی آیت کے مطابق اس غذا کے سرچشمے یعنی بارانِ رحمت کے بارے میں بھی سوچے جو حیات بخش ہے۔ اور اسے اپنی روحانی غذا کے بارے میں بھی غور و فکر کرنا چاہیئے جو بارانِ وحی کے ذریعہ سے پیغمبرؐ کے قلب پاک کی سرزمین پر نازل ہوتی ہے، معصومین کے سینے میں اس کا ذخیرہ ہوتا ہے اور جوش مارنے والے چشموں کی طرح وہ ان کے حقیقی قلوب پر جاری ہوتی ہے اور انواع و اقسام کے لذت بخش پھلوں یعنی ایمان و تقویٰ اور اخلاقی فضائل کی پرورش کرتی ہے۔

جی ہاں! انسان کو اچھی طرح دیکھنا چاہیئے کہ اس کے علم و دانش کا سرچشمہ کہاں ہے۔ یہ اس کی روحانی غذا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہیں کسی چشمۂ آلودہ سے غذائے روحانی حاصل کر رہا ہو اگر ایسا ہے تو وہ اس کے جسم و روح کو بیمار کر دے گا اور اسے ہلاکت میں ڈال دے گا۔

اور الویت کے مفہوم کے پیشِ نظر حلال و حرام اور مشروع و غیر مشروع کے مسئلہ کو بھی دلالت کے ذریعہ اس آیت سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] و [2] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۲۹۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس آیہ شریفہ میں طعام کے معنی وسیع ہیں اور نگاہ کرنے اور دیکھنے کے معنی بھی وسیع ہیں اس بنا پر مندرجہ بالا تینوں تفسیریں اس میں جمع ہو سکتی ہیں۔ یہ کہ یہاں انسان سے مراد کون شخص ہے، کے بغیر واضح ہے کہ تمام انسان اس میں شامل ہیں۔ عام اس سے کہ مومن ہوں یا کافر سب کو چاہیئے کہ اپنے مواد غذائی، ان کے عجائبات اور ان میں پوشیدہ اسرار و رموز پر غور کریں تاکہ بے ایمان افراد کو حق کا راستہ ملے اور مومن افراد کی ایمان کی قوت میں اضافہ ہو۔

واقعی مواد غذائی، پھل، غذائی اجناس اور سبزیوں میں سے ہر ایک چشم بصیرت کے لیے ایک ایسی تعجب خیز دنیا رکھتے ہیں جس کا مدتوں مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور ان سے درس حاصل کیے جا سکتے ہیں جو تمام عمر ہمیں روشنی دانش دے سکتے ہیں۔

اس کے بعد اس غذائی مواد اور اس کے منابع کی تفصیلات بتاتے ہوئے فرماتا ہے: "ہم نے آسمان سے بہت زیادہ پانی پھینکا" (انا صببنا الماء صبًّا)۔

"صب" اوپر سے پانی پھینکنے کے معنوں میں ہے یہاں اس سے مراد پانی کا بارش کی صورت میں برسنا ہے۔ آیت کے آخر میں "صبا" کی تعبیر تاکید کے لیے ہے اور اس پانی کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے۔

جی ہاں! وہ پانی جو اہم ترین سبب حیات ہے، ہمیشہ بہت زیادہ مقدار میں پروردگار کے لطف و کرم سے آسمان سے نازل ہوتا ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ تمام نہریں اور چشمے اور پانی کے کنویں اپنے پانی کے ذخائر بارش ہی سے حاصل کرتے ہیں اور سب کا اصل سبب بارش ہی ہے کہ: ؎

اگر باراں بہ کوہستاں نبارد بہ سالے دجلہ گردد خشک رودے

اگر پہاڑوں پر بارش نہ ہو تو ایک ہی سال میں دجلہ خشک نالے میں تبدیل ہو جائے۔

اس لیے مواد غذائی کے مطالعہ کے وقت ہر چیز سے پہلے انسان بارش کے نظام کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ کس طرح سورج ہمیشہ دریاؤں کی سطح پر چمکتا ہے اور وہاں سے بادل اٹھتے ہیں، ہوائیں انہیں چلاتی ہیں اور پھر سطح زمین سے دور ہونے کے باعث اور سرد فضا کے علاقہ میں پہنچ جانے کی وجہ سے دوبارہ پانی میں تبدیل ہو کر برستے ہیں۔ آب مصفیٰ، جو ہر قسم کی مضر اور نمکین آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے قطروں کی شکل میں یا برف کے ان نرم گالوں کی صورت میں جو آہستہ سے زمین کی طرف آتے ہیں اور گھاس اور درختوں میں جذب ہو جاتے ہیں، زمین پر نازل ہوتا ہے۔

پانی کا ذکر کرنے کے بعد جو نباتات کے روئیدہ ہونے کا ایک اہم سبب ہے ایک اور رکن یعنی زمین کا رخ کرتا ہے اور مزید فرماتا ہے: "پھر زمین کو ہم نے شگافتہ کیا" (ثم شققنا الارض شقًّا)۔

بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ شگافتہ کرنا کونپلوں کے ذریعہ زمین کے چیرنے کی طرف اشارہ ہے۔ واقعی یہ بہت ہی عجیب و غریب چیز ہے کہ کونپل اس نرمی اور لطافت کے

باوجود سخت قسم کی مٹی کو چیر کر اور کبھی پہاڑی پتھروں کے اندر سے اپنا سر باہر نکالتی ہیں. خالق عظیم نے اس لطیف کونپل میں کیا عظیم قدرت ودیعت کی ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ انسانوں کے ہل چلانے کے ذریعہ زمین کو شگافتہ کرنا مراد ہے حتیٰ کہ ان کیڑوں کے ذریعہ جو دوسرے حیاتی عوامل کے ہمراہ ایک قسم کا ہل چلانے کا عمل انجام دیتے ہیں. یہ ٹھیک ہے کہ ہل چلانا انسان کا کام ہے لیکن چونکہ اس کے تمام وسائل خدا نے اس کے اختیار میں رکھے ہیں لہٰذا اس کو خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

تیسری تفسیر جو اس تعبیر کے لیے نظر آتی ہے اور کئی پہلوؤں سے قابل ترجیح ہے، یہ ہے کہ زمین کے شگافتہ ہونے سے مراد اس کی سطح کے پرتوں کا ریزہ ریزہ ہونا ہے۔

اس کی وضاحت کچھ اس طرح ہے کہ ابتدا میں سطح زمین کو قشر عظیم اور [illegible] نے پوشیدہ کر رکھا تھا. پے در پے شدید بارشیں ہوئیں انہوں نے پتھروں کو شگافتہ کیا، اس کے ذروں کو جدا کیا اور زمین کے کچھ حصوں میں اور اس کے کچھ گڑھوں میں وسعت پیدا ہوئی اور اس طرح مٹی کے قابل زراعت تودے تشکیل پاتے اور اب بھی سیلاب اس کے کچھ حصوں کو تحلیل کر کے دریا میں ڈال دیتے ہیں لیکن نئی مٹی جو برف اور بارش کی وجہ سے ازسرنو تشکیل پاتی ہے اس کی جگہ لے لیتی ہے ورنہ زراعتی مٹی کمیاب [illegible]

اس طرح یہ آیت قرآن کے ایک علمی معجزے کی طرف اشارہ کر کے بتاتی ہے کہ پہلے بارشیں ہوتی ہیں پھر زمینیں شگافتہ ہوتی ہیں اور زراعت کے لیے تیار ہو جاتی ہیں. نہ صرف یہ کہ ابتدائی دنوں میں یہ عمل صورت پذیر ہوا تھا بلکہ آج بھی جاری ہے۔

یہ تفسیر اس وجہ سے کہ بعد والی آیت میں گیاہ و نباتات کے اگنے کے مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے، زیادہ مناسب نظر آتی ہے. تینوں تفسیروں کا اجتماع بھی کوئی تضاد یا قباحت نہیں رکھتا. ان دو بنیادی ارکان یعنی پانی اور مٹی کے ذکر کے بعد آٹھ قسم کی اُگنے والی چیزوں کی طرف، جو انسان اور حیوان کی غذا کے بنیادی ارکان ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اس کے بعد ہم نے زمین میں بہت سے اجناس اُگائے" (فانبتنا فیھا حبًّا). غذائی اناج جو انسان اور مختلف حیوانات کی غذا کا اصلی ذریعہ و سبب ہیں وہ اگر خشک سالی کی بنا پر ایک سال نہ ملیں تو قحط پڑ جائے اور بھوک تمام جہان کو گھیر لے اور تمام انسانوں پر مصیبت پڑ جائے۔

"حبًّا" کی تعبیر نکرہ کی شکل میں بیان عظمت یا ان اجناس کے مختلف الاقسام ہونے کی دلیل ہے اور یہ جو بعض مفسرین نے اس کی تفسیر گندم اور جو سے کی ہے اس کے پلے کوئی دلیل موجود نہیں. اس لیے کہ اس تفسیر میں تمام اناج شامل ہیں. بعد کے مرحلے میں مزید کہتا ہے:

"اسی طرح انگور اور بہت سی سبزیاں" (و عنبًا و قضبًا)۔

"عنب" تمام پھلوں میں سے انگور کا ذکر غذائی مواد کی فراوانی کی بنا پر ہے جو اس پھل میں پوشیدہ ہے اور اسے ایک مکمل غذا کی شکل میں لے آیا ہے (توجہ فرمائیں کہ عنب انگور کو بھی کہا جاتا ہے اور انگور کی بیل کو بھی اور آیات قرآنی میں اس کا دونوں پر اطلاق ہوا ہے۔ لیکن یہاں مناسب انگور ہی ہے)۔

"قضب" (بروزن جذب) اصل میں ان سبزیوں کے معنی میں ہے جنہیں مختلف موقعوں پر توڑتے ہیں یہاں مختلف قسم کی کھائی جانے والی سبزیوں کے معنی میں ہے اور انگور کے بعد اس کا ذکر اس غذائی مواد کی اہمیت کی دلیل ہے جس پر موجودہ غذا شناسی کے علم میں حد سے زیادہ انحصار کیا جاتا ہے کبھی لفظ قضب قطع کرنے اور توڑنے کے معنی میں آتا ہے اور لفظ قضیب درخت کی شاخ کے لیے استعمال ہوتا ہے اور سیف قاضب شمشیر قاطع کے معنوں میں ہے۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ قضب سے یہاں مراد "رطب" تر و تازہ کھجوریں ہیں جنہیں درخت سے توڑتے ہیں لیکن یہ تفسیر بہت ہی بعید نظر آتی ہے اس لیے کہ بعد والی آیت میں رطب کی طرف علیحدہ اشارہ ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی پیش کیا ہے کہ قضب بوئے جانے والے پھلوں کے معنی میں ہے (کھیرا تربوز وغیرہ) یا گیاہ و نبات کی جڑوں کے معنی میں ہے لیکن بعید نہیں ہے کہ یہاں قضب کے معنی وسیع ہوں جس میں کھائی جانے والی سبزیاں بھی شامل ہوں، بوئے جانے والے پھل بھی اور غذائی جڑیں بھی (جو جڑ کی صورت میں ہوتی ہیں (آلو پیاز وغیرہ) اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"اور زیتون اور بہت سے کھجوروں کے درخت"۔ (وزیتونا و نخلا)۔

ان دو پھلوں پر انحصار کی دلیل بھی واضح ہے اس لیے کہ موجودہ زمانے میں ثابت ہو چکا ہے کہ زیتون اور کھجوریں اہم ترین، طاقت بخش، مفید اور صحت آفریں مواد غذائی ہیں۔ اس کے بعد کے مرحلے میں کہتا ہے:

"اور پُر درخت باغات" (انواع و اقسام کے پھلوں کے ساتھ)۔ (وحدائق غلبا)۔ "حدائق" "حدیقہ" کی جمع ہے ایسے باغ کے معنوں میں جس کے اطراف میں دیوار ہو اور وہ محفوظ ہو۔

یہ اصل میں زمین کے اس ٹکڑے کے معنی میں ہے جس میں پانی ہو۔ یہ لفظ حدقہ چشم (آنکھ کے ڈھیلے) سے لیا گیا ہے جس میں ہمیشہ پانی رہتا ہے۔ چونکہ اس قسم کے باغات عام طور پر پھلدار ہوتے ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ جنت کے انواع و اقسام کے پھلوں کی طرف اشارہ ہو۔

"غلب" (بروزن قفل) اغلب اور غلبا کی جمع ہے جس کے معنی موٹی گردن والے کے ہیں یہ اصل میں غلبہ کے مادہ سے لیا گیا ہے اور یہاں بلند اور گھنے درختوں کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے:

"اور پھل اور چراگاہ" (وفاکھۃ و ابا)۔ "اب" (ب کی تشدید کے ساتھ) خود رو گھاس اور اس چراگاہ کے معنوں میں ہے جو جانوروں کے چرنے کے لیے ہو۔ یہ اصل میں آمادگی کے معنی دیتا ہے اور چونکہ

اس قسم کی چراگاہیں استفادہ کی غرض سے تیار ہوتی ہیں لہٰذا انہیں اب کہا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ اب سے مراد ایسا خشک میوہ ہے جو سردی کے موسم کے لیے خشک کیا جا سکے اور اس کا ذخیرہ کیا جا سکے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ فائدہ پہنچانے کے لیے مستعد ہوتا ہے۔

بہت سے اہلِ سنت اور شیعہ مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں تحریر کیا ہے کہ ایک دن حضرت عمر منبر پر تھے انہوں نے ان آیتوں کی تلاوت کی۔ اس کے بعد کہا ان سب کو تو میں جانتا ہوں لیکن اب کیا چیز ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ اس کے بعد وہ عصا جو ان کے ہاتھ میں تھا اس کو ہاتھ سے رکھ دیا اور کہا خدا کی قسم! یہ ایک طرح کا تکلف ہے۔ کیسی مشکل ہے کہ تو اب کے معنی نہیں جانتا۔ (لوگوں کو مخاطب کر کے کہا) تم ان چیزوں کی پیروی کرو جو تمہارے لیے بیان کی گئی ہے اور اس پر عمل کرو۔ جس بات کو تم نہیں جانتے اور نہیں سمجھتے اسے اپنے پروردگار کے سپرد کر دو۔[1]

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ وہ لفظ اب کے مفہوم کو پیچیدہ سمجھتے تھے حالانکہ لغتوں کے متن کی طرف توجہ کرنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس کا کوئی پیچیدہ مفہوم نہیں ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ در المنثور میں آیا ہے کہ یہی سوال حضرت ابوبکر سے بھی کیا گیا انہوں نے کہا کہ میں اگر کتابِ خدا کے بارے میں ایسی بات کہوں جسے میں نہیں جانتا تو کونسا آسمان مجھ پر سایہ ڈالے اور کونسی زمین ہو گی جو مجھے قبول کرے گی۔

یہ ٹھیک ہے کہ بہت سے اہلِ سنت علماء نے ان دو روایتوں سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کوئی شخص ایسے مسائل کے بارے میں جنہیں وہ نہ جانتا ہو خصوصاً کتاب اللہ کے بارے میں اگر نہ جانتا ہو تو کوئی بات نہ کرے۔ پھر بھی اس سوال کی گنجائش باقی رہتی ہے کہ وہ شخص جو خلیفۃ الرسول اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے حکومت کرنا چاہتا ہو وہ اس لفظ کے معنی سے آگاہ نہ ہو جو متن قرآن مجید میں ہے اور جو معانی کے اعتبار سے کوئی خاص پیچیدگی نہیں رکھتا۔

یہ اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ہر زمانہ میں ایک خدائی رہبر لوگوں کے درمیان ہو جو شریعت کے تمام مسائل سے آگاہ ہو اور ہر خطاء اشتباہ سے مسئون و معصوم ہو۔ اسی لیے اس حدیث کے ذیل میں جو مرحوم مفید نے ارشاد میں نقل کی ہے، ہم پڑھتے ہیں کہ جس وقت یہ ماجرا امیر المومنین حضرت علیؑ سے بیان کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

(سبحان الله اما علم ان الاب هو الكلاء والمرعى و ان قوله تعالىٰ "وفاكهة و ابّا" اعتداد من الله بانعامه على خلقه فيما غذاهم به و خلقه لهم و للانعامهم مما تحيى به

---

[1] تفسیر روح المعانی، قرطبی، فی ظلال القرآن، در المنثور اور المیزان زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

انفسهم و تقوم به اجسادهم) «عجیب بات ہے کیا وہ نہیں جانتا کہ اب خود رو گھاس اور چراگاہ کے معنی میں ہے اور یہ کہ «وفاکھۃ و ابّا» کا جملہ خدا کی اپنے بندوں پر عنایت ہے اس اعتبار سے کہ اس نے انہیں غذائی مواد دیے ہیں اور انہیں ان کے لیے اور ان کے چوپایوں کے لیے ایسی چیزوں میں سے پیدا کیا ہے جو ان کی زندگی کا سبب اور ان کے جسم کی بنیادی ضرورت ہیں۔[1]

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ گزشتہ آیات میں بعض پھل خصوصیت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اور یہاں بطور کلی پھل پیش کیا گیا ہے اور اس سے قطع نظر گزشتہ آیت میں جس میں باغوں کی بات تھی بلطف ہر باغوں کے پھل پیش نظر تھے تو پھر یہاں میوے اور پھل کو کس لیے پیش کیا گیا ہے۔ ہم جواب میں کہتے ہیں کہ بعض پھلوں کا خصوصیت کے ساتھ بیان ہوا ہے مثلاً انگور، زیتون اور خرما وغیرہ کا (درخت نخل کے قرینہ کے پیش نظر) تو یہ ذکر ان پھلوں کی حد سے زیادہ اہمیت کی بنا پر ہوا ہے۔[2]

اب رہی یہ بات کہ «فاکھۃ» (پھل) ان کا «حدائق» (باغات) سے الگ کر ، ذکر ہوا ہے تو یہ ممکن ہے اس بنا پر ہو کہ باغات پھلوں کے علاوہ دوسرے منافع بھی رکھتے ہیں اور ان ۔ خوبصورت منظر ہوتے ہیں خوشگوار ہوا ان میں ہوتی ہے اور اس قسم کی دوسری چیزیں۔

اس سے بھی قطع نظر بعض خود رو درخت کچھ بجائے، خود اور کچھ کی جڑیں اور چھلکے غذا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں (مثلاً چائے، زنجبیل، دارچینی وغیرہ) اس کے علاوہ بہت سے درختوں کے پتے حیوانوں کے لیے مناسب خوراک کا کام دیتے ہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ جو کچھ گزشتہ آیات میں آیا ہے اس میں انسان کی خوراک بھی شامل ہے اور حیوانات کی بھی۔ اسی لیے بعد والی آیت میں جو آخری زیر بحث آیت ہے مزید کہتا ہے:

«تاکہ تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ ہوں»۔ (متاعاً لکم ولانعامکم)

متاع ہر وہ چیز ہے جس سے انسان متمتع ہو اور فائدہ اٹھائے۔

ایک نکتہ

صحیح و سالم موادِ غذائی

جو کچھ گزشتہ آیات میں انسانوں اور چوپایوں کے لیے آیا تھا وہ آٹھ قسم کے مواد غذائی تھے اور جاذب توجہ یہ ہے کہ وہ سب نباتات سے تعلق رکھنے والی غذائیں ہیں۔ یہ اس اہمیت کی بنا پر ہے جو انسانی غذا کے سلسلے میں ان اجناس میووں اور پھلوں سے وابستہ ہیں۔

---

[1] [2] ارشاد مفید منابق نقل المیزان، جلد ۲۰ ص ۳۱۹۔

غور سے دیکھا جائے تو انسان کی حقیقی غذا یہی چیزیں ہیں۔ حیوانی غذائیں تو دوسرے درجہ پر ہیں اور بہت کم مقدار میں ہیں۔

یہاں جو کچھ اس قابل ہے کہ اس پر توجہ کی جائے وہ یہ ہے کہ اس زمانے کا غذا شناسی کا علم جو ایک وسیع اور اہم علم ہے، وہ حقیقت میں جس چیز کی تفصیل و تشریح کرتا ہے وہ وہی چیز ہے جو ان آیات میں آئی ہے۔ اس طرح وہ علم عظمت قرآن کو پیش کرتا ہے۔

خصوصاً وہ غذائی مواد جن کا اوپر والی آیات میں تذکرہ ہوا ہے، ان میں سے ہر ایک غذا شناسی کی رُو سے بہت ہی اہم اور قیمتی ہے۔ بہر حال ان امور پر غور و خوض انسان کو اس کے خالق کی عظمت اور نوع بشر پر اس کی مہربانیوں سے بہت زیادہ آشنا کرتی ہے۔ جی ہاں! غذائے جسمانی کے بارے میں غور و فکر اور اسی طرح روح کی غذا کے بارے میں دائرۂ علم کے لحاظ سے بھی اور اکتساب کے طریقوں کے اعتبار سے بھی جو غور و فکر ہے وہ انسان کو معرفتِ خدا، تعمیر ذات اور تہذیب نفس کی راہ میں بہت آگے لے جاتا ہے۔

جی ہاں! آدمی کو چاہیئے کہ وہ اپنی غذا کے بارے میں بہت زیادہ غور و فکر کرے۔ یہ مختصر سا جملہ کس قدر پُر معنی ہے۔

(۳۳) فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ۝

(۳۴) يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝

(۳۵) وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۝

(۳۶) وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ۝

(۳۷) لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ۝

(۳۸) وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝

(۳۹) ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝

(۴۰) وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝

(۴۱) تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝

(۴۲) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ۝

ترجمہ

(۳۳) جب وہ مہیب صدا آئی (صیحہ قیامت) (تو کافر گھرے رنج وغم میں ڈوب جائیں گے)۔

(۳۴) وہ دن جب انسان اپنے بھائی سے دُور بھاگے گا۔

(۳۵) اور اپنی ماں اور باپ سے۔

(۳۶) اور اپنی بیوی اور اولاد سے۔

(۳۷) اس دن ان میں سے ہر ایک کی ایک خاص وضع وکیفیت ہو گی جو

اسے مکمل طور پر اپنے آپ میں مشغول رکھے گی۔

(۳۸) کچھ چہرے اس دن خوش گوار اور نورانی ہوں گے۔

(۳۹) خنداں و مسرور۔

(۴۰) اور کچھ چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے۔

(۴۱) تاریک دھوئیں نے انہیں ڈھانپ رکھا ہوگا۔

(۴۲) وہی کافر و فاجر ہیں۔

تفسیر

صیحہ قیامت

الٰہی برکتوں اور دنیاوی نعمتوں کے تذکرے کے بعد یہاں قرآن قیامت اور اس کے حوادث کے ایک گوشہ اور مومنین و کفار کی حالت کو بیان کرتا ہے تاکہ، ایک طرف تو یہ اعلان کرے کہ یہ نعمتیں اور مال و متاع جو کچھ بھی ہے جلد گزر جانے والا ہے اور اس کا ایک خاتمہ ہے اور دوسری طرف یہ بتاتے کہ ان سب کا وجود خدا کے وجود اور قیامت پر بجائے خود ایک دلیل ہے۔ فرماتا ہے:

"جس وقت وہ مہیب اور کانوں کو پھاڑ دینے والی آواز آئے گی تو کفار و مجرمین گھرے غم و اندوہ اور ندامت میں غرق ہو جائیں گے" (فاذا جاءت الصاخة) [1]

"صاخة"، "صخ" کے مادہ سے اصل میں صوت شدید و سخت اور مہیب آواز کے معنی میں ہے یعنی بہت ممکن ہے کہ اس سے کان بہرے ہو جائیں یا جو پیچ پیچ کانوں کو بہرہ کر دیتی ہے۔ یہاں اس سے صور کے دوسرے نفخہ کی طرف اشارہ ہے۔ وہی صیحہ عظیم جو بیداری اور زندگی کا صیحہ ہے۔ جو سب کو زندہ کر کے عرصۂ

---

[1] یہ کہ اس جملہ شرطیہ میں جزا کیا ہے کئی احتمال ہیں پہلا یہ کہ جزا محذوف ہے اور بعد والی آیتوں سے اس کا پتہ چلتا ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (فاذا جاءت الصاخة فما اعظم اسف الکافرین)۔ جب وہ مہیب صدا آئی تو کفار کو کس قدر افسوس اور ندامت ہوگی (تفسیر مراغی)۔ بعض مفسرین نے کہا ہے (لکل امرئ منھم یومئذ شأن یغنیہ) کا جملہ جزا ہے (مجمع البیان)۔ یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ جزا کا استفادہ (یوم یفر المرء) سے ہوتا ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے (فاذا جاءت الصاخة یوم یفر المرء من اخیہ) (روح المعانی)۔ جب مہیب صدا آئی تو انسان اپنے بھائی سے فرار کر گیا۔

محشر کی طرف بلاتے گا۔

جی ہاں! یہ اتنا عظیم اور دل ہلا دینے والا ہے جو انسان کو سوائے اس کی ذات، اس کے اعمال اور اس کی سرنوشت کے ہر دوسری چیز سے غافل کر دے گا۔ اسی لیے اس کے بعد بلا فاصلہ مزید فرماتا ہے:

"وہ دن جس دن انسان اپنے بھائی سے دور بھاگے گا" (یوم یفر المرء من اخیہ)۔ وہی بھائی جو جان کے برابر تھا اور جسے ہر جگہ یاد کرتا تھا اور اس کے بارے میں متفکر رہتا تھا آج کلی طور پر اس سے گریزاں ہوگا، اور اسی طرح اپنے ماں باپ سے" (وامہ وابیہ)۔ اور اپنی بیوی اور اولاد سے" (و صاحبتہ و بنیہ)۔

اسی طرح انسان اپنے نزدیک ترین عزیزوں کو یعنی بھائی، ماں باپ اور اولاد کو نہ صرف فراموش کر دے گا بلکہ ان سے فرار کرے گا۔ یہ بات بتاتی ہے کہ قیامت کا ہول اس قدر زیادہ ہوگا کہ انسان کو تمام تعلقات سے بیگانہ کر دے گا۔ وہ ماں جو اس سے بے حد محبت کرتی تھی، وہ ماں باپ جن کا وہ بہت زیادہ احترام کرتا تھا، وہ بیوی جس سے اُسے شدید محبت تھی، وہ اولاد جو اس کے دل کا سرور اور آنکھوں کا نور شمار ہوتی تھی؛ وہ اس وقت ان سب سے بے تعلق ہو جائے گا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ انسان اپنے ان بھائیوں، ماں باپ، بیوی اور اولاد سے فرار کرے گا جنہوں نے ایمان و تقویٰ اور اطاعت خدا کی راہ نہیں طے کی وہ ان سے اس لیے فرار کرے گا کہ کہیں ان کا حال اس کو اپنے نرغہ میں نہ لے لے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ فرار اس بنا پر ہے کہ مبادا ان کے کچھ حقوق اس کی گردن پر ہوں اور وہ اس سے ان کا مطالبہ کریں اور وہ خود ان کے ادا کرنے سے اس وقت عاجز ہو۔

ان تینوں تفسیروں میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ نیز ان تینوں کے جمع کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہ بات کہ پہلے بھائی، اس کے بعد ماں باپ، اس کے بعد بیوی اور آخری مرحلہ میں اولاد کے بارے میں کیوں گفتگو ہوئی ہے، اس بارے میں، بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ان تمام میں، سب سے نیچے کے مرحلہ سے بالاتر مرحلہ کی طرف بات ہوئی ہے کہ پہلے وہ اپنے بھائی سے گریز کرے گا پھر اپنے ماں باپ سے اور اس کے بعد بیوی اور اولاد سے، لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوتے کہ سب لوگ ان پانچ افراد سے تعلق کے بارے میں یکساں نہیں ہوتے، کبھی یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی میں بھائی زیادہ اہم ہوتا ہے، لہٰذا اس سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے اور کبھی بیوی اور کبھی اولاد۔ لہٰذا یہاں کوئی قاعدہ کلیہ مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

البتہ ان پانچ افراد میں سے ہر ایک کے ساتھ انسان کے رشتہ کی اہمیت سے متعلق بہت سے مطالب بیان کیے جا سکتے ہیں، لیکن اس طرح نہیں ہے کہ مطلق طور پر ایک کو دوسرے پر تمام جہتوں سے ترجیح دی جا سکے

خصوصاً اس شکل میں جس شکل میں آیت میں آیا ہے۔ اس بنا پر مندرجہ بالا ترتیب اہمیت کی بنا پر نہیں ہے۔

بعد والی آیت میں اس فرار کی دلیل بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: "اس دن ان میں سے ہر ایک ایسی حالت میں ہوگا کہ جو اسے مکمل طور پر اپنی ذات سے متعلق مصروف رکھے گی (لکل امریٔ منھم یومئذ شأن یغنیہ)۔

"یغنیہ" (اس کو بے نیاز کر دے گی) اس حقیقت کی طرف ایک معنی خیز کنایہ ہے کہ اس دن انسان اپنی ذات سے متعلق اس قدر مصروف ہوگا کہ دوسرے کی طرف توجہ نہیں کرے گا اور حادثات اس قدر شدید ہوں گے کہ اس کی ساری فکر کو مشغول رکھنے کے لیے کافی ہوں گے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرتؐ سے آپ کے خاندان کے کسی فرد نے سوال کیا کہ قیامت میں انسان کیا اپنے عزیز واقارب کو یاد کرے گا؟ تو آپؐ نے فرمایا:

ثلاثۃ مواطن لا یذکر (فیھا) احد احدا عند المیزان حتی ینظر ایثقل میزانہ ام یخف؟ وعند الصراط حتی ینظر ایجوزہ ام لا؟ وعند الصحف حتی ینظر بیمینہ یأخذ الصحف ام بشمالہ؟ فھذہ ثلاثۃ مواطن لا یذکر فیھا احد حمیمہ ولا حبیبہ ولا قریبہ ولا صدیقہ ولا بنیہ ولا والدیہ وذالک قول اللہ تعالیٰ: لکل امریٔ منھم یومئذ شأن یغنیہ

"تین موقف ایسے ہیں جن میں کوئی شخص کسی کو یاد نہیں کرے گا۔ پہلا میزان جہاں اعمال تولے جائیں گے تو وہاں جب تک یہ نہ دیکھے کہ اس کا پلڑا بھاری ہے یا نہیں۔ پھر پُل صراط، جب تک نہ دیکھ لے کہ وہ اس پر سے گزر سکے گا یا نہیں۔ پھر اس وقت جب نامہ اعمال انسانوں کے ہاتھ میں دیں گے جب تک یہ نہ دیکھ لے کہ اس کے دائیں ہاتھ میں نامہ اعمال دیتے ہیں یا بائیں ہاتھ میں۔ یہ تین موقف ہیں جہاں کوئی انسان کسی دوسرے کو یاد نہیں کرے گا۔ نہ قریبی دوست، نہ یار مہربان، نہ اعزہ، نہ مخلص ساتھی، نہ اولاد اور نہ ماں باپ۔ یہ وہی چیز ہے کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

"اس دن انسان اپنے آپ میں بہت زیادہ مشغول ہوگا۔"[1] اس کے بعد اس دن جو مومنین و کفار کی حالت ہوگی اس کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اس دن کچھ چہرے خوشگوار اور نورانی ہوں گے" (وجوہ یومئذ مسفرۃ)۔ "خنداں و مسرور" (ضاحکۃ مستبشرۃ) "اور کچھ چہرے اس دن غبار آلود ہوں گے" (ووجوہ یومئذ علیھا غبرۃ)۔ "تاریک دھوئیں نے انہیں ڈھانپ رکھا ہوگا" (ترھقھا قترۃ)۔

---

[1] تفسیر برہان، جلد ۴ ص ۴۲۹۔

"وہی کافر و فاجر ہیں" (اولٰئک ھم الکفرۃ الفجرۃ)۔

"مسفرۃ" جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے "اسفار" کے مادہ سے آشکار ہونے اور چمکنے کے معنی میں ہے، شب تاریک کی طرح جس کے آخر میں سپیدہ سحری ہوتا ہے۔

"غبرۃ" (بروزن غلبہ) "غبار" کے مادہ سے اس باقی ماندہ خاک کے معنی میں ہے جو زمین سے اٹھے اور کسی چیز پر پڑ جائے۔

"قترۃ" اصل میں "قتار" (بروزن غبار) کے مادہ سے اس دھوئیں کے معنی میں ہے جو جلتی ہوئی لکڑی یا کسی دوسری چیز سے اٹھتا ہے۔ بعض ارباب لغت نے اس کی غبار کے معنی میں تفسیر کی ہے لیکن اوپر والی آیت میں ان دونوں تفسیروں کو جمع کرنا یہ بتاتا ہے کہ یہ دونوں الفاظ دو مختلف معانی رکھتے ہیں۔

"کفرۃ" اور "فجرۃ" اسی وزن پر کافر و فاجر کی جمع ہیں جن میں سے پہلا فاسد العقیدہ افراد کی طرف اور دوسرا فاسد العمل لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

ان آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ صیحۂ قیامت کے وقت انسانوں کے بُرے عقائد اور اعمال کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوں گے۔ "وجوہ" چہرہ کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ چہرہ کا رنگ ہر چیز سے زیادہ انسان کی اندرونی حالت کو بیان کرتا ہے فکری و روحانی پریشانیوں کو بھی اور جسم سے متعلق دکھ درد کو بھی۔

بہرحال ایک گروہ وہاں مسرور ہوگا ان کے چہرے شگفتہ اور نورانی ہوں گے۔ ایمان کی روشنی اور عمل کی پاکیزگی ان کے چہروں پر موجزن ہوگی۔

رنگ رخسارہ انھا خبر از سر درون می دھد

ان کے رخسارے کا رنگ ان کے اندر کے راز کی خبر دیتا ہے۔

اس کے برعکس دوسرا گروہ وہ ہے کہ کفر کی تاریکی اور ان کے اعمال کی برائی ان کے چہروں سے نمایاں ہوگی۔ گویا سیاہ گرد و غبار ان کے چہرہ پر پڑا ہوا ہے اور دھوئیں کا ہالہ اس کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ آثارِ غم و رنج و اندوہ و تکلیف و درد ان کے چہروں سے ہویدا ہیں اور اصولی طور پر، جیسا کہ سورہ رحمٰن کی آیت ۴۱ میں آیا ہے: (یعرف المجرمون بسیماھم) گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔ اس دن چہروں کا رنگ انسانوں کی پہچان کے لیے کافی ہوگا۔

ایک نکتہ

تعمیر ذات کی راہ

جو تعبیریں اس سورہ کی مختصر اور پُرجلال آیات میں آئی ہیں وہ تعمیر ذات کے لیے ایک جامع پروگرام کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۔ ایک طرف انسانوں کو حکم دیتا ہے کہ کبر و غرور کو توڑنے کے لیے وہ اپنی خلقت کی ابتداء پر توجہ کریں اور دیکھیں کہ کس طرح انسان ایک بے قیمت نطفہ سے پیدا ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تعمیر ذات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی تکبر و غرور ہے۔

۲۔ دوسری طرف قرآن الٰہی ہدایات کا تعارف یہ کہہ کر کراتا ہے کہ یہ اس سلسلہ میں بہترین زادِ راہ ہے۔ عام اس سے کہ وہ ہدایات جن کا سرچشمہ وحی ہو اور انبیاء و اولیاء کی طرف سے کی گئی رہنمائی ہو یا وہ ہدایات جو عالم تکوین کے مطالعہ سے اور اس کے قوانین و نظام پر غور و فکر کرنے سے حاصل ہوں۔

۳۔ اس کے بعد انسان کو حکم دیتا ہے کہ وہ اپنی جسمانی غذا پر گہری نظر ڈالے اور سوچے کہ خالق رحیم و مہربان نے کس طرح انواع و اقسام کے غذائی مواد، دانے، میوے اس سیاہ مٹی سے اس کے لیے پیدا کیے ہیں۔ پھر اس ربوبیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے اور نہ صرف اس موادِ غذائی کی تکوینی ساخت کی طرف دیکھے بلکہ اس کے حاصل کرنے کی کیفیت کو بھی مرکزِ توجہ قرار دے اس لیے کہ پاک و حلال غذا تعمیرِ ذات کی ایک اہم بنیاد ہے۔

۴۔ پھر اپنی روحانی غذا کی طرف زیادہ گہری نظر سے دیکھے اور غور و فکر سے کام لے کہ وہ غذا کون سے سرچشمے سے حاصل ہو رہی ہے۔ پاک سرچشمے سے یا آلودہ سے۔ اس لیے کہ ناقص تعلیمات اور گمراہ کن تبلیغات مسموم اور زہریلی غذا کی طرح ہیں جو انسان کی معنوی زندگی کو خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ کچھ لوگ جسم کی غذا کے بارے میں بڑے محتاط ہوتے ہیں لیکن اپنی روحانی غذا کے بارے میں بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ ہر فاسد و مفسد کتاب پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر قسم کی گمراہ کن تعلیمات پر کان دھرتے ہیں اور اپنی روح کی غذا کے لیے کسی قسم کی قید و شرط کے قائل نہیں ہیں۔

ایک حدیث میں حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ ما لی اری الناس اذا قرب الیھم الطعام لیلا تکلفوا انارة المصابیح لیبصروا ما یدخلوا بطونھم ولا یھتمون بغذاء النفس بان ینیروا مصابیح البابھم بالعلم لیسلموا من لواحق الجھالة والذنوب فی اعتقاداتھم واعمالھم

کیا وجہ ہے کہ میں کچھ لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ جب رات کو کھانا ان کے پاس لاتے ہیں تو چراغ روشن کرتے ہیں تاکہ دیکھیں کہ وہ کونسی غذا اپنے شکم میں داخل کر رہے ہیں لیکن اپنی روح کی غذا کو اہمیت نہیں دیتے اور علم کے ذریعہ چراغ عقل کو روشن نہیں کرتے تاکہ عوارضِ جہالت و گناہ سے بچیں اور عقیدے اور اعمال صحت مند رہیں [1]

---

[1] "سفینۃ البحار" جلد ۲ ص ۸۴ مادہ طعم۔

اسی قسم کی حدیث آپ کے فرزند ارجمند امام حسن مجتبٰیؑ سے بھی منقول ہے: (عجبت لمن یتفکر فی مأکولہ کیف لا یتفکر فی معقولہ فیجنب بطنہ ما یؤذیہ ویودع صدرہ ما یردیہ) مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو جسم کی غذا کے بارے میں غور و فکر کرتا ہے لیکن روح کی غذا کے سلسلہ میں بالکل نہیں سوچتا۔ نقصان دہ غذا کو تو اپنے شکم سے دور رکھتا ہے لیکن دل کو مہلک مطالب سے بھرتا رہتا ہے[1]

۵۔ اس کے بعد سوچ لے کہ محشر کے لیے دلخراش صیحہ سب کو موت کی نیند سے بیدار کر دے گا اور انسان کے اعمال اس کے روبرو کرے گا اور اوضاعِ محشر اتنے ہولناک ہیں کہ انسان اپنے قریبی عزیزوں اور رشتہ داروں کو بھی فراموش کر دے گا۔ اس لیے اسے غور و فکر کرنا چاہیئے کہ کیا وہ آج ایسا کام کر رہا ہے جس سے اس دن اس کا چہرہ خنداں اور نورانی ہوگا۔ ایسا تو نہیں ہے کہ اس روز اس کا چہرہ ترش و تاریک ہو۔ اس کو چاہیئے کہ وہ ابھی سے اپنے آپ کو اس دن کے لیے تیار کرے۔

خداوندا! ہمیں اصلاحِ نفس کی توفیق عطا فرما۔

پروردگارا! ہمیں روحانی جاں پرور غذا سے محروم نہ فرما۔

بارالٰہا! صیحۂ محشر سے پہلے ہمیں خوابِ گراں سے بیدار کر دے۔

آمین یا رب العالمین!

سورۂ عبس کا اختتام

---

[1] "سفینۃ البحار"، جلد ۲ ص ۸۴ مادہ طعم۔

ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۴) کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)

مدرس / مینیجر

امامیہ قرأت کالج

اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

اشاریہ

تفسیر نمونہ ——— جلد ۱۴

ترتیب و تزئین ------ سیّد شکیل حسین موسوی

------ سیّد محمد حسین زیدی الباھروی

مضامین:

اُصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

توحید

نبوت

عدل

قیامت

معجزہ

فرشتے

جنت

طلاق، ارذلِ جواز

فلسفۂ عدّت

مطلقہ کے احکام و حقوق

طلاقِ رجعی کے احکام

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

اخلاقِ رذیلہ

اقوامِ سابقہ

ثمود

عاد

قومِ لوطؑ

قومِ فرعون

قومِ نمرود

قومِ نوحؑ

شخصیات

امراء القیس

انسؓ بن مالک

حضرت امام جعفر صادقؑ (امام ششم)

عبداللہ ابن عباسؓ

عبداللہؓ ابن مسعود

عتبہ بن ربیعہ

عتبہ یا عقبہ؟

عداس

حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ (امام اوّل)

ہارون الرشید

ہجر بن قیس

عُلماء و دانشور

کتبِ آسمانی

تورات

قرآنِ حکیم

سورۂ طلاق

سورۂ تحریم

سورۂ ملک

سورۂ القلم

Presented by Ziaraat.Com

سُورۂ حاقہ

سُورۂ معارج

سُورۂ نوحؑ

سُورۂ جن

ثوابِ تلاوت :

قاری کو قوم جن کی تعداد کے برابر غلام آزاد کرنے کا ثواب دیا جائے گا۔ ۳۰۷

شانِ نزول :

مختلف روایات۔ ہم نے عجیب قرآن سنا جو سیدھی راہ کی ہدایت کرتا ہے، ہم اس پر ایمان لے آئے۔ (جن) ۳۰۹، ۳۱۰

سورۂ مزمل

مضامین :

مکی سورہ ہے، تبلیغِ رسالت میں نرمی کا حکم ہے۔

اس کے پانچ حصے ہیں۔ ۳۵۲

ثوابِ تلاوت :

تلاوت کرنے والے سے دنیا و آخرت کی سختیاں اٹھ جائیں گی۔ (رسولِ پاکؐ) ۳۵۲

جتنا تمہارے لیے ممکن ہو اتنا قرآن پڑھو۔ ۳۷۶

غور و فکر کے ساتھ تلاوتِ قرآن کرو کہ معنی و مفہوم ذہن نشین ہو جائیں۔ ۳۸۰

سورۂ مدثر

مضامین :

آشکارہ دعوتِ اسلام کے بعد پہلا سورہ ہے۔ مبداء و معاد کی دعوت، شرک سے مبارزہ اور مخالفین کو عذابِ الٰہی سے انذار و تہدید ۳۸۲

ثوابِ تلاوت :

پڑھنے والے کو مکہ میں آنحضرتؐ کی تصدیق یا تکذیب کرنے والوں کی تعداد پر دس گنا نیکیاں دی جائیں گی۔ ۳۸۴

اس نے قرآن سے مبارزہ کرنے کے لیے غور و فکر کے بعد ایک منصوبہ بنایا اور کہا یہ قرآن جادو کی طرح پُرکشش اور قولِ بشر ہے۔ ۳۹۹

سورۂ قیامت

مضامین :

زیادہ تر قیامت، نیکوں اور بدکاروں کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ ۴۲۹

ثوابِ تلاوت :

پڑھنے والے کے لیے میں اور جبریلؑ گواہ ہوں گے کہ وہ قیامت پر ایمان رکھتا تھا۔ (آنحضرتؐ) ۴۲۹

ہدایت :

قرآن کو جلدی پڑھنے کے لیے زبان کو حرکت نہ دے، اس کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ ۴۴۶

سورہ انسان (دھر)

مضامین :

پانچ حصے، نیکوں کا اجر و ثواب، ثواب کا استحقاق، اہمیتِ قرآن، مشیتِ الٰہی کی حاکمیت، سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کی بحث۔ ۴۶۷

سورۂ مرسلات

سورۂ نباء

سورۂ نازعات

سورۂ عبس

کتبِ تفسیر و تاریخ و سیر

لغاتِ قرآن

(ا)

(ت)

(ث)

(ج)

(ح)

(ن)

متفرق موضوعات

ائمہؑ کے علمِ غیب کی ایک اور راہ

ابرار کے لیے اجرِ عظیم

اپنے اوپر کپڑا لپیٹنے والے کھڑا ہو جا

اُٹھیے! عالمین کو ڈرائیے

اچھی بیوی کے اوصاف

اخلاقی رذائل

اڑتے پرندوں کو دیکھو

اس کی منحوس سرنوشت

اس مفسد قوم (نوحؑ) کو ختم ہونا چاہیے

اسے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دو

مقامات

احقاف

حبشہ

حجاز

دومتہ الجندل

روضہ (خاخ)

رہاط

شام (موجودہ سوریا)

صنعا

طائف

طویٰ

مکہ

نصیبین

یمن

مطبوعاتِ مصباح القرآن

کتاب	مترجم / مصنف		قیمت
قرآن پاک (معریٰ) رنگین		ہدیہ	۲۵۰ روپے
قرآن پاک (معریٰ) سفید کاغذ		ہدیہ	۵۰ روپے
قرآن پاک مترجم	از مولانا سید صفدر حسین نجفی	ہدیہ	۳۰۰ روپے
تفسیر نمونہ (۲۷ جلدیں)	ترجمہ مولانا سید صفدر حسین نجفی	ہدیہ	۱۲۵ روپے (فی جلد)
قرآن کا دائمی منشور	〃	ہدیہ	۱۵۰ روپے
تفسیر پیام قرآن	〃	ہدیہ	۱۵۰ روپے
ہمارے آئمہؑ (۱۲ کتابوں کا سیٹ)	〃	ہدیہ	۳۰۰ روپے
ولایت فقیہ (جلد اول)	〃	ہدیہ	۲۰۰ روپے
ولایت فقیہ (جلد دوم)	〃	ہدیہ	۲۰۰ روپے
تفسیر فصل الخطاب (۷ جلدیں)	علامہ سید علی نقی النقوی	ہدیہ	۲۰۰ روپے (فی جلد)
تحریف قرآن کی حقیقت	〃	ہدیہ	۳۰ روپے
صلح اور جنگ	〃	ہدیہ	۱۰ روپے
مذہب اور عقل	〃	ہدیہ	۳۰ روپے
رہنمایانِ اسلام	〃	ہدیہ	۴۰ روپے
اسوۂ حسینی	〃	ہدیہ	۳۰ روپے
اثباتِ پردہ	〃	ہدیہ	۳۰ روپے
معراج انسانیت	〃	ہدیہ	۲۰ روپے
زندگی کا حکیمانہ تصور	〃	ہدیہ	۲۵ روپے
انوار القرآن	ترجمہ و حواشی مولانا ذیشان حیدر جوادی	ہدیہ	۴۰۰ روپے
میزان الحکمت (۵ جلدیں)	ترجمہ مولانا محمد علی فاضل	ہدیہ	۳۰۰ روپے
تاریخ قرآن	ڈاکٹر محمود رامیار	ہدیہ	۱۸۰ روپے

قرآن سنٹر ۲۴، الفضل مارکیٹ۔ اردو بازار لاہور

فون: ۷۳۱۴۳۱۱